اجل نامہ
محی الدین نواب

اِہتمامِ اشاعت ـــ مُحمّد سلیم رفائی
بار اول ـــــ ۲۰۰۰ء
مَطبع ـــــ یُو اینڈ مِی پرنٹرز لاہور
قیمت ـــــ -/۲۲۵ روپے

اسٹاکسٹ :۔
عَلی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ ،اُردو بازار
لاہور۔ فون : ۷۲۳۷۳۱۴

دیباچہ

موت دنیاوی زندگی کی انتہا اور لافانیت کی ابتداء ہے۔ موت سے اکثر لوگ خوف کھاتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ موت زندگی ختم کردیتی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اگر موت ان کی اِس زندگی پہ "دی اینڈ" کا ٹھپہ لگاتی ہے تو بدلے میں ان پر ایک نئی دنیا کا دروازہ بھی کھول دیتی ہے۔ برطانوی ڈرامہ نگار جیمز بیری نے موت کو ایک بہت بڑا ایڈونچر قرار دیا تھا........... اور کچھ غلط قرار نہیں دیا تھا۔ اگر سازوسامان اور سفر کی تیاری مکمل ہو تو موت واقعی ایک بہت بڑا ایڈونچر ہے۔

موت سے ڈرنا تو ایک فطری امر ہے' حیرت کی کوئی بات نہیں حیرت تو اُس وقت ہوتی ہے جب لوگ ہنستے کھیلتے موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ جہاد کے لئے نکلنے والا مجاہد موت سے خائف نہیں' موت کا طالب ہوتا ہے۔ مسلمانوں پر موقوف نہیں' دوسری اقوام و مذاہب کے لوگ بھی اپنے نظریات کے تحفظ کی خاطر جان پر کھیل جاتے ہیں۔ مسلمان کو تو شہید ہونے پر جنت کا وعدہ ہے' لیکن یہ دوسرے لوگ کیوں موت سے ڈرتے نہیں؟

سیدھی سادی بات ہے لیکن غور کرنے والے کے لئے۔ سطح سے تھوڑا نیچے جا کر جائزہ لیں تو خودبخود علم ہو جاتا ہے کہ جب کوئی شخص خواہ وہ کیمونسٹ ہو' ہندو ہو' سکھ ہو' عیسائی ہو' یہودی ہو یا مسلمان اپنے کاز کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے تو اُس کے ذہن میں یہ نہیں ہوتا کہ اگر میں مرگیا اور میرے مرنے کے بعد' دوسروں نے کامیابی بھی حاصل کرلی تو اِس سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس مقصد کے لئے وہ جان دے رہا ہے' اُسے اگر وہ خود حاصل نہ کرسکا' پھر بھی اُس کی روح' اپنے بعد آنے والوں کی کامیابی کو دیکھ کر مسرور ہوگی۔ جو لوگ سوچ کر عمل و عزم کا دامن ہاتھ سے

عرض مصنف

مجھے یقین نہیں ہے کہ میں جلدی مرجاؤں گا۔ یہ خوب صورت دنیا حیات و موت کی تجربہ گاہ ہے اور میں ہر تجربے سے کامیاب وکامران گزر رہا ہوں اور موت کو پیچھے چھوڑتا جا رہا ہوں۔ لوگ بیماریوں سے لڑنے اور موت سے بچنے کے لیے ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں۔ میری حیاتِ طولانی کا راز یہ ہے کہ میں اپنے قارئین کے پاس اپنی تحریر کی صورت میں جاتا ہوں اور ان کی دعائیں کماتا ہوں۔ میرے پاس بے شمار قارئین کے خطوط آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں لکھتا رہوں اور وہ پڑھتے رہیں۔ ان کے ان الفاظ میں یہ شدید خواہش ہے کہ میرے لکھنے کی عمر بڑھتی رہے اور جب خواہش شدت اختیار کرلے تو وہ دعا بن جاتی ہے۔

بہت عرصہ پہلے ایک خاتون کا خط آیا۔ انہوں نے لکھا تھا۔ "بھائی! تم ہمارے اندر کا کرب کیسے بیان کر دیتے ہو۔ میں ماں کی زبان سے بچوں کو وہ احساسِ آدمیت نہ دے سکی' جو تمہارے قلم نے دیا ہے۔ مائیں بہت خود غرض ہوتی ہیں' صرف اپنے بچوں کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتی ہیں۔ میری دعا ہے کہ تمہیں میری عمر لگ جائے۔"

یہ دسمبر ۱۹۹۰ء کے آخری ہفتے کی دوپہر تھی۔ اچانک میری سانس رک گئی اور میں زندگی سے کٹ گیا۔ یہ فینٹسی یا کوئی خیالی کہانی نہیں' میری حرف بہ حرف سچی رُوداد ہے۔ اس لمحے میرے نام اجل نامہ آگیا تھا۔

میرے حالات یوں رہے کہ میں پچھلے پانچ برسوں سے بدترین کھانسی اور دمے کا مریض رہا ہوں۔ ہر موسمِ سرما کے چار مہینے بستر پکڑ لیتا ہوں۔ میں ایسے ہی کسی بستر پر پیدا ہوا تھا اور ایسے ہی کسی بستر سے مجھے ہمیشہ کے لیے اٹھ جانا تھا مگر میں ابھی اٹھنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنی زندگی سے بہت پیار ہے۔ ایسا پیار جس میں قدرتی طور پر بھرپور اعتماد ہے کہ میں ابھی بہت عرصہ زندہ رہوں گا۔

آہ! مگر اجل سر پر کھڑی ہو تو آدمی کیسا بے اختیار اور بے بس ہو جاتا ہے۔ جب مجھ پر کھانسی کا دورہ پڑتا ہے تو مسلسل کھانسی کے دوران سانس لینے کی مہلت نہیں ملتی۔ میرے بیوی بچے دم بخود ہو کر توجہ سے دیکھتے ہیں کہ میں سانس لے بھی رہا ہوں یا نہیں؟ میں نہیں جانتا کہ میرے جیسے مریض ایسی مسلسل کھانسیوں کے دوران کس طرح اپنی سانسیں بحال رکھتے ہوں گے۔ میری اپنی بات یہ ہے کہ میں یوگا کی مشقیں کرتا رہا ہوں۔ جوانی کی وہ مشقیں بڑھاپے میں کام آرہی ہیں۔ میں آج بھی دو منٹ کے لیے سانس چھوڑ دیتے ہیں کہ دنیا کی زندگی چار روزہ ہے' مرگئے تو اِس ساری جدوجہد کا کیا فائدہ ہوگا' ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے صرف اتنا عرض کر دیتا ہوں کہ جب قائداعظم کو اپنے پھیپھڑوں سے چمٹے موذی مرض کا علم ہوگیا تھا' اُس وقت اگر وہ بھی یہی کچھ سوچ کر تحریکِ پاکستان کی رہنمائی سے ہاتھ اٹھا لیتے' تو آج ہم ہندو کی غلامی کررہے ہوتے۔

خیر' ذکر موت کا ہو رہا ہے۔ موت کے طلبگاروں کی ایک قسم وہ ہے جو میں نے اوپر بیان کی اور دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو وقتی پریشانیوں' غموں اور مصائب سے گھبرا کر موت میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور خودکشی کرکے ہر رنج و الم سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

مشہور شاعر رابرٹ ساؤدری اپنی نظم The Dream میں موت کی زبانی کہتا ہے۔

"میرا نام موت ہے۔ میں تمہاری آخری بہترین دوست ہوں۔"

واقعی جو ہمیں ایک لافانی زندگی عطا کرے اور ہمیں ہمارے دکھوں اور تکالیف سے نجات دے وہ ہمارا دشمن نہیں دوست ہوگا.......... اور محی الدین نواب نے "اجل نامہ" میں اجل سے یعنی موت سے دوستی کرلی ہے۔

یہ دوستی کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی اِس کی کہانی محی الدین نواب کی زبانی ملاحظہ کیجئے۔ اِس انتخاب میں شامل تمام داستانیں موت نے بیان کی ہیں۔ اِن کے متعلق سردست اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اجل نواز کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کو محی الدین نواب نے قرطاس پر منتقل کیا ہے اور موت اور زندگی کے اِس امتزاج نے اِن داستانوں کو دو دھاری تلوار بنا دیا ہے۔

اِن کہانیوں میں سبھی کچھ ہے۔ معاشرے کے تلخ حقائق' صبا رفتار تحریر اور جابجا آنے والے تیز موڑ' برجستہ مکالمے اور دلکش زبان.......... ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے آپ کو بجلی کے جھٹکے بھی لگیں گے' آپ کی آنکھوں میں آنسو بھی آئیں گے' آپ کھل کھلا کر ہنسنے پر مجبور بھی ہوجائیں گے' کہیں آپ کا خون کھولنے لگے گا اور کبھی آپ یوں ڈھلک جائیں گے جیسے غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ اِن کہانیوں کو تنہائی میں پڑھیے گا۔

عظیم احمد

روک لیتا ہوں یا پھر سانس روکنے کے دوران نا معلوم طریقے سے چور سانس لینے کی چور مشق ہو گئی۔ بہرحال ہر ذی روح کی طرح میرے لیے بھی وقتِ مقررہ تک جینے کا بہانہ ہو گیا تھا۔

مگر اس دوپہر اچانک سانس رک گئی۔ یوگا کی مشق دھری کی دھری رہ گئی۔ مہنگی دوائیں پانی ہو گئیں۔ حیات یکلخت گم ہو گئی۔ خدا گواہ ہے کہ میں لاپتا ہو گیا تھا اور خدا گواہ ہے کہ اپنی موت سے پہلے میں نے ایک رات اپنا جنازہ دیکھا تھا جو ایک مسجد اور درگاہ کے درمیانی صحن سے گزر رہا تھا۔ میں مرچکا تھا مگر میرے اندر زندگی چیخ رہی تھی۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ انسان جب بھی تڑپتا ہے اس کا جسم اضطرابی حرکتیں کرتا ہے مگر میں اپنی لاش کے اندر تڑپ رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ یہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ مجھے یہاں سے واپس لے جاؤ۔ دنیا کی سب سے عبرت ناک سواری جنازہ ہے۔ مجھے اس سواری سے اتاردو۔ اللہ اور رسول ﷺ میری گھٹی میں ہیں۔ میں ہوش سنبھالنے سے اب تک فرصت کے لمحات میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کا اعتراف کرتا رہتا ہوں اور کلمۂ شہادت کا اردو ترجمہ زیرِ لب دہراتا رہتا ہوں لیکن اس رات اپنے جنازے میں چاروں شانے چت پڑا' کلمۂ شہادت بھول گیا۔ صرف موت کا خوف رہا اور زندگی کی طلب میں بے حس و حرکت لاش کے اندر تڑپتا رہا۔ خدا اور رسول ﷺ کا نام لینا چاہتا تھا مگر زندگی کی محبت اور کشش غالب آ رہی تھی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میرا وہ خواب کب اور کیسے اختتام کو پہنچا۔ میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلے زور زور سے سانس لیتے ہوئے اطمینان حاصل کیا کہ میں زندہ ہوں پھر شکرانے کے طور پر اللہ رسول ﷺ کو یاد کرنے لگا۔

اس خواب سے ایک بہت ہی تلخ حقیقت کا احساس ہوا۔ یہ یاد کرکے بڑی شرم آئی کہ ہم تمام عمر خدا کا نام لیتے ہیں۔ پانچوں وقت سجدے کرتے ہیں لیکن جب موت آتی ہے تو مارے خوف کے خدا کو بھول کر زندگی کو پکارتے ہیں۔ میں کسی حد تک انسانی نفسیات کو سمجھتا ہوں۔ بڑے سے بڑے عبادت گزار دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھتے اور عبادت کی گہرائیوں میں غرق رہتے ہیں لیکن ان کے لاشعور میں زندگی کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔ اکثر لوگوں کی عبادت کے پیچھے خود غرضی ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ میری بات تسلیم کرلی جائے۔ میں نے تو نیند کی حالت میں عارضی موت مرکر اپنے دوغلے اعمال کو آزمایا ہے۔ میں ایک مصنف ہو کر سچ نہیں لکھوں گا تو پھر سچائی پر سے اعتبار اٹھتا جائے گا اور میرا یہ تجربہ اور یقین ہے کہ میں جو سچ کہتا ہوں اور سچ لکھتا ہوں تو وہ ساری سچائیاں دنیا کے بیشتر افراد کی نفسیاتی عادات پر پوری اترتی ہیں۔

خواب سے چونکنے پر مجھے یوں لگا کہ جس مسجد اور درگاہ کے درمیانی صحن میں میرا جنازہ لے جایا گیا تھا' وہاں میں پہلے کبھی جا چکا ہوں۔ کچھ دنوں بعد یاد آیا کہ میں جنوری ۱۹۸۱ء میں دہلی گیا تھا وہاں حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھی تھی۔ اس کے سامنے ایک صحن تھا اور دوسری طرف مسجد تھی۔ میرا جنازہ اسی صحن میں پہنچایا گیا تھا۔ میں اس خواب سے اس بات کا معترف ہوا کہ کبھی کبھی پیش آنے والے کسی واقعے کی آگہی پہلے سے ہو جاتی ہے۔ مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ میرے چل چلاؤ کا وقت آ رہا ہے۔ وہ وقت آیا ہی کو ہے کہ موت کا فرشتہ آئے گا اور میری روح قبض کرکے میرا خالی بدن چھوڑ جائے گا لیکن اس وقت میں نے سوچا کہ خواب زندگی کی سچائیوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ محض خواب ہوتے ہیں اور بھلا دیئے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف کبھی کبھی ہوتا ہے کہ بعض خواب آگہی کے طور پر نظر آتے ہیں۔ پیشگی اطلاع دے کر یادداشت سے گم ہو جاتے ہیں۔

پھر وہ دوپہر آئی جب میرا وہ خواب سچ ہوا۔ کھانسی کا ایسا پاگل دورہ پڑا کہ ایک دم سے دماغ کو جھٹکا سا لگا اور یکلخت میری سانس رک گئی۔ میں کھانسنے کے دوران جیسے جھکا ہوا تھا' ویسے ہی جھکا رہ گیا۔ بعد میں میری بیوی نے بتایا کہ میرے دیدے پھیل گئے تھے اور بالکل ساکت ہو گئے تھے۔ اُس بے چاری نے چند لمحوں تک انتظار کیا کہ میں شاید حرکت کروں گا۔ کچھ بولوں گا یا بیماری کے مطابق پھر کھانسنا شروع کروں گا۔ پھر وہ رو پڑی۔ ماں کو روتے دیکھ کر میرے بچے رونے لگے۔ کوئی مرنے والا دیکھ نہیں پاتا کہ اس کے بچے کیسے بلک رہے ہیں۔

الوداع شریکِ حیات! کہ اب حیات نہیں رہی۔ تُو بھی شریک نہ رہی۔ میں تیرے حصے کی مسرتیں دیتا رہا۔ اب اپنے حصے کے آنسو ملتے رہیں گے۔ الوداع پیارے قارئین! اب سماجی' معاشرتی سچائیاں میری کہانیوں کی صورت میں شائع نہیں ہو سکیں گی۔ الوداع کہ میں شریکِ حیات کو شوہر کے پیار سے' بچوں کو باپ کی شفقت سے اور قارئین کو سچی کہانیوں کے خزانے سے خالی کرکے جاچکا ہوں۔ جہاں جاچکا ہوں' وہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

اچانک ایک خاتون کی چیخ سنائی دی۔ بہت دور سے آواز آئی۔ "میرے بھائی! تُو نے ہماری نسل کو احساسِ آدمیت دیا ہے۔ مائیں صرف اپنے بچوں کو درازی عمر کی دعائیں دیتی ہیں مگر میری دعا ہے کہ تجھے میری عمر لگ جائے............"

یکبارگی میری شریکِ حیات نے اتنی زور سے جھنجوڑا کہ میرے جسم کو جھٹکا لگتے ہی سانس آگئی۔ میں زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ میرے بچے مجھ سے لپٹ گئے۔ میری شریکِ حیات روتے روتے ہنس رہی تھی اور ہنستے ہنستے رو رہی تھی۔ مجھے زندگی واپس ملنے کے بعد میں نے اپنے محبت کرنے والے قارئین کو نہیں بھلایا۔ ۱۹۹۲ سے اب تک ہر دوسرے تیسرے ماہ ان کی خدمت میں اپنے قلم کی سچائیاں لے کر حاضر ہو جاتا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی سے پیار ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اس لئے میں قارئین کو اپنا حال سناتا ہوں تو میرے ڈاکٹر قارئین خطوط نہیں لکھتے' میرے درازی عمر کا نسخہ لکھتے ہیں اور یہ تمام نسخے عرش تک پہنچتے ہیں۔

مجھے اپنے قارئین کی محبتوں اور دعاؤں پر کس قدر اعتماد ہے' اس کا حوالہ میں قرآن مجید سے پیش کررہا ہوں۔ سورہ لقمان ۳۱ اور آیت ۴۲ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے' اس کی روح نیند میں قبض کرلیتا ہے۔ پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے' اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقتِ مقررہ کے لیے واپس بھیج دیتا ہے۔"

مذکورہ آیت میں وہ سب کچھ ہے' جو میرے ساتھ پیش آیا۔ میری روح نیند میں قبض کی گئی اور میرا جنازہ مسجد اور درگاہ کے درمیانی صحن میں پہنچایا گیا۔ ایسا نیند میں ہوا تھا۔ آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے' اسے روک لیتا ہے۔

میرا ایمان ہے کہ عرش پر دعاؤں کے نسخے جا رہے تھے اور اس ربِ کریم نے مذکورہ آیت کے مطابق میری روح کو ایک مقررہ وقت کے لیے واپس بھیج دیا ہے۔ ان حالات سے گزرنے کے بعد میں نے سوچا' پتا نہیں میری نئی زندگی کے لیے کتنا وقت مقرر کیا گیا ہے؟ ویسے جتنا بھی وقت ہے' مجھے حیات و موت کے مختلف پہلوؤں کو کہانیوں میں بیان کرنا چاہیے۔

لٰہذا میری کتاب "اجل نامہ" کے عنوان سے دیگر کہانیوں سمیت آپ کے ہاتھ میں ہے

ان کہانیوں میں یوں تو طرح طرح کے کردار آئیں گے اور اپنی مدتِ حیات عجیب و غریب انداز میں پوری کریں گے لیکن دو اہم کردار ہر کہانی میں موجود رہیں گے۔ ان میں سے ایک ملک الموت ہے اور دوسرا محی الدین نواب............

محی الدین نواب

اجل نواز کے چار روپ کی رُوداد

اجل نامہ

کیا فرشتہ موت انسانی شکل میں آسکتا ہے؟ ہمارا جواب ہے' جی ہاں آسکتا ہے۔ کیا قاتل انسانی شکل میں نہیں آتا؟ حضرت لوطؑ کے زمانے میں فرشتے لڑکوں کے روپ میں اُن کے پاس آئے تھے۔

فرشتہ موت ایک علامت ہے۔ وہ ریل کا انجن بھی ہو سکتا ہے۔ وہ فیکٹری کی مشین بھی ہو سکتی ہے۔ اور کسی رائفل کی گمنام گولی بھی۔ وہ زلزلہ بھی ہو سکتا ہے اور آتش فشاں بھی۔ وہ موت کی ہزارہا اشکال میں سے کچھ بھی ہو سکتا ہے! موت ایک صداقت ہے۔ روپ کچھ بھی ہو' صداقت بدل نہیں سکتی۔

ہماری پہلی ملاقات غائبانہ ہوئی۔ میں نے محض آواز سنی اور پوچھا "کون؟"
صدا آئی میں "میں ہوں۔"
"میں کون؟ اپنا نام' نشان اور حسب نسب بیان کرو۔"
"میرا نام عزرائیل ہے۔"
"میں نے آج تک کسی بندے کا نام عزرائیل نہیں سنا۔"
"ہاں انسان تمام فرشتوں کے نام پر اپنا نام رکھتے ہیں۔ کسی کا نام اسرائیل ہوتا ہے' ئی اسرافیل کہلاتا ہے اور کوئی اپنا نام جبریل رکھتا ہے۔ میں ایک ایسا فرشتہ ہوں' جس کا کوئی نہیں اپناتا۔ اس لیے کہ میں موت کا فرشتہ ہوں اور جانداروں کے لیے شاید ریدہ ہوں۔"

میں نے کہا "جانی دشمن کبھی پسندیدہ نہیں ہوتا۔ تمہاری ہم سے کیا دشمنی ہے؟ ا کیوں مار ڈالتے ہو؟"
"میں کسی کا دشمن نہیں ہوں اور کسی کا دوست نہیں ہوں۔ پھر بھی دوست اور ے کی طرح تمہارے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہوں۔ پھر جب خدا کا حکم ہوتا ہے تو روح کرلیتا ہوں۔"

اس نے کہا "یہ قضا و قدر کی بات ہے۔ قضا وہ حکم ہے' جو روزِ ازل تمام کائنات لیے طے ہو چکا ہے اور قدر وہ حکم ہے جو بتدریج قضا کو ہر فرد تک پہنچتا ہے۔ اگر تم بات کو نہایت آسانی سے سمجھنا چاہتے ہو تو یوں سمجھو کہ ہم موت کے فرشتے حکمِ اندی سے نئے آنے والوں کے لیے جگہ بناتے رہتے ہیں۔"
میں نے پوچھا "تم موت کے فرشتے کہہ رہے ہو۔ کیا تم ایک نہیں ہو۔ کئی موت رشتے ہیں؟"

"ہاں ایک افسر فرشتے کے ماتحت فرشتوں کا ایک پورا عملہ ہے' جو موت وارد کرنے' کو جسم سے نکالنے اور اسے قبضے میں لینے کی بہت سی مختلف النوع خدمات انجام دیتا "

"تم میرے پاس آئے ہو۔ کیا میرا وقت پورا ہو چکا ہے؟"

"ابھی نہیں۔ ابھی تمہاری سانسیں باقی ہیں۔ تم حیات و موت کے فلسفے کو آسا الفاظ میں پیش کرنا چاہتے ہو لیکن یہ میرے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔"

میں نے خوش ہو کر کہا "مجھے تمہارا تعاون حاصل کر کے خوشی ہوگی۔ کیا آج سے دوست بن کر رہیں گے؟"

"زندگی اور موت ایک دوسرے کی دوست نہیں ہو سکتیں۔ میں موت ہوں سے دوستی کے لیے مصافحہ کرنا چاہوں گا تو ہاتھ ملاتے ہی تمہارا مُردہ پاؤں گا۔ افسو دوست بن کر بھی تمہیں چھو نہیں سکوں گا۔"

"میں تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ کیا تمہارا وجود ہے؟"

"بے شک فرشتوں کا وجود ہے۔ میں بھی ہوں۔ مگر میں انسانوں کی دنیا میں صور بدل بدل کر آتا ہوں۔ جب انسان کی طبعی موت ہو تو میں نظر نہیں آتا۔ اسے بیماری مرنا ہو تو مہلک مرض بن کر جاتا ہوں' آفات سے مرنا ہو تو زلزلے اور طوفان کی صور میں آتا ہوں۔ کسی کے مقدر میں قتل ہونا لکھا ہو تو اس کے قاتل کے اندر سما جاتا ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں' میرے سامنے آؤ۔ میرے ساتھ رہو اور یہ بتاؤ کہ قضا بتدر کسی فرد تک کیسے پہنچتی ہے؟"

"میں پہلے مرحلے میں بتاؤں گا کہ لوگ خود ہی رفتہ رفتہ اپنی موت کا سامان طرح کرتے ہیں اور یہ بتانے کے لیے تمہارے پاس میٹھی چھری بن کر آؤں گا۔"

اکثر دوست جان نثار بھی ہوتے ہیں اور میٹھی چھری بھی بن جاتے ہیں۔ بدقسمتی کسی موڑ پر دوست ہو کر چھرا گھونپ دیتے ہیں۔ اس نے کہا "جب تک تمہاری مو مقررہ وقت نہیں آئے گا' میں تمہیں بیماریوں' حادثات اور آفات سے بچاتا رہوں گا۔ تمہارے مقدر میں جیسی موت لکھی ہوگی' اسی طرح تمہاری روح قبض کر لوں گا۔ ا دوست کو میٹھی چھری کہتے ہیں۔ کیا تمہاری دنیا میں میٹھی چھریوں کی کمی ہے؟"

"بے شک کمی نہیں ہے۔ تم کب آ رہے ہو؟ کس نام اور شناخت سے آر ہو؟"

"چونکہ انسانی روپ میں آ رہا ہوں' اس لیے تم سے مصافحہ بھی کر سکوں گا۔ ہم نو و ہم پیالہ رہوں گا اور میرا نام ہو گا اجل نواز........"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اجل نواز نے کہا "ریسیور اٹھاؤ" مرجانہ بات کرنا چا ہے۔"

"یہ مرجانہ کون ہے؟ تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"جتنی ہستیوں کی روحیں قبض کرنے کی ذمے داریاں مجھ پر ہیں' میں ان سب کو جانتا ہوں۔"

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی' میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے پوچھا "ہیلو کون؟"

"میں مرجانہ بول رہی ہوں۔ محی الدین نواب سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"فرمائیے' میں ہی بول رہا ہوں۔"

"اوہ' کیا واقعی نواب صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی ہاں آپ یقین کریں۔ میں ہی بول رہا ہوں۔"

"میں آپ کی فین ہوں۔ آپ کی کہانیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتی رہی ہوں۔"

"مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ آپ اتنے ذوق و شوق سے میری تحریر پڑھتی ہیں۔ آپ جیسے قارئین سے عزت اور ستائش ملتی ہے تو میرا حوصلہ بڑھتا ہے اور میں خوب سے خوب تر لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"کیا آپ مجھ سے ملاقات کرنا پسند کریں گے۔ میں ایک مسئلے میں الجھی ہوئی ہوں اور الجھن کا تعلق آپ کی ایک کہانی سے ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میری کوئی کہانی آپ کی الجھن کا سبب بن گئی ہے۔ آپ میرے دفتر کسی بھی دن' کسی بھی وقت آسکتی ہیں۔"

"ابھی چار بجے آجاؤں؟"

میں نے آنے کے لیے کہا پھر ریسیور رکھ دیا۔ اس کے بعد زیر لب پکارا "ہیلو اجل نواز! کیا موجود ہو؟" مجھے جواب نہیں ملا۔ وہ شاید نہیں تھا لیکن اس کی عدم موجودگی خلافِ حقیقت تھی۔ کیونکہ موت غیر حاضر نہیں رہتی۔ ہمیشہ زندگی کے ساتھ رہا کرتی ہے۔

آفس کا دروازہ کھلا میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک جوان دکھائی دیا۔ اس نے قریب آکر مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر اس سے مصافحہ کیا۔ میرے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اس کا ہاتھ موت کی طرح سرد تھا۔ وہ مسکرا کر بولا "میں ہوں تمہارا دوست اجل نواز۔"

"دوست! تم نے ہاتھ ملاتے ہی ٹھنڈا کر دیا۔"

"اور تم نے ہاتھ ملا کر مجھے گرما دیا۔ میں نے یہ نیا انسانی جسم اپنایا ہے۔ اس لیے

ابھی حرارت پیدا نہیں ہوئی۔ ایک بار میرے گلے لگ جاؤ۔ میں نے آج تک زندگیوں کو ٹھنڈا کیا ہے۔ آج تم مجھے زندگی کی تھوڑی سی گرمی دے دو، ہم ٹھنڈک اور حرارت کے تبادلے سے دوستی کا توازن قائم رکھیں گے۔"

میں آگے بڑھا اور بڑی گرم جوشی سے اسے گلے لگالیا۔ وہ بڑا عجیب مرحلہ تھا۔ کوئی موت کو گلے لگا کر زندہ نہیں رہتا مگر میں سانسیں لے رہا تھا۔ یہ سمجھنے کی بات ہے۔ انسان نہایت زہریلے ناگ کو گلے میں مفلر کی طرح لپیٹ لیتا ہے۔ موت ناگ کے روپ میں بھی ہوتی ہے یوں ثابت ہوا کہ موت کو گلے لگانے والا پہلا شخص میں نہیں ہوں۔ کتنے ہی سپیرے اور مداری موت سے کھیلنے کا تماشا دکھاتے ہی رہتے ہیں۔

وہ بولا "تم نے میرے اندر ایک لطیف سی حرارت پیدا کر دی ہے۔ میرے اندر برف پگھل رہی ہے۔"

میرا درجہ حرارت کم ہو رہا تھا۔ میں نے الگ ہو کر کہا "مجھے تم سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔ آؤ بیٹھو۔"

وہ ہنستے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "رسمی جملوں نے حد کر دی ہے۔ آدمی دشمن سے مل کر بھی خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ خوب مذاق کرتا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی وہ آنے والی ہے۔ کچھ اس کے متعلق بتاؤ۔"

"اس کا نام مرجانہ پاچاری ہے۔ اس کی چھوٹی بہن کا نام فرزانہ پاچاری ہے۔ وہ دونوں ایک قبیلے کے سردار حاکم علی پاچاری کی بیٹیاں ہیں۔ لسبیلہ کی بیلہ نامی بستی میں ان کی ایک حویلی ہے۔ سردار کو بیٹوں کی بڑی آرزو تھی۔ بیٹے نہ ہوئے تو وہ بیٹیوں کو کراچی شہر میں تعلیم دلا رہا ہے۔ بڑی بیٹی مرجانہ کا کالج تک پڑھ لینا ان کی خاندانی اور علاقائی روایات کے خلاف ہے۔ چھوٹی بہن فرزانہ چھ جماعتوں سے زیادہ نہ پڑھ سکی اس لیے اپنے صدیوں پرانے ماحول بیلہ میں مطمئن رہتی ہے۔"

میں نے پوچھا "یعنی مرجانہ اپنے علاقائی رسم و رواج اور خاندانی روایات کی باغی ہے؟"

"ہاں، سردار نے محبت اور شفقت سے اسکول میں بچی کو داخل کرایا تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ بچی جوان ہوگی تو لسبیلہ جیسے ویران اور خشک علاقے میں اس کے لطیف جذبوں کا دم گھٹنے لگے گا۔ اس دم گھٹنے کے مرحلے تک بیٹی خود نہیں آئی ہے، باپ نے اسے پہنچایا ہے۔ اب وہ لندن جا کر خواہ کیمبرج تک پڑھ آئے، شادی تو اپنے ہی قبیلے یا آس پاس کے کسی قبیلے میں ہوگی۔ اگر وہ کسی شہری گل فام کو آئیڈیل بنائے گی تو قبیلے کا کوئی غیرت مند

اسے گولی مار دے گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "میں سمجھ گیا اجل نواز! تم اس غیرت مند کے اندر گھس کر اس بے چاری کو گولی مارو گے۔"

"میری پوری کوشش ہوگی اور میرے ساتھ تم بھی کوشش کرو گے تو میرا وعدہ ہے، دشمن اسے نہیں مار سکیں گے۔ اگرچہ ایک دن اسے مرنا ہے لیکن وہ بہت کچھ کرکے مرے گی اور وہ منظر قابلِ دید ہوگا۔ اس کے قاتلوں کے ہاتھ کانپ رہے ہوں گے۔ پیروں تلے سے زمین سرک رہی ہوگی۔ ان کے ماتھے پر پسینہ آ رہا ہوگا اور میں تذبذب میں رہوں گا کہ اس کی روح کیسے قبض کروں؟"

میں گم صم سا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا، وہ بولا "پتا نہیں خدا نے اپنے بعض بندوں کو کیا حوصلہ، کیسی ذہانت اور کیسی حکمت عملی کا شعور دیا ہے کہ ان کی روح قبض کرتے وقت موت کے فرشتے گڑبڑا جاتے ہیں۔"

"بھئی سیدھی سی بات بتاؤ، کیا تم مرجانہ کی روح قبض نہیں کر سکو گے؟"

"ابھی نہ پوچھو۔ میں سوچتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں کہ ان لمحات میں اپنا فرض کیسے ادا کروں گا۔ ان لمحات میں اس کی موت اٹل ہوگی مگر وہ موت کو ٹال دے گی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ میں بھی تمہارے ساتھ کوشش کروں گا تو دشمن اسے نہیں ہلاک کر سکیں گے۔"

"بے شک، وقتِ مقررہ تک میری تمہاری یہی کوشش ہوگی کہ اسے کوئی ہلاک نہ کرے۔ میری پریشانی یہ ہے کہ وہ موت کا مقررہ وقت آنے ہی نہیں دے گی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو، ہر ذی روح کو اپنے معینہ وقت پر فنا ہے۔"

"یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تم بھی معینہ وقت پر مر چکے تھے لیکن اس وقت میرے سامنے زندہ بیٹھے ہوئے ہو۔ میرے دوست! مشیتِ الٰہی کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اگر تم چاہنے والوں کی دعاؤں سے جی گئے تو یہ رحمتِ خداوندی کا ایک بہانہ تھا۔ مرجانہ اگر اپنی حکمتِ عملی سے موت کو ٹال دے گی تو وہ ٹال مٹول پہلے سے لوحِ محفوظ پر لکھی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی ایمان اور عمل سے مشروط ہے۔ جب کوئی بندہ یہ شرائط پوری کرتا ہے تو خدا اس کے مقدر سے لے کر موت تک تحریر بدل دیتا ہے اور اسے تمہاری جیسی عبوری زندگی عطا کرتا ہے۔"

"لیکن میں عاملِ کامل نہیں ہوں۔ پھر مجھے یہ عبوری زندگی کیسے مل گئی؟"

"ہم میں سے کون جانتا ہے کہ خدا کو بندے کی کون سی ادا پسند آ جاتی ہے۔ ویسے

اب یہ بحث ختم کرو۔ وہ آ رہی ہے۔ اس عمارت کے زینے پر پہلا قدم رکھ رہی ہے۔"

"آنے دو۔ مجھے اطمینان اور خوشی ہے کہ وہ زندہ رہے گی۔"

اجل نواز نے حیرانی سے پوچھا "کیا دماغ چل گیا ہے؟ میں نے کب کہا ہے کہ وہ زندہ رہے گی۔ میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ وہ موت کو ٹال دے گی۔"

"بات تو ایک ہی ہوئی نا؟"

اس نے میرے سامنے سے کہانی کا ایک صفحہ اٹھ کر ذرا دور رکھ دیا۔ وہ ہوا میں دوبارہ میرے قریب آ گرا' اس نے پھر کہا۔ "دیکھو میں نے اس صفحے کو کہانی کے بقیہ مسودے سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا تھا' اسے تمہارے سامنے سے ٹال دیا مگر سیلنگ فین کی ہوا سے یہ پھر تمہارے پاس آ گیا ہے۔ موت بھی اسی طرح ٹلتی ہے پھر کسی لمحے پلٹ آتی ہے۔ وہ جو ابھی تمہارے سامنے آ رہی ہے۔ ایک دن تمہارے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے گی۔"

میں نے شدید صدمے سے چونک کر اسے دیکھا۔ اوہ خدایا! وہ جو میری فین ہے' میری عقیدت مند ہے' مجھ سے ملنے آ رہی ہے' کیا وہ میرے سامنے بے بسی سے دم توڑے گی؟ دروازہ کھل گیا۔ مرجانہ آئی۔ جیسے بہار آتی ہے' ویسے ہی اس کے وجود سے خوشبو کا جھونکا آیا۔ میرے دفتر کا موسم بدل گیا۔ وہ جہاں پاؤں رکھتی ہوگی' وہاں پھول کھلتے ہوں گے۔ ہستی کو رونق ملتی ہوگی۔ خداوند کریم نے کیا خوب ہستیاں پیدا کی ہیں۔ ہر ہستی خوب سے خوب تر ہے لیکن اجل نواز مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔

جب کوئی کہتا ہے ہستی کو کہ ہستی خوب ہے
اس کی غفلت پر فنا اس وقت ہنستی خوب ہے

وہ ہم دونوں کو دیکھ کر بولی "کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟ ابھی میں نے فون کیا تھا۔ میرا نام........."

میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "مرجانہ ہے۔"

اجل نواز نے بھی کرسی سے اٹھ کر کہا "ہاں مرجانا ہے۔ ابھی نواب صاحب سے یہی ذکر ہو رہا تھا۔ میرا نام نواز ہے۔ تم ادھر بیٹھو۔ میں وہاں بیٹھ جاؤں گا۔" وہ دوسری کرسی پر چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا' وہ اجل نواز سے نظریں چرا رہی ہے اور بے اختیار اسے دیکھتی بھی جا رہی ہے۔ دنیا کے ہر راہی کی نظر اپنی منزل پر رہتی ہے۔ اسے منزل کی پہچان نہیں تھی' تب بھی منزل کی کشش اسے پکار رہی تھی۔

وہ میرے سامنے میز کے دوسری طرف بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر اجل نواز کو دیکھا پھر مجھ

سے کہا "آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اچھا لکھنے کی بات پر مجھے کیا کہنا چاہیے؟ سوچا رسمی طور پر شکریہ ادا کروں۔ اس سے پہلے ہی وہ بولی "میں آپ کی محض تعریف کرنے نہیں آئی ہوں۔ ایک چھوٹا سا تحفہ دینا چاہتی ہوں۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف۔"

اس نے اپنے پرس سے ایک لفافہ نکال کر میری جانب بڑھایا' میں نے کہا "لفافے میں خط ہوتا ہے یا رقم ہوتی ہے' یہ خط ہے تو مجھے دو' رقم ہے تو واپس رکھ لو۔"

"اس میں صرف ایک تصویر ہے' جو آپ کے لیے کہانی کا ایک موضوع بن سکے گی۔"

وہ خود سسپنس سے بھرپور موضوع بن کر میرے سامنے آئی تھی۔ پھر وہ دوسرا موضوع کیا ہو سکتا تھا؟ میں نے اس سے لفافہ لے کر کھولا۔ اس میں سے ایک تصویر نکلی۔ پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر میں ایک پانچ یا چھ برس کی بچی تھی۔ اس کے لباس سے اور بالوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ لڑکی ہے لیکن روشنائی سے اس کی مونچھیں اور داڑھی بنی ہوئی تھیں۔ میں نے مسکرا کر کہا "آپ نے ایک خوب صورت سی بچی کو کارٹون بنایا ہے۔ چونکہ آپ اسے کہانی کا موضوع بنانے کی بات کر رہی ہیں تو میں اس کارٹون پر نہیں ہنسوں گا۔"

وہ بولی "ہنسنا نہیں چاہیے۔ یہ مذاق نہیں المیہ ہے۔ یہ بیٹی نہیں ایک بیٹا ہے۔ یہ جب بھی ہمارے گھر میں پیدا ہوا' اسے موت کے فرشتے نے مار ڈالا۔"

میں نے سر گھما کر اجل نواز کو دیکھا۔ پھر مرجانہ سے کہا "تم ایک بیٹی کی تصویر کو جبراً بیٹا بناؤ گی تو کیا تمہارے گھر میں بیٹا پیدا ہو جائے گا؟"

"نہیں ہوگا۔ جسے پیدا نہیں ہونا ہے' وہ ہزار جتن کے باوجود پیدا نہیں ہوگا۔ میں اس گھر کی پہلی بیٹی ہوں جبکہ قبیلے کی سرداری کے لیے بیٹا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے باوجود باپ نے مجھے کلیجے سے لگایا۔ دو سال کے بعد فرزانہ پیدا ہوئی۔ باپ نے جھکے ہوئے سر سے اسے بھی قبول کر لیا۔" وہ ایک ذرا توقف سے بولی "سر اس لیے جھکا رہا کہ وہ سردار توہین محسوس کر رہا تھا۔ بیٹا پیدا کرنے کے قابل نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ میری ماں مزاروں پر جاتی تھی ایک بیٹے کے لیے منتیں مانگتی تھی۔ جس کے ہاں بیٹا ہوتا تھا اس کی چوکھٹ پر جھک کر سلام کرتی تھی اور بیٹا پیدا کرنے والی ماں سے عاجزی سے کہتی تھی کہ خدا سے اس کے لیے بھی ایک بیٹے کی دعا کرے۔

"جب میں پانچ برس کی ہوئی تو میری یہ تصویر اتاری گئی۔ جب حاکم بابا نے مجھے یہ

تصویر دکھا کر کہا کہ میری بیٹی کتنی خوب صورت لگ رہی ہے تو مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ میں حاکم بابا اور امی کی پریشانیاں اور غم زدہ چہرے دیکھتی رہتی تھی۔ میرے ننھے سے دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ مجھے بیٹی نہیں بیٹا ہونا چاہیے۔ میں خدا کی قدرت میں تبدیلی تو نہیں لاسکتی تھی اس لیے قلم اور روشنائی سے اپنی تصویر کے چہرے پر یہ مونچھیں اور داڑھی بنادی۔ جب یہ تصویر میرے حاکم بابا کے ہاتھ لگی تو وہ خوش ہو کر میری امی سے بولے، دیکھو دیکھو، ہماری مرجی نے بیٹے کی تصویر بنائی ہے۔ مرجی کی ماں! اس بار ہمارے ہاں ضرور بیٹا پیدا ہوگا۔ میری امی نے مجھے چوم کر کہا، اللہ بڑا کارساز ہے۔ معصوم بچے جو کہتے ہیں کرتے ہیں ان میں صداقت ہوتی ہے۔ جب مرادیں پوری نہ ہوتی ہوں، مایوسیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہو تو لوگ بچوں کو بھی پیر، ولی یا کراماتی سمجھ کر ایسے بچوں کو پھولوں کے ہار پہناتے ہیں اور عقیدت سے سجدہ بھی کرنے لگتے ہیں۔ ٹھیک آٹھ ماہ بعد ہمارے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ پھر تو میری واہ واہ ہونے لگی۔ اسی خوشی میں حویلی کے باہر پچیس رائفلوں سے ہوائی فائرنگ کی گئی۔ فائرنگ کی آواز ختم ہوئی تو پتا چلا، وہ پیدا ہونے والا بیٹا صرف پچیس منٹ کی زندگی گزار کر مرچکا ہے۔ آہ! میں اکثر سوچتی ہوں، یہ موت کا فرشتہ کیسا سنگ دل ہوتا ہے؟ کیا اس کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟ اس کے اندر رحم کے جذبات نہیں ہوتے؟ اس ملک الموت نے برسوں سے تڑپنے والے ماں باپ کے سامنے ان کے پچیس منٹ کے بیٹے کو مار ڈالا۔ وہ کیسا ظالم ہے۔ میرے سامنے آئے تو میں اس کا منہ نوچ ڈالوں۔"

مرجانہ نے منہ نوچنے کے انداز میں یونہی بے خیالی سے اجل نواز کو دیکھا، وہ بولا "میں حاضر ہوں، مجھے نوچ ڈالو۔"

وہ جھینپ گئی پھر بولی "سوری، میں جذبات میں بہہ گئی تھی۔ بہرحال، آئندہ دو چار برسوں میں میرے دو بھائی اور پیدا ہوئے مگر افسوس اجل نے انہیں بھی چھین لیا۔" وہ پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر کی طرف اشارہ کرکے بولی "اب یہی ایک بیٹا تصویر میں رہ گیا ہے۔ امی یہ تصویر دیکھتے دیکھتے اللہ کو پیاری ہوگئی ہیں اور میرے حاکم بابا کی کمر جھک گئی ہے۔ جب کوئی بیٹا نہ ہو، صرف بیٹیاں ہوں تو کمر بڑھاپے سے نہیں جھکتی، شرم سے ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "کچھ گھرانوں میں بیٹے پیدا کرنے کی فکر کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بیٹے پیدا کرنے کی کوششیں اور امیدیں جاری رکھتے رکھتے ملک کی آبادی بڑھائی جارہی ہے۔ تم نے اپنی تصویر کے چہرے پر داڑھی مونچھوں کا اضافہ کرکے اور خود کو بیٹا بنانے کی سعی

کرکے ایک عجیب سی دلچسپی پیدا کی ہے۔ میں اس تصویر کے حوالے سے ایک دلچسپ اور متاثر کن کہانی لکھوں گا۔"

وہ مسکرا کر بولی "آپ نے میرا یہ تحفہ قبول کرکے مجھے بہت بڑی خوشی دی ہے۔ میں اس خوشی میں آپ کو بہترین چائے پلاؤں گی۔"

میں نے چونک کر ندامت سے کہا "تم میرے دفتر میں آئی ہو مگر میں باتوں میں ایسا الجھ گیا کہ............"

وہ قطع کلامی کرتی ہوئی بولی "میں آپ کے دفتر آئی ہوں، گھر نہیں۔ آپ شرمندگی ظاہر کرکے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ پھر یہ کہ میں اپنے کچن میں تیار ہونے والی چیزیں کھاتی پیتی ہوں، آپ صرف ملازم کو بلائیں۔"

میں نے کال بیل بجائی۔ ایک ملازم اندر آیا، وہ بولی "تین پیالیاں اچھی طرح دھو کر لاؤ اور میرے گارڈ کو یہاں بھیج دو۔"

ملازم چلا گیا چند سیکنڈ کے بعد ایک گارڈ ہاتھ میں کلاشنکوف اٹھائے آیا۔ پھر مرجانہ کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا۔ وہ بولی "یہاں پیالیاں ہیں، ڈرائیور سے کہو چائے اور کھانے کا سامان لے آئے۔"

وہ ادب سے گھوم کر چلا گیا۔ اجل نواز نے پوچھا "کیا ایک سیکیورٹی گارڈ یا ایک ہزار گارڈز آنے والی موت کو ٹال سکتے ہیں؟"

وہ بولی "یہ سوال ایک ڈاکٹر سے کرو، جو روزانہ بڑے اور پیچیدہ آپریشن کرتا ہے۔ وہ آپریشن نہیں کرے گا تو مریض لازمی مرے گا اور کرے گا تو دس میں سے آٹھ کی موت ٹال دے گا۔ کسی کا مقدر آپریشن کے ذریعے موت کو ٹالتا ہے اور کسی کی تقدیر سیکیورٹی گارڈز کے ذریعے اس کی موت کو دور رکھتی ہے۔ ورنہ موت کو قریب آنا ہوتا ہے تو وہ گارڈز کی موجودگی میں بھی اتنی قریب آجاتی ہے جتنے کہ تم میرے قریب ہو۔"

اجل نے کہا "ہاں میں تمہارے بہت قریب ہوں۔"

وہ بولی "صرف قریب ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر تم دشمن جاں ہوتے، تب بھی مجھے ان لمحات میں ہلاک نہ کرپاتے۔ میری موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ میری پجیرو میں آگے پیچھے جو مسلح گارڈز ہوتے ہیں، وہ محض اس رعب اور دبدبے کے لیے ہوتے ہیں کہ میں سردار حاکم علی پاچاری کی دخترِ نیک اختر ہوں۔"

ملازم مختلف پلیٹوں میں کھانے کا سامان لے آئے۔ ٹین کے ڈبوں میں پیک پھل، خشک میوے اور بہترین غیر ملکی بسکٹ وغیرہ تھے۔ مرجانہ پاچاری نے کہا "حاکم بابا کا حکم ہے

کہ میں بازار کی کھلی چیزیں نہ کھاؤں۔ سیاٹ بندر کے ساحل سے یہ غیر ملکی پیک کیا ہوا کھانا میرے لیے آتا ہے یا پھر میں خود اپنے کچن میں اپنے ہاتھوں سے پکا کھاتی ہوں۔"

اجل نے کہا "بڑے لوگ شان اور امارت دکھانے یا فوڈ پوائزنگ سے بچنے کے لیے ایسا کرتے ہیں جبکہ دنیا کے کروڑوں لوگ بازار کی کھلی چیزیں کھا کر اور فاقہ زدہ لوگ ہوا کھا کر جیتے ہی رہتے ہیں۔"

وہ بولی "مسٹر نواز! تمہاری ہر بات کے پیچھے سے موت کی مہک آتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے' زندگی خواہ احتیاط سے گزرے یا بے احتیاطی سے گزاری جائے' انجام موت ہی ہے لیکن اس انجام کو پہنچنے تک احتیاط سے ایک صحت مند زندگی گزاری جاسکتی ہے۔"

میں نے کہا "تم سے مل کر اور تمہاری باتیں سن کر خوشی ہو رہی ہے۔"

"ابھی میں نے بات کہاں شروع کی ہے؟ کہنے والی بات رہ گئی ہے۔" میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا' وہ بولی "میں نے آپ سے فون پر کہا تھا کہ میں ایک مسئلے میں الجھی ہوئی ہوں اور اس الجھن کا تعلق آپ کی ایک کہانی سے ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں' تم نے یہ کہا تھا مگر تم نے یہاں آتے ہی کوئی اور موضوع چھیڑ دیا۔ خیر اب بتاؤ' مسئلہ کیا ہے؟ میری وہ کون سی کہانی ہے' جو الجھن کا باعث بن رہی ہے؟"

"آپ نے کئی سال پہلے ایک کہانی لکھی تھی۔ اس کا عنوان "عذابِ آگہی"

میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ اتنی کہانیاں لکھ چکا ہوں کہ عنوانات یاد نہیں رہتے۔ حافظہ نہیں بتاتا کہ کس عنوان کے تحت کس موضوع پر لکھ چکا ہوں۔ اس نے یاد دلایا "آپ نے اس کہانی میں ایک کردار پیش کیا تھا۔ ایک شخص کو وقت سے پہلے آگہی حاصل ہو جاتی ہے۔ آئندہ پیش آنے والے واقعے کو وہ بہت پہلے ہی خواب میں ہُو بہو دیکھ لیتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں یاد آیا۔ ایک شخص کو پیش آنے والے واقعے کی اطلاع پہلے سے مل جاتی تھی۔ ہم اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ کے ذریعے خبریں موصول کرتے ہیں یا علم نجوم کے ذریعے مستقبل کی کچھ باتیں معلوم کرتے ہیں لیکن ایک قدرتی ذریعہ ہے' جسے ہم قبل از وقت احساس یا پری انفارمیشن سنس کہتے ہیں۔ یہ قبل از وقت احساس جب شدت اختیار کرتا ہے اور ہم بے چین ہو جاتے ہیں تو اطلاعی طور پر وہ بات ہمیں خواب میں دکھائی دیتی ہے یا پھر عالمِ تنہائی میں وہ احساس ذہن پر غالب ہو کر تصور میں صاف دکھائی دیتا ہے۔"

اس نے پوچھا "آپ کیسے جانتے ہیں کہ ایسا انسانی زندگی میں ہوتا ہے؟ کیا آپ نے سنا ہے' پڑھا ہے یا آپ کا اپنا کوئی ذاتی تجربہ ہے؟"

اجل نواز نے مسکرا کر مجھے دیکھا' میں نے کہا "تمام لکھنے والوں کی زندگی میں تین باتیں اہم ہیں۔ مشاہدہ' مطالعہ اور تجربہ۔ پہلا مشاہدہ ہے یعنی شعور کی پہلی بیداری سے دیکھنا' خود کو اور دنیا کو دیکھ دیکھ کر سمجھنا۔ دوسری منزل پر تعلیم کا سلسلہ ہے یعنی درسی کتابوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ تیسرا مرحلہ ہے تجربہ یعنی خود پر اور دوسروں پر گزرنے والے حالات اور واقعات کا تجزیہ کرنا۔ جب میں ان تین مراحل سے گزر کر مطمئن ہوتا ہوں کہ میں نے صحیح معلومات حاصل کی ہیں تو پھر میں اس موضوع پر لکھتا ہوں۔"

مرجانہ نے پوچھا "آپ کی وضاحت سے میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کو بھی کسی پیش آنے والے واقعے کی آگہی ہوتی ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں کہ آگہی ہمیشہ حاصل ہو۔ ایسا کبھی اتفاق سے ہو جاتا ہے۔"

"کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کو کیسے اور کن حالات میں آگہی حاصل ہوئی تھی؟"

"میں پچھلے پانچ برسوں سے مسلسل کھانسی اور دمے کے مرض میں مبتلا رہا۔ میں نے کتنے ہی ماہرین سے رجوع کیا۔ بڑی مہنگی دوائیں استعمال کیں لیکن مرض بڑھتا گیا' جوں جوں دوا کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں مجھ پر موت کا احساس غالب آگیا تھا۔ بعض احساسات غیر شعوری طور پر حواس پر چھا جاتے ہیں اور ہمیں پتا نہیں چلتا لیکن ایک بے چینی سی رہتی ہے۔ یہ بے چینی خواب یا تصور کے ذریعے اپنی ادھوری سی صورت دکھاتی ہے۔ وہ صورت کچھ سمجھ میں آتی ہے اور کچھ نہیں آتی۔"

"بے شک یہی بات ہے۔ آپ بڑے عام فہم انداز میں وضاحت کر رہے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ پر موت کا احساس غالب آگیا تھا اور آپ نے اس غلبے کو شعوری طور پر محسوس نہیں کیا تھا۔"

"جی ہاں۔ یہ بات میں انسانی نفسیات کے حوالے سے کہہ رہا ہوں لیکن اس کے علاوہ ایک قدرتی سچائی ہے جسے ہم جھٹلا نہیں سکتے۔ میرا ایمان ہے کہ ان دنوں مجھے اپنی موت کا اشارہ قدرتی طور پر مل چکا تھا۔ میں نے ایک رات ایک مسجد اور درگاہ کے درمیانی صحن میں اپنا جنازہ دیکھا تھا۔ اس کے چند روز بعد کھانستے کھانستے اچانک میری سانس رک گئی اور میں مر گیا۔"

اس نے چونک کر مجھے بے یقینی سے دیکھا' پھر ہنس کر بولی۔ "آپ مر گئے اور میرے سامنے زندہ بیٹھے ہیں۔ پلیز نواب صاحب! آپ اس سنجیدہ موضوع کو مذاق نہ بنائیں۔"

اجل نے کہا "جب تک موت نہ آئے' مذاق ہی لگتی ہے۔ ویسے میرا یہ دوست مذاق نہیں کر رہا ہے۔ یہ سچ مچ مر چکا تھا۔ اس کے بیوی بچوں کے سامنے اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ میرا نام اجل نواز ہے اور میں اس کا عملی گواہ ہوں۔"

مرجانہ نے اسے تعجب سے دیکھ کر پوچھا۔ "اجل نواز! یہ......... یہ تو عجیب سا نام ہے۔ اجل تو موت کو' قضا کو کہتے ہیں۔"

"ہاں کہتے ہیں......... پھر؟"

"پھر یہ کہ اچھی صفات والے نام رکھے جاتے ہیں۔ ایسے نام جنہیں سن کر زندگی کا احساس ہوتا ہے' خوشی محسوس ہوتی ہے۔"

اجل نے کہا "کسی کا نام جبار ہوتا ہے۔ جبار کے معنی ہیں جبر کرنا' ظلم کرنا۔ کیا جبر سے خوشی ہوتی ہے' کسی کا نام شیرو ہوتا ہے۔ شیر کی طرح چیر پھاڑ ڈالنے والا۔ ہماری سوسائٹی میں بے شمار نام موت کا ذکر یا اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ قتیل کے معنی ہیں' وہ جو قتل ہو گیا۔ لیکن یہ محض ایک نام ہے۔"

وہ بولی "واقعی میں نے پہلے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ بے شمار افراد کے نام موت کی سمت اشارہ کرتے ہیں۔"

اجل نے پوچھا "حتیٰ کہ تم نے اپنے نام پر بھی غور نہیں کیا۔"

مرجانہ نے چونک کر آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا پھر کہا "ہاں۔ مگر مرجان ایک ننھے سے خوب صورت موتی کو کہتے ہیں۔ ماں باپ کے لاڈ پیار نے اس نام کو کشادگی دی اور میں مرجان سے مرجانہ کہلانے لگی۔"

"جیسے زندگی کشادگی اختیار کرتے کرتے موت کہلانے لگتی ہے۔ ہم دونوں کا بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اجل کا کہنا ہے مرجاؤ اور تم مرجانہ ہو۔ بخدا اتنی پیاری شخصیت کی مالک ہو کہ تمہیں کوئی مرجانے کو نہیں کہے گا لیکن نام میں مرجانے کا اشارہ ہے۔"

وہ ہنس کر بولی "میں تمہارے نام پر تنقید کر کے پھنس گئی۔ میں کہنا کچھ چاہتی تھی مگر بات کا رخ بدل گیا۔"

میں نے کہا "آگہی کے موضوع پر بات وہاں رک گئی' جہاں میں نے اپنی موت کا ذکر کیا تھا۔ تم یقین کرو' میں مر چکا تھا۔ گہری نیند کو نصف موت کہتے ہیں مگر میں نیند میں نہیں

تھا۔ بے ہوشی بھی موت کے برابر ہوتی ہے۔ بے ہوش ہونے والا صرف دنیا سے ہی نہیں' اپنی ذات سے بھی غافل ہو جاتا ہے اور ان لمحات میں' میں بے ہوش نہیں تھا۔ یہ جو دیکھنا' سننا' سونگھنا' چکھنا اور چھونا' پانچ حواس ہیں' ان سے میں بالکل محروم ہو گیا تھا۔"

"میں سمجھ رہی ہوں۔ ہماری دنیا میں دو ہی حقائق ہیں' ٹو بی اور ناٹ ٹو بی۔ ہونا ہے یا نہیں ہونا ہے۔ ہم ہوتے ہیں یا پھر نہیں ہوتے۔ جیسے آپ تھے' پھر نہیں رہے لیکن یہ تیسری بات کیسے ہو گئی؟ آپ زندہ کیسے ہیں؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ اپنے ایمان کی پختگی سے یہی سمجھتا ہوں کہ ابھی میری کچھ زندگی باقی تھی اس لیے ابھی میں یہاں تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہوں۔"

اجل نے کہا "میرا خیال ہے' بات پھر کہیں سے کہیں چلی جائے گی۔ بہتر ہے مرجانہ' تم وہ کہو' جو کہنے آئی ہو۔"

اس نے کرسی پر پہلو بدلا پھر ایک ذرا چپ رہ کر بولی "مجھے بھی پری انفارمیشن سنس نے پریشان کیا ہوا ہے۔ کبھی آگہی حاصل ہوتی ہے۔ میں کبھی خواب میں یا کبھی بالکل تنہائی میں جو دیکھتی ہوں' وہ آئندہ ہوبہو اسی طرح میرے اور سب کے سامنے پیش آتا ہے۔"

وہ ذرا تذبذب میں رہی پھر بولی "میں نے بچپن میں اس بات کو نہیں سمجھا لیکن جیسے جیسے پڑھتی لکھتی اور شعور حاصل کرتی گئی' پریشانی بھی بڑھتی گئی۔ پہلے تو وہم سا ہوا کہ میرے اندر کوئی بدروح سما گئی ہے۔ وہ جو بولتی ہے یا مجھے جو تماشا دکھاتی ہے' بعد میں وہ تماشا سچ ثابت ہوتا ہے۔"

وہ بول رہی تھی' ہم سن رہے تھے۔ چونکہ وہ نفسیات کی طالبہ تھی اس لیے اس نے وہم و گمان کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ماہرینِ نفسیات سے رجوع کرتی رہی۔ وہ ماہرین نفسیات کی روشنی میں اسے سمجھاتے رہے لیکن وہ مطمئن نہ ہو سکی۔ تب ذہن میں یہ بات سمانے لگی کہ وہ ایب نارمل ہے۔ کبھی کبھی ذہنی توازن میں فرق آجاتا ہے اور وہ خواہ مخواہ بے تکی باتیں سوچنے اور تصور میں دیکھنے لگتی ہے۔ پھر بھی تسلی نہ ہوتی کہ وہ باتیں اگر بے تکی ہیں تو بعد میں سچ مچ کیسے ظہور پذیر ہوتی ہیں؟

میرے سامنے میز پر اس کی پوسٹ کارڈ تصویر رکھی ہوئی تھی۔ وہ تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولی "میں نے پانچ برس کی عمر میں اس پر داڑھی اور مونچھیں بنائی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں ایسا دانستہ کر رہی تھی یا نادانستہ؟ مگر ایسا کرتے وقت میرے خیالوں میں ایک ننھا منا سا بھائی تھا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ پیدا ہو گیا ہے۔ مگر اس ننھی سی جان کے کانوں میں ایسا دہشت ناک صورِ اسرافیل پھونکا گیا کہ وہ مر گیا۔"

میں نے تسلیم کیا کہ وہ آگہی تھی۔ تصویر دیتے وقت وہ بتا چکی تھی کہ بھائی پیدا ہوا تھا مگر مرگیا تھا۔ میں نے اجل کی طرف دیکھا۔ وہ مرجانہ سے بولا "میں جانتا ہوں' تمہارے پہلے بھائی کی موت کیسے ہوئی تھی؟"

"کیسے ہوئی تھی؟"

"ابھی تم نے درست کہا کہ ننھے سے کانوں میں صورِ اسرافیل پھونکا گیا تھا۔ موت کا ایک بہانہ ہوتا ہے جیسا کہ تمہارا بیان ہے' اس کی پیدائش کی خوشی میں پچیس رائفلوں سے ہوائی فائرنگ کی گئی تھی۔ فائرنگ کی مسلسل دہشت ناک آوازیں ننھی سی جان کے لیے صورِ اسرافیل تھیں۔ ان قیامت خیز آوازوں سے بچے کی حرکتِ قلب بند ہوگئی تھی۔"

قبائلی علاقوں میں بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔ جذبوں اور مسرتوں کی شدت سے ہاتھ بہکتے ہیں تو آس پاس والوں کو گولیاں لگ جاتی ہیں۔ ان میں کوئی اسپتال پہنچتا ہے کوئی قبرستان پہنچ جاتا ہے۔ اجل کو تو بہانہ چاہیے۔ مرجانہ نے کہا "میں چھ برس کی تھی۔ ایک رات بستر پر جاگ رہی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ میں نے اس تاریکی میں دیکھا' میرا دوسرا بھائی پیدا ہوا تھا مگر اسے میری امی نے مار ڈالا۔"

میں نے چونک کر پوچھا "کیا کہہ رہی ہو؟ تمہارے والدین بیٹے کے لیے ترس رہے تھے۔ تڑپ رہے تھے۔ ایک سردار بیٹا نہایت ضروری تھا اور تم کہتی ہو......... کہ تمہاری امی نے اسے........."

وہ بولی "ہاں مجھے ایسی ہی آگہی حاصل ہوئی تھی لیکن آگہی کے اس علم میں کچھ گڑبڑ تھی۔ بھلا میری امی اسے کیوں ہلاک کرتیں؟ وہ تو اسے تین دنوں تک بڑی ممتا سے دودھ پلاتی رہیں۔ تیسری رات وہ مرگیا۔"

میں نے پھر سر گھما کر اجل نواز کو دیکھا' وہ بولا "وہ آگہی غلط نہیں تھی۔ اس بچے کی موت کا سبب تمہاری امی تھیں۔"

"میں نہیں مانتی اور مجھے دکھ ہو رہا ہے کہ تم میری امی کو اپنے ہی بچے کی قاتل کہہ رہے ہو۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہارا دل دکھا رہا ہوں مگر ابھی تمہیں مطمئن کردوں گا۔ میرے سوالوں کے جواب دو۔ کیا تم نے تیسری بار یہ خواب نہیں دیکھا کہ تیسرا بھائی پیدا ہوا ہے اور جس ہتھیار سے تمہاری ماں اپنے تیسرے بیٹے کو ہلاک کر رہی ہے' اسی ہتھیار سے خود مر رہی ہے؟"

وہ حیرانی سے بولی "ہاں' میں نے تیسری بار بالکل یہی خواب دیکھا تھا۔ تم کیسے جانتے ہو؟"

"مجھ سے سوال نہ کرو۔ میرے سوالوں کا جواب دو۔ کیا اس آگہی کے مطابق وہ تیسرا بیٹا پیدا ہوا؟ اور دو دنوں کے بعد وہ بھی چل بسا؟ اور اس کے کچھ عرصے بعد تمہاری امی بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں؟"

"ہاں یہی سب کچھ ہوا لیکن........."

"لیکن کوئی سوال نہ کرنا۔ ابھی جواب دو' تمہارے علاقے میں بچوں کی پیدائش کے وہی پرانے طریقے ہیں۔ گھر کی خواتین کو اسپتال نہیں لے جاتے۔ زچگی کے لیے کوئی بوڑھی تجربہ کار دائی آتی ہے؟"

"ہاں اب سے بیس برس پہلے یہی ہوتا تھا۔ میری امی نے حاکم بابا سے التجا کی کہ اس بار اسپتال میں زچگی بھی ہو اور علاج بھی۔ ان دنوں بیلہ میں ہماری خاندانی شان کے مطابق اسپتال نہیں تھے۔ صرف ایک شکستہ دیوار والی ڈسپنسری تھی۔ امی کو کراچی لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ حویلی میں ہی تیسرا بیٹا پیدا ہوگیا لیکن ماں اور بچے کی حالت تشویش ناک تھی۔ انہیں ایک گاڑی میں کراچی کے بڑے اسپتال تک پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے پوری توجہ دی پھر بھی بچہ مرگیا۔ اس کے بعد شاید صدمے نے امی کو مار ڈالا۔"

اجل نے کہا "تمہاری امی کو صدمہ ضرور تھا لیکن موت صدمے سے نہیں ہوئی۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"تمہیں جو آگہی حاصل ہوئی تھی اس کی روشنی میں کہہ رہا ہوں۔ تم اس وقت چھ سات سال کی بچی تھیں۔ موت کا سبب نہیں بتایا گیا۔ ماں زندہ ہوتی تو تمہیں بتاتی کیونکہ ایسی باتیں باپ اپنی جوان بیٹیوں سے نہیں کرتے۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر کہا "تم نے میرے اندر تجسس بھر دیا ہے۔ مجھے بتاؤ تم کیا جانتے ہو؟"

وہ بولا "بیس برس پہلے بیلہ کے پسماندہ علاقے میں تمہاری امی کا دیسی علاج ہوتا رہا یا پھر شہر سے آنے والے ناتجربے کار ڈاکٹر اٹینڈ کرتے رہے۔ کراچی کے اسپتال میں تیسرے بیٹے کی موت کے بعد انکشاف ہوا کہ زچہ کو بریسٹ کینسر تھا۔"

وہ ایک دم سے ساکت ہو کر اجل کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ بولا "ماں اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے۔ تمہاری امی نے اپنے دوسرے بیٹے کو کینسر پلایا۔ تمہیں جو آگہی ملی' وہ درست تھی کہ تمہاری امی نے خود اپنے بچے کو مار ڈالا۔ کیا نادانستگی میں قتل نہیں کیا جاتا؟" وہ دم

بخود رہی۔ اجل نے کہا "تم نے تیسری بار دیکھا کہ ماں تیسرے بیٹے کو جس ہتھیار سے مار رہی ہے' خود اسی ہتھیار سے مر رہی ہے۔ اور وہ ہتھیار چھاتی کا کینسر تھا' جس نے دونوں کا کام تمام کر دیا۔"

میرے دفتری کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ وہ شدت غم سے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے وقت سمجھ میں نہیں آتا کہ غم زدہ کو کیسے تسلیاں دی جائیں؟ دیکھا جائے تو غم کیا تھا؟ اب تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس المیے کو برسوں بیت گئے تھے لیکن بات پہلے کچھ ہو اور بیس برس بعد کچھ اور انکشاف ہو تو پرانے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ میں نے بڑے سے پلاسٹک کے تھرماس کو اٹھایا پھر اس کی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا "ایک ایک کپ ہو جائے۔ تم نہایت عمدہ چائے بنا کر لائی ہو۔ پینے سے دماغ کی دھند چھٹ جاتی ہے۔"

اس نے پیالی اٹھائی پھر اسے ہونٹوں سے لگا کر ایک چسکی لینے کے بعد اجل سے کہا "پتا نہیں تم میں کیا بات ہے۔ جب سے آئی ہوں' تم سے متاثر ہو رہی ہوں۔ تم نے علم آگہی کے حوالے سے میری امی اور تینوں بچوں کے سلسلے میں جو تشریح کی ہے' اس سے ذہن روشن ہو گیا ہے کہ ہمیں موت کے یا آفات کے اشارے کیسے ملتے ہیں؟ ہم ان اشاروں کو اپنی محدود ذہانت سے کیا سمجھتے ہیں اور بالآخر کیا ہو جاتا ہے۔"

پھر وہ چائے کا دوسرا گھونٹ حلق میں اتار کر بولی "آپ دونوں سے مل کر یقین ہو گیا ہے کہ اب میری الجھن دور ہو جائے گی۔"

میں نے اپنی پیالی بھرتے ہوئے پوچھا "کیا اب بھی کوئی الجھن باقی ہے؟"

"ہاں اب میں وہی بیان کرنے والی ہوں۔"

اجل نواز نے تھرماس لے کر اپنی پیالی بھرتے ہوئے کہا "کچھ کہنے سے پہلے میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک گھونٹ پی کر بولا "پہلے میرے رائٹر دوست کو اپنے وہ حالات سناؤ' جن کے نتیجے میں تم الجھن کا شکار ہو رہی ہو۔"

وہ چائے پینے لگی۔ سوچنے لگی کہ بات کہاں سے شروع کرے پھر وہ بولی "پچھلے کئی برسوں سے میرے حاکم بابا کی سرداری تو تھی مگر سر نہیں تھا اور جو تھا' وہ جھکا ہوا تھا۔ اگرچہ ہماری وہی شان اور وہی رکھ رکھاؤ تھا مگر ہم سالاری قبیلے کے زیر اثر آ گئے تھے۔"

مرجانہ پاچاری کی داستان یوں تھی کہ اس کے باپ سردار حاکم علی پاچاری کے مقابلے میں سردار جنید سالاری بہت مالدار اور بااثر تھا۔ جنوب مشرقی ساحل پر گھڑیاں

ریڈیو' موٹر سائیکلیں اور شراب کی بوتلیں اسمگل ہو کر آتی تھیں اور کراچی اور کوئٹہ وغیرہ پہنچائی جاتی تھیں۔ سردار جنید سالاری ان اسمگلروں سے ٹیکس وصول کرتا تھا۔ دوسری طرف سردار حاکم علی کے خاندانی حالات نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ کوئی بیٹا نہیں تھا جو گن پوائنٹ پر لسبیلہ سے گزرنے والوں کا راستہ روکتا۔ اپنی روایتی شان و شوکت اور رعب اور دبدبہ قائم رکھنے کے لیے آمدنی کے زیادہ سے زیادہ وسائل ضروری ہوتے ہیں اور ان وسائل کو قائم رکھنے کے لیے جائز اور ناجائز اختیارات حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ سردار حاکم علی نے اپنی ساکھ کو بحال رکھنے کے لیے اچانک وڈیروں اور جاگیرداروں کی طرح پٹڑی بدلی اور سیاست میں آ گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑے گا۔ باہر سے دوسری سیاسی پارٹیاں آ کر اس قبیلے کے ووٹ لیا کرتی تھیں۔ حاکم علی نے اس علاقے میں ان پارٹیوں کی پوزیشن مشکوک کر دی۔ سردار کا اس علاقے میں بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ صدیوں سے سرداری چلی آ رہی تھی۔ وہاں کا کوئی بندہ اس کے حکم کے خلاف کسی پارٹی کو ووٹ نہ دیتا اور خود دو ڈھائی ہزار ووٹ لے کر اسمبلی میں پہنچ جاتا۔

دو بڑی پارٹیوں کے لیڈروں نے اس سے سودے بازی شروع کی۔ ایک لیڈر نے پوچھا "آپ سیاست میں کیوں آ رہے ہیں؟ جو قدر و منزلت سرداری میں ہے' وہ سیاست میں نہیں ہے۔"

اس نے جواب دیا "میری سرداری لسبیلہ کے علاقوں تک ہے لیکن میری سیاسی قوت یہاں سے اسلام آباد تک پھیلے گی۔"

"تو پھر آپ ہماری پارٹی میں شریک ہو جائیں۔ ہمارے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں۔"

"آپ کی پارٹی میں سردار جنید سالاری کا بیٹا حماد سالاری ہے۔ ان کے ساحل پر اترنے والے مال کا ٹیکس مجھے نہیں ملتا ہے۔"

"بس اتنی سے بات ہے؟ ہم سالاریوں سے معاملات طے کرواتے ہیں۔ آپ کو اسمگلنگ میں سے معقول حصہ ملے گا۔ آپ الیکشن نہ لڑیں۔ آرام سے سرداری کرتے رہیں۔"

"الیکشن کے بعد میرا حصہ روک دیا جائے گا تو میں آپ جیسے اسمبلیوں میں بیٹھنے والوں کا کیا بگاڑ لوں گا۔"

"آپ کو ہم پر بھروسا نہیں ہے تو آپ ہماری پارٹی کے ٹکٹ پر لڑیں اور ہمارے ہو کر رہیں۔ آپ تنہا سیاست میں رہ کر سالاریوں سے کچھ وصول نہیں کر سکیں گے۔"

سردار حاکم علی نے قہقہہ لگا کر کہا "آپ مجھے تنہا کہہ رہے ہیں۔ پاکستان کی سیاست میں سب سے بڑی طاقت آزاد امیدوار کی ہوتی ہے۔ وہ جس پارٹی میں جاتا ہے' وہی پارٹی حکومت بناتی ہے۔"

پارٹی لیڈر اس حقیقت سے انکار نہ کر سکا۔ سوچنے لگا' حاکم علی کے علاقے کی ایک سیٹ بھی کم ہوئی تو اس کی پارٹی کو حکومت بنانے میں دشواریاں پیش آئیں گی۔ اس نے کہا "ٹھیک ہے' آپ آزاد امیدوار کی حیثیت سے اسمبلی میں آئیں۔ اگر ہم حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہوئے تو آپ کن شرائط پر ہمارا ساتھ دیں گے؟"

"یہی کہ اسمگلنگ کا نصف منافع مجھے اور نصف سالاریوں کو ملے۔ اور اگر آپ کی پارٹی حکومت نہ بنا سکی اور سالاریوں کو آپ کے ساتھ اپوزیشن میں بیٹھنا پڑا تو میں برسرِ اقتدار پارٹی سے سودا کر کے صرف سپات بندر کا ہی نہیں میلان بندر کے ساحل کا سارا منافع تنہا حاصل کروں گا۔ اگر حاصل نہ کر سکا تو اسمگلروں کے قدم وہاں سے اکھاڑ دوں گا۔ اس علاقے کے کوسٹ گارڈز اور بحری پولیس میرے احکامات کی تعمیل کرے گی۔"

معاملہ گھمبیر ہو گیا تھا۔ ان علاقوں میں معمول کے مطابق جو سیاست چلی آ رہی تھی اس میں حاکم علی ہلچل پیدا کر رہا تھا۔ یوں تو سیاسی داؤ پیچ سے بڑی بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن کچھ دو اور کچھ لو کے سودے پر تمام پیچیدگیاں چشم زدن میں دور ہو جاتی ہیں۔ ہماری سیاسی بنیاد صرف "دو اور لو" ہے۔ ایک پارٹی حکومت بنانے کے لیے ایک آزاد امیدوار کی حمایت چاہتی ہے۔ امیدوار کہتا ہے۔ دو کروڑ کا قرضہ منظور کراؤ اور ہمارے ووٹ سے حکومت بناؤ۔ کوئی کامیاب امیدوار کہتا ہے' میرے بیٹے پر دہشت گردی کا مقدمہ چل رہا ہے۔ مقدمے کی فائلیں اور ریکارڈ ضائع کرادو اور میرا ووٹ لے کر حکومت کرو۔ کسی کامیاب رکن نے چار ڈاکوؤں کو گود لے رکھا ہے۔ کوئی چھ ڈاکوؤں کی پرورش کر رہا ہے۔ دنیا کے تمام ملکوں کی قانونی اور سرحدی بقا پولیس اور فوج سے رہتی ہے لیکن چند اراکینِ اسمبلی کے علاقوں کا تحفظ مسلح ڈاکو کرتے ہیں۔ ان ڈاکوؤں کی دہشت سے غریب عوام کے ووٹ حاصل کر کے اسمبلیوں میں پہنچا جاتا ہے اور یہ سودا ہوتا ہے کہ پروردہ ڈاکوؤں کو تحفظ دو اور اپنی حکومت بناؤ۔ ایسے اراکین جو ڈرگ مافیا کے نمائندگی ہیں' وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ منشیات کی تیاری اور ترسیل کے لیے سہولتیں دو اور اسمبلیوں میں ہماری حمایت حاصل کرو۔ سردار حاکم علی نے بھی یہی سیاسی رویہ اختیار کیا تھا۔ آزاد امیدوار ہونے کا اعلان کر کے یہ اشارہ دے دیا کہ وہ کسی بھی حکومت بنانے والی

پارٹی سے سودا کر کے سپات بندر اور میلان بندر کے ساحلوں پر اترنے والے مال اور منافع کا حصے دار ہو گا۔

سیاسی پارٹی کے لیڈر نے سردار جنید سالاری اور اس کے بیٹے حماد سالاری سے ملاقات کی۔ وہ باپ بیٹے پہلے ہی حاکم علی کا اعلان سن چکے تھے۔ حماد سالاری ایک بار پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن جیت چکا تھا۔ دوسری بار بھی اپنے علاقے میں وہی جیتنے والا تھا لیکن منجھا ہوا پختہ سیاست دان نہیں تھا۔ سیاسی پارٹی کی انگلی پکڑ کر چلتا تھا۔ حماد نے پارٹی لیڈر سے پوچھا "حاکم علی آزاد امیدوار کی حیثیت سے جیت کر ہمارا کیا بگاڑ لے گا؟"

لیڈر نے کہا "اگر ہماری پارٹی اکثریت حاصل کر لے گی تو کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ ہمارے سامنے گھٹنے ٹیکے گا یا پھر اپوزیشن میں بیٹھے گا۔ اسے تمہارے میلان بندر کے ساحل سے منافع کا ایک تنکا بھی نہیں ملے گا۔"

"اور اگر ہماری پارٹی نے اکثریت حاصل نہ کی تو؟"

"تو پھر حاکم علی پرابلم بن جائے گا۔ وہ دوسری پارٹی کو برسرِ اقتدار لانے کے لیے وہاں کے ساحلوں کا سودا کرے گا۔ وہاں کی انتظامیہ حاکم علی کے احکامات کی پابند رہے گی۔"

دونوں باپ بیٹے ٹینشن میں مبتلا ہو گئے۔ انہیں تو الیکشن لڑنے اور جیتنے سے دلچسپی تھی اور نہ ہی ان کی نظروں میں پاکستان کی اہمیت تھی۔ اہمیت صرف ان ساحلوں کی تھی جہاں اسمگلنگ کا مال اترتا تھا لیکن پاکستان سے کوئی دلی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود ان ساحلوں پر بدستور قبضہ جمائے رکھنے کے لیے پاکستان کی سیاست میں حصہ لینا ضروری تھا۔ جنید سالاری نے کہا "یہ حاکم علی بڑی لمبی چھلانگ لگا رہا ہے۔"

اس کے بیٹے حماد نے کہا "سردار بابا! وہ بوڑھا ہے' آخر کتنی چھلانگ لگائے گا۔ ایک بار گرے گا تو اس کی جگہ لینے والا کوئی بیٹا نہیں ہے۔"

"بے شک وہ اس معاملے میں بدنصیب ہے کہ اس کے بعد سردار بننے والا کوئی بیٹا نہیں ہے' صرف دو بیٹیاں ہیں لیکن جب تک اس بوڑھے میں دم خم ہے' وہ سیاسی جنگ جاری رکھے گا۔"

وہ سب سوچ میں پڑ گئے۔ جنید سالاری نے کہا "بیٹے حماد! وہ ہم پر جو سیاسی حملہ کر رہا ہے' ابھی اس کا توڑ کرنا ہو گا۔ اس کا کوئی بیٹا ہو یا نہ ہو۔ تم میرے بیٹے ہو' یہاں کے ساحلوں پر صرف تمہارا قبضہ ہونا چاہیے۔"

پارٹی لیڈر نے اپنی ران پر ہاتھ مار کے کہا "وہ مارا۔"

سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ اس شاطر سیاست داں نے کوئی چال سوچ لی ہے۔ جنید سالاری نے پوچھا "کیا مخالف کی کمر ٹوٹے گی؟"

"ایسے ٹوٹے گی کہ وہ بستر سے اٹھ نہیں سکے گا۔ آپ کے آگے ہمیشہ سر جھکا کر رہے گا۔"

"اسے جھکانے کی ایسی کیا تدبیر ہوسکتی ہے؟"

"آپ دونوں باپ بیٹے اتنی دیر سے اس اہم نکتے پر بول رہے ہیں کہ حاکم علی کا کوئی بیٹا نہیں۔ سیدھی سی بات ہے' آپ اپنے بیٹے حماد کو حاکم علی کا بیٹا بنا دیں۔ اس کے دروازے پر جائیں۔ اس کی بیٹی کا رشتہ مانگیں۔ اسے داماد کی صورت میں بیٹا ملے گا اور آپ کو بہو کی صورت میں وہاں کے ساحل۔ اسے کہتے ہیں سیاست۔"

دونوں باپ بیٹے اس پہلو پر غور کرنے لگے۔ ویسے یہ بات چھیڑی نہ جاتی' تب بھی حماد' مرجانہ کا دیوانہ تھا۔ کراچی میں ایک دو بار اس سے مل چکا تھا۔ مگر وہ ایسی اسمارٹ اور خود سر تھی کہ اس کے سامنے دل کی بات زبان پر نہیں آتی تھی۔ ورنہ وہ ایک مردِ میدان تھا۔ مختلف علاقوں سے لڑکیاں اٹھوالیتا تھا۔ مرجانہ اس پسماندہ علاقے سے شہر جا کر بھری ہوئی بندوق ہوگئی تھی۔ پھر ایک سردار زادی تھی۔ وہ اس کے لیے للچا کر رہ گیا تھا۔ اس وقت پارٹی لیڈر کے مشورے نے مرجانہ کو حاصل کرنے کی راہ ہموار کر دی۔ اس نے باپ سے کہا "سردار بابا! یہ تو بہت ہی عمدہ اور زبردست چال ہے۔ حاکم علی محبت اور رشتوں کی میٹھی چھری سے جھک جائے گا۔ آپ میرے لیے مرجانہ کا رشتہ مانگ لیں۔"

باپ نے کہا "وہ ہم سے بدظن ہے۔ اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر سکتا ہے۔"

پارٹی لیڈر نے کہا "قبائلی سرداروں کے درمیان محض اپنی انا کی خاطر کشیدگی رہا کرتی ہے۔ آپس میں صلح صفائی کے ذریعے رنجشیں دور ہو جایا کرتی ہیں۔ ہم سب مل کر کوشش کریں گے تو دوستی کی راہ ہموار ہو جائے گی۔"

لیڈر کے مشیر خاص نے کہا "سردار جنید! آپ دوستی میں پہل کریں۔ خیر سگالی کے طور پر حاکم علی کے لیے کچھ تحائف بھیجیں اور اس نے آزاد امیدوار ہونے کا جو اعلان کیا ہے اس پر دلی مسرت کا اظہار کریں۔ اس کے بعد میں پارٹی کی طرف سے اسے آپ کی دوستی اور فراخ دلی کا یقین دلاؤں گا۔"

وہ سب بڑی دیر تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے پھر سیاسی پارٹی کے لوگ اپنے لیڈر کے ساتھ وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد حماد نے کہا "سردار بابا! میں

مرجانہ کو پسند کرتا ہوں۔ سوچتا تھا کہ آپ اس قبیلے کی لڑکی لانا گوارا نہیں کریں گے مگر اب تو معاملہ سیاسی ہے۔"

"ہاں بیٹے! یہ سیاست بڑی ظالم چیز ہے' یہ ارادہ بھی بدل دیتی ہے اور ایمان بھی.......... میں حاکم علی سے بڑا سردار ہوں۔ مجھے اس کے دروازے پر نہیں جانا چاہیے۔ مگر سیاست مجھے لے جائے گی۔"

"سردار بابا! میں ایک دن کے لیے کراچی جارہا ہوں' مرجانہ سے ملوں گا۔ اس پر شہری رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اس پر سے کچھ رنگ کھرچنے کی کوشش کروں گا۔"

بوڑھا سردار تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ اسے کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ پھر وہ بات ذہن میں واضح ہونے لگی۔ اس نے کہا۔ "حاکم علی کا یہ صدمہ تمام عمر کا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ آج مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے' اگر تمہارا ایک اور بھائی ہوتا تو میں حاکم علی کی دوسری بیٹی فرزانہ کو بھی یہاں لے آتا۔"

"بابا! اپنے سسر کا سر جھکائے رکھنے کے لیے یہ ایک داماد ہی کافی ہوگا۔"

"بیٹے! تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر میں رکھو۔ اگر وہ مرجانہ سے تمہارا رشتہ کرنے کے بعد فرزانہ کا رشتہ کسی دوسرے سیاسی لیڈر سے کرے گا اور وہ لیڈر تم پر بھاری پڑے گا تو کیا ہوگا؟"

"بابا! کیا آپ مجھے کمزور سمجھتے ہیں؟ ایسا کون سا تیس مار خان ہے جو مجھ پر بھاری پڑنے آئے گا؟"

"تم یوں حساب کرو کہ حاکم علی اسمبلی کا ایک رکن ہے۔ دوسرے رکن تم ہو اور تیسرا رکن فرزانہ کا شوہر ہوگا یعنی ہمارے خاندانوں میں اسمبلیوں کی تین سیٹیں ہوں گی۔ وہ سپات بندر اور میلان بندر کے ساحل اپنے پاس رکھنے کے لیے چھوٹے داماد کو ہمیشہ اپنی حمایت اور اعتماد میں رکھے گا۔ پھر کسی بھی حکومت بنانے والی پارٹی سے سودا ہوگا تو اسمبلی میں تمہاری تنہا حمایت کے مقابلے میں حاکم علی کے حمایتیوں کی تعداد زیادہ ہو جائے گی۔"

حماد نے کہا "مرجانہ سے شادی کروں گا تو فی الحال ہم وہاں کے ساحل بچالیں گے۔ جب فرزانہ کی شادی کی بات چلے گی تو ہوا کا رخ دیکھا جائے گا کہ حاکم علی کا دوسرا داماد سیاسی ہے یا غیر سیاسی؟ ہماری کوشش ہوگی کہ اس گھر میں دوسرا داماد ہی نہ آئے۔"

دوسری صبح حماد اپنی مرسیڈیز میں شہر چلا گیا۔ سردار جنید نے حاکم علی کے پاس پیغام بھیجا "میں سردار حاکم علی پاچاری کی خدمت میں مکران کی شیریں کھجوریں پیش کرنے آج

شام کو آرہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف۔"

حاکم علی حیران ہوا کہ سردار خود اس کے دروازے پر آرہا ہے۔ اس نے جواب بھیجا "خوش آمدید۔ آپ آئیں ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے۔ میں چشم بہ راہ ہوں۔"

سردار جنید کا قاصد چلا گیا۔ حاکم علی نے باقاعدہ دو مشیر اور ایک پرسنل سیکریٹری کو اچھی تنخواہوں پر رکھ لیا تھا۔ اس کے دونوں مشیر اسے سیاسی داؤ پیچ سے آگاہ کرتے تھے اور سیکریٹری لکھنے پڑھنے' سیاسی افراد اور صحافیوں سے رابطہ رکھنے کے فرائض انجام دیتا تھا۔

ایک مشیر نے حاکم علی سے کہا "حضور! ہمیں اس پہلو پر نظر رکھنا ہے کہ سردار جنید کیوں تشریف لا رہے ہیں؟ اب سے پہلے کبھی تشریف کیوں نہیں لائے؟"

حاکم علی نے کہا "سردار جنید! اپنی انا اور برتری کو مقدم رکھتا ہے۔ کسی سردار کے دروازے پر خود نہیں جاتا لیکن وہ انسانی جذبات اور باہمی تعلقات کا لحاظ بھی کرتا ہے۔ جب مرجانہ کی ماں کا انتقال ہوا تو وہ تعزیت کے لیے اس حویلی میں آیا تھا۔"

دوسرے مشیر نے کہا "یعنی اس کے آنے کی ایک وجہ تھی۔ سوال یہ ہے کہ آج کیوں آرہا ہے؟ اب آپ محض ایک سردار نہیں' سیاست داں بھی ہیں۔ آپ نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کیا ہے۔ وہ جو آرہا ہے تو اس کی آمد سیاسی نوعیت کی ہے۔"

حاکم علی نے قائل ہو کر کہا "بے شک وہ کوئی سیاسی چال چلے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"وہ آپ کو الیکشن لڑنے سے نہیں روکے گا۔ کیونکہ سیاسی پارٹی کے لیڈر نے اسے بتادیا ہو گا کہ آپ اپنے فیصلے سے باز نہیں آئیں گے۔"

"تو پھر وہ کوئی سمجھوتا کرنے آئے گا۔"

"ہمیں یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ کس طرح کا سمجھوتا کرے گا۔ ایک بات تو طے ہے کہ وہ کوئی نقصان اٹھانے کے لیے آپ کی طرف قدم نہیں بڑھا رہا ہے۔"

حاکم علی نے کہا "اسے آنے دو۔ دیکھا جائے گا۔ ہم بھی نادان نہیں ہیں۔"

مشیر نے کہا "جناب! دنیا کی ہر لڑائی میں کہا جاتا ہے کہ ہم نادان یا کمزور نہیں ہیں۔ دشمن کو آنے دو' دیکھا جائے گا لیکن سیاست میں پہلے دیکھا اور چال کو سمجھا جاتا ہے اس کے بعد چال چلنے والے کا سامنا کیا جاتا ہے۔"

"تو پھر سمجھو۔ تم دونوں مشیر کس دن کے لیے ہو۔"

وہ دونوں ایک دوسرے سے ہر پہلو پر بحث کرنے لگے۔ دونوں سرداروں کی طاقت اور ان کی کمزوریاں انہیں معلوم تھیں۔ عقل کہتی ہے کہ دوستی کی غرض سے آنے والا' حاکم علی کی کسی کمزوری کو نہیں اچھالے گا اور خود کو محتاج اور مالی طور پر کمزور بنانے کے لیے اپنے ساحل کا منافع نہیں دے گا۔

دونوں سرداروں کے تاریخی پس منظر اور خاندانی شجروں میں پختگی تھی۔ اپنے علاقوں میں ان کی جڑیں مضبوط تھیں۔ تب دونوں مشیروں نے ان کے خاندانی اور مقامی رسم و رواج پر توجہ دی تو بات سمجھ میں آئی۔ ایک مشیر نے کہا "جناب! سردار جنید نے پیغام میں یہ کہا ہے کہ وہ مکران کی شیریں کھجوریں لا رہا ہے۔ اگرچہ صرف کھجوریں نہیں لائے گا۔ ایک سردار کی حیثیت سے بہت سے تحائف پیش کرے گا لیکن یہاں کے دستور کے مطابق کھجوریں رشتوں کی مٹھاس کو مستحکم بنانے یا پھر رشتہ مانگنے کے لیے لائی جاتی ہیں۔"

سردار حاکم علی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہوں۔ میں نے ادھر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اس کا ایک بیٹا ہے۔ میری دو بیٹیاں ہیں۔ ہم درجے میں برابر کے سردار ہیں۔ بے شک وہ رشتے کے لیے زبان کھول سکتا ہے۔"

"حضور! آپ کیا جواب دیں گے؟"

"دو بیٹیاں ہیں' انہیں تو بیاہنا ہے۔ بڑی پچیس برس کی ہو گئی ہے۔ شہر اور تعلیم چھوڑنا نہیں چاہتی ہے۔ چھوٹی اب چوبیس کی ہونے والی ہے۔ مجھے تو راضی ہو جانا چاہیے۔ تم دونوں کیا کہتے ہو؟"

ایک نے کہا "بے شک' رشتہ ہو جانا چاہیے لیکن دوسرے علاقوں کے سرداروں کے ہاں بھی کتنی ہی نوجوان اور کم سن لڑکیاں ہیں۔ سردار جنید نوجوان لڑکیوں کو چھوڑ کر زیادہ عمر والیوں کا رشتہ کیوں مانگنے آرہا ہے؟"

سردار حاکم علی نے غصے سے مشیر کو دیکھا۔ اسے یہ بات بری لگی کہ دوسرے سرداروں کی بیٹیوں کے مقابلے میں اس کی بیٹیاں گھر بیٹھے بیٹھے چوبیس اور پچیس برس کی ہو گئی ہیں اور وہ مشیر اس کی بیٹیوں کو بہت عمر والیاں کہہ رہا ہے۔ اس مشیر نے ملازمت کے پہلے دن کہا تھا "جناب! اچھا اور سچا مشورہ دینے والا شخص پہلے آپ کے اندر کی تمام کمزوریاں معلوم کرے گا تاکہ مخالفین کی کمزوریوں سے موازنہ کرکے صحیح مشورہ دے سکے۔ ہر شخص اپنی ذات پر تنقید برداشت نہیں کرتا۔ طیش میں آجاتا ہے۔ کبھی آپ کو

طیش آئے گا تو میں ملازمت چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

سردار حاکم علی غصے میں ٹہلنے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اسے دیکھ کر بولا "مشیر حسین! تم اسم بامسمیٰ ہو۔ مجھے تم پر غصہ آرہا ہے مگر غصہ کرنے سے میری بیٹیوں کی عمریں چار چھ برس کم نہیں ہو جائیں گی۔ اگر واقعی وہ رشتہ مانگنے آرہا ہے تو یہ غور طلب پہلو ہے کہ وہ میرے گھر کیوں آرہا ہے؟"

"اور جناب! ایسے وقت آرہا ہے' جب آپ آزاد امیدوار بننے کا اعلان کر چکے ہیں۔"

دوسرے مشیر نے کہا "اس کی سیاسی پارٹی چاہتی ہے کہ آپ اس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں۔ آپ نے انکار کر دیا ہے۔ اب آپ جیسے آزاد امیدوار کو اپنی طرف مائل کرنے کی یہی ایک زبردست چال ہے کہ آپ کی بیٹی کے ساتھ آپ کی اسمبلی کی ایک سیٹ بھی ان کے پاس رہا کرے۔"

سردار حاکم علی کی کھوپڑی روشن ہوگئی۔ وہ سر سہلاتے ہوئے بولا "تم دونوں مشیر واقعی مجھے سمجھا رہے ہو کہ سیاست کیا ہوتی ہے۔ اسے کیسے سمجھا اور برتا جاتا ہے۔ وہ کمبخت حماد میرا داماد بن کر میرے سر پر سوار ہو جائے گا۔"

"جناب! سرداری کے حوالے سے آپ کا جو کچھ ہے اور سیاسی ہتھکنڈوں سے آپ جو کچھ حاصل کریں گے' وہ سب آپ کے بیٹے کا ہوتا۔ بیٹا نہیں ہے' اس لیے سب کچھ داماد کا ہوگا۔"

حاکم علی نے ہاتھ اٹھا کر کہا "بس۔ سمجھ میں آگئی سیاست۔ بیٹی کا رشتہ نہیں دوں گا۔"

مشیر حسین نے کہا "جناب! آپ سیاست کو سمجھنے کا دعویٰ نہ کریں۔ سیاست وہ ہے' جو سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ بیٹی کا رشتہ ضرور دیں۔"

حاکم علی نے چونک کر پوچھا "کیا بکتے ہو؟ کیا ادھر بیٹی دے کر ناک کٹوالوں؟"

"جناب آپ انہیں خوش کریں کہ اپنے گھر کی ناک انہیں دے رہے ہیں۔ سیاست میں بندوق اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ کاندھا دوسرے کا ہوتا ہے۔ اگر زید کو مارنا ہو تو بکر کا نشانہ لگایا جاتا ہے۔ گولی بکر کی سمت جاتی ہے مگر مرتا زید ہے۔ اس لیے کہ سیاسی نشانہ زید ہی ہوتا ہے۔"

دوسرے مشیر نے کہا "سیدھی سی بات یہ ہے کہ جہاں سراسر نقصان ہو' وہاں سے فائدہ اٹھانے کے ہنر کو سیاست کہتے ہیں۔ آپ بیٹی کا رشتہ دے کر فائدے میں رہیں

گے۔"

"مجھے سمجھاؤ' بازی کیسے کھیلی جائے گی؟"

"پہلے تو آپ سردار جنید کی باتوں سے اندازہ کریں کہ وہ کس نیت سے رشتہ مانگنے آیا ہے۔ اگر وہ سیاسی فائدے کی نیت سے آئے گا تو آپ کی کسی بھی بیٹی کو بہو بنانا قبول کرلے گا۔ آپ یہ طے کرلیں کہ مس مرجانہ کا رشتہ نہیں دیں گے۔"

"لیکن مرجانہ بڑی ہے' پہلے اسی کا رشتہ مانگا جائے گا۔"

"آپ کہہ سکتے ہیں کہ بڑی صاحب زادی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جا رہی ہیں۔"

"مرجانہ کا رشتہ نہ دینے اور فرزانہ کا رشتہ دینے سے کیا فرق پڑے گا؟"

مشیر حسین نے کہا "میں پھر ایک بات کہوں گا تو آپ کو تکلیف بھی پہنچے گی اور غصہ بھی آئے گا لیکن آپ کو سیاست کی خاطر برداشت کرنا ہوگا۔"

حاکم علی نے اسے گھور کر دیکھا پھر کہا "ٹھیک ہے بولو؟"

"جناب! بڑی صاحب زادی جتنی خوب صورت اور اسمارٹ ہے' چھوٹی اس کے بالکل برعکس ہے۔ نہ تعلیم ہے' نہ روپ رنگ ہے۔ آپ ایک باپ کی حیثیت سے سمجھ سکتے ہیں کہ کسی بھی سردار گھرانے سے اس کا رشتہ نہیں آئے گا۔"

یہ سچی اور کھری بات تھی۔ وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ واقعی آج ایک سنہری موقع ہاتھ آرہا ہے۔ اگر سردار جنید ایک سیاسی چال چلنے آرہا ہے تو اپنے بیٹے کو میرا داماد بنانے کے لیے کھوٹا سکہ بھی قبول کرلے گا۔ اس نے کہا "مشیر حسین! یہ بہت ہی اچھا مشورہ ہے۔ میں چاہتا ہوں' فرزانہ بیاہی جائے۔ اس طرح نہ بیاہی جانے والی کا بوجھ سر سے اترے گا لیکن حماد پھر بھی داماد بن کر نصف بیٹا اور نصف حق دار بنے گا۔ مجھ پر طرح طرح سے دباؤ ڈالے گا۔"

"اگر آپ اس پر دوگنا دباؤ ڈالیں گے تو وہ سیاسی پارٹی حماد کو نرم پڑنے پر مجبور کرے گی۔"

"میں کیسے دوگنا دباؤ ڈال سکتا ہوں؟"

"جناب! آپ نے صاحبزادی مرجانہ کو آخر کس دن کے لیے تعلیم دلائی ہے؟ وہ ایم اے کے فائنل ائر میں ہے۔ اس کا مضمون پولیٹیکل سائنس ہے۔ آپ اسے آزاد امیدوار کی حیثیت سے قومی اسمبلی میں لے جائیں اور خود صوبائی میں مقابلہ کریں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟ میں بیٹی کو سیاست میں لاؤں؟ یہاں ہمارے علاقوں میں' ہمارے قبیلے میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

"ہمارے ملک کے دوسرے تمام صوبوں میں ایسا ہوتا ہے۔ کتنی ہی خواتین الیکشن لڑ چکی ہیں۔ کتنی ہی خواتین اسمبلیوں میں پہنچ چکی ہیں۔ آپ ایسا کریں گے تو یہ کوئی پہلی اور عجیب و غریب بات نہیں ہوگی۔"

دوسرے مشیر نے کہا "خدا نے آپ کو بیٹا نہیں دیا لیکن صاحب زادی مرجانہ بیٹے سے کم نہیں ہیں۔ سیاست میں آئیں گی تو زبردست کارکردگی کا مظاہرہ کریں گی۔"

یہ تو باپ کی برسوں کی خواہش تھی کہ گھر میں بیٹا نہ سہی' مرجانہ بیٹا بن کر رہے۔ بیٹے کے لیے جتنے ارمان ہوتے ہیں' وہ سب اس نے مرجانہ کے ذریعے پورے کیے۔ اس لیے اسے شہری اور جدید تعلیم دی۔ وہ مشیر حسین کے شانے کو تھپک کر بولا "میں تم سے بہت خوش ہوں' یہ تو کمال ہو جائے گا۔ بیٹی قومی اسمبلی میں اور میں صوبائی میں۔ دونوں انتخابات میں جیتنے کے لیے ہم باپ بیٹی کا ایسا ووٹ بنک ہے کہ کوئی سیاسی پارٹی اس حلقے سے ایک ووٹ نہیں لے سکے گی۔"

ایسے علاقوں میں رہنے والے غریب ہاریوں' مزدوروں' مچھیروں اور ہزاروں مقروض خاندانوں کے افراد کی اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنا ایک ووٹ بھی کسی دوسری پارٹی کو دیں۔ مشیر حسین نے کہا "اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ابھی آپ صاحب زادی مرجانہ کے سیاست میں آنے کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ سردار جنید اور اس کے بیٹے سے یہی کہا جائے کہ وہ لندن جا رہی ہیں۔ انہیں اسی فریب میں رکھیں کہ آپ سیاست میں تنہا ہیں۔ صاحب زادی درپردہ امیدوار بننے کے مراحل سے گزرنے کے بعد اچانک آزاد امیدوار کی حیثیت سے منظرِعام پر آئیں گی۔"

یہ موضوع ایسا پیچیدہ اور بحث طلب تھا کہ بحث و مباحثے میں شام ہوگئی۔ خبر آئی کہ سردار جنید سالاری باجے گاجے کے ساتھ آرہا ہے۔ حاکم علی کے مسلح حواری حویلی کے اوپر نیچے اور دائیں بائیں کھڑے ہو کر استقبالیہ انداز میں ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔ سردار اپنی مرسیڈیز میں تھا۔ آگے پیچھے کی گاڑیوں میں اس کے مسلح وفادار تھے۔ دس عورتیں اپنے اپنے سروں پر بڑے بڑے تھال اٹھائے ہوئے تھیں۔ باجے کی دھن پر کئی مرد رقص کر رہے تھے۔ حویلی کے سامنے بڑی بھیڑ اور رونق لگ گئی تھی۔ سردار حاکم علی نے حویلی سے باہر آکر سردار جنید کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ان دونوں پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ سیاسی پارٹی کے چند اہم افراد بھی آئے تھے۔ وہ سب حاکم علی کے ساتھ حویلی کے بڑے ہال میں آئے۔ وہاں فرشی نشست کا انتظام تھا۔ مہمان اور میزبان دائرے میں بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان دس عدد تھال لا کر رکھے گئے۔ حاکم علی نے کہا "سردار جنید!

آپ نے میرے علاقے اور میری حویلی میں آکر میری عزت بڑھائی ہے اور یوں میری نظروں میں آپ پہلے سے زیادہ محترم ہوگئے ہیں لیکن یہ تحائف اور تکلفات کس لیے؟"

سردار جنید نے کہا "میں گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے سب سے پہلے آپ کو سیاست میں قدم رکھنے کی مبارک باد دیتا ہوں۔ ہزار ہزار دلی مبارک باد........." تمام مہمان یک آواز مبارک باد دینے لگے۔ سردار جنید نے کہا "پہلے میرے بیٹے حماد کو اعتراض تھا کہ آپ آزاد امیدوار کی حیثیت سے آرہے ہیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ بابا تم ابھی بچے ہو' سردار حاکم علی پاچاری کو نہیں جانتے' وہ آزاد شیر ہے۔ کسی جکڑبندی کو قبول نہیں کرتا۔ وہ سب کو گھاس ڈالتا ہے اور خود شکار مار کر کھاتا ہے۔"

سب لوگ واہ واہ سبحان اللہ کہنے لگے۔ فخروانبساط سے حاکم علی کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ وہ بولا "سردار جنید! یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ میں تو اپنے آباؤاجداد کی روایتی دلیری اور آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"آپ کے اس فیصلے نے ہم سرداروں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں نے تو اپنے بیٹے حماد سے کہہ دیا ہے کہ اگر اس سیاسی پارٹی نے آئندہ انتخابات میں اچھی کارکردگی نہ دکھائی تو تم بھی سردار حاکم علی پاچاری کے نقشِ قدم پر چلو۔ ان سے سیکھو کہ شیر کس طرح آزاد رہ کر اپنے علاقے میں حکومت کرتے ہیں۔ آزاد امیدوار کی حیثیت سے جنگ لڑنے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور میرا بیٹا آپ سے یہ حوصلہ سیکھے گا۔"

حاکم علی نے کہا "سردار جنید! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ میرے بارے میں اتنے اچھے خیالات رکھتے ہیں۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں نے ہمارے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں۔ آج آپ نے میرا دل صاف کر دیا ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیں میں بھی آپ کو ہر طرح سے خوش کرنا اور آپ کا دل جیتنا چاہتا ہوں۔"

"آپ دل جیتنے کی بات کہہ کر حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔ آج میں ایک سوالی بن کر آپ کے پاس آیا ہوں" یہ کہہ کر اس نے ایک تھال پر سے خوان پوش کو ہٹایا۔ تھال تازہ کھجوروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے کہا "یہ کھجوریں ہیں۔ محبت اور گہرے رشتوں کی مٹھاس کی علامت ہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ میرے صاحب زادے حماد سالاری کو اپنی غلامی میں قبول کریں اور صاحب زادی مرجانہ کو میرے گھر کی رونق بنادیں۔"

سردار حاکم چپ رہا جیسے کوئی فیصلہ کر رہا ہو۔ ایک خادم ایک ایک تھال پر سے

خوان پوش ہٹاتا جا رہا تھا۔

"ان تھالوں میں طرح طرح کے خشک میوے' جاپان سے اسمگل کیے ہوئے بیش قیمت کپڑوں کے تھان اور دوبئی سے اسمگل کیے ہوئے سونے کے زیورات سے بھرے ہوئے مخملی ڈبے تھے۔ سردار حاکم علی نے کہا "سردار جنید! آپ نے اچانک ہی میرے اندر دھماکا سا پیدا کر دیا ہے۔ یہ تو میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ آپ میری صاحب زادی کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔"

ہر طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ حاکم علی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر حاضرین کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "معزز مہمان! ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے' وہ بولا "میری دو صاحب زادیاں ہیں۔ دستور کے مطابق پہلے بڑی صاحب زادی کی شادی ہونے چاہیے لیکن وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جا رہی ہے۔"

سردار جنید نے کہا "برادر حاکم علی! آپ نے اسے بہت زیادہ پڑھایا ہے اب اور پڑھ کر کیا کریں گے۔ لڑکیاں جس قدر پڑھ لیں' آخر انہیں بیوی' ماں اور گھر کی نگراں بن کر رہنا پڑتا ہے۔"

"یہ ہم اپنے علاقوں میں ایسا سوچتے ہیں مگر دنیا جہان کی عورتیں' ڈاکٹر' انجینئر' پروفیسر اور پائلٹ وغیرہ بن رہی ہیں۔ ستاروں پر کمند ڈال رہی ہیں۔ ملکوں پر حکمرانی کر رہی ہیں۔ میں نے مرجانہ کی پرورش بیٹے کی طرح کی ہے۔ وہ اپنے طور پر اپنے فیصلے کرتی ہے۔ اگر آپ مرجانہ کو ہی اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں تو شاید برسوں انتظار کرنا پڑ جائے۔ ورنہ آپ سے رشتے داری کے لیے میری دوسری صاحب زادی فرزانہ حاضر ہے۔"

سردار جنید الجھ سا گیا۔ اسے بیٹے کی پسند معلوم تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ فرزانہ معمولی صورت شکل کی لڑکی ہے۔ اس میں کوئی ایسی خوبی اور کشش نہیں ہے کہ بیٹا اس سے شادی کے لیے راضی ہو جائے۔ حاکم علی نے کہا "میں آپ کی زبان خالی نہیں جانے دوں گا۔ آپ کس سوچ میں پڑ گئے ہیں' میں تو رشتے کے لیے راضی ہوں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "برادر حاکم علی! میں چاہتا ہوں' ایک بار مرجانہ سے اس رشتے کے لیے پوچھا جائے۔ شاید وہ راضی ہو جائے۔"

"وہ راضی ہو جائے تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا لیکن میں اس کے مستقبل کے منصوبوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ مجھ سے صاف صاف کہہ چکی ہے کہ آئندہ پانچ برس تک اس سے شادی کی بات نہ کی جائے۔ کوئی رشتہ آئے تو چھوٹی بہن فرزانہ کو بیاہ دیا

جائے۔"

سردار جنید نے کن انکھیوں سے پارٹی لیڈر کے مشیر کو دیکھا۔ مشیر نے راضی ہونے کا اشارہ کیا۔ سردار نے کہا "برادر حاکم علی! میں تو رشتہ کرنے آیا ہوں۔ آپ کسی بھی بیٹی کے لیے راضی ہیں تو پھر رشتہ ضرور ہوگا لیکن ایک بار میں صاحب زادی مرجانہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں اسے قائل کر لوں۔"

"بے شک وہ آپ کی بھی بیٹی ہے۔ آپ اس سے مل کر اس کی بھلائی چاہیں گے۔ وہ شہر میں ہے۔ آپ چاہیں تو میں اسے یہاں بلا لوں.......... یا آپ اس سے تنہائی میں ملاقات کرنا چاہیں تو شہر تشریف لے جائیں۔"

"میں خود شہر جا کر اس سے ملاقات کروں گا۔"

اس گفتگو کے بعد دسترخوان بچھایا گیا اور پُرتکلف کھانوں کی ڈشیں لا کر رکھی جانے لگیں۔ سردار جنید کو امید تھی کہ بیٹا شہر گیا ہوا ہے' وہ مرجانہ کو شیشے میں اتار لے گا۔

سوسائٹی کے ہل پارک کے پاس ایک شاندار کوٹھی میں مرجانہ کی رہائش تھی۔ وہاں اس کے مزاج کے مطابق سلجھے ہوئے تین ملازم اور دو کنیزیں تھیں۔ چار سیکیورٹی گارڈز تھے' جو باری باری ڈیوٹی کے لیے موجود رہتے تھے۔ اگرچہ وہ شاہانہ طرز کی زندگی گزارتی تھی لیکن فضول شوق اور تفریحات میں وقت ضائع نہیں کرتی تھی۔ اس کا زیادہ وقت لائبریریوں میں گزرتا تھا۔ پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر رہی تھی لیکن جب سے علم آگہی نے اسے پریشان کیا تھا' تب سے وہ ماہرِنِ نفسیات سے رجوع کرنے کے علاوہ خود نفسیاتی کتب کا مطالعہ کرنے لگی تھی۔

احاطے کے گیٹ کے پاس ڈیوٹی دینے والے دربان نے فون کے ذریعے مرجانہ سے کہا "بی بی صاحبہ! آپ سے ایک صاحب ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ سردار جنید سالاری کے فرزند حماد سالاری ہیں۔"

وہ بولی "گارڈ سے کہو انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔"

دربان نے گارڈ کو مرجانہ کا حکم سنایا۔ گارڈ نے حماد سے کہا۔ "آئیں تشریف لے آئیں۔"

حماد نے ناگواری سے پوچھا "کیسے تشریف لاؤں۔ گاڑی کے لیے گیٹ کھولو۔"

"سوری سر! کسی وزیٹر کو گاڑی احاطے میں لانے کی اجازت نہیں ہے' آپ ادھر پارک کریں۔"

حماد کو سبکی کا احساس ہوا۔ اگر اہم مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو وہ کوٹھی کی طرف تھوک

کر چلا جاتا۔ اس نے گاڑی ایک جگہ پارک کی پھر گیٹ کے ضمنی دروازے سے داخل ہو کر گارڈ کے پاس آیا۔ گارڈ اس کی تلاشی لینے لگا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولا ”یہ کیا حرکت ہے؟ میں چور اچکا ہوں؟“

گارڈ نے عاجزی سے کہا ”سوری سر! بی بی صاحبہ کے پروفیسر آتے ہیں تو ان کی بھی تلاشی لی جاتی ہے۔“ یہ تو بڑی بے عزتی کی بات تھی کہ ایک بہت بڑے سردار کے بیٹے کی تلاشی لی گئی۔ ایک ریوالور برآمد ہوا۔ سرداروں، وڈیروں اور جاگیرداروں کے پاس ایسے کھلونے ہوا کرتے ہیں۔ گارڈ نے کہا ”آپ کا ہتھیار ہمارے پاس محفوظ رہے گا۔ واپسی میں آپ کو مل جائے گا۔“ پھر اس نے ملازم سے کہا ”صاحب کو اندر پہنچا دو۔“

حماد ملازم کی راہنمائی میں چلتا ہوا کوٹھی کے اندر آیا۔ پھر ایک ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک منٹ بعد ایک کنیز ایک ٹرالی میں تازہ پھل، خشک میوے، کچھ نمکین چیزیں اور چائے لے آئی۔ اس کے جانے کے بعد مرجانہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا وہ سنجیدگی سے بولی ”ہیلو۔ کیسے راستہ بھٹک گئے؟“

وہ بولا ”پچھلے چار برسوں میں یہ ہماری تیسری ملاقات ہے۔ میں بہت اچھے موڈ میں آیا تھا لیکن تمہارے ملازمین کے رویوں نے موڈ خراب کر دیا۔“

”مجھے افسوس ہے، کیا کسی نے بدتمیزی کی ہے۔“

”بھئی تمہاری اجازت کے بغیر وہ نہیں ہو سکتا تھا، جو میرے ساتھ ابھی ہوا ہے۔ مجھے گاڑی باہر پارک کرنی پڑی۔ احاطے میں آیا تو گارڈ نے میری تلاشی لی اور میرا ریوالور ضبط کر لیا۔ کیا تم یہ سمجھ سکتی ہو کہ میں نے صرف تمہاری چاہت میں، تم سے ملنے کی خاطر یہ توہین برداشت کی ہے؟“

وہ اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ کر بولی ”میں نے اپنے لیے حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں۔ تم اسے اپنی توہین سمجھتے ہو اور مجھ سے چاہت کا دعویٰ بھی کرتے ہو۔“

”تمہیں اپنے چاہنے والے پر تو بھروسا ہونا چاہیے۔“

”کتنے ہی چاہنے والے ہیں۔ کتنوں پر بھروسا کریں۔ یونیورسٹی کی سہیلیاں ہیں دوست ہیں، پروفیسرز ہیں، کچھ قریبی رشتے دار ہیں۔ سب ہی مجھے چاہتے ہیں لیکن چیکنگ کے بغیر کوئی میرے روبرو نہیں آتا۔“

”لیکن کیوں۔ پچھلی بار ایسا نہیں تھا۔ یہاں مجھے کسی نے چیک نہیں کیا تھا؟“

”بے شک پچھلے چار مہینے سے میں نے ایسے انتظامات کئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا

ہے کہ میں خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہوں۔“

”ایسا کیا خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ تعلیم دینے والے پروفیسر پر اور مجھ جیسے چاہنے والے پر بھی بھروسا نہیں کر رہی ہو؟“

”آج تم بار بار اپنی چاہت کا ذکر کر رہے ہو جبکہ میں اپنے بے شمار چاہنے والوں کا ذکر کر چکی ہوں۔“

”لیکن مرجانہ! میری چاہت کچھ اور ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے تمہارے جیسی لائف پارٹنر کی ضرورت ہے۔ تمہیں سیکیورٹی گارڈز کی نہیں، مجھ جیسے محافظ کی ضرورت ہے۔“

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی ”حماد! ٹرالی سے کچھ لے کر کھاؤ۔ پینے کے لیے چائے بھی ہے اور ٹھنڈا شربت بھی۔ میرا مشورہ ہے ٹھنڈا پیو اور اپنے ذہن کی گرمی نکال دو۔“

وہ گلاس میں شربت انڈیلنے لگی، وہ بولا ”رہنے دو۔ میں نہیں پیوں گا۔ تم میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی ہو۔ شاید میں خود غرض ہو کر صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔ مجھے تمہارے مسائل معلوم کرنے چاہئیں۔ یہ.......... یہ جو سیکیورٹی کے سخت انتظامات ہیں، یہ کیوں ہیں؟ مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے حصے کے خطرات سے کھیلوں گا۔ تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔“

اس نے پوچھا ”کیا تم میرے کسی ایسے دشمن سے مقابلہ کر سکتے ہو، جو نظر نہیں آتا؟“

اس نے حیرانی سے پوچھا ”ایسا کون دشمن ہے، جو نادیدہ ہے اور خطرہ بنا ہوا ہے؟“

”یہی معلوم ہوتا تو میرے سیکیورٹی گارڈز اسے مار ڈالتے۔“

”کیا وہ چھپ کر دھمکیاں دیتا ہے؟ کبھی فون کرتا ہے یا کسی طرح خفیہ پیغام بھیجتا ہے؟“

”میں نے آج تک اس کی آواز نہیں سنی یعنی کبھی فون پر بھی اس نے کچھ نہیں کہا اور نہ کبھی اس نے کوئی پیغام بھیجا ہے۔“

”تم ایسی باتیں کر رہی ہو، جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تمہیں سب ایب نارمل کہیں گے۔“

”میں ماہرین نفسیات سے رجوع کر چکی ہوں۔ انہوں نے صاف صاف لفظوں میں تو نہیں کہا لیکن ان کے ٹریٹ منٹ سے پتا چل گیا کہ وہ مجھے ذہنی مریضہ سمجھتے ہیں۔“

وہ مسکرا کر بولا "تمہیں ایسا سمجھنے والے خود پاگل ہیں۔ تم اتنے بڑے شہر میں اتـ سلیقے سے زندگی گزار رہی ہو۔ دماغی طور پر صحت مند ہو۔ صرف اپنے ذہن سے وہ نادید خطرہ نکال دو جو دراصل خطرہ نہیں محض تمہارا وہم ہے۔ کیا تمہاری کسی سے دشمـ ہے؟"

"ایک سردار کی بیٹی ہوں۔ کسی کو بھی مجھ سے دشمنی ہو سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بحث نہیں کروں گا۔ تم نے حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں۔ اچھی بات ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم مجھے اپنا باڈی گارڈ بنالو۔"

"ایسی بات نہ کرو۔ میرے پاس پہلے ہی کافی گارڈز ہیں۔"

"دیکھو مرجانہ! تم میری بات سمجھ کر بھی انجان بن رہی ہو۔ میں صاف لفظوں مـ کہہ دوں کہ تمہیں شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے شریکِ حیات کیوں بنانا چاہتے ہو؟"

مرجانہ کے اس سوال سے وہ ذرا گڑبڑا گیا جیسے چوری پکڑی گئی ہو اور مرجانہ ـ سمجھ لیا ہو کہ وہ سیاسی مقصد کے لیے اپنا کام بنانے آیا ہے۔ پھر وہ سنبھل کر بولا "تم مـ ایک شریکِ حیات بننے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اس لیے شادی کی درخواست کر ہوں۔"

"غلط کہہ رہے ہو۔ تمام خوبیاں کسی ایک میں نہیں ہوتیں۔ اب میرا یہی کمزور پہ دیکھ لو کہ ایک نادیدہ خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا جیون ساتـ بننے والا بھی اپنی جان مصیبت میں ڈالے۔"

"میں تمہارے ساتھ خطرات میں کھیلنے کو تیار ہوں۔"

"جذباتی باتوں سے پرہیز کرو۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ کیا یہ درد تم اپنے میں منتقل کر کے مجھے دردِ سر سے ابھی نجات دلا سکتے ہو؟"

"یہ تو تم عجیب سی بات کہہ رہی ہو۔"

"تمہاری ہی بات کو دوسرے لفظوں میں کہہ رہی ہوں۔ میرے حصے کے خطرا سے کھیلنے کا دعویٰ کر رہے ہو اور ایک ذرا سے دردِ سر میں شریک نہیں ہو رہے ہو۔ ا لیے کہ یہ تمہارے بس میں نہیں ہے۔ موت میرے نام آئے گی تو میں ہی مروں گ میری جگہ تم نہیں مرو گے۔"

"دنیا کا کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ نہیں مرتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس سے شادی ہی نہ کرے۔"

"اور دنیا کی کوئی وفادار عورت اپنے سر منڈلانے والے خطرے کو کسی ایسے شخص کے سر جانے نہیں دیتی جو آئندہ جیون ساتھی بننے والا ہو۔"

"تمہاری باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم میری پیش کش کو رد کر رہی ہو۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"کیا میں نے اتنے سخت حفاظتی انتظامات محض دکھاوے کے لیے کئے ہیں؟ تب تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ مجھے فراڈ سمجھو اور میرا خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔"

وہ تھوڑی دیر تک اسے تکتا رہا اور کبھی دوسری طرف دیکھتا رہا پھر بولا "ہمارے علاقے کے حالات بدل رہے ہیں۔ ہمارا متحد اور ایک خاندان ہو کر رہنا بہت ضروری ہے۔"

"وہاں ایسی کیا انقلابی تبدیلیاں آگئی ہیں؟"

"کیا تمہیں پتا ہے کہ تمہارے حاکم بابا نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑنے کا اعلان کیا ہے؟"

"ظاہر ہے باپ نے اعلان کیا ہے۔ بیٹی غافل نہیں ہوگی۔ بائی دی وے' اس سے حالات کیسے بدل گئے؟"

"دوسری سیاسی پارٹیاں جوڑ توڑ میں لگی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں' تمہارے بابا آزاد امیدوار نہ بنیں مگر میں چاہتا ہوں' تمہارے بابا کسی پارٹی کی پابندیوں میں نہ رہیں۔ تم ان ساحلوں کی اہمیت کو سمجھتی ہو۔ انہیں کسی دوسری پارٹی کی تحویل میں نہیں جانا چاہیے۔ اسمبلی میں میری اور تمہارے بابا کی سیٹیں ملا کر دو ہوں گی تو ہمارا پلڑا بھاری رہے گا۔ ہم دونوں کا خاندان ایک ہو جائے گا تو ان ساحلوں کا سارا منافع ہم دونوں کا مشترکہ ہو جائے گا۔"

"اب سمجھی' ہم سیاسی شادی کے ذریعے ساحلی علاقوں پر حکومت کرتے رہیں گے۔"

"بات یہی ہے۔ کیا تم چاہو گی کہ ان علاقوں میں ہماری ساکھ بگڑ جائے؟"

"ہرگز نہیں۔ ہماری یہ شان و شوکت وہاں کی آمدنی سے ہے۔ میں عشق و محبت والی جذباتی زندگی کو حماقت سمجھتی ہوں۔ سراسر عملی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم منافع بخش سیاسی سوچ رکھتے ہو۔ ہمارے خاندانوں کو ضرور ایک ہونا چاہیے۔"

وہ خوشی سے اچھل کر بیٹھ گیا پھر بولا "تم ایک پرفیکٹ عملی زندگی گزارنے والی شریکِ حیات ثابت ہوگی۔"

"میں عملی زندگی گزارنے والی لڑکی ضرور ہوں مگر مجھے شریکِ حیات کیوں کہہ رہے ہو؟ ہمارے خاندانوں کو ایک کرنا چاہتے ہو تو میری بہن فرزانہ سے شادی کرلو۔"

"آں؟" وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا پھر بولا "مرجانہ! میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ تمہارا دیوانہ ہوں۔ میں نے دن رات تمہارے سپنے دیکھے ہیں۔"

"پلیز حماد! میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ عشق و محبت والی جذباتی زندگی کو حماقت سمجھتی ہوں۔ مجھ سے صرف سیاست اور منافع والی باتیں کرو۔ اگر ہمارے متحد ہونے سے وہ ساحل ہمارے قبضے میں رہیں گے تو ایک مکمل عملی انسان ہونے کا ثبوت دو اور فرزانہ سے شادی کرلو۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہا پھر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مرجانہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا "میں نے اپنی بہن سے شادی کرنے کے لیے کہا ہے۔ اس کے بعد میری آرزو کرو گے تو یہ بے حیائی ہوگی۔"

پھر آگے کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی۔ وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس رات کھانے کے دوران فون کی گھنٹی بجی۔ ایک ملازمہ نے ریسیور اٹھا کر سنا پھر فون اٹھا کر کھانے کی میز پر لا کر بولی "حضور بابا صاحب' یاد فرما رہے ہیں۔"

وہ ریسیور کان سے لگا کر بولی "ہیلو بابا! سلام عرض کرتی ہوں۔"

"وعلیکم السلام بیٹی۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ کیا کر رہی ہو؟"

"نرگسی کوفتے کھا رہی ہوں۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"ابھی مہمانوں کو رخصت کیا ہے۔ سردار جنید سالاری بڑی دھوم دھام سے قیمتی تحائف کے ساتھ تمہارا رشتہ مانگنے آیا تھا۔ تمہیں بہو بنانا چاہتا ہے۔"

"ہوں۔ بڑی پلاننگ ہو رہی ہے۔ باپ آپ کے پاس اور بیٹا میرے پاس آیا تھا۔ جب میں شادی کی بات ٹالنے لگی تو اس نے ہمارے اور اس کے خاندانی اتحاد کی اہمیت سمجھائی کہ کس طرح ہم سیاسی طور پر متحد ہو کر سپات بندر اور میلان بندر کو قبضے میں رکھ سکتے ہیں۔"

"بیٹی! تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے جواب دیا ہے کہ میرا شادی کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس علاقے میں متحد حکومت کرنا چاہتے ہو تو فرزانہ سے شادی کرلو۔"

"واہ بیٹی! شاباش' ہم باپ بیٹی کے ذہن ایک طرح سے سوچتے ہیں۔ میں نے بھی جواب میں سردار جنید سے کہا ہے کہ مرجانہ ابھی شادی نہیں کرے گی۔ اعلیٰ تعلیم کے

لیے یو کے جائے گی۔"

"ردِعمل کیا ہوا بابا؟"

"سردار جنید شش و پنج میں ہے۔ میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے اس کے بیٹے سے برتر ہو سکتا ہوں کیونکہ وہ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے گا۔ وہ مجھے اپنی طرف جھکانے کے لیے ہر حال میں میرا داماد بننا چاہے گا۔"

"پھر تو بابا! میرے انکار کے بعد وہ فرزانہ کو ضرور قبول کریں گے۔ آپ ان کی چال کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ فرزانہ کا رشتہ دینے سے بھی انکار کر دیں۔"

"نہیں بیٹی! فرزانہ کے لیے اس سے اچھا رشتہ پھر نہیں آئے گا۔ فرزانہ وہاں دلہن بن کر جائے گی۔ تمہارے باپ کے پاس شہ مات دینے والی چال ہے۔ کل مشیر حسین تمہارے پاس آرہا ہے۔ وہ ہماری پلاننگ تمہیں سمجھائے گا۔ تمہیں میرا بیٹا بن کر ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔"

"بابا! جب آپ مجھے بیٹا کہتے ہیں تو مجھے فخر ہوتا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں' ہم ان لوگوں کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ توبہ توبہ کریں گے۔" باپ بیٹی میں تھوڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ کھانے کے دوران فرزانہ کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے بہن سے بہت محبت تھی۔ اس کے لیے فکرمند رہتی تھی کہ نہ اس نے تعلیم حاصل کی' نہ زندگی گزارنے کا اچھا سلیقہ سیکھا۔ صورت شکل بھی معمولی سی تھی۔ مرجانہ اس سے زیادہ باپ کے لیے فکر کرتی تھی کہ باپ کے سر سے اس کا بوجھ کیسے اترے گا؟ چھوٹے خاندانوں سے آنے والا کوئی رشتہ قبول نہیں کیا جائے گا اور بڑے خاندانوں سے کوئی اسے بہو بنانے نہیں آئے گا۔ وہ چوبیس برس کی ہو چکی تھی۔ چوالیس برس کی ہو کر بھی گھر میں بیٹھی رہتی۔ باپ اسے دیکھ دیکھ کر مرجاتا۔ اب اس کے سہاگن بننے کی صورت نکل آئی تھی۔ سالاری ساحلی علاقوں میں اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے ضرور رشتے کی زنجیر لائیں گے اور بڑی محبت سے فرزانہ کو باندھ کر لے جائیں گے۔ ہر بیٹی والا لڑکے والوں کے سامنے جھکتا ہے۔ مرجانہ یہی سوچ رہی تھی' کیا میرا حاکم بابا جھک جائے گا؟ حاکم بابا نے فون پر کہا تھا کہ شہ مات دینے والی ایک چال ہے۔ وہ سوچ رہی تھی' اللہ کرے بابا کی چال زبردست ہو اور سسرال میں فرزانہ پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اگر سردار جنید کے پاس بھی جواباً کوئی زبردست چال ہوئی تو فرزانہ بے چاری سیاست کی چکی میں پس جائے گی پھر ایک دن بے موت ماری جائے گی۔

وہ کھانے کے بعد کوٹھی کی چھت پر ٹہلتی رہی۔ اسے اپنے حاکم بابا کی فہم و فراست

پر یقین تھا۔ ہر بازی میں کامیابی یا ناکامی تو ہوتی ہی ہے۔ اندیشہ یہی تھا کہ ناکامی کی صورت میں سب سے زیادہ نقصان فرزانہ کو پہنچنے والا ہے۔ سیاست میں دولت اور عزت کو تو داؤ پر لگایا ہی جاتا ہے۔ ایک بیٹی کو بھی داؤ پر لگایا جا رہا تھا۔ وہ معمول کے مطابق سونے کے وقت خواب گاہ میں آئی پھر لائٹ آف کرکے آرام دہ بستر پر لیٹ گئی۔ نیند کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ آرام دہ بستر پر آجائے۔ یہ تو کانٹوں کے بستر پر بھی آجاتی ہے اور نہ آنا چاہے تو پھولوں کی سیج پر بھی نہیں آتی۔ مرجانہ کے ساتھ مدتوں میں کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ بستر پر پڑی رہتی تھی اور رات گزرنے پر سوچتی تھی کہ وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی؟ جو کچھ وہ دیکھتی رہی تھی اور سنتی رہی تھی' وہ خیالات کا شور مچاتا ہوا ہجوم تھا؟ یا کوئی ہلچل پیدا کرنے والا خواب تھا؟ اس رات بھی تاریک خواب گاہ میں خیالات کی یلغار ہوئی۔ یا تو وہ جاگ رہی تھی اور خیالات امنڈ کر آئے تھے۔ یا وہ سو رہی تھی اور خواب آیا تھا۔ یا.......... یا پھر آگہی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا' ایک تلوار ہے جو بہت آہستہ آہستہ اپنی نیام سے نکل رہی ہے۔ تلوار خود نہیں نکلتی' نکالی جاتی ہے' دو ہاتھ جو دستانے پہنے ہوئے تھے' وہ اس تلوار کو نکال رہے تھے اور وہ تنہا تھی۔ بے یارومددگار چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی۔ تب ان ہاتھوں نے اس کے پیٹ میں تلوار کی نوک پیوست کر دی۔ پھر اس کے پیٹ کو اوپر سے نیچے تک چیر ڈالا۔ صرف چیرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا تھا' پیٹ پھاڑ ڈالا گیا تھا۔

اے اجل! تُو نے یہ کیا کیا؟ کس گناہ کا حساب لے لیا؟

☆==========☆==========☆

میرے دفتری کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی مرجانہ کی پیالی کی چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اجل نواز طشتری پر رکھی ہوئی خالی پیالی کو یوں آہستہ آہستہ گھما رہا تھا جیسے گھڑی کا کانٹا گھما رہا ہو اور سمجھا رہا ہو' ہر زندہ شے اپنے مقررہ وقت پر تھم جاتی ہے۔ رک جاتی ہے' صرف وقت کا کانٹا نہیں رکتا' چلتا رہتا ہے' گھومتا رہتا ہے اور موت کے خوف سے سر گھماتا رہتا ہے۔ موت کو ہمیشہ نظرانداز کیا جاتا ہے۔ سب نظر انداز کرتے ہیں۔ تعجب ہے نظرانداز کرتے رہنے کے باوجود ڈرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی بات ختم کر چکی تھی۔ میں نے پوچھا "کیا یہ ایک خواب یا خیال نہیں تھا' جو آیا اور گزر گیا؟"

وہ بولی "آپ نے بھی ایک خواب دیکھا تھا جو کچھ عرصے بعد عارضی موت کی صورت میں پورا ہوا تھا لیکن میرا کیس آپ سے ذرا مختلف ہے۔ جب حماد میری بہن

فرزانہ کو دلہن بنا کر لے گیا۔ اس رات بھی میں نے اپنی خواب گاہ کی تاریکی میں وہی منظر دیکھا' دو دستانے پہنے ہوئے ہاتھ تلوار کو نیام سے نکال رہے ہیں اور پیٹ پھاڑ رہے ہیں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "یہ سراسر آگہی ہے۔ ایک خواب جیسا پہلے نظر آتا ہے' ویسا ہی دوسری بار من و عن نظر نہیں آتا۔ آجائے تو وہ قدرتی تنبیہہ ہے' تاکید ہے' آگہی ہے۔"

میں نے اجل نواز کو دیکھا۔ جب موت کا الٹی میٹم مل چکا تھا تو پھر ہم سے زیادہ وہی اس آگہی کے متعلق جانتا ہوگا۔ اس کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ موت کی زبان نہیں ہوتی۔ آہٹ بھی نہیں ہوتی۔ وہ بے آواز آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ مگر وہ مجسم انسان اور دوست بن کر آیا تھا۔ میں نے پوچھا "کیوں اجل! کیا کہتے ہو؟"

مرجانہ نے اسے دیکھا۔ اس نے مرجانہ کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "تمہیں پریشانی کیا ہے؟ کیا تمہیں اپنی موت کا خوف ہے؟"

"خوف کی بات نہیں ہے۔ زندگی سے محبت کی بات ہے۔ مرنا ایک دن ہے۔ میں وقت سے پہلے خوف زدہ رہ کر زندگی کو بے کیف اور مسرتوں سے خالی کیوں بناؤں؟"

"تو پھر خوش رہو۔ کسی نے تمہارا پیٹ نہیں پھاڑا ہے۔"

مرجانہ نے ایک دم سے چونک کر اجل کو دیکھا۔ کچھ دیر تک اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی "ہاں' میں نے دوبارہ پوری تفصیل سے وہی واردات دیکھی لیکن قاتل اور مقتولہ کے چہرے نہیں دیکھے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ کوئی مجھے قتل کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "جب میں نے مسجد اور درگاہ کے درمیانی صحن میں اپنا جنازہ دیکھا تو خود کو اس جنازے میں پورے یقین سے دیکھا تھا لیکن تم نے دوبار جو واردات دیکھی اس میں خود کو نہیں دیکھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ آئندہ کبھی قتل ہونے والی کوئی اور ہے۔"

وہ بولی "ہاں اگر وہ میں نہیں ہوں تو وہ بے چاری کوئی اور ہے۔ کاش میں دوبار میں سے ایک بار اس کا چہرہ دیکھ پاتی۔"

اجل نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا "دیکھنے کے لیے چہرہ ضروری ہے۔ آئینہ اوپر سے ٹوٹ جائے تو نچلے حصے سے باقی دھڑ دیکھ کر معلوم نہیں ہوتا ہے کہ شکستہ آئینے کے روبرو کون ہے؟"

"اگر جسم پر زخم کا نشان یا کوئی پیدائشی نشان ہو تو شناخت ہو جاتی ہے۔"

"تو پھر یاد کرو کہ تم نے دوبار اس عورت کے جسم کا اور کتنا حصہ دیکھا۔ آگہی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ تمہیں جتنا نظر آیا اسی کو یاد کرو۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی آگہی مل چکی تھی۔ اسے حافظے کی اسکرین پر لا کر دیکھنے لگی۔ پھر کہنے لگی "میں نے عورت کا پیٹ اور کولہے دیکھے۔ ان کولہوں کے اطراف اس کے دونوں ہاتھ بستر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔"

اجل نے پوچھا "اس عورت کا بدن بے داغ تھا۔ کوئی پیدائشی نشان بھی نہیں تھا؟"

وہ بولی "ہاں۔ وہ بالکل بے داغ تھی۔"

"اس کے دونوں ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں تھیں۔ زیورات نہیں تھے؟"

"نہیں تھے۔ دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

اجل نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "کیا بات کرتی ہو۔ اپنا دایاں ہاتھ دیکھو۔"

یکلخت مرجانہ نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا۔ پھر اس کے حلق سے دبی دبی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی چھنگلی میں یعنی سب سے چھوٹی انگلی میں ایک چاندی کا چھلا تھا۔ جیسے چشم زدن میں بجلی کی روشنی ہوتی ہے اتنی ہی تیزی سے یاد آ گیا کہ اس قتل ہونے والی کی دائیں ہاتھ کی چھنگلی میں چاندی کا وہی چھلا تھا۔ میں نے کسی حد تک سمجھنے کے باوجود پوچھا "مس مرجانہ! کیا بات ہے؟"

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اجل نواز کو دیکھ رہی تھی پھر مجھے دیکھ کر بولی "میں نے دوبار جس عورت کو دیکھا' اس کی انگلی میں یہی چھلا تھا۔ وہ.........وہ میں ہوں' جسے دیکھ رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی کھسکا کر اجل نواز کے قریب ہو گئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی "تم کون ہو؟"

اس نے کہا "میں بتا چکا ہوں۔"

"تم نے جو بتایا ہے' وہ نہیں ہو اور جو نہیں بتا رہے ہو' وہ ہو۔ کیا آج سے پہلے تم کبھی ہماری حویلی میں گئے ہو؟ کبھی میرے والدین سے سامنا ہوا ہے؟"

"کبھی سامنا نہیں ہوا۔ کبھی حویلی میں بھی نہیں گیا اور آج پہلی بار تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

"پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میری امی کو بریسٹ کینسر تھا۔ آگہی مجھے حاصل ہوئی

اور معلوم تمہیں کہ قتل ہونے والی کی چھنگلی میں میرا یہی چھلا ہے اور یہی رہے گا۔"

وہ بولا "کوئی ضروری تو نہیں کہ جو ابھی ہے' وہ اگلے لمحے میں بھی رہے گا۔ کیا اپنا یہ چھلا مجھے دو گی؟"

"کس لیے دوں؟ کیوں مانگ رہے ہو؟"

"تم بے انتہا دولت مند ہو اور یہ ایک معمولی سا چاندی کا چھلا ہے۔ کسی بحث کے بغیر دے دو۔"

اس نے ایک بار اجل کو پھر دوسری بار چھلے کو دیکھا۔ اسے چھنگلی سے اتارنے لگی۔ وہ انگلی کے گوشت میں ذرا سا دھنسا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے نکلا۔ اس نے اجل کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر وہ چھلا رکھ دیا۔ اجل نے اسے لے کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی ایک ساعت پہلے جو تھا' وہ دوسری ساعت میں تمہارے پاس نہیں رہا۔ آگہی اپنی جگہ درست ہے۔ اس بے چاری چھلے والی کی موت ہے اور تم چھلے والی نہیں ہو۔"

مرجانہ کا چہرہ مسرتوں سے کھل گیا۔ وہ اپنی خالی انگلی کو سہلا رہی تھی اور بڑی عقیدت و محبت سے اجل کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا "کسی کے کہہ دینے سے یا دلاسا دینے سے موت کبھی نہیں ٹلتی۔ مگر خدا جانتا ہے کہ تمہارے ایسا کہہ دینے سے مجھے اپنی موت کے ٹل جانے کا یقین ہو گیا۔ تم کیا ہو اجل؟ میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ تمہاری اصلیت معلوم کر کے رہوں گی۔"

"میں اپنے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں' وہ ضرور بتاؤں گا۔ فی الحال یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ موت نہ آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شامت نہیں آئے گی۔ موت تو ایک دن آتی ہے' شامت آئے دن آتی رہتی ہے۔ شامت کیا ہے؟ موت کی سہیلی ہے۔ زندگی کے پاس آ کر بڑی اتراتی ہے۔ زبردستی آ کر گلے پڑ جاتی ہے۔ کبھی آسانی سے' کبھی مشکل سے پیچھا چھوڑتی ہے اور جب جاتی ہے تو موت کا اشارہ چھوڑ کر جاتی ہے۔"

مرجانہ نے کہا "بے شک' مجھے اشارہ مل گیا ہے۔ مجھے بھی مرنا ہی ہے لیکن میں جسے دیکھتی ہوں' وہ کوئی اور ہے' کیا وہ میری بہن فرزانہ ہو گی؟"

وہ بولا "قیاس آرائیاں کی جا سکتی ہیں۔ محتاط اندازے لگائے جا سکتے ہیں۔ آئندہ جو ہونے والا ہے' اس کے متعلق یقین سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تم کہہ سکتے ہو۔ تم نے میرے خاندان سے اور میرے حالات سے تعلق رکھنے والی ایسی باتیں بتائی ہیں جو میں نہیں جانتی تھی اور تم بالکل غیر اور اجنبی ہو کر بہت کچھ جانتے ہو۔"

"یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔ تمہاری طرح مجھے بھی آگہی حاصل ہوتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ تم آگہی شکستہ صورت میں پاتی ہو۔ میں مکمل صورت میں پاتا ہوں۔ میں ان واقعات کا تجزیہ کرلیتا ہوں جن کا تم نہیں کرسکتیں۔"

"لیکن تم میرے معاملات کو کیسے جانتے ہو؟"

"اگر میں کہوں کہ تم سے دلی لگاؤ ہے' تم سے گہرا ربط رکھتا ہوں تو تم شاید تم نہ مانو۔"

"میں یہ سن کر خوش ہو رہی ہوں کیونکہ مجھے تمہارے جیسے ساتھی کی ضرورت ہے۔ فرزانہ کی شادی کے تین ماہ بعد ہی میں نے بھی آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں بڑے آزمائشی مراحل سے گزر رہی ہوں۔ آج پہلی ملاقات میں تمہاری ذہانت اور فراست سے متاثر ہوگئی ہوں۔ تم نے میرے معاملات کی تہہ تک پہنچ کر ثابت کر دیا ہے کہ میرے بہت کام آسکتے ہو۔"

"تم ایسا سمجھتی ہو تو میں تمہارے کام آؤں گا۔"

"مگر اس سے پہلے تمہاری زندگی کے پچھلے اور موجودہ حالات کا مجھے علم ہونا چاہیے۔"

"تم فی الوقت اپنی کوٹھی میں جاؤ۔ میں آکر تمہیں بتادوں گا۔"

"تم میری کوٹھی میں ابھی میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ کیا یہاں ضروری کام ہے؟"

"ہاں اپنے رائٹر دوست سے تھوڑی سی گفتگو کروں گا۔ یہ وعدہ ہے کہ تمہارے وہاں پہنچتے ہی میں پہنچ جاؤں گا۔"

مرجانہ نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مجھ سے ملاقات ہونے کی خوشی ظاہر کی' میرا شکریہ ادا کیا پھر چلی گئی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ وہ شام کے چار بجے آئی تھی۔ بڑی طویل نشست رہی تھی۔ اس کے ساتھ معاملات ایسے پیچیدہ تھے کہ انہیں تفصیل سے سننا اور سمجھنا ضروری تھا اور یہ اندازہ تھا کہ معاملات اور زیادہ پیچیدہ ہوں گے۔ میں نے اجل سے کہا "تم میں نہ جانے کیسا سحر ہے' پہلے تو وہ تمہیں بے اختیار بار بار دیکھتی رہی۔ پھر زبان سے تسلیم بھی کیا کہ تم سے بے حد متاثر ہے۔"

"صرف مرجانہ کی بات نہ کرو۔ کیا تمہیں مجھ میں کشش محسوس نہیں ہو رہی ہے؟"

میں نے تسلیم کیا "بے شک' تمہاری طرف دل ایسا کھنچ رہا ہے جیسے میں لوہا ہوں اور تم مقناطیس۔"

"بالکل درست کہا۔ موت مقناطیس ہے۔ زندگی کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ زندگی سمجھ نہیں پاتی۔ ناسمجھی میں میری طرف یوں آتی رہتی ہے جیسے خواہش پکار رہی ہو اگرچہ کوئی میری خواہش نہیں کرتا لیکن باسی مٹھائی پر چڑھا ہوا چاندی کا ورق خواہش کو چمکاتا ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا اس کے ساتھ "فوراً" نہیں گئے۔ اس کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم کرنے کو رہ گئی ہیں۔"

"ہاں تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ وہ پچھلے والی عورت کون ہے؟"

میں نے کہا "اس سلسلے میں یقین کی حد تک اندازہ ہے کہ وہ بے چاری فرزانہ ہے کیونکہ آگہی اپنوں کے سلسلے میں یا اپنی ذات کے سلسلے میں ہوتی ہے۔ بچپن میں اس نے اپنی ماں اور پیدا ہو کر مرنے والے اپنے تین بھائیوں کو قبل از وقت مرتے دیکھا۔ اب وہ قتل کی جو واردات دیکھ رہی ہے۔ اس کا تعلق بھی اپنوں سے ہے۔ اس کے خاندان میں دو ہی بہنیں ہیں' تم نے مرجانہ کی انگلی سے چھلا نکال کر اسے واردات سے دور کر دیا۔ اب وہ بے چاری فرزانہ رہ گئی ہے۔"

وہ بولا "اب تم انسانی ہمدردی سے چاہو گے کہ فرزانہ پر ایسا ظلم نہ ہو۔"

"جو بھی صحیح معنوں میں انسان ہے' وہ ظاہر ہے ہمدردی کرے گا۔"

"آہ! میں انسان نہیں ہوں۔ میں درندہ بھی نہیں ہوں۔ قضا صفت ہوں' قدرت کے راستے پر چل رہا ہوں۔ جہاں حکمِ خداوندی ہوگا' وہاں کوئی حجت نہیں ہوگی۔ حکم کی تعمیل کروں گا پھر آگے بڑھ جاؤں گا۔"

"وہاں کے حالات بتاؤ۔ فرزانہ اپنے سسرال میں کیسی زندگی گزار رہی ہے؟"

"جیسے عوام دو بڑی سیاسی پارٹیوں کے درمیان زندگی گزارتے ہیں۔"

سردار جنید اور اس کا بیٹا حماد بہت زیادہ باراتی لے کر آئے تھے۔ یوں دلہا والے اپنی شان' اپنا حلقۂ اثر اور اپنے حمایتیوں کی تعداد دکھاتے ہیں۔ ان سے ووٹروں کی تعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ فرزانہ کو وہاں سے باجے گاجے اور درجنوں بندوقوں کی فائرنگ کے ساتھ ایسے لے گئے جیسے وہ پولنگ اسٹیشن سے کامیابی کی سند لے کر جا رہے ہوں۔ حماد کو اگرچہ خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ اپنے ایک مخالف امیدوار کی ایک کمزوری لے کر گھر آیا ہے لیکن وہ اپنی جیت پر نازاں ہونے کے باوجود بجھا بجھا سا تھا۔ اس کے ذہن پر مرجانہ چھائی ہوئی تھی۔ فرزانہ ایسی بُری بھی نہیں تھی۔ پھر دلہن کے روپ میں اچھی لگ رہی تھی لیکن اس نے بڑی بے دلی سے اسے اپنایا اور اپنانے کے دوران اس کے کانوں میں یہ

مطالبہ پھونکتا رہا کہ بیٹا ہونا چاہیے۔ بیٹا ہونا چاہیے۔ ہمارے خاندان میں پہلے سردار پیدا ہوتا ہے۔

حماد سالاری کے مشیر اسے سمجھاتے تھے کہ فرزانہ سے جتنے بیٹھے بن کر رہو گے' اتنا ہی اس کے باپ کو قائل کر سکو گے کہ تم اس کی بیٹی سے محبت کرنے والے شوہر اور سسر کے بے غرض داماد ہو۔ نہ تمہیں اب کوئی لالچ ہے اور نہ ہی سیاسی سمجھوتے کے وقت تم سسر کے سامنے لالچ دکھا کر ساحلی علاقوں سے زیادہ منافع طلب کرو گے۔

یوں بھی سردار حاکم علی کہنے لگا تھا کہ اب وہ بیٹے والا ہوگیا ہے۔ جنید اس کا داماد نہیں بیٹا ہے اور اس کے یہ جذبات آئندہ سیاسی حالات اور تعلقات کو مزید خوش گوار بنانے والے تھے۔ پھر وہ وقت آیا کہ الیکشن کی تاریخ مقرر ہوئی اور امیدوار کاغذاتِ نامزدگی داخل کرانے لگے تو انکشاف ہوا کہ مرجانہ قومی اسمبلی کے لیے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑی ہو رہی ہے۔ اخبارات میں اس کا نام اور اس کی زندگی کے کچھ حالات شائع ہونے لگے تھے۔ حماد نے اخبار پڑھتے ہی ناگواری سے کہا "یہ کیا بکواس ہے؟ میری بیوی کے خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی سیاست میں مردوں کے درمیان آیا کرے گی۔"

اس کے باپ جنید اور پارٹی کے لیڈر نے کہا "یہ کوئی اعتراض کا پہلو نہیں ہے۔ خواتین سیاست میں حصہ لیتی ہیں۔"

"بے شک خواتین سیاست میں حصہ لیتی ہیں لیکن ہمارے ملک کی سیاست میں یہ کچھ مناسب نہیں ہے۔"

پارٹی لیڈر نے کہا "یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ ہم عوام سے کہتے ہیں' نیک کردار اور باعمل امیدوار کو ووٹ دو۔ ایک ایسی کنواری لڑکی کے کردار کو کون نیک اور بااعتماد کہے گا جو ہمیشہ گھر کی چار دیواری سے دور شہر میں رہا کرتی ہے۔ نہ جانے کیسے کیسے لوگوں سے اس کے تعلقات ہیں۔ اس کے خلاف بڑے اسکینڈلز بنائے جاسکتے ہیں۔"

سردار جنید نے کہا "یہ دل کو بہلانے والی باتیں ہیں۔ یہ اسکینڈلز اور بدنامیاں سیاست دانوں کا کیا بگاڑ لیتی ہیں۔ اس میدان میں جو جتنا بدنام ہوتا ہے۔ اتنا ہی اس کا نام اچھلتا ہے اور اتنی ہی زیادہ کامیابی اسے حاصل ہوتی ہے۔ مرجانہ کو اس کے علاقے سے بہت ہی نمایاں کامیابی حاصل ہوگی۔ بیلہ کے غریب ہاری' مچھیرے اور مقروض افراد کے تمام ووٹ ان باپ بیٹی کو ملیں گے۔"

حماد نے کہا "ان باپ بیٹی نے ہمیں بے وقوف بنایا ہے۔ حاکم علی نے کھوٹا سکہ مجھے

تھما دیا اور سیاست میں چلنے والی بیٹی کو اپنے پاس رکھا ہے۔ اب وہ قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں میں ہوں گے' ان کی دو سیٹیں پکی ہیں۔"

پارٹی لیڈر نے کہا "خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ ہماری پوری پارٹی ہے۔ ہمارے کئی امیدوار جیتیں گے۔ ان کا پلڑا صرف اس لیے بھاری رہے گا کہ دونوں آزاد امیدوار رہ کر زبردست بارگیننگ کر سکیں گے۔ ہم ایسا وقت نہیں آنے دیں گے۔"

سردار جنید نے کہا "حاکم علی کے مشیر زبردست ہیں۔ وہ بڑی سوچی سمجھی چالیں چل رہا ہے۔ اگر میں کوئی جوابی چال نہ چل سکا تو دونوں میں سے کسی ایک کو لڑھکا دوں گا۔ باپ کو یا بیٹی کو۔"

بعد میں باپ بیٹے نے سوچا کہ مرجانہ کو لڑھکا دیا جائے۔ وہ مرجائے گی تو بوڑھے سردار حاکم علی کی ایک ہی بیٹی فرزانہ اس کی دولت' جائداد اور ساحلی منافعوں کی مالک ہوگی۔ یوں سب کچھ حماد سالاری کا ہوگا۔ مرجانہ کی موت سے باپ کی کمر ایسے ٹوٹے گی کہ پھر وہ سیاست کا رخ نہیں کرے گا۔

فیصلے کے اس موڑ پر آکر حماد نے سوچا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ مرجانہ نے سیکیورٹی کے ایسے انتظامات کیوں کئے ہیں۔ وہ بہت پہلے سے سیاست میں آنے کا منصوبہ بنا چکی تھی۔ اپنے لیے خطرات محسوس کر رہی تھی۔ اس وقت میں سمجھ نہ سکا کہ اس کے سیکیورٹی گارڈ نے مجھے کیوں چیک کیا اور میرا ہتھیار ضبط کرنے کے بعد مرجانہ سے ملنے کی اجازت دی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھ سے ملنے سے پہلے ہی میرے ارادے سمجھ گئی تھی۔

باپ نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟ تم کسی جھگڑے میں نہ پڑنا۔ میں اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔"

"سردار بابا! بہت مشکل ہے۔ وہ بڑے سخت حفاظتی انتظامات میں رہتی ہے۔" بیٹے نے باپ کو بتایا کہ وہ کیسے طمطراق سے شاہانہ طرز کی زندگی گزارتی ہے۔ کوئی پرندہ بھی آجائے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے۔ اس پر قاتلانہ حملہ بہت ہی مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن ہے۔

سردار جنید نے کہا "ناممکن کو تیری بیوی فرزانہ ممکن بنا دے گی۔ اس کے پاؤں بھاری ہیں۔ وہ ماں بننے والی ہے۔ تُو اپنے سسر سے کہہ سکتا ہے کہ اس کے میکے والے گود بھرائی کی رسمیں پوری کریں۔ ایسے وقت کیا مرجانہ شہر سے نہیں آئے گی؟ کیا حویلی

میں عورتوں کے درمیان سیکیورٹی گارڈز کو لے کر آئے گی؟"

"آپ درست کہتے ہیں۔ وہاں صرف عورتیں ہوں گی۔ اس کا کوئی محافظ ساتھ نہیں ہوگا۔ اگر وہ اپنی ہی حویلی میں کھانے پینے کی کوئی زہر آلود چیز استعمال کرے گی اور دم توڑے گی تو ہم پر کوئی شبہ نہیں کرے گا۔"

یہ طے پا گیا کہ اسی ایک ہفتے کے اندر فرزانہ میکے جائے گی۔ وہاں گود بھرائی کی رسم ادا ہوگی تو مرجانہ وہاں ضرور آئے گی۔ میں نے اجل سے پوچھا "کیا وہ جائے گی؟"

"ہاں وہ بہن کی گود میں بچہ اور اس کی خوشیاں دیکھنا چاہتی ہے اس لیے وہاں جائے گی۔ کل شام کو گود بھرائی کی رسم ادا ہونے والی ہے۔" وہ اٹھ کر بولا "میں اب مرجانہ کے پاس جا رہا ہوں۔ رات کو کسی وقت تمہارے گھر آؤں گا۔"

میں نے گھبرا کر کہا "پلیز! میرے گھر نہ آنا۔ تم سے گھر کی دوستی مہنگی پڑے گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "کوئی نہیں چاہتا کہ میں اس کے بیوی بچوں کے قریب جاؤں۔ کوئی بات نہیں' ہماری ملاقات باہر ہوا کرے گی۔ یا پھر محض آواز کے ذریعے رابطہ رکھوں گا۔"

"رابطہ برابر رکھا کرو۔ مرجانہ زندگی کے اہم موڑ سے گزرنے والی ہے۔"

وہ مسکرا کر بولا "زندگی کے نہیں' موت کے ایک موڑ سے کترانے والی ہے۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ میرے اندر ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ سرد لہر موت کا پہلا تعارف ہوتی ہے۔ اجل نے مجھے یقین دلایا تھا کہ ابھی میری تھوڑی سی زندگی ہے اس لیے مطمئن تھا' اس نے کہا "تمہاری دوستی کا شکریہ! تم سے ہاتھ ملا کر مجھے حرارت ملتی ہے۔" وہ چلا گیا۔ میں نے رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے سوچا' اجل نامہ کے عنوان سے جو باتیں لکھنے چلا ہوں' ان کا تعلق حیات سے ہے۔ زندگی کی ایسی جدوجہد سے ہے' جسے انسان آخری سانس تک جاری رکھتا ہے۔ دیکھا جائے تو میں حیات نامہ لکھ رہا تھا اور میرا دوست اس پر اجل نامہ کی چھاپ لگاتا جا رہا تھا۔

میرے سامنے مرجانہ کی داستانِ حیات تھی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ایک مصنف کی حیثیت سے لکھتا کہ کل شام مرجانہ گود بھرائی کی تقریب میں جائے گی۔ پھر اس کی طرف آنے والی موت فرزانہ کی طرف پلٹ جائے گی۔ اگر میں ایسی سچویشن لکھ دوں تو قارئین کے لیے بڑا ہی ڈرامائی انداز پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ مرجانہ کو جو آگہی مل رہی ہے' اس کے پیشِ نظر موت کو رخ بدل کر فرزانہ کی طرف جانا چاہیے لیکن کاتبِ تقدیر جو داستانیں مقدر کے حوالوں سے رقم کرتا ہے' وہ ہم جیسے مصنف نہیں کرپاتے۔ اپنے قلم

کی نوک سے انہیں جہاں چاہتے ہیں' وہاں گھما دیتے ہیں۔ مرجانہ اور فرزانہ حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے کردار تھے۔ میں بستر پر کروٹیں بدل بدل کر اپنے مزاج اور اسٹائل کے مطابق انہیں کوئی اچھا برا انجام نہیں دے سکتا تھا۔

☆========☆========☆

مرجانہ نے کان سے ریسیور لگا کر پوچھا "ہیلو' کون ہے؟"

"میں ہوں فرزانہ۔ تم تو کبھی فون پر بھی میری خیریت دریافت نہیں کرتی ہو۔"

"میری پیاری بہنا! تمہاری خیریت حاکم بابا سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ تمہیں تو پتا ہے' میں آج کل سیاسی معاملات میں مصروف رہتی ہوں۔"

"میں تمہاری مصروفیات کو نہیں جاننا چاہتی۔ کل تم نہیں آؤ گی تو مجھ پر مصیبت آجائے گی۔"

"ایسی کیا مصیبت آجائے گی؟ تم خیریت سے تو ہونا؟"

"بس جی رہی ہوں۔ پہلی رات سے اب تک یہی دھمکی دیتے ہیں کہ میں نے بیٹا پیدا نہ کیا تو مجھے طلاق دے کر دوسری سے بیٹا پیدا کرائیں گے۔"

"یہ سرداروں کی جہالت اور صدیوں کا روایتی مطالبہ ہے کہ سرداری نظام رائج رکھنے کے لیے بیٹا ہی پیدا ہونا چاہیے۔ تم اسے دھمکیاں دینے دو۔ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔ اللہ نے چاہا تو تم ایک بیٹے کو جنم دوگی۔"

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ کل تم آرہی ہو نا؟ حماد کئی بار کہہ چکے ہیں کہ میں تمہیں فون پر ضرور آنے کے لیے کہوں۔"

"میری بہن کی پہلی خوشی ہے۔ حماد بار بار نہ بھی کہتے تب بھی آتی۔ اب بھی آؤں گی۔ کل شام پہنچ جاؤں گی۔"

"میں جانتی ہوں تم ضرور آؤ گی۔ پھر بھی کہہ رہی ہوں' آندھی طوفان آئے تب بھی چلی آنا۔"

"میری بہن! بات کیا ہے؟ آخر اتنا اصرار کیوں کر رہی ہو؟" فون پر تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر مرجانہ نے اس کی سسکیاں سنیں' پوچھا "میری جان! فرزانہ! کیا تم رو رہی ہو؟ کیا بات ہے؟ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔"

وہ رو رو کر بولی "فون پر کیا کہوں؟ تم آؤ گی تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں گی۔"

"آنسو پونچھ لو۔ میں کل صبح ہی یہاں سے چل پڑوں گی۔ دوپہر کا کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گی اور تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک بہن کو تسلیاں دیتی رہی پھر رابطہ ختم کر دیا۔ ریسیور رکھ کر گھڑی کو دیکھ کر بڑبڑائی ''اتنی دیر ہو گئی۔ اجل نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔''

''آ گیا۔ میں تو تمہارے پاس ہوں۔''

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ پتا نہیں چلا کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ وہ سامنے نہیں تھا۔ سر گھما کر دیکھا' وہ دائیں بائیں بھی نظر نہیں آیا۔ اس کی آواز پھر آئی۔ ''ابھی نظر نہیں آؤں گا۔ پہلے تمہیں بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔ تم نے کئی بار میرے بارے میں سوال کیا۔ میں نے ٹال دیا۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھ رہی تھی اور اس کی آواز سن رہی تھی۔ وہ بولا ''اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کرنے والے فرشتوں میں سے ایک ہوں۔ ایک فرشتے کی حیثیت سے انسانی آنکھوں کو نظر نہیں آتا۔ تم میری آواز سے مجھے پہچان رہی ہو کہ میں اجل ہوں۔ حالانکہ اجل بے آواز ہوتی ہے۔ کسی آہٹ کے بغیر آتی ہے اور زندگی کو ساتھ لے جاتی ہے۔''

مرجانہ نے خلا میں تکتے ہوئے پوچھا ''کیا تم مجھے نادان بچی سمجھ کر ڈرا رہے ہو؟''

''اسی لیے سامنے نہیں آ رہا ہوں کہ ڈر جاؤ یا پھر مان جاؤ کہ میں سچ مچ اجل ہوں۔''

''میں نہیں ڈرتی۔ ایک دن تو مرنا ہی ہے لیکن موت نظر نہیں آتی پھر تم رائٹر کے دفتر میں کیسے نظر آ رہے تھے؟''

''موت نظر نہیں آتی' سمجھ میں آتی ہے۔ دراصل موت کا دوسرا نام غلطی ہے۔ آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر اپنی تمام صلاحیتوں سے اور اوزاروں سے مریضوں کو موت سے بچا لیتا ہے۔ وہی ڈاکٹر ایک ذرا سی غلطی کرے تو مریض مر جاتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ آدمی اپنی غلطی سے مرے' وہ زیادہ تر دوسروں کی غلطیوں سے مر جاتا ہے۔ میری صورت نظر آتی ہے' کبھی چٹکی میں زہر ہو تو وہ میں ہوں۔ رائفل میں بلٹ ہو تو وہ میں ہوں۔ میری پہلی اور آخری پہچان انسان کی کمینگی میں ہے۔ پہلے وہ اپنی کمینگی کی آنچ میں مجھے پکاتا ہے پھر جو زہریلی کھچڑی تیار ہو جائے' اسے کسی مطلوبہ شخص کو کھلا دیتا ہے۔ میں ان کی بات نہیں کرتا' جو طبعی عمر گزارتے ہیں' پھر جو اللہ تعالیٰ سے لے کر آتے ہیں' اسے اس کے سپرد کرکے خاموشی سے' آرام سے اور عزت سے دنیا چھوڑ دیتے ہیں۔ پوری دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہیں' جو قدرتی طور پر عزت سے مرتے ہیں یا شہادت کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے میں ان کی بات نہیں کرتا۔ ان دنوں میرا تعلق صرف ان سے ہے جو حرام موت یا بے موت مرتے ہیں۔ یہ بات گرہ میں باندھ لو' جیسی زندگی خدا

کو پسند ہے' ویسی نہ گزاری جائے تو وہ گزرنے والا طبعی موت کی راہ سے ہٹ کر حرام موت کی سمت سفر کرتا رہتا ہے۔''

مرجانہ نے پوچھا ''تم میرے پاس آئے ہو۔ اس کا مطلب ہے' میری موت آ گئی ہے؟''

''یاد کرو' میں خود نہیں آیا۔ تم نے خود اپنی اس کوٹھی میں آنے کو کہا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ موت خود نہیں آتی۔ آدمی انجانے میں اسے بلا لیتا ہے۔''

''بات تو وہی ہوئی نا؟ میری موت آئی تھی' میں نے انجانے میں تمہیں بلا لیا۔''

''اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ موت کو بلاتے رہو' وہ نہیں آتی۔ خودکشی بھی ناکام ہو جاتی ہے۔ میں ابھی اجل بن کر نہیں' دوست بن کر آیا ہوں۔ اگر تمہیں دوستی منظور ہوگی تو میں اس رائٹر کے دوست کی انسانی شکل میں آؤں گا۔ ورنہ کہو تو چلا جاتا ہوں۔''

وہ بولی ''دوستی اس سے کی جاتی ہے' جس سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ تم آ جاؤ۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور وہ آ گیا۔ وہ سحر زدہ سی ہو کر بولی ''واقعی اجل میں بے پناہ کشش ہوتی ہے۔ زندگی دانستہ یا نادانستہ کھنچی چلی جاتی ہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ پہلی ہی نظر سے تمہاری طرف مائل ہو گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے آگے بڑھ کر تمہارے اندر سما جاؤں۔ مگر ابھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔''

وہ مسکراتا ہوا ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گیا' اس نے پوچھا ''تم اندر کیسے آئے۔ کیا باہر سیکیورٹی گارڈز نہیں ہیں؟''

''باہر تمہارے سخت حفاظتی انتظامات ہیں لیکن میں جسے چاہوں' نظر آتا ہوں۔ یہ نہیں چاہتا تھا کہ گارڈز مجھے دیکھیں اور خواہ مخواہ وقت ضائع کریں۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ خواب گاہ کا دروازہ مقفل تھا۔ میں اندر کیسے آ گیا؟''

وہ مسکرا کر بولی ''نہیں پوچھوں گی' یہ خواب گاہ کیا چیز ہے؟ تم تو بدن کی تجوری سے سانسیں نکال کر لے جاتے ہو۔''

وہ اس کے سامنے ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئی پھر بولی ''تم نے میری امی اور تینوں بھائیوں کی موت کے متعلق سب کچھ درست کہا۔ پلیز' میری بہن فرزانہ کے متعلق بتاؤ۔''

''مجھ سے کوئی ایسی بات نہ پوچھو' جس کا تعلق موت سے ہو۔ کچھ پوچھنا ہی غلط ہے کیونکہ وہ تو اٹل ہے' اسے جس طریقہ کار سے آنا ہے' وہ آئے گی۔''

''یعنی جو آگہی ملی ہے' وہ ظہور پذیر ہوگی۔''

"آگہی ایک مکمل اطلاع نہیں ہے۔ ایک اشارہ ہے۔ ایک ایسی اطلاع ہے جس میں
ترتیب نہیں' انتشار ہوتا ہے۔ جو آگہی ملتی ہے' ویسا ہوتا ہے لیکن بالکل ویسا ہی نہیں
ہوتا۔ واقعے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ مثلاً تم نے قبل از وقت دیکھا تھا کہ تمہاری ا
جس ہتھیار سے اپنے بچے کو ہلاک کر رہی ہیں' اسی ہتھیار سے خود ہلاک ہو رہی ہیں۔ مم
نے جب تک وضاحت نہیں کی' تب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہاری والدہ نے نادانستگ
میں بریسٹ کینسر سے بچے کو بھی ہلاک کیا اور خود بھی اسی بیماری میں ماری گئیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میری بہن کے ساتھ بالکل وہی نہیں ہوگا' جو میں دیک
رہی ہوں؟"

"ہاں بالکل وہی نہیں ہوگا۔ مگر وہی ہوگا۔ قتل تو ہوگا مگر قتل کی نوعیت دوسر
ہوگی۔"

"ابھی اس کا فون آیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی' وہ رو رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کن
حالات سے گزر رہی ہے؟"

"وہ ذہنی عذاب سے گزر رہی ہے اور اس کی وجہ تم ہو۔ تم حماد کے حواس پر چھا
ہو۔ وہ تمہیں حاصل نہ کرسکا۔ اس لیے پہلی رات سے اسے حاصل کرتے ہوئے یہ کہ
آرہا ہے کہ وہ مرجانہ کو حاصل کر رہا ہے۔ وہ بے چاری خود کو اپنے شوہر کے سپرد کرت
وقت اپنی ذات میں صفر ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ تم لے لیتی ہو۔"

وہ منہ پھیر کر بولی "ایسی بے حیائی کی باتیں نہ کرو۔ مجھے غصہ آرہا ہے۔ میں حماد ک
گولی ماردوں گی۔ بلا سے میری بہن بیوہ ہو جائے۔"

"جو بیوی ہوتی ہے' وہ بیوہ ہوتی ہے۔ اس نے تو سہاگ رات کو فرزانہ کا گھونگھٹ
اٹھا کر اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ پھر بیوی کیسی؟ نکاح قبول کراتے وقت قاضی نے پوچھ
فرزانہ بیگم سے نکاح قبول ہے؟ اس نے دل میں کہا' مرجانہ بیگم سے نکاح قبول ہے۔ آخ
کے دو الفاظ اس نے بلند آواز سے ادا کیے۔ اس نے فرزانہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کے
سامنے گھونگھٹ میں آیا کرے۔ جب وہ خواب گاہ میں آتی ہے تو وہ لائٹ آف کر د
ہے۔ پھر سیج پر جو آتی ہے' وہ اس کے لیے مرجانہ ہوتی ہے۔"

مرجانہ مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ آندھی چل رہی تھی کہ وہ بہ
کی جگہ اسے سوچ اور سمجھ رہا ہے۔ وہ جھنجلا کر بولی "کیا مرد اپنی بدنیتی کے ساتھ اس قد
ذلیل اور کمینہ ہو جاتا ہے؟"

"بات مرد کی نہیں صرف بدنیتی اور انتقام کی بات ہے۔ بعض عورتیں بھی بدن

کے اندھیرے میں شوہر کی جگہ کسی اور کو دیکھتی ہیں۔ ہمارا دکھانا کچھ ہے اور کرنا کچھ ہے۔
یہ ایسا دور ہے کہ آدمی لغت کو جزدان میں لپیٹ کر قرآن مجید کی قسم کھاتا ہے۔ جب اتنا
بڑا دھوکا دیتے وقت خوفِ خدا نہیں ہوتا تو پھر ایک فرزانہ کو تاریکی کے غلاف میں چھپا کر
کسی مرجانہ پر شب خون مارنے سے اسے کیا شرم آئے گی۔"

"وہ میری بہن سے جو زیادتیاں کر رہا ہے' میں ان کا انتقام ضرور لوں گی۔ اسے اپنی
بہن کی طرف جھکاؤں گی یا پھر اسے جینے نہیں دوں گی۔"

"ہاں تم کچھ نہ کچھ تو ضرور کرو گی مگر اس کے لیے صبر و تحمل ضروری ہے۔"

"وہ کم بخت اسے دھمکیاں دے رہا ہے کہ بیٹا پیدا کرنا ہے۔ کیا بیٹا پیدا کرنا کسی ماں
کے اختیار میں ہوتا ہے؟"

"جو کچھ ہے' اللہ کے اختیار میں ہے۔ کوئی اور نہیں جانتا کہ کیا پیدا ہونے والا ہے؟
اور کب پیدا ہونے والا ہے؟ اور کہاں پیدا ہونے اور کہاں مرنے والا ہے؟

"اس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہی بارش برساتا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ
ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے۔ کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے
والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین پر اس کی موت آنی ہے۔ اللہ سب
کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔" (سورۃ لقمان ۳۱ آیت ۳۴)۔

مرجانہ سر جھکائے سنتی رہی۔ پھر بولی "اللہ تعالیٰ نے ہمیں ذہانت دی ہے کہ ہم
ذہانت سے تدبیر کریں اور ظالم کو ظلم کرنے سے روکیں۔ اجل! تم بہت کچھ جانتے
ہو......... کچھ ایسی باتیں بھی جان لیتے ہو' جو عام لوگ نہیں جان پاتے۔ ہمارے درمیان
جو دوستی قائم ہو رہی ہے' میں اس کا واسطہ دیتی ہوں' فرزانہ کے لیے کچھ کرو۔"

"انسانی زندگی میں سو طرح کے صدمات ہوتے ہیں۔ فرزانہ کو ایک ہی صدمہ ہے
کہ شوہر اس کی ذات اور شخصیت کے ساتھ اسے قبول نہیں کر رہا ہے۔ یہ اس کی ذاتی
زندگی کا ایک صدمہ ہے' اسے برداشت کرنے دو۔"

"تمہارا مشورہ یہ ہے کہ حماد کو ڈھیل دی جائے؟"

"ڈھیل تمہیں بھی مل رہی ہے۔ تمہارے باپ کو بھی مل رہی ہے۔ کیونکہ تم سب
نے مل کر فرزانہ کو سیاست کی بھٹی میں جھونکا ہے۔ تم سب کی نظروں میں سپات بندر اور
میلان بندر کے ساحلی علاقے زیادہ اہم ہیں۔ اس کھیل میں فرزانہ کی اہمیت صرف جذباتی
ہے۔"

"تم مجھے اور میرے بابا کو طعنے دے رہے ہو لیکن میں برا نہیں مانوں گی۔ کیونکہ یہ

سچائی ہے لیکن سیاست کرنے والوں کے دلوں میں بھی جذبات ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بھ بہنوں اور بچوں کے لیے بے چین ہوتے ہیں۔ میں بھی اسی طرح فرزانہ کے لیے چین ہوں۔"

"فرزانہ کو اپنے حصے کی زندگی گزارنے دو۔ تم اس سے جتنی دور رہوگی' ایک اتنی ہی شدت سے اس پر ہونے والے مظالم کا حساب لے سکوگی۔"

"لیکن میں اس سے دور تو نہیں رہوں گی۔ کل اس سے ملنے جا رہی ہوں۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ اس سے ملنے جا رہی ہو۔ ابھی میں نے ایک آیت سنـ تھی' جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کی موت آنی ہے۔ جس سرز میں تم بہن سے ملنے جاؤ گی' وہاں تمہاری موت کا اہتمام ہو چکا ہے۔ تمہیں اس سازش خبر نہیں تھی اور تمہیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ کل تم یہاں سے وہاں جانے والی ہو نہیں۔"

"تمہیں خبر ہے۔ مگر تم کیسے دوست ہو؟ میری پریشانی میں اضافہ کر رہے ہو؟"

"انسان کو پریشانیوں اور خوف و ہراس سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ا آئندہ کا علم نہیں دیا۔ تم غور کرو' تمہیں علم آگہی کی تھوڑی سی جھلک مل جاتی ہے تو کـ پریشانی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مجھے دوستی کا واسطہ دے کر مستقبل کی باتیں نہ پوچھو۔ تم بہ سے ملنے کے لیے بے چین ہو۔ تم وہاں جانے والی ہو۔ ایک دوست کی حیثیت سے مشو ہے' ضرور جاؤ۔"

وہ سوچنے لگی "میں ہفتوں اور مہینوں کے پروگرام پہلے سے بناتی ہوں۔ ہر آ والے کل کی مصروفیات میری نوٹ بک میں درج ہوتی ہیں اور میں ان کے مطا مصروف رہا کرتی ہوں۔ کبھی کبھی مصروفیات میں تبدیلیاں ہو جاتی ہیں لیکن کل مصروف رہنے کے لیے نوٹ بک میں جو کچھ لکھا ہے' وہ کاتب تقدیر کی تحریر سے مختلف ہے۔ کا میں ۔ندہ واپس آنے کے لیے جاؤں گی مگر وہاں موت لکھی جا رہی ہے۔" وہ اجل ـ بولی "میں نے اپنی سلامتی کے لیے سیکیورٹی گارڈز رکھے ہیں لیکن موت کا فرشتہ خود م محافظ بن جائے تو کوئی دشمن ہلاک نہیں کر سکے گا۔"

اجل نے ہنستے ہوئے کہا "میں تمہارا محافظ بن کر نہ رہوں' تب بھی کوئی تمہیـ ہلاک نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اجل تو میں ہوں۔ میں ہی تمہاری روح قبض کروں گا' جب بھی حکم ہو جائے۔"

"جب وقت آئے گا' تب ایسا کرو گے۔ اس وقت تک کے لیے میرے ساتھی' میرے ہم سفر بن جاؤ۔ مجھے محض ایک محافظ ہی کی نہیں' ایک ذہین مشیر کی بھی ضرورت ہے۔ تم جو مشورے دو گے' میں ان پر عمل کر کے مخالفین پر بھاری پڑوں گی۔ میں تمہاری ذہانت کے سہارے سیاست دانوں کی نیندیں حرام کردوں گی۔"

"تم بہت کچھ کر سکو گی۔ مگر میرے تمام مشوروں پر عمل نہیں کر سکو گی۔"

"کیوں نہیں کر سکوں گی؟"

"کیونکہ سیاست داں کامیابی کے پہلے مرحلے سے ہی اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ صرف اپنی خداداد ذہانت سے سیاسی ہیرو بن رہا ہے۔ جب وہ اقتدار سے نیچے گرتا ہے تو الزام دیتا ہے کہ مشیروں کے غلط مشوروں کے باعث تخت سے تختہ ہو گیا ہے۔"

"اس سلسلے میں بعد میں بحث ہوتی رہے گی۔ وعدہ کرو' آج سے بلکہ ابھی سے میرے ساتھ رہو گے؟"

"رہوں گا۔ مگر آتا جاتا رہوں گا۔ میرے کہیں جانے کے بعد بھی تنہا نہیں رہو گی۔ جیسے ہی آواز دو گی' اسی لمحے میں حاضر ہو جایا کروں گا۔"

وہ مطمئن ہو کر بستر پر آکر لیٹ گئی۔ اجل بھی آکر لیٹ گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی' پھر بولی "یہ کیا حرکت ہے؟"

"تم نے ہی کہا تھا' ساتھی بن جاؤ۔ ہم سفر بن جاؤ۔"

"مگر میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"میرا بھی وہ مطلب نہیں ہے' جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"تو پھر اس طرح میرے پاس لیٹنے کا مطلب کیا ہے؟"

اجل نے اس کی کلائی تھام لی۔ اسے گرفت میں لیا۔ گرفت بالکل ٹھنڈی تھی۔ تب یاد آیا کہ موت نے اسے پکڑا ہے اور یہ سمجھ میں آیا کہ موت زندگی کے ساتھ صرف رہتی نہیں ہے' ساتھ سوتی بھی ہے۔ وہ جو اس کے ساتھ اجل ہے' وہ نامحرم نہیں ہے۔ اس کی آخری سانس تک کا ساتھی ہے۔ بات واضح ہوئی تو وہ اس کے ساتھ سو گئی۔

دوسری صبح اجل نے ناشتا کرتے وقت پوچھا "کیا یہاں سے اپنے باڈی گارڈز لے کر جاؤ گی؟"

"ضرور لے جاؤں گی۔ اپنی امارت' شان و شوکت اور اونچے مرتبے کی نمائش ضروری ہوتی ہے۔"

"تو پھر میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا۔ یوں بھی آج دو گھنٹے کے بعد مجھے چ
روحوں کو ان کے جسموں سے نجات دلانی ہے۔"

"تم زبان سے پھر رہے ہو۔ تم نے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"میں وعدے پر قائم رہوں گا۔ جیسے ہی آواز دوگی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

وہ ناشتے کی میز پر مرجانہ کے ساتھ وقت گزار کر چلا گیا۔ کوٹھی کے باہر مرجانہ
پجیرو اور تمام باڈی گارڈز اسلحہ اور ضروری سامانِ سفر کے ساتھ موجود تھے۔ وہ
پجیرو میں آکر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد سفر شروع ہو گیا۔ وہاں سے بیلہ تک راستے جا
پہچانے تھے۔ وہ بارہا ان راستوں پر سفر کر چکی تھی۔ سفر میں تھوڑی بہت دشواریاں پیش
آتی ہیں، کبھی حادثے بھی پیش آتے ہیں۔ راہ چلتے کوئی واردات بھی ہو جاتی ہے۔ ا
کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ وہ تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کی تمام تیاریوں کے بعد س
کرتی تھی۔ اس روز حب کے علاقے سے گزرتے وقت معمول میں تبدیلی آگئی۔ پجیرو
ایک پہیہ اچانک دھماکے سے بیکار ہو گیا۔ صاف پتا چل گیا، کہیں سے گولی چلائی گئی ہے ا
گاڑی کو آگے جانے سے روک دیا گیا ہے۔

گاڑی ایک طرف ترچھی ہو کر رک گئی تھی۔ چاروں سیکیورٹی گارڈز پجیرو
چاروں کھڑکیوں سے دور تک کسی گولی چلانے والے کو متلاشی نظروں سے دیکھ رہے تھے
کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ تب وہ گاڑی سے باہر نکل کر دیکھنے پر مجبور ہوئے۔ یوں بھی گاڑ
کا پہیہ تبدیل کرنا ضروری تھا۔

ان کے باہر نکلتے ہی تڑاتڑ فائرنگ ہونے لگی۔ سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ دو گا
گولیاں کھا کر گرے اور مٹی میں لوٹنے لگے۔ مرجانہ دو سیٹوں کے درمیان لیٹ گئی تھی
ایک گولی ایک طرف کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر گھسی دوسری طرف کھڑکی کا شیشہ توڑ کر با
نکل گئی۔

مرجانہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ ایسے وقت اجل کی یاد آئی۔ اس نے پکارا

"اجل فوراً آؤ۔"

اس کا جواب سنائی دیا "گھبراؤ نہیں۔ تمہارے آس پاس ہوں۔ میں نے تم سے
تھا کہ دو گھنٹے کے بعد ذرا مصروف رہوں گا۔ کیونکہ چار روحوں کو ان کے جسموں
نجات دلانا ہے۔ تمہارے چار گارڈز ہیں۔ ان میں سے دو کی روحیں قبض کر چکا ہوں
ٹھہرو آتا ہوں۔ تیسرا بھی تڑپ رہا ہے۔ بے چارے کو سکون پہنچادوں۔" وہ چلا گیا
مرجانہ سر تھام کر سوچنے لگی "دوست بھی کیا خوب ہے۔ میرے چاروں گارڈز کی موت

پیشگی اطلاع دے گیا تھا۔ صرف تعداد بتائی تھی گارڈز کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا........"

اس کی آواز آئی "میں تمہارے پاس ہوں۔ اٹھ جاؤ اور سیٹ پر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارے چاروں وفادار کام آچکے ہیں۔"

"کیا تم چاہتے ہو، میرا بھی کام تمام ہو جائے؟ یہ گاڑی کے ٹوٹے ہوئے شیشے دیکھو۔ دشمن گاڑی کے اندر بھی گولیاں چلا رہے ہیں۔"

"جب تک اجل کا وقت نہیں ہوگا، تمہاری طرف کوئی گولی نہیں آئے گی۔"

کسی نے ذرا فاصلے سے للکار کر کہا "جو گاڑی میں رہ گئے ہیں، وہ باہر آجائیں ورنہ ہم دستی بم سے گاڑی اڑا دیں گے۔" وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ دس مسلح افراد نظر آئے۔ انہوں نے اپنی پگڑیوں کے ایک سرے سے اپنے منہ لپیٹ رکھے تھے۔ کسی جانے پہچانے چہرے کی شناخت نہیں ہو سکتی تھی۔ مرجانہ نے پوچھا "کیا تم لوگ تاوان حاصل کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہو؟"

سب خاموش تھے۔ سب کی گنوں کا رخ اس کی طرف تھا۔ دور سے ایک بڑی ویگن کار دھول اڑاتی آرہی تھی۔ وہ قریب آکر رک گئی۔ اس میں سے جو شخص باہر آیا۔ اس کا چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ اس نے ایک مسلح شخص کو حکم دیا "بی بی کا تمام سامان پجیرو سے نکال کر اس گاڑی میں رکھو۔"

مرجانہ نے پوچھا "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ مجھ سے معاملات طے کرو۔"

وہ بولا "گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں ایک غلام ہوں، معاملات آقا طے کرے گا۔"

"مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"وہاں لے جاؤں گا، جہاں یہ گاڑی جا کر رکے گی اور میں نہیں جانتا یہ کہاں رکے گی۔ مجھے اس سلسلے میں موبائل فون سے اطلاع ملتی رہے گی۔"

اسے اجل کی آواز سنائی دی "بحث سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

وہ گاڑی کے اندر جا کر بیٹھتی ہوئی بولی "تم کیسے دوست اور محافظ ہو؟ دشمنوں کے حوالے کر رہے ہو؟"

"بھئی میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں کوئی نقصان پہنچے، تب شکایت کرنا۔"

"کوئی نقصان پہنچنے کا انتظار کیوں کروں؟ تم اجل ہو۔ ان سب کو چشم زدن میں موت کے گھاٹ اتار سکتے ہو۔"

"ان میں سے کسی کی موت کا وقت نہیں آیا۔ میں وقتِ مقررہ سے پہلے کسی کو

ہلاک نہیں کرسکوں گا۔" وہ ویگن وہاں سے جانے لگی۔ مرجانہ درمیانی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے آگے پیچھے کی سیٹوں پر گن مین تھے۔ مرجانہ نے سوچا۔ میں نے اجل کی باتوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ کل رات ہی کہہ چکا تھا کہ تمہیں خبر نہیں کہ کل تم یہاں سے وہاں جاسکوگی یا نہیں؟ یعنی بہن سے ملاقات کرسکوں گی یا نہیں؟ اجل کی آواز سنائی دی "جب وقت گزر جاتا ہے' تب عقل آتی ہے کہ اگر ایسا نہ کرتے تو ایسا نہ ہوتا' ویسا ہوتا۔ میں کہتا ہوں' تم عقل سے کچھ بھی سوچتیں' یہی ہوتا جو ہو رہا ہے۔"

"آخر کیوں' ایسا ہو رہا ہے؟"

"اس لیے کہ حویلی میں تمہاری موت کا سامان ہو چکا ہے چونکہ ابھی تمہاری زندگی ہے اس لیے موت کا راستہ بدل گیا ہے۔ تم زندگی کی راہ پر جا رہی ہو۔"

"کیا میں یہ سمجھوں کہ مجھے اس گاڑی میں لے جانے والے دشمن نہیں ہیں۔ یہ تمہارے کارندے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔ میرا کوئی کارندہ نہیں ہے۔ یہ سب دشمن ہیں۔" اجل اسے اصل معاملات سمجھانے لگا قصہ یوں تھا کہ سردار جنید سالاری اور اس کے بیٹے حماد سالاری نے بڑا ٹھوس منصوبہ بنایا تھا کہ فرزانہ کے میکے میں گود بھرائی کی رسم ادا ہوگی۔ وہاں مرجانہ اپنی ہی حویلی میں آکر زہریلا کھانا کھائے گی تو اس کی ہلاکت کا شبہ سالاریوں پر نہیں کیا جائے گا۔ یوں سردار حاکم علی کی سیاسی حمایت اور اسمبلی کی ایک سیٹ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ داماد حماد اپنی بیوی فرزانہ کے حوالے سے حاکم علی کی دولت اور جائداد کا تنہا مالک ہوگا۔ اپنے ساحل میلان بندر کے علاوہ حاکم علی کے ساحل سپات بندر کا بھی مالک و مختار بن جائے گا۔ کسی شک و شبہے کے بغیر منصوبہ جامع اور ٹھوس تھا۔ حویلی میں ہونے والی تقریب میں مرجانہ کی موت لازمی ہوتی لیکن حماد پر مرجانہ کا جنون سوار تھا۔ وہ ایسا جنونی تھا کہ فرزانہ کو مرجانہ سمجھ کر وصول کرتا تھا۔ پھر بھی ناکامی و نامرادی پر تلملاتا تھا۔ اس کا سردار باپ اور سیاسی پارٹی کے لوگ اسے جذبات سے خالی اور سیاست سے بھرپور بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے پارٹی کے مفاد کے لیے فرزانہ کو اس کے پلے باندھ دیا تھا مگر اس دیوانے نے سوچا' مرجانہ زہریلا کھانا کھا کر مرجائے گی تو اس کا حسن و شباب مٹی میں مل جائے گا۔ وہ مرتے مرتے بھی اسے نہیں ملے گی۔ پھر کیوں نہ ایسی چال چلی جائے کہ پہلے دل بھر کے اسے حاصل کرلیا جائے۔ جب دل بھر جائے تو اسے مار کر پھینک دیا جائے۔

وہ اپنی عیاشی کی یہ بات اپنے سردار باپ سے نہیں کرسکتا تھا۔ باپ سیاست اور

ساحلی علاقوں کے مفادات کو خطرے میں ڈال کر اسے عیاشی کی اجازت نہ دیتا۔ اسی لیے حماد نے اپنے خاص مسلح وفاداروں کے ذریعے مرجانہ کے اغوا کا منصوبہ بنایا۔ اس کی دانست میں یہ منصوبہ بھی جامع اور ٹھوس تھا کیونکہ جب مرجانہ اغوا کی جارہی تھی تو اس وقت دونوں باپ بیٹے صبح سے سردار حاکم علی کے ساتھ اس کی حویلی میں تھے۔ شام کو ایک پولیس انسپکٹر نے یہ خبر سنائی کہ حب کے ایک ویران علاقے میں ایک پجیرو شکستہ حالت میں ملی ہے۔ چار مسلح گارڈز مُردہ پائے گئے ہیں۔ ڈیش بورڈ سے گاڑی کے کاغذات نکال کر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ وہ سردار حاکم علی کی بیٹی مرجانہ کی پجیرو ہے اور مرجانہ غائب ہے۔

سردار حاکم علی کا سر چکرا گیا۔ مرجانہ اپنے باپ کی جان تھی۔ وہ چکرا کر گر پڑا تھا۔ سردار جنید اور حماد اسے سنبھال رہے تھے اور تسلیاں دے رہے تھے کہ شاید مرجانہ شہر میں ہو۔ اغوا نہ کی گئی ہو۔۔ اگر ایسا ہوا ہوگا تو فوراً تاوان ادا کرکے اسے واپس لایا جائے گا۔ پھر بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ اسے واپس لانے کے لیے تجوری کا منہ کھول دیا گیا۔ کتنی ہی پولیس پارٹیاں اسے تلاش کرنے لگیں۔ دور دراز کے وڈیروں اور جاگیرداروں کے ذریعے ڈاکوؤں سے رابطہ کیا گیا۔ کھلی پیش کش کی گئی کہ تاوان کی رقم منہ مانگی لو اور لڑکی واپس کرو۔

سردار جنید نے کہا "برادر حاکم علی! مرجانہ کی تصاویر اخبارات میں شائع کراؤ اور ایک لاکھ روپے انعام رکھو۔ جو اسے ڈھونڈ کر لائے گا یا سراغ لگائے گا' اسے انعام دیا جائے گا۔"

حاکم علی نے کہا "وہ ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے نامزد ہو چکی ہے۔ اخبارات میں تصاویر شائع ہوں گی تو وہ بدنام ہو جائے گی۔ کسی مرد سیاست داں پر گولیاں چلائی جائیں یا اسے اغوا کیا جائے تو اسے اور زیادہ شہرت اور ہمدردی حاصل ہوتی ہے لیکن نوجوان کنواری لڑکی اخبارات کے ذریعے بدنام ہو جائے گی اور واپس آئے گی تو کوئی اسے بے داغ تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ اپنے سیاسی کیریئر کی ابتدا ہی سے داغ دار کہلائے گی۔"

سردار جنید اور حماد دونوں ہی چاہتے تھے کہ وہ داغدار کہلائے اور منہ چھپا کر حویلی میں بیٹھ جائے پھر ان کے لیے سیاسی میدان صاف ہو جائے اور دونوں ساحلوں پر سالاریوں کی حکمرانی قائم رہے۔ باپ اپنی بیٹی کی نیک نامی قائم رکھنے کے لیے پریس والوں سے یہ بات چھپا رہا تھا چونکہ اس علاقے سے باپ بیٹی دونوں ہی الیکشن میں حصہ لے رہے تھے اس لیے اخباری رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کی آمدورفت رہتی تھی۔ حاکم علی سے طرح

طرح کے سوالات کئے جارہے تھے۔ وہ سبھی سے ایک بات کہہ رہا تھا کہ مرجانہ خیریت سے ہے۔ اس کے چھ مسلح گارڈز تھے جن میں سے چار مارے گئے۔ باقی دو گارڈز اسے سلامتی سے لے آئے تھے چونکہ مرجانہ کے اعصاب متاثر ہوئے ہیں اس لیے وہ ڈاکٹروں کے مشوروں کے مطابق کچھ روز آرام کرنے کے لیے کہیں باہر چلی گئی ہے لیکن باپ بیٹے نے درپردہ چند رپورٹروں کی جیبیں گرم کردیں۔ انہیں حقیقت بتادی کہ مرجانہ کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ اغوا کرنے والوں کی طرف سے خاموشی ہے۔ وہ تاوان کی بات نہیں کر رہے ہیں جب بات ہوگی اور وہ واپس آئے گی تو پتا نہیں کیا کچھ گنوا کر آئے گی؟

فرزانہ جب دلہن بن کر حماد کے پاس آئی تھی تو اس کے البم میں مرجانہ کی کئی تصویریں تھیں۔ چند تصویریں یونیورسٹی کے لڑکوں کے ساتھ بھی تھیں۔ ایسی تصاویر اخبار والوں کو ان شرائط پر دی گئیں کہ ان لڑکوں سے اس کے ناجائز تعلقات کی اسٹوری شائع کی جائے گی اور یہ ظاہر نہیں ہوگا کہ وہ تمام تصاویر اور لواسکینڈلز باپ بیٹے کے ذریعے حاصل ہوئے ہیں۔ تیسرے ہی دن سے اخبارات میں مرجانہ کے متعلق دلوں کو گرما دینے والی اور جذبات کو بھڑکا دینے والی خبریں اور قیاس آرائیوں پر مبنی فیچر شائع ہونے لگے۔ ایک آدھ اخباری رپورٹر نے دعویٰ کیا کہ مرجانہ باہر کہیں نہیں گئی ہے۔ اسے کہیں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ شاید نو ماہ بعد منظرعام پر آئے گی یا الیکشن لڑنے کے فیصلے پر قائم رہے گی تو ایک آدھ ہفتے ہی میں اسقاط حمل کے بعد چلی آئے گی۔

ملک کے بڑے اور معتبراخبارات ایسی بے تکی خبریں کبھی شائع نہیں کرتے لیکن چھوٹے اخبارات اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے ایسی خبروں اور فیچرز کو بارہ مسالے کی چاٹ بنا کر شائع کرتے ہیں۔ ایسے اخبارات پڑھ کر حاکم علی پر پہلے سے زیادہ بڑھاپا چھا گیا۔ تین دن گزر چکے تھے اور مرجانہ کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ بوڑھا حاکم علی بڑے حوصلے سے بیٹی کی گم شدگی اور بدنامیاں برداشت کر رہا تھا۔ پھر ایک دن فرزانہ نے کہا "بابا! مرجانہ کی جو تصویریں اخبارات میں شائع ہوئی ہیں' وہ میرے البم سے چرائی گئی ہیں۔" بات سمجھ میں آنے لگی۔ حاکم علی نے سوچا' البم سے چوری کا الزام باپ بیٹے کو دینا مناسب نہیں ہے۔ وہ صاف کہہ دیں گے کہ انہوں نے فرزانہ کی البم کو کبھی ہاتھ لگایا تھا نہ ایسی تصویریں دیکھی تھیں۔ اگر ایسی تصویریں تھیں تو وہ فرزانہ کی بے پروائی اور پھوہڑپن سے کسی دشمن کے ہاتھ لگ گئی ہیں اور چونکہ فرزانہ ان کے گھر کی عزت ہے اس لیے وہ مرجانہ کی عزت اچھالنے کی حماقت نہیں کریں گے۔

حاکم علی کے مشیر نے کہا "باپ بیٹے نے موقعے سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ بی بی

مرجانہ طویل گمشدگی کے بعد جب بھی واپس آئیں گی' کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔ سیاست سے آؤٹ ہو جائیں گی۔"

مشیر حسین نے کہا "ہم اب بھی بگڑی ہوئی بات بنالیں گے۔ صرف ایک کام ہو جائے۔ بی بی جی واپس مل جائیں۔ تین دنوں کے بعد بھی کسی نے تاوان کی بات نہیں چلائی ہے' اس سے صاف ظاہر ہے کہ دشمن انہیں بدنام کرکے انتخاب سے پہلے ہی سیاست سے نکال رہے ہیں۔"

دوسرے مشیر نے کہا "ہم نے ایک بات پر پہلے توجہ نہیں دی۔ عموماً گود بھرائی کی رسم پہلے یا دوسرے مہینے میں ہوا کرتی ہے۔ حماد نے آٹھ ماہ بعد آپ سے اس رسم کا تقاضا کیوں کیا؟ کیا صرف اس لیے کہ مرجانہ بی بی شہر سے آئیں اور انہیں اٹھوا لیا جائے؟"

حاکم علی نے کہا "میں تم لوگوں کے مشوروں کے مطابق اپنی بیٹی وہاں بیاہ کر ایسا نقصان اٹھا رہا ہوں کہ نہ سیاست میں ذہن کام کر رہا ہے' نہ بدنامی سے بچنے کی صورت نظر آرہی ہے۔ پتا نہیں میری بیٹی کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟"

بیٹی خیریت سے تھی۔ اسے ایک پرانی سی حویلی میں قید کیا گیا تھا۔ حماد نے ادھر کے پولیس افسران کو سونے کی وردیاں پہنادی تھیں اس لیے وہ ادھر جانے سے پہلے سو جاتے تھے۔ یہ اندیشہ نہیں رہا تھا کہ ادھر مرجانہ کا کوئی حمایتی پہنچ پائے گا۔ جبکہ اس کا حمایتی اجل اس کے ساتھ تھا اور اسے یقین دلا رہا تھا کہ حماد اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

تیسرے دن مرجانہ کے پاس وہ تمام اخبارات پہنچائے گئے' جن میں اس کے اغوا ہونے کی خبروں کے علاوہ اس کے بوائے فرینڈز وغیرہ کے ساتھ تصاویر بھی شائع کی گئی تھیں اور اس کے کردار پر کیچڑ اچھالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ اس نے اخبارات پھینکتے ہوئے کہا "یہ سب کیا ہے اجل؟ تم نے کہا تھا' مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ کیا ایک کنواری لڑکی کی اس سے زیادہ رسوائی ہوسکتی ہے؟ کیا میرا سیاسی کیریئر تباہ نہیں ہو رہا ہے؟"

اس نے کہا "بہت کچھ ہو رہا ہے اور اس لیے ہو رہا ہے کہ وہ چالیں چل رہے ہیں۔ جوابی چالیں چلنے کی باری تمہاری بھی آئے گی۔ پھر تم ان کا تماشا دیکھو گی۔"

"یہ بتلاؤ کہ مجھے یہاں کب تک رہنا ہے؟ اور مجھے رہائی کیسے ملے گی؟"

"میں چاہوں تو ابھی یہاں سے نکال لے جاؤں لیکن مناسب یہ ہوگا کہ یہاں حماد آئے اور تم سے سامنا ہو۔ بعد میں اس کا نتیجہ اچھا نکلے گا۔"

"وہ یہاں کب آئے گا؟"

"مناسب موقعے کے انتظار میں ہے۔ تین دنوں سے تمہارے پاس آنے کے لیے بے چین ہو رہا ہے۔ اس عرصے میں وہ تمہارے باپ کو اور پریس والوں کو یہ تاثر دے چکا ہے کہ مرجانہ کے اغوا کی واردات میں ان باپ بیٹے کے ہاتھ صاف ہیں۔"

"یہ جگہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ آخر وہ کم بخت کب آئے گا؟"

"آرہا ہے' پہنچنے ہی والا ہے۔"

"تم میرے محافظ دوست ہو۔ کیا تم پسند کرو گے کہ وہ یہاں آکر مجھے ہاتھ لگائے؟"

"اسے آنے تو دو اور دیکھو کہ بندہ کیا سوچتا ہے اور اللہ کیا کرتا ہے۔"

باہر شور برپا ہوا کہ چھوٹے سردار تشریف لا رہے ہیں۔ اپنے آقا کی آمد پر اس کے تابعدار ہوائی فائرنگ کرتے ہیں۔ کبھی درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں اور کبھی باغ میں کھلے ہوئے پھولوں پر گولیاں چلاتے ہیں اور نشانہ بازی میں مہارت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ پرانی حویلی کے باغ میں حماد کی کار آکر رکی تو اس کے دس عدد مسلح وفاداروں نے بھی فائرنگ کی۔ اپنی اپنی نشانہ بازی کا مظاہرہ کیا۔ اجل نے اپنی سہیلی شامت سے کہا "کچھ کرو۔"

شامت نے ایک وفادار کا ہاتھ بہکا دیا۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی حماد کی طرف گئی پھر اس کی ایک ران میں پیوست ہوگئی۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخ مار کر لڑکھڑایا۔ کار سے ٹکرایا۔ پھر زمین پر گر پڑا۔

موت سے پہلے شامت آتی ہے۔ چونکہ حماد کے مقدر میں موت نہیں تھی اس لیے شامت آئی تھی۔ شامت کی عملی صفات یہ ہیں کہ وہ بیک وقت کئی طرف سے آتی ہے۔ گولی چلانے والے کی جو شامت آئی اور بعد میں اسے الٹا لٹکا کر طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں' وہ ایک الگ سی بات ہے۔ بات تو حماد کی ہو رہی ہے۔ شامت اگر چاہتی تو بلٹ کی صورت میں جسم کے کسی دوسرے حصے کو زخمی کرکے گزر جاتی۔ مگر وہ گلے پڑ گئی۔ ران کے دبیز گوشت میں پیوست ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں یہ شامت آئی کہ وہ بلٹ آپریشن کے بغیر نہیں نکل سکتا تھا۔ آپریشن کے سلسلے میں یہ شامت آئی کہ ادھر میلوں دور تک اطراف میں کوئی ایسا اسپتال نہیں تھا' جہاں آپریشن کرنے والا کوئی سرجن ہو۔ اس کے وفادار اسے اٹھا کر حویلی کے ایک کمرے میں لے آئے تھے۔ وہاں معمولی زخموں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے صرف ایک فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا اور کہہ رہا تھا "میں مرجاؤں گا۔ ڈاکٹر کو بلاؤ' جلدی بلاؤ۔"

ایک وفادار نے کہا "مالک! سب سے قریبی شہر سکھر ہے' جو اسی میل دور ہے۔ اتنی دور جانے میں چھ گھنٹے ضرور لگیں گے۔ آپ کو ایسی حالت میں لے جائیں گے تو جنگل کے ناہموار راستوں میں زخم کی تکلیف بڑھتی جائے گی۔"

وہ غصے اور تکلیف سے دہاڑتا ہوا بولا "سور کے بچو! کچھ بھی کرو' فوراً گولی نکالو۔"

سور کے بچے دوڑتے ہوئے باہر گئے۔ فی الوقت یہی سمجھ میں آیا کہ پانچ میل کے فاصلے پر جو گوٹھ ہے وہاں کی ڈسپنسری کے ڈاکٹر کو اغوا کرکے لایا جائے۔ شاید وہ گوشت میں دھنسی ہوئی گولی نکال دے۔ کمرے میں اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک وفادار رہ گیا۔ حماد نے مٹھیاں بھینچ کر کراہتے ہوئے کہا۔ "تکلیف برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ کار کی ڈکی میں سے وہسکی کی بوتل لے آؤ۔ مجھے اتنی پلاؤ کہ تکلیف بھول جاؤں۔"

وہ وفادار اپنی گن اور کارتوس کی پیٹی ایک طرف رکھ کر دوڑتا ہوا باہر گیا۔ اس کے جاتے ہی مرجانہ آئی پھر اس نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ وہ بستر پر پڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بوکھلا گیا۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھنا چاہا' تکلیف کی شدت نے اسے پھر پٹخ دیا۔ وہ دروازے سے پلنگ تک فاتحانہ انداز میں چلتی ہوئی آئی اور بولی۔ "تم مجھے فتح کرنے یہاں آئے تھے۔ اگر اپنے پیروں پر چل کر آتے تو ایک مجبور اور کمزور لڑکی کے بستر تک پہنچ جاتے۔ دیکھو' بازی کیسے پلٹ جاتی ہے۔ میں فاتحانہ شان سے تمہارے بستر تک آئی ہوں۔"

وہ تکلیف سے تڑپتے ہوئے بولا "میں قسم کھا کر کہتا ہوں' تمہاری محبت میں دیوانہ ہوں۔ میں نے دیوانگی میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ میری غلطی کو معاف کردو۔ میں تمہارا بہنوئی ہوں۔ تمہاری بہن کا سہاگ ہوں۔"

وہ بولی "میں نے کوئی الزام نہیں دیا۔ ابھی کوئی سزا نہیں دی' پھر معافی کس بات کی مانگ رہے ہو؟"

دروازے پر دستک سنائی دی۔ مرجانہ نے ایک طرف رکھی ہوئی گن اٹھائی۔ اس کی لوڈنگ چیک کی پھر بلند آواز سے بولی۔ "اپنے چھوٹے سردار کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو اس کمرے سے دور رہو۔"

پھر اس نے گن کا رخ حماد کی طرف کیا۔ وہ تڑپ کر گرجتے ہوئے بولا "جاؤ بھاگ جاؤ' اور تمام کتوں سے کہہ دو ادھر نہ آئیں۔ اس کے پاس گن ہے' یہ مجھے مار ڈالے گی۔"

باہر خاموشی رہی۔ تب حماد نے محسوس کیا۔ کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ اس نے

آنکھیں اٹھا کر سرہانے کی طرف دیکھا۔ ایک پُراسرار اجنبی کو دیکھ کر خوف کی ایک لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ "تت.......... تم.......... تم کون ہو؟"

مرجانہ نے کہا "یہ میرا محافظ اور مشیر ہے' لاجواب شاطر ہے' شطرنج اچھی کھیلتا ہے۔ ہارنے والی بازی کو جیت میں بدل دیتا ہے۔"

گوشت میں دھنسے ہوئے بلٹ سے جو تکلیف بڑھتی جا رہی تھی' وہ ناقابلِ بیان تھی۔ اس پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ ہوش و حواس سے غافل ہوتے ہوئے بولا "مجھے بچالو' وہ.......... وہ دیکھو' موت میرے سر پر کھڑی ہے مجھے بچالو۔"

اجل اس کے سرہانے سے ہٹ گیا۔ موت ٹل گئی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اجل نے ایک چاقو نکال کر اسے کھولا پھر کہا "ابھی اس کے مقدر میں زندگی ہے اس لیے چاقو کی نوک سے بلٹ نکل آئے گی۔"

اس پرانی کھنڈر نما حویلی کے باہر حماد کے وفادار اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ ان کا آقا ایک قیدی لڑکی کے رحم و کرم پر ہے۔ اس لڑکی پر کیسے قابو پایا جائے؟ آقا کی جان کیسے بچائی جائے؟ انہوں نے بحث کے دوران آقا کی دلخراش چیخ سنی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ حماد کو بچانے کے لیے ظالمانہ آپریشن کے ذریعے گولی نکالی جا رہی ہے۔ وہ سب اپنی گنیں سنبھالتے ہوئے حویلی کے اندر اس کمرے کی سمت آ رہے تھے۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ دروازہ بند ہوگا تو اسے توڑتے ہوئے کمرے میں گھس جائیں۔ پھر آقا زندہ نہ پایا گیا تو مرجانہ کو گولی مار دیں گے۔ وہ سب دروازے پر آ کر ٹھٹک گئے۔ وہ بند نہیں تھا۔ پوری طرح کھلا ہوا تھا چھوٹے سردار کے پاس مرجانہ کے علاوہ ایک ڈاکٹر نظر آیا جو حماد کے زخم پر پٹی باندھ رہا تھا۔ مرجانہ بے ہوش پڑے ہوئے حماد کی کنپٹی سے گن کی نال لگائے کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی "جہاں ہو' وہیں رک جاؤ۔ آنکھوں سے دیکھ لو۔ ڈاکٹر نے گولی نکال دی ہے۔ تمہارا آقا زندہ ہے مگر بے ہوش ہے لیکن تم میں سے کوئی کمرے میں قدم رکھے گا یا گولی چلائے گا تو اس سے پہلے ہی پھر ایک بلٹ اس کے اندر گھسا دوں گی' جاؤ دفع ہو جاؤ۔"

وہ سب پیچھے چلے گئے ایک نے کہا "ہم نہیں جانتے' یہ ڈاکٹر کہاں سے آیا ہے؟ اور آ ہی گیا ہے تو اس وقت تک یہاں قیدی رہے گا جب تک ہم چھوٹے سرکار کو اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے نہیں دیکھیں گے۔"

دوسرے نے کہا "تم بھی اس وقت تک زندہ رہو گی' جب ہم سرکار کو زندہ پائیں گے.......... ورنہ.........."

وہ بات کاٹ کر بولی "تمہارے سرکار کی کنپٹی سے یہ موت لگی ہوئی ہے۔ ٹریگر دباؤں یا یہاں سے جاتے ہو؟"

بولنے والوں کو چپ لگ گئی۔ وہ سب وہاں سے چلے گئے۔ اجل نے کہا "میں حماد کی کار سے کچھ ضروری سامان لے آیا ہوں۔ ان میں ایک موبائل فون ہے۔ تم اپنے حاکم بابا کو اپنی خیریت کی اطلاع دے سکتی ہو۔"

اس نے ایک طرف رکھے ہوئے سامان سے فون اٹھا کر پوچھا۔ "کیا صرف خیریت کی اطلاع دوں؟"

"ہاں ان سے کہو' جس نے تمہیں اغوا کیا ہے' وہ تاوان کے سلسلے میں باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

اس نے فون پر رابطہ کیا۔ باپ نے آواز سنتے ہی خوشی سے پوچھا "میری جان! تم کہاں ہو؟"

"حاکم بابا! مجھے اس جگہ کا علم نہیں ہے لیکن میں خیریت سے ہوں۔ قیدی ہوں مگر عزت آبرو سے ہوں۔"

اجل نے اس سے فون لے کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "سردار حاکم علی باچاری! آپ نے اپنی صاحبزادی کی آواز سن لی۔ اس کا اطمینان بھی محسوس کیا ہو گا۔ وہ بالکل خیریت سے ہے۔"

"تم کون ہو؟ اسے کیوں قید کیا ہے؟ ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں' آپ کل صبح یہاں آئیں اور اپنی بیٹی کو ساتھ لے جائیں۔"

"اس مہربانی کے عوض کیا لوگے؟"

"میں چاہتا ہوں' سپات بندر اور میلان بندر کے درمیان ایک قبرستان کی جگہ مختص کی جائے۔"

حاکم علی نے حیرانی سے کہا "یہ تمہارا عجیب مطالبہ ہے۔"

"مطالبہ عجیب ہے مگر مہنگا نہیں ہے۔ تم وہاں سے چار ہزار گز کا پلاٹ قبرستان کے لیے لکھ دو۔ باقی چار ہزار گز کا پلاٹ میں سردار جنید سے لکھوالوں گا۔"

"سردار جنید پلاٹ تو کیا اپنے پلاٹ کی ایک چٹکی مٹی بھی نہیں دے گا۔ میں مجبور ہوں۔ کل صبح پکے کاغذ پر چار ہزار گز کا پلاٹ لکھ کر لے آؤں گا۔ مگر کہاں آنا ہوگا؟"

اجل نے اسے اس جگہ کا پتا بتایا۔ راستوں کی نشاندہی کی پھر وارننگ دی کہ صرف دو باڈی گارڈز کے ساتھ آئے۔ پولیس آئے گی تو بیٹی پھر کبھی نہیں ملے گی۔

اس نے فون بند کر دیا۔ مرجانہ نے کہا "مانتی ہوں کہ تم اجل ہو، موت ہی کی با
کرتے ہو لیکن سیاست بند رکھ کے درمیان قبرستان کیوں بنانا چاہتے ہو؟"

"اس لیے کہ تمہارے اور سردار جنید کے علاقوں میں سیاست زور پکڑ رہی ہے
دونوں علاقوں کا ایک مشترکہ سیاسی قبرستان ہونا چاہیے۔ اس قبرستان میں صرف س
غنڈوں، آلہ کاروں، سیاسی چمچوں اور مشیروں اور کامیاب وناکام سیاست دانوں کے ہ
وہ معصوم لوگ دفنائے جائیں گے جو نادانی میں نعرے لگاتے ہوئے مارے جائیں گے۔"
مسکراتے ہوئے بولا "اجل کی حیثیت سے میرا ارادہ ہے کہ ملک میں جتنے انتخابی حلقے ہ
اتنے ہی سیاسی قبرستان ہوں تاکہ اعداد و شمار سے معلوم ہو کہ موت کے فرشتے
پاکستان کو اتنی تعداد میں نہیں مارا جتنا کہ سیاست دانوں کی اکھاڑ پچھاڑ نے مارا ہے۔"

رات کو آٹھ بجے حماد کو ہوش آگیا۔ اجل نے اسے دوائیں کھلائیں۔ انجک
لگائے۔ ابتدائی طبی امداد کے سامان سے جو میسر آیا وہ سب کچھ اس کی توانائی بحال کر
کے لیے استعمال کرایا پھر پوچھا "کیا اپنے لوگوں سے باتیں کرنے کے قابل ہو؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا پھر کہا "میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے
اچھے اسپتال میں پہنچادو۔"

"یہ کام تو تمہارا باپ ہی کر سکے گا۔ اس سے فون پر کہو کہ وہ تمہیں آکر
جائے۔"

مرجانہ نے موبائل فون اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے کمزور لرزتے ہوئے ہاتھو
سے اسے تھام کر آپریٹ کیا۔ رابطہ قائم ہونے پر بڑی نقاہت سے بولا "سردار بابا! میں ہو
حماد۔ مم......... مجھے گولی لگی ہے۔ مجھے اسپتال پہنچادو۔ نہیں تو میں مرجاؤں گا۔ با
مم......... مجھے........"

باپ نے بات کاٹ کر کہا "میں یہ کیا سن رہا ہوں؟ تمہیں گولی لگی ہے؟ تم کہاں ہو
میں ابھی آرہا ہوں۔ بتاؤ کہاں ہو؟"

اجل نے حماد سے فون لے لیا۔ پھر اپنے کان سے لگا کر پوچھا۔ "بیٹے کی آواز س
لی؟ اب میری سنو۔ تمہارے بیٹے کے جسم سے گولی نکال دی ہے۔ یہ ابھی زندہ رہے گا
خون زیادہ بہہ گیا ہے اس لیے اسپتال پہنچانا ہوگا اور جتنی جلدی میرے مطالبات پورے
ہوں گے اتنی ہی جلدی تم اسے اسپتال پہنچا سکو گے۔"

سردار جنید نے پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں اجل ہوں۔ جو اسپتال پہنچنے میں دیر کرتا ہے، اسے قبرستان پہنچا دیتا ہوں۔"

"مگر معلوم تو ہو کہ تم ہمارے دشمن کیوں ہو؟ مجھے اپنا ٹھکانا بتاؤ۔ میں راستے میں
فون پر بات کرتا رہوں گا۔"

اجل نے اسے بھی پتا بتایا۔ راستوں کی نشاندہی کی پھر کہا "یہاں آنے کی شرائط سن
لو۔ تمہارے ساتھ صرف ایک ڈرائیور ہوگا۔ اپنے اور بیٹے کے نام سے سادے اسٹامپ
پیپرز لے آؤ۔ بیٹے کی خواب گاہ کی الماری میں ایک براؤن کلر کا بریف کیس ہے وہ جن
نمبروں سے کھلتا ہے، وہ نمبر حماد جانتا ہے۔ لہٰذا اسے کھولنے یا توڑنے کی حماقت کئے بغیر
یہاں لے آؤ اور تم اتنے سمجھ دار تو ضرور ہو کہ پولیس کو نہیں لاؤ گے۔ کیونکہ بیٹے کو
زندہ چاہو گے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ حماد کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ کمزوری کے باعث اسے
نیند آگئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد پھر آنکھ کھل گئی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اسے کچھ پھل
کھلائے گئے۔ دودھ پینے کے لیے دیا گیا۔ اجل نے اس کے دو وفاداروں کو بلایا۔ مرجانہ
نے پھر حماد کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اجل نے کہا "اپنے آدمیوں سے کہو، اپنے گھروں کو
لوٹ جائیں پندرہ منٹ کے بعد حویلی کے اندر یا باہر کوئی بھی نظر آئے گا تو ہم تمہیں گولی
ماردیں گے۔"

حماد نے اپنے وفاداروں سے کہا "تم لوگوں نے سن لیا۔ اب تعمیل کرو۔ بڑے
سردار یہاں آنے والے ہیں۔ ہمارے درمیان سمجھوتا ہورہا ہے۔ اب تم لوگوں کا کام
نہیں رہا۔ اس لیے جاؤ۔ میری زندگی چاہتے ہو تو کہیں آس پاس چھپ کر نہ رہنا۔"

انہوں نے بے بسی سے اپنے چھوٹے سردار کو دیکھا۔ پھر سب ہی وہاں سے سرجھکا
کر چلے گئے۔ حماد کا سر چکرا رہا تھا۔ نقاہت غالب آرہی تھی۔ وہ پھر سو گیا۔ وہ مرجانہ کو
ہوس کا نشانہ بنانے اور کچھ روز وہاں گزارنے کے لیے کھانے پینے کا سامان لایا تھا۔ اجل
نے مرجانہ کے ساتھ پیٹ بھر کر کھایا۔ دونوں ہنستے بولتے رہے پھر اجل نے کہا "جاؤ، اب
آرام سے سو جاؤ۔ دونوں سردار صبح سے پہلے پہنچ جائیں گے۔ تب تک نیند پوری کرلو۔"

"کیا تم مطمئن ہو کہ حماد کے آدمی جا چکے ہیں؟"

"ہاں میں دیکھ سکتا ہوں۔ ادھر دور و نزدیک کوئی چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ حکم کے
بندے ہیں، جاچکے ہیں۔"

وہ دوسرے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کرکے سو گئی۔

میں ایک ایسا لکھنے والا ہوں، جس کے سونے اور جاگنے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں
ہے۔ اکثر راتوں کو لکھتا ہوں اور دن کو سوتا ہوں۔ میں اس رات بھی جاگ رہا تھا اور لکھ

رہا تھا۔ مرجانہ کے سونے کے بعد اجل میرے پاس آگیا۔ میں نے اس کے سامنے ک
ریکارڈر کو آن کر دیا۔ وہ مرجانہ کی تمام روداد تفصیل سے بیان کرنے لگا۔ میں تمام
روداد سننے کے بعد کہا "اچھا تو آج صبح دونوں سمدھی سردار کھل کر دشمن کی حیثیت
سامنے آئیں گے۔"

"ہاں' یہ تو ہونا ہی تھا۔ اس لیے یہی ہو گا۔"

"تم چالیں ہی ایسی چل رہے ہو کہ ایسا ہوتا رہے۔"

"میری مجبوری ہے۔ جتنے افراد کی موت کی ذمے داریاں مجھ پر ہیں' میں انہیں
ہی جوڑ توڑ کے ساتھ ان کے آخری مقررہ وقت تک لے جا رہا ہوں۔"

"کیا صبح کسی کی روح قبض کرنے والے ہو؟"

"نہیں۔ ابھی ان میں سے کسی کا وقت نہیں آیا ہے۔"

"تم نے مرجانہ کو اغوا ہونے دیا۔ ایسا نہ کرتے تو وہ حویلی میں پہنچ کر زہر ملا
کھانے سے مرجاتی۔ تم نے حماد کو بھی سرجری کے ذریعے بچالیا۔ کیا صرف اس لیے
انہیں وقتِ مقررہ تک پہنچنا ہے؟"

"ہاں موت کا ایک دن معین ہے۔ اپنے معینہ وقت پر ہر ذی روح کو روح سے
ہونا ہے۔ میں نے مرجانہ اور حماد کو اس لیے بھی بچا رکھا ہے کہ ان کی موت ایسی
ہو گی۔ اس لیے ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ان کی موت جیسی ہو گی' وہ میں ابھی نہیں بتاؤ
سو سوری۔"

"یہ بتاؤ کہ مرجانہ تمہیں کتنی حسین اور دلنشین لگتی ہے؟"

"تم اس لیے پوچھ رہے ہو کہ میں مرجانہ کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگا ہو
اسی سے ظاہر ہے کہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"

"یار اجل! تمہیں بہت اچھی لگتی ہے۔ اس پر تو ترس کھاؤ۔ تم کسی دن کس
سے اس کی روح قبض کرو گے؟"

"پہلی بات تو یہ کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مجھے
اچھی' بہت اچھی لگتی ہے۔ اتنی اچھی حسینہ کو دل میں بھر لیا جاتا ہے۔ مگر افسوس
کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔" وہ چلا گیا۔ کیونکہ اس پرانی حویلی میں سردار جنید اپنے
ڈرائیور اور اجل کے مطلوبہ سامان کے ساتھ پہنچ گیا تھا۔ اجل نے حویلی کے درو
سے باہر آکر کہا "ڈرائیور اور اسلحے کو گاڑی میں چھوڑ دو۔ سارے اسٹامپ پیپرز اور
کیس لے کر اندر چلے آؤ۔"

سردار جنید نے مطلوبہ سامان اٹھا کر حویلی کے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا "کیا تم
نے میرے بیٹے کو قید کیا ہے؟"

اجل نے کمرے میں پہنچ کر کہا "پہلے بیٹے کو دیکھ لو' پورا کا پورا ہے۔ ایک ذرا سا
ادھڑ گیا ہے۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا بیٹے کے پاس آیا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ اس نے بیٹے کی پیشانی
کو چوم لیا۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکنوں سے زندگی کا یقین کیا۔ اس کی
ایک ران پر بندھی ہوئی پٹی کو دیکھ کر سنگدل سردار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ آنسو
پونچھتے ہوئے بولا "یہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اگرچہ یہ تمہارے رحم و کرم پر ہے اور میں
یہاں مجبور ہوں۔ پھر بھی میرے اندر ایک باپ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ میں تمہیں گولی
ماردوں۔ میرے بیٹے سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

اجل نے کہا "بوڑھے سردار! تیری اتنی زندگی گزر گئی اور اب تک یہ بات سمجھ
میں نہیں آئی کہ آدمی خود اپنا دشمن ہوتا ہے اور خود ہی اپنی موت یا شامت تک پہنچتا
ہے۔ تیرے بیٹے نے مرجانہ کو اغوا کیا اور یہ بات تجھ سے چھپائی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میرے بیٹے پر الزام ہے۔"

"یہ سچ ہے" مرجانہ کی آواز سن کر سردار جنید چونک گیا۔ پلٹ کر دروازے کی سمت
دیکھا۔ وہ کمرے کے اندر آتی ہوئی کہہ رہی تھی "تم باپ بیٹے بہت ہی کمینے ہو۔ کسی
انسان کو مار کر کہتے ہو چیونٹی مرگئی۔ میں حویلی میں زہریلا کھانا کھا کر مرجاتی تو میرے بابا
ایسے ہی روتے جیسے ابھی تمہاری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ تم جیسے لوگ بیٹوں کے
لیے ہی کیوں روتے اور تڑپتے ہو؟ کیا بیٹیاں انسان کی بچی نہیں ہوتی ہیں؟"

وہ بولا "میں فضول باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میرے بیٹے کو فوراً اسپتال
پہنچانا ضروری ہے۔ فوراً معاملہ طے کرو اور اسے لے جانے دو۔"

"اسے ضرور لے جاؤ گے لیکن باہر گاڑی کی آواز سنو۔ سردار حاکم علی پاچاری
تشریف لے آئے ہیں۔"

سردار جنید' حاکم علی کا نام سن کر چونک گیا۔ مرجانہ خوشی سے دوڑتی ہوئی باہر چلی
گئی۔ سردار جنید نے کہا۔ "حاکم علی کے اس کمرے میں پہنچنے سے پہلے اپنی قیمت' اپنی
ضرورت اور اپنے مقاصد بتاؤ۔ جتنی شرائط مجھ سے منوا سکتے ہو' ابھی میں اسٹامپ پیپر پر
لکھ کر وہ شرائط تسلیم کروں گا۔ میری صرف ایک بات مان لو۔ ان باپ بیٹی کو یہیں دفن
کردو۔ مرجانہ گمشدہ ہے' اسے تاقیامت گم شدہ رہنے دو۔ باقی حاکم علی سے میں نمٹ لوں

گا۔"

اجل نے کہا "تم نے جو اتنی لمبی بکواس کی' اس میں مجھے صرف دفن کرنے والا میں مزہ آیا کیونکہ میری ڈیوٹی یہی ہے۔ جو زمین کے اوپر ہوتے ہیں' میں انہیں زیر پہنچا دیتا ہوں۔"

"یعنی تم ان دونوں کے خلاف میرا ساتھ دینے کو تیار ہو؟"

"ہاں مگر تم جلدی نہ کرو۔ میں ان کی موجودگی میں تمہارا ساتھ دے سکتا بشرطیکہ بِکنا چاہوں اور جب بِکنے یا ہارس ٹریڈنگ کی بات آئے گی تو حاکم علی بھی بولی گا۔"

"مگر میری بولی ہر حال میں اس سے زیادہ ہوگی۔ کیونکہ یہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ جانشین سردار ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارے ہاں بیٹے کتنے اہم ہوتے ہیں۔ وہ نہ ہو اگلی نسل میں سرداری ہی ختم ہو جائے۔"

"تم اپنے حالات اور اپنی روایات کے مطابق درست کہہ رہے ہو لیکن روایت ہے کہ بیٹا ہو یا بیٹی' میں کسی کو نہیں چھوڑتا۔ میں تو صرف اپنا فرض ادا ہوں۔"

"تمہاری باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ میری پیش کش کو ٹھکرا رہے ہو۔ وہ باپ ابھی تک یہاں نہیں آئے ہیں۔ یقیناً باہر کسی پلاننگ میں مصروف ہیں۔"

"ظاہر ہے بیٹی اپنے باپ کو بتا رہی ہوگی کہ تمہارے بیٹے نے کتنی کمینگی اسے اغوا کرا کے اس پرانی حویلی میں قید کر رکھا تھا اور میں نے کس طرح یہ بازی پلٹ ہے۔ اب وہ آزاد ہے اور تمہارا بیٹا قیدی۔"

وہ گڑگڑا کر بولا "خدا کے لیے میرا ساتھ دو۔ میرے بیٹے کو اسپتال پہنچا کر ا بچالو۔"

وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ حاکم علی اپنی بیٹی کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ اس نے غ ہوئے سردار جنید کو دیکھا۔ پھر اس کے زخمی بیٹے کے پاس آیا۔ اس نے اپنی ایک انگلی کے زخم پر ماری۔ حماد چیخ کر نیند سے بیدار ہو گیا۔ تکلیف سے تڑپنے لگا۔ باپ نے کر بیٹے کی طرف دوڑتے ہوئے کہا "اسے ہاتھ نہ لگاؤ حاکم علی! میں تمہیں زندہ چھوڑوں گا۔" پھر وہ بیٹے کے قریب آنے سے پہلے ہی رک گیا۔ مرجانہ نے اپنی حماد کی کنپٹی سے لگا دی تھی اور کہہ رہی تھی "میرے حاکم بابا سے بعد میں نمٹو گے۔ کیا پہلے تمہارے بیٹے سے نمٹ لوں؟"

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کرسی نہ ہوتی تو گر پڑتا۔ اس کی کُل کائنات وہی ایک بیٹا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا "میں قصور مانتا ہوں۔ حماد نے مرجانہ کو اغوا کیا۔ اس جرم میں مجھے گولی مار دو۔ مگر میرے بیٹے حماد کو جانے دو۔ میں اسٹامپ پیپرز لایا ہوں۔ سیات بندر اور میلان بندر کے ساحلی علاقے مجھ سے لے لو۔"

حاکم علی نے کہا "وہ تمام ساحلی علاقے ہمارے تمہارے باپ کی جاگیر نہیں ہیں کہ اسٹامپ پیپر لکھو گے۔ وہ سرکاری علاقے ہیں۔ بحیرہ عرب میں پاکستانی ساحل ہیں۔ ہم پاکستانی سیاست میں حصہ لے کر ہی ان ساحلوں پر اپنی من مانی کر سکتے ہیں۔ اس لیے صرف سیاست کی بات کرو۔"

سردار جنید نے کہا "سیاست میں دشمنی تو ہوتی ہے لیکن اپنا اپنا مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہو تو فوراً دوستی ہو جاتی ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ میں اپنے بیٹے کو مرنے اور بدنام ہونے نہیں دوں گا اور تم اپنی بیٹی کو بیوہ ہوتے نہیں دیکھو گے"

مرجانہ نے کہا "بات صرف تمہارے بیٹے کے مرنے اور میری بہن کے بیوہ ہونے کی نہیں ہے۔ میری اس رسوائی کی ہے' جو تم لوگوں نے اخباروں کے ذریعے کی ہے۔ کیا تم باپ بیٹے میری نیک نامی دوبارہ بحال کر سکتے ہو؟"

"یہ ہم پر الزام ہے۔ ہم نے تمہاری کوئی تصویر اور.........."

وہ بات کاٹ کر بولی "یو شٹ اپ۔ حماد نے گولی کھانے کے بعد درد سے نجات حاصل کرنے کے لیے سارے بھید کھول دیئے ہیں۔ تم نے ہماری ہی حویلی میں مجھے زہر دے کر مار ڈالنے کے انتظامات کیئے تھے۔ ہٹ دھرمی کرو گے' حقیقت تسلیم نہیں کرو گے تو تمہارے بیٹے کی سانسیں کم سے کم ہوتی جائیں گی۔"

حماد دیدے پھیلائے تمام باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بڑی نقاہت سے کہا "بابا! یہ جو کہتے ہیں' آپ مان لیں۔ مجھے یہاں سے لے چلیں۔"

"بیٹے! میں ان کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں لیکن مرجانہ کی نیک نامی کیسے واپس لاؤں؟"

اجل نے کہا "اگر کوشش کی جائیں گی تو پھر سے نیک نام ہونے کے لیے اور اخبارات کے ذریعے غلط فہمیاں مٹانے کے لیے شاید برسوں لگ جائیں۔ اس کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ حماد بھی بدنام ہو جائے۔ یہ آوارہ' بدچلن' عیاش اور ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث رہنے والے سردار زادے کی حیثیت سے بدنام ہوگا تو پھر حماد اور مرجانہ کی بدنامیوں کا پلڑا برابر رہے گا۔ پھر الیکشن میں کوئی کسی پر کیچڑ نہیں اچھالے گا۔"

حماد نے کہا "اگرچہ میں ایسا نہیں ہوں مگر سزا کے طور پر مرجانہ کے برابر با ہونے کو تیار ہوں۔"

اجل نے کہا "تم خود کو نیک اور پارسا کہہ رہے ہو۔ مگر تمہارا باپ تمہارا وہ برا کیس لے کر آیا ہے' جس میں تمہارے کالے دھندوں کی تحریری اور تصویری دستاویز ہیں۔"

حماد تکلیف بھول کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا پھر گھبرا کر بولا "کیسا بریف کیس؟ کون بریف کیس؟ نہیں' میرے خلاف کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہیں۔"

اجل نے براؤن بریف کیس اٹھا کر پوچھا "اسے تم کھولو گے یا میں کھولوں؟ ص نمبر بتادو۔"

"نن.......... نہیں.......... مجھے نمبر یاد نہیں ہیں۔ میں نمبر بھول گیا ہوں۔ اس صرف جائداد کے کاغذات ہیں۔"

اجل نے کہا "تم بھول گئے ہو تو میں بتا دیتا ہوں۔ ون ون' ون نائن نائن ٹو۔"

اس نے نمبر دہراتے ہوئے بریف کیس کو کھول دیا۔ حماد اگر زخمی اور کمزور نہ تو بستر سے چھلانگ لگا کر بریف کیس کو چھین کر لے جاتا یا اسے آگ لگا دیتا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ بریف کیس کے کھلتے ہی وہ پھر چکرا کر تکیئے پر گر پڑا۔

سردار جنید حیران اور بے حد پریشان تھا۔ اس نے اجل سے پوچھا "تمہیں ا لاک نمبر کس نے بتایا تھا؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس میں میرے بیٹے کے خلاف بھرا ہوا ہے؟"

مرجانہ نے کہا "تمہارے اس سوال کا جواب ضروری نہیں ہے۔ اب یہ تحریری اور تصویری دستاویزی ثبوت ہمارے پاس رہیں گے۔ ہم اس وقت تک یہ چ منظرِ عام پر نہیں لائیں گے' جب تک تم دونوں کا سیاسی تعاون رہے گا۔ اگر کبھی ہما خلاف کوئی سازش کرو گے تو صرف تم ہی نہیں' تمہاری سیاسی پارٹی بھی بدنام ہو گی۔"

اجل نے کہا "حماد کی اتنی کمزوریاں مرجانہ کے ہاتھ آگئی ہیں کہ اب اسٹامپ پیپ کچھ لکھوانا ضروری نہیں رہ گیا ہے۔ ویسے چند باتیں اپنی یادداشت میں محفوظ کر لو۔ تم بیٹا اپنے علاقے سے صوبائی انتخابات میں حصہ لے رہا ہے اور تمہاری پارٹی کا دوسرا قومی انتخابات لڑنے والا ہے لیکن اس کے مقابلے میں' میں انتخاب لڑوں گا۔"

سردار جنید نے چونک کر اسے دیکھا پھر پوچھا "تم.......... تم ہمارے حلقے سے انت لڑو گے۔ ناممکن ہے۔ وہاں سے ہماری پارٹی کا ایک بندہ کامیاب ہو گا۔"

مرجانہ نے کہا "میں کہہ چکی ہوں کہ تمہارا سیاسی تعاون جاری رہے گا تو تمہارے بیٹے کے عیوب اور جرائم چھپے رہیں گے لہٰذا حماد کی نیک نامی کے لیے تم اپنے علاقے کے تمام ووٹروں کو حکم دو گے کہ قومی اسمبلی کے انتخاب میں وہ اجل نواز کو ووٹ دیں اگر کوئی چال چلو گے اور اجل انتخاب ہارے گا تو تمہارا بیٹا اپنی زندگی ہار جائے گا یا دستاویزی ثبوت کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا۔"

اجل قومی اسمبلی کا انتخاب لڑے گا' یہ بظاہر ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ بھلا موت کا فرشتہ کب دنیاوی معاملات میں حصہ لیتا ہے؟ یہ تو محض قصے کہانیوں والی بات لگتی ہے۔ لیکن نہیں یہی ہماری ملکی سیاست کی سب سے بڑی حقیقت اور ناقابلِ تردید سچائی ہے۔ پاکستان میں موت کے فرشتے ہی سیاست کا کھیل کھیلتے ہیں۔ میں تو اجل نامے میں صرف ایک اجل کو پیش کر رہا ہوں۔ دیکھیں میرا یہ دوست آگے چل کر ہمیں کیا دیتا ہے اور کیا سکھاتا ہے اور ہم کیا سیکھ پاتے ہیں؟ فی الحال اجل نے سیاسی قبرستان علیحدہ بنانے کا ارادہ کیا ہے تاکہ مہذبانہ اور سیاسی موت مرنے والوں کی صحیح مردم شماری ہو سکے۔

سردار جنید نے کہا "مسٹر اجل! تم کون ہو؟ اب سے پہلے تمہیں کبھی دیکھا نہیں۔ ذرا سوچو ایک مکمل اجنبی کی حمایت کروں گا تو سیاسی پارٹی مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ میں اس پارٹی سے بڑے فائدے حاصل کرتا رہتا ہوں۔ میں مرجانہ سے درخواست کرتا ہوں' کوئی ایسا راستہ نکالا جائے کہ پارٹی سے اختلافات نہ ہوں۔"

وہ بولی "تم باپ بیٹے نے اپنی شامت خود بلائی ہے۔ پہلے صرف میرے بابا آزاد امیدوار کی حیثیت سے آ رہے تھے۔ ان کا سیاست میں آنا' تمہیں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ انہیں اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے تم نے اپنے بیٹے کو ان کا داماد بنا دیا۔ پھر میرے سیاسی کیریئر کی ابتدا نے تم باپ بیٹے کو میرے اغوا اور قتل کی طرف مائل کیا کیونکہ باپ بیٹی کی سیاسی قوت دگنی ہو رہی تھی۔ تم ہماری سیاسی قوت گھٹانے کی فکر میں تھے' ہم اجل کے تعاون سے اسے اور بڑھا رہے ہیں۔ سیاست میں ہر طرح کی سودے بازی ہوتی ہے لیکن اپنی قوت گھٹانے کا سودا کبھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اجل ہر حال میں تمہارے حلقے سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑے گا۔"

اجل نے کہا "تمہارے تباہ کن عزائم جو مرجانہ کے خلاف تھے' وہ چھپے نہیں رہے اور ہم نے بھی اپنے عزائم واضح کر دیئے ہیں۔ اب بیٹے کو یہاں سے لے جاؤ اور دن رات سوچتے رہو۔"

سردار حاکم علی نے کہا "مرجانہ! تم نے بہت ہی ذہین اور معاملہ فہم اجل کو اپنا مشیر

اور محافظ بنایا ہے۔ میں یہاں آنے سے پہلے جیسے اپنا سب کچھ ان کمبختوں کے آگے ہار تھا۔ اب لگتا ہے کہ پورے لسبیلہ اور ساحلی علاقوں کا سکندرِاعظم بن گیا ہوں سردار جنید! میں اپنی بیٹی کو سہاگن رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے فوراً اپنے بیٹے کو اسپتال ۔ جاؤ۔"

حاکم علی نے اپنے دو وفاداروں کو بلایا۔ انہوں نے حماد کو اٹھا کر سردار جنید کی گاڑ میں ڈال دیا۔ وہ اپنے بیٹے کو وہاں سے لے گیا۔ اسے اسپتال پہنچا کر اس نے بیٹے کی زند اور سلامتی جیت لی لیکن الیکشن میں ہار جیت کے فیصلوں سے پہلے ہی ساحلی علاقے اور ا برتری ہار رہا تھا۔ بہت بری طرح سردار حاکم علی کے دباؤ میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنی کمزور اور شکست خوردگی کے بارے میں پارٹی لیڈر سے بات کی۔ پارٹی لیڈر نے کہا "یہ تو بہ ہی برا ہوا۔ حماد نے اس لڑکی کی ہوس میں آپ کو ہی ان کے قدموں میں نہیں جھکایا ہے ان علاقوں سے ہماری پارٹی کی شکست بھی پکی کر دی ہے۔ آپ اپنے حلقے کا ووٹ بینک اجل نواز کو دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔"

"میں تو بری طرح پھنس گیا ہوں۔ سیاست ہو یا سرداری' سب اپنے بیٹے کے ل ہی کر رہا تھا۔ مگر صاف نظر آ رہا ہے کہ بیٹا میری طرح سر اٹھا کر آئندہ کبھی سرداری سیاست نہیں کر سکے گا۔"

"سردار جنید! سر نہ اٹھے تو سرداری کیا۔ اب تو عمر بھر کی پسپائی اور حاکم علی ک تابعداری ہے۔"

"آپ بہت بڑے پارٹی لیڈر ہیں۔ بہت بڑا سیاسی دماغ رکھتے ہیں۔ یہاں صرف ہماری ہی نہیں' آپ کی پارٹی کی بھی پسپائی ہے۔ آپ کچھ کریں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے' میں کیا کروں؟"

"میں آپ کے امریکا جانے آنے کے اخراجات برداشت کروں گا۔ سنا ہے' ج سیاست داں وہاں سے آشیرواد لے کر آتا ہے' وہ ہاری ہوئی بازی بھی جیت جاتا ہے۔ آپ وہاں سے کوئی نسخہ لا سکتے ہیں۔"

"امریکا صرف انہیں جیت کی سند دیتا ہے' جو پورے ملک میں مضبوط پوزیشن رکھ ہیں۔ ہماری پارٹی صرف ایک ہی صوبے تک محدود ہے۔ شاید دوسرے صوبوں سے ہمارے کوئی ایک دو امیدوار جیت جائیں۔ اس کے باوجود ہمیں اپنے ہی صوبے میں حکومت بنانے کے لیے توڑ جوڑ میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ ہمیں دشمن کے شکنجے سے نکالنے کی تدبیر کریں۔"

"وقت کا تقاضا ہے کہ آپ کچھ عرصے تک باپ بیٹی کے سامنے ذرا جھکے رہیں۔ ان سے میٹھے بنے رہیں۔ اجل نواز کے متعلق معلومات حاصل کریں کہ وہ کون ہے؟ اس حویلی کے ملازموں اور خادماؤں کو خریدیں۔ شاید اس طرح معلوم ہو جائے کہ آپ کے بیٹے کے خلاف وہ دستاویزی ثبوت کہاں چھپا کر رکھے گئے ہیں۔"

"یہ قصے کہانیوں جیسی جاسوسی اور انتظار ہم سے نہیں ہو گا۔ آپ صرف تخت یا تختہ والی بات کریں۔ میرے دماغ میں ایک ہی کیڑا کلبلا رہا ہے۔ سردار حاکم علی کو غائب کردوں اور اس کی سلامتی کے عوض حماد کے خلاف تمام دستاویزی ثبوت کا مطالبہ کروں۔ مرجانہ بوڑھے باپ کی خاطر تمام ثبوت بھی واپس کرے گی اور ہماری بہت سی شرائط بھی تسلیم کرے گی۔"

"ہو سکتا ہے سردار جنید کہ تم ایسے طریقۂ کار سے اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاؤ لیکن نئی بازی شروع کرنے سے پہلے پچھلی شکست کی وجوہات کو ہمہ وقت نظر میں رکھنا چاہیے۔"

"شکست کی صرف ایک وجہ تھی اور وہ میرے بیٹے کی ہوس پرستی تھی۔"

"حماد تو اسے اغوا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسے تین دنوں تک قیدی بنا کر رکھا۔ وہ تو فاتح بنا ہوا تھا پھر بازی کیسے پلٹ گئی جو قیدی تھی' وہ آزاد ہو گئی۔ جو آزاد تھا' وہ قیدی بن گیا۔ سردار جنید! شکست کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے مرجانہ کو محض ایک لڑکی سمجھا ہے۔ ابھی تک اس کی طاقت کا اندازہ نہیں کیا ہے اور اب بھی صحیح طور پر اس کی طاقت اور خفیہ ذرائع کو سمجھے بغیر اس کے باپ کو اغوا کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ سوچنے کے انداز میں بولا "ہوں' یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جہاں وہ تنہا قید کی گئی تھی' وہاں اس کا مشیر اور محافظ اجل کیسے پہنچ گیا تھا؟ اسے کیسے معلوم ہوا کہ وہ وہاں قید کی گئی ہے؟ پھر اس نے اور مرجانہ نے میرے بیٹے کو گن پوائنٹ پر رکھ کر ہمارے دس وفاداروں کو وہاں سے چلے جانے پر مجبور کیا۔"

"بس آپ ایسی ہی لائن پر سوچیں کہ آپ حاکم علی کو بھی اغوا کر کے کہیں چھپائیں گے تو آپ کے مطالبات پورے ہونے سے پہلے انہیں خفیہ اڈے کا علم ہو جائے گا۔ لہٰذا سوال کا جواب تلاش کریں کہ اجل کن ذرائع سے آپ کے خفیہ اڈوں کا پتہ چلا سکتا ہے۔"

"میں کل ہی سردار حاکم علی سے ملنے گیا تھا۔ پتا چلا حویلی میں مرجانہ اور اجل نہیں ہیں۔ شہر گئے ہوئے ہیں۔ الیکشن کے سلسلے میں مصروف ہیں۔ میں نے حاکم علی سے اجل

کے متعلق کچھ سوالات کئے۔ بڈھا بہت گہرا ہے' کچھ بتاتا نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ وہ اجل کو نہیں جانتا ہے۔ مرجانہ اسے شہر سے لائی تھی۔ وہ اپنی ذہانت اور بہترین کارکر کے باعث ان باپ بیٹی کے دل جیت چکا ہے۔"

"اس کی دوسری بیٹی یعنی آپ کی بہو فرزانہ کہاں ہے؟"

"حماد اسے بڑی محبت سے گھر لے آیا ہے۔ اب تو محبت سے ہی کام نکالنا ہو گا۔ ا کی زچگی کا وقت قریب ہے۔ کل اسے شہر لے جایا جائے گا۔ ہم دعا مانگ رہے ہیں کہ ہو۔" سردار جنید دعا مانگتے وقت کہتا تھا کہ یہ اس کی دلی تمنا ہے کہ اس کے ہاں ایک ہو۔ پھر وہ فخر سے کہتا تھا کہ آباؤاجداد کے زمانے سے ان کے ہاں پہلے نر بچہ ہوتا آیا یوں تو یہ سرداری کا معاملہ تھا۔ نر بچہ ہی ضروری تھا۔ ویسے دیکھا جائے تو کوئی گھر ایسا نہ ہے' جہاں بیٹے کی تمنا نہ کی جاتی ہو' بد بختی سے بیٹی ہو تو اسے اللہ کی مرضی سمجھ کر ق کر لیا جاتا ہے۔ اگر یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں نہ ہوتا اور بیٹے بیٹی بازار سے خرید لانے کا سلسلہ ہوتا تو سب ہی بیٹا خرید کر لاتے۔ پھر دکانوں میں صرف بیٹیاں خریدار انتظار میں بیٹھی رہا کرتیں۔ بیٹھنے کا لائسنس تو سرکار سے ملتا ہی رہتا ہے۔

فرزانہ بہت خوش تھی۔ جب سے حماد اسپتال سے آیا تھا' تب سے وہ ایک مح کرنے والا شوہر بن گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے سامنے گھونگھٹ میں آئی تو حماد گھونگھٹ الٹ کر کہا۔ "تم میری فرزانہ ہو' میری بیوی ہو۔ مجھے اپنی غلطیوں کا احساس گیا ہے۔ آج سے ہم نئی زندگی شروع کریں گے۔" فرزانہ کو شادی کے گیارہ ماہ بعد بار سہاگن کی خوشیاں نصیب ہوئیں۔ اسے حمل کے ساتویں مہینے سے ہی کچھ تکلی ہونے لگی تھی۔ مقامی لیڈی ڈاکٹر علاج کر رہی تھی۔ اسے برے برے خواب آنے تھے لیکن نویں مہینے میں اچانک شوہر کی محبت ملی تو وہ ساری تکلیفیں بھول گئی۔ پھر حماد اسے اپنی کار میں کراچی لے آیا۔ ایک بڑے اسپتال میں اسے داخل کرایا۔ وہ بہت خو تھی۔ مگر وہاں کی تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر نے کہا "مسٹر! آپ نے بیوی سے بڑی غفلت ہے۔ حمل کی ابتدا سے ہی چیک اپ کراتے رہنا چاہیے تھا۔"

حماد نے پوچھا "بات کیا ہے' ڈاکٹر.......... اسے کیا بیماری ہے؟"

"کیس بگڑنے کا چانس ہے۔ مگر ہم اس پر پوری توجہ دیں گے۔ آپ یہ دوائیں آئیں۔"

اس شام سردار جنید ایک پوتے کی خوش خبری سننے آیا۔ بیٹے نے کہا "بری خبر یہ کہ فرزانہ کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی تھی' کیس بگڑنے کا چا

ہے۔"

"زچگی کے سینکڑوں کیس بگڑتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود بچوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نے بچے کی حالت تو بتائی ہو گی کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"وہ ڈاکٹر ایک خاتون ہے۔ مجھے کھل کر کوئی بات نہیں بتا رہی ہے۔ البتہ کل صبح الٹراساؤنڈ کے ذریعے بچے کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے گا۔"

دوسرے دن باپ بیٹے اسپتال پہنچے تو الٹراساؤنڈ کے ذریعے پتا چلا کہ بیٹا ہونے والا ہے۔ آدھی رات سے پہلے زچگی ہو سکتی ہے لیکن ماں کی طرح بچہ بھی کمزور ہے۔ حماد سے کہا گیا تھا کہ نارمل زچگی کا امکان بہت کم ہے۔ شاید میجر آپریشن کرنا پڑے۔ ایسے آپریشن سے پہلے اسپتال کے ایک مخصوص اجازت نامے پر شوہر دستخط کرتا ہے تاکہ زچگی کے مراحل میں زچہ یا بچہ ہلاک ہو جائے یا دونوں کی ہلاکت ہو جائے تو اسپتال والوں کو الزام نہ دیا جائے۔ سردار جنید نے بیٹے کو ایک طرف لے جا کر رازداری سے کہا "کسی طرح معلوم کرو' کیا تمہارا بیٹا یعنی میرا پوتا کسی طرح بھی بچ سکتا ہے؟"

"بابا! ہم دعا کریں گے تو میرا بیٹا صحیح سلامت پیدا ہو گا۔"

"تم گدھے ہو۔ دعا مسجد میں کی جاتی ہے۔ یہ اسپتال ہے۔ یہاں بچہ دوا سے اور تدبیر سے پیدا ہو گا۔"

"کیسی تدبیر؟ میں نہیں سمجھا۔"

"بیٹے! میں نے دنیا دیکھی ہے۔ درجنوں زچگیوں کے کیس سنے ہیں۔ کیس بگڑ جائے تو ڈاکٹر زچہ کو بچاتے ہیں۔ بچے کی پروا نہیں کرتے کیونکہ بچے پھر بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر ہمیں ایک بیٹے کی خوشخبری مل چکی ہے۔ کیا تم چاہو گے کہ میجر آپریشن ہو تو ڈاکٹر فرزانہ کو بچا لے اور تمہارے بیٹے' میرے پوتے کو مرنے دے؟"

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "بابا! میں نے ادھر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ بیٹا ضروری ہے بلکہ صرف بیٹا ہی ضروری ہے۔"

"تو پھر اسپتال کے فارم پر کیا اپنے بیٹے کی موت کا پروانہ لکھ کر دستخط کرو گے؟"

وہ پھر سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ اس کے بعد بولا "پہلے میں اسپتال کا وہ مخصوص فارم پڑھوں گا اور اس میں یہ سوال کیا گیا ہو گا کہ میں بیوی چاہتا ہوں یا بچہ؟ تو میں بچے کی سلامتی کے لیے دستخط کروں گا۔"

"بیٹے! ڈاکٹر جان بچانے کے لیے ہوتے ہیں۔ جان لینے کے لیے نہیں۔ تم کس عقل سے سوچ رہے ہو کہ آپریشن کرنے والا ڈاکٹر اس فرزانہ کو نہیں بچائے گا جو زندگی

گزارتی چلی آرہی ہے اور اس بچے کو بچالے گا' جس نے دنیا میں آکر ایک بھی سانس نہیں لی ہے۔ تم صرف اپنے بیٹے کی سلامتی چاہو گے تو ڈاکٹر تمہاری خاطر فرزانہ کو قتل نہیں کرے گا۔"

قتل! آپریشن تھیٹر میں چاقو' قینچی جیسے اوزاروں سے بعض مریضوں کا قتل ہو ہے۔ مگر وہ قتل نہیں کہلاتا۔ انسانی جان بچانے کی ایک ایماندارانہ کوشش کہلاتی ہے لیکن سرداری نظام کے آپریشن تھیٹر میں کوئی ایک قتل ہوتا ہے۔ ماں یا بیٹا! کھرا سکہ بیٹا ہوتا ہے۔ آئندہ زمانوں تک یہ سکہ رائج الوقت رہتا ہے۔ ماں تو ٹکسالی مشین ہوتی ہے ناکارہ ہو جاتی ہے تو دوسری آجاتی ہے۔ سردار جنید نے کہا "کیا تم اخبارات نہیں پڑھتے دیوار پر لگے ہوئے پوسٹروں پر نظر نہیں ڈالتے؟ ٹی وی اور سینما کے اسکرین پر یہ مشورے نہیں پڑھتے کہ بچے کم پیدا کرو۔ جب سرکار بھی یہی کہتی ہے تو اسپتال میں ڈاکٹر بچے کو کیوں بچائے گا' وہ ماں کو اولیت دے گا۔ بچہ بچ گیا تو ٹھیک ہے ورنہ بچے کم خوش حال گھرانا لیکن سرداری نظام میں گھرانے کی خوشحالی بیٹے سے ہوتی ہے' ماں سے نہیں ہوتی۔"

"میں خوب سمجھ رہا ہوں بابا! مگر اب کیا ہو گا؟ آپ کے پوتے کو کیسے بچایا جائے؟"

"تم ہمیشہ کام بگاڑتے ہو پھر پوچھتے ہو' اب کیا ہو گا؟ تمہیں فرزانہ کو اتنے بڑے اسپتال میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"پھر اسے کہاں لے جاتا؟"

"یہ بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں ہر جگہ دو نمبر کا مال ملتا ہے۔ کیا دو نمبر کے میٹرنٹی ہوم اور ڈاکٹر نہیں ملتے ہوں گے؟ ضرور ملتے ہوں گے۔ تم اپنی بیوی کو اس اسپتال سے نکالو اور کوٹھی میں لے جاؤ۔ میں دو نمبر کے ایک ڈاکٹر سے واقف ہوں۔ ابھی جاکر اس سے معاملات طے کرتا ہوں پھر تمہیں فون کروں گا۔ تم فرزانہ کو لے کر چلے آنا۔"

لیڈی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ زچگی آدھی رات تک ہو سکتی ہے۔ ابھی تقریباً دس گھنٹے باقی تھے۔ زچگی کی نئی جگہ اور نئے انتظامات کے لیے کافی وقت تھا۔ فرزانہ حماد کے ساتھ کار میں آکر بیٹھ گئی' پھر بولی "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"اپنی کوٹھی میں۔ یہ اسپتال مجھے پسند نہیں ہے۔"

وہ ہلکی ہلکی تکلیف برداشت کر رہی تھی۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا مگر حماد کے ساتھ رہ کر مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ شوہر کی محبت اور توجہ پا کر بڑے حوصلے سے تکلیف برداشت کر رہی تھی۔ اس نے کہا "ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ آج رات تک زچگی ہو سکتی

ہے۔"

وہ بولا "فکر نہ کرو۔ بابا ایک بہت اچھے اسپتال میں انتظامات کرنے گئے ہیں۔ ہم کوٹھی سے اسپتال جائیں گے۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔ تمہیں سنبھالنے کے لیے حویلی سے کسی ملازمہ کو لانا چاہیے تھا۔"

وہ بڑے درد سے مسکرا کر بولی "میں نہیں بھولی تھی۔ کسی ملازمہ کو ساتھ لا سکتی تھی۔ مگر میں زیادہ سے زیادہ آپ کے ساتھ تنہا رہنا چاہتی ہوں۔ خدا ہماری مرادیں پوری کرے۔ میں چاہتی ہوں اپنے بچے کے سوا ہماری تنہائی میں کوئی تیسرا نہ ہو۔"

وہ دونوں کوٹھی پہنچے۔ آدھے گھنٹے بعد ہی سردار جنید نے ایک پرائیویٹ اسپتال کا پتا بتا کر کہا "فرزانہ کو فوراً لے آؤ۔ ہماری مراد پوری ہو سکے گی۔ ڈاکٹر معاملات طے کرنے سے پہلے فرزانہ کا معائنہ کرنا چاہتا ہے۔"

حماد نے کہا "میں ابھی اسے لے کر آرہا ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر بیڈ روم میں آیا۔ فرزانہ موبائل فون پر کہہ رہی تھی "میں ابھی اسپتال جانے والی ہوں۔ کل رات اسپتال سے بھی فون کیا تھا۔ گھنٹی بجتی رہی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ مرجانہ آخر کہاں گئی ہے؟؟"

وہ دوسری طرف کی باتیں سنتی رہی پھر بولی "اچھی بات ہے وہ رات کو کھانے کے وقت گھر آئے گی تو حماد اسے اسپتال کا پتا اور فون نمبر بتا دیں گے۔ میری حالت اچھی رہی تو میں خود فون کرلوں گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ حماد نے کہا "چلو اٹھو' ایک اچھے اسپتال میں انتظام ہو رہا ہے۔ میں مرجانہ سے برابر رابطہ رکھوں گا اور اسے اسپتال کا پتا بتا دوں گا۔ اب یہ موبائل مجھے دے دو۔ مجھے کچھ ضروری کالیں کرنی ہیں۔" اس نے فرزانہ سے موبائل فون لے لیا تاکہ وہ اسپتال پہنچنے کے بعد مرجانہ سے رابطہ ہی نہ کر سکے۔ وہ حماد کے ساتھ اس اسپتال میں پہنچی تو اسے خوف سا محسوس ہوا۔ اس کی دیواریں بے رنگ و روغن تھیں۔ اسپتال کا باقاعدہ عملہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ شدید تکلیف میں مبتلا تھی۔ اسے کار سے لیبر روم تک اسٹریچر ٹرالی پر لے جانے کا بھی انتظام نہیں تھا۔ وہ حماد کے سہارے اسپتال کے اندر اپنے قدموں سے گئی تو بڑا حوصلہ ملا کہ اس کا محبوب شوہر اور محافظ اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

ایک بند کمرے میں ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔ سیاہ رنگت والی بوڑھی ڈاکٹر کا چہرہ بھی بھیانک سا تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی سی تھیں۔ سرخ بلب کی طرح

گھورتی تھیں۔ دانت اس حد تک بڑے تھے کہ ہونٹ بند نہیں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر ایک بھاری بھرکم شخصیت کا مالک دکھائی دیتا تھا۔ مگر آنکھوں سے اور چہرے سے قصائی نظر آ تھا۔ وہ معائنے کے بعد اپنے دفتری کمرے میں آیا۔ وہاں سردار جنید اور حماد بیٹھے ہو تھے۔ اس نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر کہا "آپ کیس زیادہ بگاڑنے کے بعد اسے لائے ہیں بچہ اتنا کمزور ہے کہ میجر آپریشن کے بغیر پیدائش ناممکن ہوگی۔"

سردار جنید نے کہا "میں آپ سے کہہ چکا ہوں۔ ہماری پہلی اور آخری ضرورت و بچہ ہے۔ آپ فوراً آپریشن کے ذریعے ناممکن کو ممکن بنائیں۔ میں آفر دے چکا ہوں یہاں سے ایک پوتا لے جانے کے لیے ابھی پچیس ہزار دوں گا۔"

"یہ تب کی بات ہے، جب میں نے زچہ کا معائنہ نہیں کیا تھا۔" پھر سر جھکا کر سرگوشی میں بولا "بچے کو صحیح سلامت نکالنے کے لیے ایک طرح سے قتل جیسا آپریشن ہوگا۔ میں اتنا بڑا کیس پچاس ہزار سے کم میں نہیں کروں گا۔"

دو نمبری ڈاکٹر نے زچہ کی نازک حالت کو خوب سمجھ لیا تھا۔ یہ سمجھ گیا تھا کہ ایک حالت میں اب وہ باپ بیٹے اسے دوسرے اسپتالوں میں لیے نہیں پھریں گے اور کہیں لے بھی گئے تو محض ایک زندہ بیٹا اور مُردہ بہو حاصل نہیں کر سکیں گے۔ آپریشن کے دوران سب سے پہلے زچہ کو بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بچے کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور عموماً بچتا نہیں ہے۔

سردار جنید نے کہا "حماد! فارم پُر کرو اور دستخط کرو۔ میں رقم لا رہا ہوں۔" باپ اٹھ کر کمرے سے باہر گیا۔ بیٹا ڈاکٹر سے فارم لے کر اسے پُر کرنے لگا۔ اسپتال کے باہر سردا کی پجیرو کے آس پاس مسلح وفادار کھڑے ہوئے تھے۔ سردار نے پجیرو کے اندر آ کر پچھلی سیٹ کا اوپری حصہ اٹھایا۔ اندرونی حصے میں اسلحے کے ساتھ بڑے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے پچاس ہزار نکال کر اسے ایک کاغذ میں لپیٹا۔ باہر آ کر پجیرو کو لاک کیا۔ پھر واپس دو نمبری کے دفتر کی طرف جانے لگا۔

انسان کی زندگی میں صرف ایک موت ایسی ہے، جو مفت لی جاتی ہے اور مفت دی جاتی ہے لیکن وہ پچاس ہزار دینے جا رہا تھا کیونکہ سودا صرف اجل کا نہیں، ایک زندہ پوتے کا بھی تھا۔

☆========☆========☆

تاریکی! گہری تاریکی جیسے قبر کے اندر ہوتی ہے۔

اس کی عادت تھی کہ وہ خواب گاہ میں سونے سے پہلے تمام لائٹس بجھا دیتی تھی۔ کھلی آنکھوں سے گہری تاریکی میں تکتی رہتی تھی اور سوچتی رہتی تھی۔ ان لمحات میں کئی طرح کی سوچیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ اپنے بنگلے میں رات کے کھانے کے دوران ملازمہ نے بتایا تھا کہ بی بی فرزانہ کا فون آیا تھا۔ پھر کسی وقت فون آئے گا اور وہ بتائیں گی کہ کس اسپتال میں ہیں۔

اسے فون کا انتظار تھا۔ اسی وقت گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا "ہیلو فرزانہ؟"

سردار حاکم علی کی آواز سنائی دی "بیٹی! میں ہوں۔ دوپہر کو پتا چلا تھا کہ فرزانہ کو اسپتال سیونتھ ڈے میں داخل کرایا گیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فون کیا تو سیونتھ ڈے سے خبر ملی کہ حماد، فرزانہ کو وہاں سے لے گیا ہے۔"

"جی ہاں دو گھنٹے پہلے فون آیا تھا۔ میں یہاں نہیں تھی۔ ملازمہ نے کہا ہے کہ پھر فون آئے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ کس اسپتال میں ہے۔ اطلاع ملتے ہی فوراً وہاں جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے بیٹی! مجھ سے رابطہ رکھو اور اس کی خیریت بتاتی رہو۔ میں صبح وہاں پہنچوں گا۔"

"بابا! وہ دونوں باپ بیٹے سیدھے ہوگئے ہیں۔ پرسوں فرزانہ نے فون پر بتایا تھا کہ حماد دن رات اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ وہ اپنے اطمینان کے مطابق فرزانہ کو کسی بہترین اسپتال میں لے گیا ہوگا۔"

"ان باپ بیٹے کی دُکھتی رگ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اب وہ انسان بن کر رہیں گے۔"

"اللہ کرے وہ انسان ہی رہیں لیکن اجل کہہ رہا تھا، سیاست میں بگلا بھگت زیادہ ہوتے ہیں۔ کسی لمحے میں بھی بازی ایسی پلٹ جاتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور

سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا۔"

"اجل بڑی ذہانت کی باتیں تمہیں سمجھاتا ہے۔ ہم ان باپ بیٹے کی عزت کریں
لیکن بھروسا نہیں کریں گے۔ اسپتال کا پتا معلوم ہوتے ہی تم بہن کے پاس چلی جانا۔ م
صبح ضرور آؤں گا۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ ریسیور رکھ کر پھر تاریکی کی آغوش میں لیٹ گئی۔ مختلف نوعی
کے خیالات پھر گڈمڈ ہونے لگے۔ اجل کی ایک بات ان خیالات پر حاوی ہو رہی تھی
سیاست میں ہار جیت' عداوت اور نفرت سب ہوتی ہے صرف محبت نہیں ہوتی۔ حیا
انسانی کا یہ اہم شعبہ ہمیشہ محبت سے خالی رہتا ہے۔ اس ملک میں سیاست کے حوالے
آج تک کسی کو محبت اور عنایت نہیں ملی۔ پھر فرزانہ کو حماد کیسے محبت دے رہا ہے
سیاست کی بنیاد کچھ لو اور کچھ دو پر ہے۔ پھر وہ کیا لینے کے لیے اس عورت کو محبت د
رہا ہے' جسے فرزانہ نہیں' مرجانہ سمجھ کر قبول کرتا رہا؟

تب' ہاں اور تب آگہی کے آسیب نے اپنی آنکھ کھولی۔ گہری تاریکی میں وہ منظ
روشن ہوگیا۔

اس نے دیکھا' ایک تلوار ہے جو آہستہ آہستہ اپنی نیام سے نکل رہی ہے۔ تلوار خو
نہیں نکلتی' نکالی جاتی ہے۔ دو ہاتھ جو دستانے پہنے ہوئے تھے' وہ اس تلوار کو نکال ر
تھے۔

آگہی واضح نہیں تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ڈاکٹر نے دستانے پہنے تھے۔ وہ تلوا
نہیں آپریشن کے اوزار تھام رہا تھا۔ آگہی کے آسیب نے منظر دکھایا کہ دستانے پہنے ہو
ہاتھوں نے اس کے پیٹ میں تلوار کی نوک پیوست کر دی ہے اور اس کے پیٹ کو او
سے نیچے تک چاک کر رہا ہے۔ اس نے صرف چاک کرنے یا چیرنے پر اکتفا نہیں کیا
بلکہ اس کا پیٹ پھاڑ رہا ہے۔

دنیا کے ہر انسان کی پہلی آواز اشک آلود چیخ سے شروع ہوتی ہے۔ بچے نے اپ
پہلی چیخ سنائی۔ دو دستانے والے ہاتھوں نے بچے کی ننھی سی ٹانگوں کو پکڑ کر اسے الٹا لٹکا
ہوا تھا۔ طبی طریقہ کار سے اس کی سانسیں بحال کر رہا تھا۔ اس الٹے لٹکے ہوئے بچے کا سر
نیچے کی طرف ماں کے دائیں ہاتھ کی طرف تھا۔ اور اس دائیں ہاتھ کی چھنگلی میں چاندی کا
ایک چھلا تھا۔

مرجانہ بہن کو پکارتی اور چیختی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے اطراف گہری تاریکی
تھی۔ اس تاریکی میں اجل کا خاکہ سا نظر آ رہا تھا۔ وہ چیخ کر بولی "اجل! میری بہن۔ میری

فرزانہ............"

باہر بادل زور سے گرجا۔ بجلی نے کڑک دار آواز سنائی۔ ان آوازوں میں اجل کی
آواز ابھری۔

آغاز کسی شے کا نہ انجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

☆=========☆=========☆

وہ تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کر رہی تھی اور اجل سے پوچھ رہی تھی۔ "سچ بتاؤ' جو
آگہی مجھے مل رہی تھی' وہ درست رہی؟ کیا میری فرزانہ کو قتل کیا گیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "مرجانہ! تمہاری بہن اسپتال میں تھی آپریشن تھیٹر میں قتل نہیں
ہوتا' وہاں زندگی بچائی جاتی ہے لیکن دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے' جہاں چھپ چھپا کر یا
سر توڑ کوشش کر کے زندگی بچالی جاتی ہو۔ خواہ وہ آپریشن تھیٹر ہو یا ماں کی گود۔"

وہ اسپتال کے سامنے گاڑی روک کر بولی۔ "تم گول مول باتیں کر رہے ہو' صرف
ہاں یا نہ میں جواب دو۔ کیا میری بہن کو قتل کیا گیا ہے؟"

"بعض اوقات اجل کے پاس ہاں یا نہ میں جواب دینے کا بھی وقت نہیں رہتا۔ مجھے
ابھی پانچ سیکنڈ کے اندر ایک جسم کو روح سے خالی کرنا ہے۔ اس لیے جا رہا ہوں۔" وہ چلا
گیا۔ مرجانہ کار سے نکل کر اسپتال کے اندر جانے لگی۔ شام کو ملازمہ نے بتایا تھا کہ بی بی
فرزانہ کسی دوسرے اسپتال میں منتقل ہوگئی ہیں۔ وہاں سے فون کر کے اس اسپتال کا پتا
بتائیں گی لیکن بتانے کی نوبت نہیں آئی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ یہ تو اجل
ہی کو معلوم تھا کہ وہ مقتولہ کس اسپتال میں ہے۔ لہٰذا وہ مرجانہ کو وہاں تک پہنچا کر اُس
سے جدا ہوگیا تھا۔ حماد نے دور ہی سے مرجانہ کو آتے دیکھا تو گھبرا گیا۔ دوڑتا ہوا اپنے باپ
سردار جنید کے پاس آیا۔ وہ ڈاکٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کہا "بابا! مرجانہ آ رہی
ہے۔"

باپ بیٹے اب تک مطمئن اور خوش تھے۔ مرجانہ کی آمد پر پریشان ہوگئے۔ باپ نے
پوچھا۔ "کیا اِدھر آ رہی ہے؟"

"ادھر انکوائری کاؤنٹر کی طرف جا رہی تھی۔ معلومات حاصل کر کے ادھر ہی آئے
گی۔"

ڈاکٹر نے پوچھا "پریشانی کیا ہے؟ کیا تم لوگوں نے کسی کو قتل کیا ہے؟ کیا آپریشن کے
دوران موت واقع نہیں ہوتی ہے؟"

حماد نے کہا "ہاں ہوتی ہے۔ مجھے بیوی کی موت پر رونا چاہئے مگر کیسے رونا آئے؟ زبردستی آنسو نہیں آتے۔"

ڈاکٹر نے کہا "آجاتے ہیں، تم دونوں دوسرے کمرے میں جاؤ۔"

وہ چلے گئے۔ اس نے آپریشن کے وقت اسسٹ کرنے والی لیڈی ڈاکٹر کو بلا کر "ان باپ بیٹے کی آنکھوں میں گلیسرین لگادو اور ایک چھوٹی سی شیشی میں انہیں دے د وہ جب چاہیں گے اس کے استعمال سے آنکھوں میں آنسو لاتے رہیں گے۔"

لیڈی ڈاکٹر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد مرجانہ نے دروازے پر آکر پوچھا۔ "کیا م اندر آسکتی ہوں؟"

"تشریف لائیں۔ ویسے ابھی ایک آپریشن کے بعد بری طرح مایوسی اور تھک محسوس کر رہا ہوں۔ اگر آپ دوسرے کسی ڈاکٹر سے رجوع کریں تو........."

وہ بولی "میرا نام مرجانہ ہے۔ میں نے ابھی معلوم کیا ہے، آپ نے ہی میری بہ فرزانہ کا آپریشن کیا ہے۔ مجھے نتیجہ بھی معلوم ہو چکا ہے۔ میں اپنی بہن سے محروم ہو چ ہوں مگر یہ کیسے ہو گیا۔ وہ زچگی سے پہلے کچھ زیادہ بیمار یا کمزور نہیں تھی۔ پھر آپریشن نوبت کیوں آئی؟"

"محترمہ! ڈاکٹر میں ہوں۔ اس کی بیماری اور کمزوریوں کو آپ سے زیادہ سمج ہوں۔ اس کا شوہر اسے اسپتال سیونتھ ڈے سے یہاں لایا تھا۔ وہاں بھی اس کا آپریش ہونے والا تھا لیکن ایک دن پہلے اس اسپتال میں ایک زچہ آپریشن کے دوران مرگئی تھی آپ کی بہن نے اسے بدشگونی سمجھا۔ اپنے شوہر سے ضد کی کہ وہ دوسرے اسپتال می جائے گی۔ وہ بہت بری حالت میں یہاں لائی گئی تھی۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ میں نے اسے بچا کی ہر ممکن کوشش کی مگر افسوس۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگی۔ یہ کیا معما ہے؟ اجل نے واضح جوا نہیں دیا اور ڈاکٹرز زندگی دیا کرتے ہیں۔ جان بوجھ کر کسی کو موت کے گھاٹ نہیں اتار پھر......... پھر وہ آگہی کیا تھی؟ اس نے آہٹ سن کر سر اٹھایا۔ دونوں باپ بیٹے درواز پر کھڑے تھے۔ دھاروں آنسو رواں تھے۔ حماد نے روتے ہوئے کہا۔ "آہ! مرجانہ! میر زندگی مجھ سے روٹھ کر چلی گئی۔ اپنی فرزانہ کو اب کہاں سے لاؤں۔ اس نے اپنی محبت ایک نشانی دی اور ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی........."

سردار جنید کا چہرہ بھی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا مرجانہ کے پاس آیا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا "میں تمہیں کس زبان سے کہوں کہ بیٹی صبر کرو۔ میں ا

نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ خود مجھ سے صبر نہیں ہو رہا ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مرجانہ کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ دونوں اس کی بہن کے لیے رو رہے تھے۔ پھر وہ کیسے نہ روتی؟ ان کی آنکھیں گلیسرین کے باعث سرخ ہو گئی تھیں اور آنسو سچے لگ رہے تھے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ کوئی سچا روئے تو اثر نہیں ہوتا۔ جھوٹے کے آنسو بڑی جلدی متاثر کر دیتے ہیں۔ باپ بیٹے ایسے آنسو روتے وقت اپنے اپنے کلیجے میں بڑی ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے۔ انتقامی کارروائی کے پہلے مرحلے میں زبردست کامیابی ہوئی تھی۔ دشمن کی ایک بیٹی مرگئی تھی اور ان کے لیے بیٹا اور پوتا چھوڑ گئی تھی۔ سردار جنید پوتے کی پیدائش سے پہلے ہی اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر کہتا آیا تھا کہ آباؤاجداد کے زمانے سے ان کے خاندان میں آنے والی ہر بہو پہلے ایک بیٹا پیدا کرتی ہے۔

حماد نے روتے ہوئے کہا "اچھا ہوا تم آگئیں۔ اپنی بہن کے بیٹے کو تم ہی سنبھال سکتی ہو۔ وہ بہت کمزور ہے۔ وہ انتہائی نگہداشت میں ہے۔ ایک ڈاکٹر اور نرس مسلسل اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔"

اسی وقت ایک نرس نے آکر ڈاکٹر سے کہا "سر! سو سوری........." وہ کہتے کہتے رک گئی پھر مرجانہ اور ان باپ بیٹے کو دیکھا۔ اس کے بعد جھجکتے ہوئے بولی "دی چائلڈ از نو مور۔ ہم نے بہت کوشش کیں۔ مگر........."

حماد نے تڑپ کر کہا "نہیں، میرا بیٹا نہیں مرسکتا۔ تم جھوٹ کہتی ہو۔ وہ نہیں مر سکتا۔ وہ زندہ رہے گا۔" وہ تیزی سے چلتا ہوا ادھر چلا گیا، جدھر بچے کو خصوصی نگرانی میں رکھا گیا تھا۔ مرجانہ بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ سردار جنید بے جان سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا یہ دعویٰ درست رہا تھا کہ ان کے خاندان میں آنے والی ہر بہو پہلے بیٹا پیدا کرتی ہے مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس اسپتال میں مرجانہ کے ساتھ اجل بھی آیا ہوا ہے اور وہ بڑی عجلت میں تھا۔ اسے پانچ سیکنڈ کے اندر ایک روح قبض کرنی تھی اور وہ روح اسی بچے کی تھی۔ زندگی، موت کی قرض دار ہوتی ہے۔ کوئی پیدا ہوتے ہی یہ قرض یکمشت ادا کر دیتا ہے۔ جیسے اس بچے نے ادا کیا اور جو یکمشت ادا نہیں کرتے، وہ یہ قرضہ قسط وار لمحہ لمحہ، دکھ درد کے سود کے ساتھ ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔ سردار حاکم علی کو فون کے ذریعے اطلاع دے دی گئی کہ اس کی بیٹی زچگی کے کیس میں بچے کے ساتھ فوت ہو گئی ہے اور ماں بچے کی میت کراچی سے بیلہ لائی جا رہی ہے۔

سردار جنید نے کراچی سے سفر کرنے کے دوران حاکم علی سے فون پر کہا "تقدیر کے

آگے ہم بے بس ہیں۔ تمہاری بیٹی اور میری بہو کی زندگی بس اتنی ہی تھی لیکن برادر علی' سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرزانہ اور میرے پوتے کی تدفین کہاں ہوگی؟ مرجانہ ان میت بیلہ لے جا رہی ہے۔ جبکہ فرزانہ میری بہو تھی اور پوتا میرا ہے۔ ان کی آخ آرام گاہ ہمارے خاندانی قبرستان میں ہونی چاہیے۔"

حاکم علی نے کہا "آپ اصولاً درست کہہ رہے ہیں' میں ابھی مرجانہ سے کہتا ہو کہ وہ راستہ بدل کر آپ کی طرف جائے' میں بھی وہیں آجاؤں گا۔"

حاکم علی نے اس سے رابطہ ختم کرکے فون پر مرجانہ کو مخاطب کیا "بیٹی! کیا تم بہن ادھر لا رہی ہو؟"

"جی ہاں۔ ایک گھنٹے میں پہنچ جاؤں گی۔"

"دیکھو بیٹی! تم سمجھ دار ہو۔ فرزانہ اور بچے پر حماد کا حق ہے۔ ابھی سردار جنید بات ہوئی ہے۔ وہ اپنے خاندانی قبرستان میں ان کی تدفین چاہتے ہیں۔"

"بابا! آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"وہ اصولاً" درست کہہ رہے ہیں۔ میت اُدھر لے جاؤ۔ میں بھی آرہا ہوں۔"

وہ راضی ہو کر فون بند کرنا چاہتی تھی۔ پھر رک گئی۔ اجل کی آواز آئی۔ "اپنے سے کہو' میت نہ میکے جائے گی نہ سسرال۔ تم یہ میت گاڑی سپات بندر اور میلان بند کے درمیان وہاں لے جارہی ہو' جہاں سمندری کٹاؤ سے ایک تنگ خلیج سی بنی ہو ہے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو۔ میں میت کو ادھر کیوں لے جاؤں؟"

"پہلے جو کہہ رہا ہوں' وہی اپنے بابا سے کہو۔ بعد میں مجھ سے بحث کرتی رہنا۔ ا سے یہ بھی کہنا کہ وہ گورکن مزدور اور تجہیزو تکفین کے اسباب کے ساتھ آئیں۔"

مرجانہ نے اس کی ہدایت کے مطابق باپ سے یہی کہا۔ باپ نے حیرانی سے پوچھا "بیٹی! تم یہ بے تکی حرکت کیوں کررہی ہو؟ میت خراب نہ کرو۔ کسی تیسری جگہ اسے نہ لے جاؤ۔"

"بابا! یہ اجل کا مشورہ ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اس کے مشوروں میں مصلحت اندیشی ہوتی ہے۔ آپ گورکن مزدور اور آخری رسومات کے تمام سامان کے ساتھ آئیں۔ میں اس سلسلے میں سردار جنید سے بات کررہی ہوں۔"

اس نے رابطہ ختم کرکے پوچھا۔ "ہاں اجل! اب بتاؤ' بات کیا ہے؟"

وہ بولا "کیا تم بھول گئیں جہاں تمہیں اغوا کیا گیا تھا' وہاں میں نے کہاں تھا کہ سپات

بندر اور میلان بندر کے درمیان ایک سیاسی قبرستان بنے گا۔"

یہ سنتے ہی اس نے کار روک دی۔ پیچھے آنے والی میت گاڑی بھی رک گئی۔ وہ بولی "اس کا مطلب ہے' میری بہن سیاست سے ماری گئی ہے اور تم مجھ سے حقیقت چھپاتے رہے ہو۔"

"میں تمہارا دوست ہوں۔ تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا لیکن بتانے کا ایک سلیقہ' ایک طریقہ ہوتا ہے۔ تمہیں اسپتال میں حقیقت معلوم ہوتی تو وہاں قیامت مچادیتیں لیکن کبھی ثابت نہ کرپاتیں جبکہ تمہاری آگہی درست تھی۔ قتل ہوا تھا۔ پولیس' عدالت' قانون کوئی تسلیم نہ کرتا۔ سب کچھ طبی طریقہء کار کے مطابق ہوا ہے۔"

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولی "میں ان باپ بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

"اجل سے کہہ رہی ہو کہ انہیں زندہ نہیں چھوڑوگی۔ ان کی روح مجھے قبض کرنی ہے۔"

"تم میرے دوست ہو یا دشمن؟ کیا دشمن ہو؟ اسی لیے انہیں معاف کررہے ہو؟"

"میں دوست ہوں۔ یقین نہیں کروگی' تب بھی دشمن نہیں بنوں گا۔ کیونکہ صرف مقررہ وقت پر زندگی کا دشمن بنتا ہوں۔ نہ تمہارا' نہ ان کا ابھی کوئی وقت مقرر ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' میں ہزار کوششیں کروں' پھر بھی انتقام نہیں لے سکوں گی؟"

"انتقام تو ان کی آخری سانسوں تک لے سکتی ہو۔ انتقام ایک دوسرا عمل ہے اور کسی کی جان لینا وہ عمل ہے جو صرف میرے لیے وقف ہے۔ دماغ ٹھنڈا رکھو اور منزل کا راستہ بدل کر چلو۔"

وہ راستہ بدل کر آگے بڑھتے ہوئے بولی "مجھے دماغ ٹھنڈا رکھنے کو کہہ رہے ہو۔ کیا میرا کلیجا ٹھنڈا نہیں کرسکتے؟"

"ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ خدا کے کلام کو کیوں بھولتی ہو' اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کے لغوی معنی برداشت کرنا ہے لیکن صبر کے دینی معنی اللہ پر اعتماد کرنا ہیں۔ ایمان ہے تو صبر کرو۔ نہیں ہے تو اپنے دماغ پر جبر کرتی رہو اور غصے میں تپتی رہو۔"

وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتی ہوئی غصے پر قابو پانے اور صبر کرنے کی کوششیں کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے فون کے ذریعے سردار جنید کو مخاطب کیا "ہیلو' میں مرجانہ بول رہی ہوں۔ میرے مشیر اجل نواز کا مشورہ ہے کہ میری بہن کی تدفین نہ میکے میں ہوگی' نہ سسرال میں۔ تدفین ہوگی سیاسی قبرستان میں۔"

"سیاسی قبرستان؟" سردار جنید نے چونکنے کے انداز میں کہا۔ "ہاں یاد آیا۔ تمہا
مشیر نے ایسے کسی قبرستان کا ذکر کیا تھا، مگر بیٹی! یہ بالکل بے تکی بلکہ مضحکہ خیز بات ہے
بہن کے قاتل نے اسے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تو غصہ آیا۔ اجل نے کہا۔ "م
صبر۔ آرام سے بات کرو۔"

وہ بولی "میں میت گاڑی لے کر سپات بندر اور میلان بندر کی درمیانی خلیج
آخری سرے پر آرہی ہوں اور جو کہہ رہی ہوں، اس پر عمل کرو۔ میں بڑے آرام
بول رہی ہوں۔ تم باپ بیٹے بھی آرام سے عمل کرو۔ اپنے رشتے داروں اور اپنی
پارٹی کے اہم ارکان کو لے کر شام تک پہنچ جاؤ۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تم نے اچانک تیور کیوں بدلے ہیں؟ تمہارا
تمہیں اپنے مشوروں سے گمراہ کر رہا ہے۔"

"مجھے جو کہنا تھا، میں کہہ چکی ہوں۔ اب کراچی میں اپنے وکیل سے رابطہ کر
ہوں کہ مجھے اور میرے بابا کو بھی جانی نقصان پہنچ سکتا ہے یا ہمیں اغوا کیا جاسکتا ہے۔
میں صبح تک وکیل کو اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دوں گی تو وہ میرے اجازت نامے
مطابق بینک کے لاکر سے وہ تمام تحریری اور تصویری دستاویزات نکال کر حماد کے س
کیریئر کی دھجیاں اڑائے گا اور عدالت میں ثابت کرے گا کہ تم باپ بیٹے نے جرائم ک
تمام ثبوت حاصل کرنے کے لیے ہمیں اغوا کیا ہے یا مار ڈالا ہے۔ تم دونوں کی بھلائی
میں ہے کہ شام تک اس جگہ پہنچ جاؤ جہاں اس ملک کا پہلا سیاسی قبرستان بننے والا ہے

اس نے فون بند کر دیا۔ اجل نے کہا "اب ذرا غور کرو۔ تمہارے صبر کرنے
دھیمے سے دھمکی دینے کے نتیجے میں وہ باپ بیٹے کس قدر گہری تشویش میں مبتلا ہوں گے۔
تم نے بہن کے قتل سے انجان بن کر اور صرف سیاسی قبرستان کی بات کہہ کر ا
عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسی کو انتقام کہتے ہیں۔ ایسا انتقام موت سے زیادہ تکلیف
ہوتا ہے۔"

ادھر سردار جنید واقعی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے حماد کو مرجانہ کی فون
باتیں سنائیں، پھر فون کے ذریعے سردار حاکم علی سے رابطہ کیا۔ حویلی کے ملازم نے بتا
اس کا آقا حاکم علی تجہیز و تکفین کا تمام سامان لے کر سپات بندر گیا ہے۔ سردار جنید نے
سے کہا "وہ بڈھا حاکم علی بھی بیٹی کی طرح نیا قبرستان بنانے گیا ہے۔ بیٹے! کوئی بہت بڑ
ہونے والی ہے۔ انہیں شاید معلوم ہو گیا ہے کہ فرزانہ کو قتل کیا گیا ہے۔"

"نہیں بابا! وہ واردات قانون کے دائرے میں رہ کر کی گئی ہے۔ دنیا کی کوئی عدا

سے قتل ثابت نہیں کر سکے گی۔ ہمیں خوف زدہ ہو کر ایسی کوئی بات زبان سے نہیں نکالنا
چاہیے، جس سے ہم گرفت میں آجائیں۔"

حماد نے فون پر پارٹی لیڈر سے گفتگو کی۔ اسے تمام حالات سنائے۔ صرف قتل والی
بات چھپائی۔ لیڈر نے کہا۔ "یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ مرجانہ تمہاری بیوی اور
بچے کی قبریں وہاں کیوں بنانا چاہتی ہے اور ہمیں آنے پر کیوں مجبور کر رہی ہے۔"

"یہ تو وہاں پہنچ کر اور مرجانہ سے روبرو گفتگو کرکے معلوم کیا جائے گا کہ اس کے
تیور کیوں بدل گئے ہیں۔ بہرحال ہمیں شام سے پہلے وہاں پہنچنا ہے۔ آپ فوراً پارٹی کے
اہم افراد کے ساتھ آجائیں۔"

انہوں نے دوسرے قبیلے کے سرداروں کو بھی فرزانہ کی آخری رسومات میں شریک
ہونے کے لیے کہا تاکہ وہ بھی مرجانہ کو ایک نیا قبرستان بنانے سے باز رکھیں اور اس سے
معلوم کریں کہ وہ اپنے مشیر کے اشاروں پر کیوں چل رہی ہے؟ شام تک وہ تمام اہم افراد
اپنی اپنی گاڑیوں میں وہاں پہنچنے لگے، جہاں ایک بڑی اور ایک چھوٹی قبر کی کھدائی شروع
ہو چکی تھی۔ وہاں اجل بھی مرجانہ اور سردار حاکم کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ پارٹی لیڈر نے
کہا۔ "مرجانہ! میں تمہیں اور فرزانہ کو اپنی بیٹیاں سمجھتا آرہا ہوں۔ فرزانہ کی موت کا اس
قدر صدمہ ہے کہ اس کی آخری رسومات میں شریک ہونے کے لیے اپنے علاقے سے اتنی
دور چلا آیا ہوں۔ آخر تم نے اپنی بہن کی تدفین کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا؟"

مرجانہ نے پوچھا۔ "کیا سردار جنید اور حماد نے نہیں بتایا کہ یہاں سیاسی قبرستان کا
افتتاح ہو رہا ہے۔"

"بیٹی! افتتاح کا لفظ کسی تعمیری پروجیکٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"

اجل نے کہا "صاحبان! یہ اپنی نوعیت کا سب سے پہلا اور سب سے انوکھا تعمیری
پروجیکٹ ہے۔ آپ حضرات سوالات کرتے رہیں گے اور میں جواب دیتا رہوں گا تو اس
پروجیکٹ کی پوری طرح وضاحت ہوتی رہے گی۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ اس
قبرستان میں صرف وہی لوگ دفن کیے جائیں گے جو سیاست میں مارے گئے ہوں یا بڑی
سیاست سے مارے گئے ہوں۔"

سردار جنید نے کہا "لیکن میری بہو اور پوتا کسی سیاست کا شکار نہیں ہوئے تھے۔
ہمارے پاس اسپتال کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہے۔ میری بہو کی بیماری کے کاغذات اور دواؤں کی
رسیدیں بھی ہیں۔"

"کاغذات، رسیدیں، دستاویزات، ٹاپ سیکرٹ فائلیں، یہ سب سیاسی ہاتھ تیار کرتے

ہیں۔ ہمارے ملک کی بڑی بڑی سیاسی شخصیتوں کو ایسی سازشوں سے مارا گیا کہ ان
قاتل ہاتھوں کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا گیا لیکن ہمارے اس سیاسی قبرستان میں ج
دفن کیا جائے گا اس کی قبر کے کتبے پر اس خفیہ قاتل کا نام لکھا جائے گا۔"

پارٹی لیڈر نے پوچھا "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہاں فرزانہ کے کتبے پر اس
قاتل کا نام لکھا جائے گا اور جو نام لکھا جائے گا' اسے ملک، کا قانون اور عدالت تسلیم کر
گی۔"

اجل نے کہا۔ "بے شک ہم فرزانہ کی قبر کے سرہانے سادہ پتھر نصب کریں۔
میں اس پتھر پر چھ ہندسے لکھوں گا۔ پھر وہ قاتل کسی دن کسی وقت آئے گا اور اس
کتبے پر اقبال جرم کے ساتھ اپنا نام' ولدیت اور پتا لکھ جائے گا۔"

ایک قبیلے کے سردار نے کہا۔ "کیا تم کوئی جادوگر' عامل یا ماہرِ نجوم ہو؟
سروپا بکواس کیے جا رہے ہو۔"

"سانچ کو آنچ کیا ہے۔ یہاں تدفین ہو رہی ہے۔ قبر کے سرہانے سادہ کتبہ
ہو گا۔ سردار جنید' حماد اور یہ سیاسی پارٹی والے یہاں قبرستان بنانے سے ہمیں روک
سکیں گے کیونکہ کسی کو بھی طاقت سے روکا جاتا ہے اور طاقت ہمارے پاس ہے۔ اسی
تم سب یہاں آنے پر مجبور ہوئے ہو۔" تدفین کا کام جاری رہا۔ سردار حاکم علی ا
ملازموں کو حکم دیتا رہا کہ اس قبرستان کے احاطے کی چاردیواری اٹھائی جائے گی۔ قبر
کے باہر کچھ ملازموں کو ان کے خاندانوں کے ساتھ آباد کیا جائے گا تاکہ وہ قبرو
حفاظت کرتے رہیں۔

ماں اور بچے کی قبریں تیار ہوگئیں۔ ان پر پانی چھڑک کر پھولوں کی چادریں بچھ
گئیں۔ فرزانہ کی قبر کے سرہانے ایک سادہ کتبہ نصب کر دیا گیا۔ کتبہ دوسری طرف
سادہ ہی رہتا ہے۔ اجل نے کہا۔ "اس کتبے کے دوسری طرف وہ خفیہ ہاتھ والا دفن
جائے گا جو ابھی ظاہر نہیں ہو رہا ہے۔" اجل نے جیب سے ایک بڑے سائز کا مارکر نک
پھر کتبے کے دوسری طرف لکھنے لگا۔ "ون' ون' ون' نائن' نائن' ٹو"

یہ لکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ سب کی سوالیہ نظریں ان چھ ہندسوں پر جمی ہوئی تھیں
سمندر کے کنارے سرد ہوا چل رہی تھی۔ اس کے باوجود حماد کو پسینہ آنے لگا۔ یہ وہ
عدد تھے' جن سے اس نے اپنے بریف کیس کو لاک کیا تھا۔ یہ نمبر اس کے سوا کوئی
جانتا تھا لیکن اجل نے ان نمبروں سے لاک کھول کر بریف کیس سے اس کے خلاف
تحریری اور تصویری دستاویزات نکال کر مرجانہ کو دے دی تھیں۔ پارٹی لیڈر نے کتبے

نمبروں کو پڑھتے ہوئے کہا "ون' ون' ون' نائن' نائن' ٹو۔ اس طرح تو تاریخ بنتی ہے۔ یعنی
پہلی تاریخ' پہلا مہینہ' انیس سو بیانوے (۱۹۹۲-۱-۱)"

اجل نے کہا۔ "ہاں یہ آخری تاریخ ہے۔ اگر قاتل اس سے پہلے آکر اس کتبے پر
اقبال جرم نہیں کرے گا تو اس تاریخ کو چار کاندھوں پر لایا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ کتبے
سے دور کھڑی ہوئی مرجانہ کی پجیرو کی طرف جانے لگا۔

☆==========☆==========☆
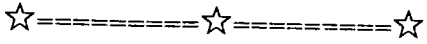
ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں سیاسی پارٹی کا اجلاس جاری تھا۔ یہ صوبے کی اہم
سیاسی پارٹیوں میں سے ایک تھی لیکن وہ ایک پسماندہ صوبے کے پسماندہ ضلع لسبیلہ کے
ایک پارٹی لیڈر کی کوٹھی تھی۔ مقامی معیار کے مطابق وہاں صوفے' کرسیاں تھیں۔ کچھ
افراد قالین پر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جو زیادہ اہم تھے' وہ کرسیوں پر تھے اور جو بہت زیادہ
اہم تھے' وہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جو وہاں کا سب سے بڑا وڈیرا تھا' وہ سب سے بڑی
اور بھاری پگڑی سر پر رکھے' سب سے اونچی مسند پر براجمان تھا۔ گویا مشرقی طرز کا ایک
دربار لگا ہوا تھا۔ اس دربار میں سردار جنید اور حماد بھی تھے اور کوشش یہ کی گئی تھی کہ
سردار حاکم علی' مرجانہ اور اجل کو اس خفیہ اجلاس کا علم نہ ہونے پائے۔ اجلاس کی ابتدا
میں پارٹی لیڈر نے بڑے وڈیرے شاہ صاحب کی آمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "محترم
شاہ صاحب! ہماری پارٹی کے صدر ہیں بلکہ ہماری پارٹی کے روحِ رواں ہیں۔ جب ہمیں
پیچیدہ مسائل پیش آتے ہیں تو ہم محترم شاہ صاحب کو اجلاس میں شریک ہونے کی زحمت
دیتے ہیں۔ آج بھی چند پریشان کن مسائل کے باعث یہ اجلاس منعقد کیا گیا ہے۔"

اس نے پہلے پیچیدہ مسئلے کی وضاحت کی کہ سردار جنید کے حلقے سے پارٹی کے دو
امیدوار قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں ضرور پہنچتے ہیں۔ اسی طرح سردار حاکم علی کے حلقے
سے بھی انہیں دو نشستیں مل جایا کرتی تھیں۔ اس بار اچانک ہی حاکم علی نے آزاد امیدوار
ہونے کا اعلان کیا۔ اسے اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے حماد نے اس کی بیٹی فرزانہ سے
شادی کرلی۔ یہ خیال تھا کہ اس طرح سسر اپنے داماد کے خلاف کسی دوسری پارٹی سے
سودے بازی نہیں کرے گا لیکن الیکشن تو ابھی دور ہیں۔ اس سے پہلے ہی حاکم علی نے یہ
اعلان کرکے دوسرا دھماکا کیا کہ اس کی بیٹی مرجانہ قومی اسمبلی کے لیے آزاد امیدوار کی
حیثیت سے کاغذات داخل کرا چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پارٹی دو نشستوں سے
محروم ہو رہی ہے اور سیاست بندر اور میلان بندر کے ساحلوں پر سردار جنید کی گرفت
کمزور اور سردار حاکم علی کی گرفت مضبوط ہونے والی ہے۔

"سیاست میں کچھ دو اور کچھ لو۔ یہی دو باتیں ہیں۔ سردار جنید اور حماد ابتدا سے ہماری پارٹی کے وفادار اور ہمارے مہربان ہیں۔ ہم ان سے وہ ساحلی علاقے چھین کر حاکم علی کو نہیں دے سکتے تھے۔ ایسی صورت میں حاکم علی کو توڑ ڈالنے کے لیے مرجانہ کو اغوا کیا گیا۔ اگر اسے مار ڈالا جاتا تو حاکم علی ایک ہی بیٹی فرزانہ کے باعث اپنے داماد حماد کے دباؤ میں رہتا لیکن یہ چال بھی کامیاب نہ رہی۔ پتا نہیں وہ باپ بیٹی کہاں سے ایک مکار مشیر اجل نواز کو پکڑ لائے ہیں۔ ہمیں اب تک معلوم نہ ہوسکا کہ وہ جوان کون ہے؟ اس کا ماضی کیا ہے اور اس کی معلومات کے ذرائع کیا ہیں۔ اس نے حماد کے خلاف ایسے ٹھوس ثبوت حاصل کر لیے ہیں کہ وہ دستاویزات منظرِعام پر آجائیں تو حماد کے ساتھ ہماری پارٹی کی پوزیشن بھی کمزور ہو جائے گی۔ اس کمزوری کے باعث حاکم علی اب سردار جنید کے حلقے سے بھی قومی اور صوبائی اسمبلی کی دو نشستیں لے جانے والا ہے۔ ہماری پارٹی کا امیدوار حماد مجبور ہو کر حاکم علی کا ساتھ دے گا اور سردار جنید مجبور ہو کر اپنے حلقے کے تمام ووٹ اجل نواز کی جھولی میں ڈالے گا۔ اس طرح حاکم علی ہماری پارٹی سے چار سیٹیں لے جا رہا ہے۔ آپ حضرات اچھی طرح چار سیٹوں کے نقصانات کو سمجھ سکتے ہیں۔ حکومت بناتے وقت جب ہمارا مقابلہ دوسری بڑی سیاسی پارٹی سے ہوگا اور سیٹوں کی خرید و فروخت ہوگی تو حاکم علی کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ لوٹا جدھر لڑھکے گا ادھر والی پارٹی حکومت بنالے گی۔" پھر پارٹی لیڈر نے کہا۔ "میں نے اختصار سے حاکم علی کی موجودہ پوزیشن بیان کی ہے۔ اس سے آپ حضرات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کتنی مضبوطی سے پھیل رہا ہے اور ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے۔"

ایک نے سوال کیا "حاکم علی نے اب سے پہلے سیاست میں قدم نہیں رکھا تھا۔ اس کے حلقے کے ووٹ ہماری پارٹی کو ملا کرتے تھے۔ پھر وہ اچانک ہمارا مخالف کیوں ہوگیا؟"

سردار جنید نے کہا۔ "مخالفت مجھ سے ہے۔ وہ ان تمام ساحلی علاقوں پر اپنا کنٹرول چاہتا ہے، جو میری آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ جبکہ میرے علاقے کی آمدنی کا دس فیصد منافع اسے دیا جاتا ہے۔"

"ظاہر ہے، وہ دس فیصد منافع سے مطمئن نہیں ہوگا۔ وہ بھی سردار ہے۔ آپ کی برابری چاہے گا۔ برابری نہیں ملے گی تو دوسرا راستہ اختیار کرے گا اور وہ ایسا کر رہا ہے۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں میں وہاں کا پچاس فیصد منافع اسے دے دوں؟"

وڈیرے شاہ صاحب نے کہا "سردار جنید! گرمی سے نہیں، نرمی سے بولو۔ یہاں

سب اونچی آواز اور اونچی گردن والے ہیں۔ کوئی کسی سے کم نہیں ہے۔"

ایک وڈیرے نے کہا "آپ سے یہ کسی نے نہیں کہا ہے کہ آپ پچاس فیصد منافع حاکم علی کو دے دیں۔ آدمی سانس چھوڑ دیتا ہے، منافع نہیں چھوڑتا۔ آپ بھی نہیں چھوڑیں گے۔ سوال حاکم علی کا ہے کہ ہم نے اسے حصہ دینے میں انصاف نہیں کیا۔"

شاہ صاحب نے کہا "کبھی کبھی انصاف کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر ایک سیاسی پارٹی آپ میں سے ہر امیدوار کے ذریعے اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے کے لیے آپ کو کچھ دیتی ہے۔ دیتے وقت ناانصافی ہو جاتی ہے۔" اس نے حاضرین پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "یہاں تین قبیلوں کے سردار ہیں اور پانچ معزز وڈیرے ہیں۔ ان سب کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ان کے علاقوں کے کسی بھی بے روزگار کو حب اور اوتھل انڈسٹریز میں روزگار نہ ملے۔ یہ غریب ہاری، چھوٹے کاشتکار، کمی اور دو وقت کی روٹیوں کے عوض غلامی کرنے والے فیکٹریوں اور ملوں میں جاکر مزدوری کریں گے تو سرداروں اور وڈیروں کے ووٹر کم ہوتے جائیں گے۔ کیوں، ہے نا یہی بات؟"

ایک سردار نے کہا "جی ہاں شاہ صاحب! ہم تو اپنے علاقے کے تمام مردوں اور عورتوں کی صحیح تعداد یاد رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی کم ہو تو ہمارے آدمی اسے تلاش کرتے ہیں۔ ہماری جیب سے ایک روپیہ گر جائے کوئی بات نہیں۔ مگر ایک ووٹر کو نہ گم ہونا چاہیے اور نہ کہیں جاکر روزگار تلاش کرنا چاہیے۔"

ایک وڈیرے نے ہنستے ہوئے کہا "یوں سمجھیں کہ ہم نے پولٹری فارم بنا رکھا ہے۔ انڈے اور چوزوں کا حساب کیا جاتا ہے۔ ہمارے علاقے میں خاندانی منصوبہ بندی کی موبائل ٹیم آئے تو ہم اسے ٹال دیتے ہیں۔ جتنے بچے ہوں، اتنے ووٹ بڑھتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد چوالیس برسوں میں تقریباً تین گنا ووٹروں کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ سرکاری نعرہ ہے کہ بچے کم خوشحال گھرانا لیکن وڈیرا اور سرداری نعرہ ہے، بچے طاقت خوشحال سیاست..........."

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ وہاں بیٹھے ہوئے محکمۂ لیبر کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ "آپ لوگ ہمارا احسان مانیں، آپ لوگوں کے علاقوں سے جتنے مزدور آتے ہیں، ہم انہیں ملوں کے دروازے سے ہی باہر بھگا دیتے ہیں۔"

پارٹی لیڈر نے کہا "آفیسر! آپ احسان کرتے ہیں۔ ہم نے بھی آپ کے تبادلے کو دوبار رکوایا ہے۔ کسی دوسری جگہ تبادلے پر چلے جاتے تو آج لاکھوں میں نہ کھیلتے۔ یہاں جتنے بھی معزز افراد تشریف رکھتے ہیں، سب ہی کے مفادات ایک دوسرے سے وابستہ

ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اپنے اہم مسئلے سے ہٹ کر باتیں نہ کریں۔"

ایک نے تائید کی "ہاں بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔ حاکم علی کا مسئلہ ابھی حل طلب ہے۔ اسے کس طرح اپنے راستے پر لایا جائے؟"

دوسرے نے کہا۔ "اس کے دو مشیر اور مرجانہ کا ایک مشیر' وہ تینوں ہی چالباز ہیں۔ اسے ہمارے راستے پر آنے نہیں دیں گے۔"

سردار جنید نے کہا "ہم ان میں سے کسی کو ختم بھی نہیں کرسکتے۔ آپ میں سے کتنے ہی حضرات نے دیکھا ہے کہ وہ ہمیں فرزانہ کی موت کا ذمے دار سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے سیاسی قبرستان بنایا ہے اور ایک کتبے پر فرزانہ کے قاتل کی تاریخ وفات بھی لکھ دی ہے۔"

حماد سکون سے بیٹھا ہوا تھا۔ باپ کی بات پر پریشان ہوگیا۔ اس کے دماغ میں وہ چھ ہندسے چکرانے لگے۔ ایک وڈیرے نے کہا۔ "یہ سیاسی قبرستان کیا بکواس ہے؟ کیا ہم سب سیاست کرنے والے وہاں دفن ہوا کریں گے!؟"

ایک وڈیرے نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پُرکھوں کی قبریں جہاں ہیں' ہم بھی ایک دن اسی آبائی قبرستان میں جائیں گے۔ کس کی مجال ہے کہ ہمیں اس سیاسی قبرستان میں لے جائے۔"

وڈیرے شاہ صاحب نے کہا "کوئی نہیں جانتا کہ مقدر اسے کہاں لے جائے گا۔ کلام پاک میں یہ واضح طور سے درج ہے کہ.......... اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کی موت آنی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا باخبر ہے۔ لہٰذا اپنی مونچھوں پر تاؤ نہ دو اور دعوے نہ کرو کہ اپنے ہی آبائی قبرستان میں جاؤ گے۔"

وہاں لسبیلہ اور خضدار کے علاقوں میں شاہ صاحب کو پیر اور روحانی پیشوا بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ سب ان کے مشوروں کو مانتے تھے اور ان کی ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ ان کی شمولیت سے اس سیاسی پارٹی کو صوبے میں مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "ہم انسانوں کو کیوں پیدا کیا گیا؟ صرف عبادت کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ عبادت کے لیے فرشتے کم نہیں ہیں۔ وہ دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بڑے آرام اور سکون سے مصروف رہتے ہیں لیکن ہم انسانوں کو کانٹوں پر عبادت کرنے کے لیے اس زمین پر بھیجا گیا ہے۔ وہ معبود دیکھتا ہے کہ ہم طرح طرح کے مصائب اور آلام سے گزرنے کے دوران بھی عبادت جاری رکھتے ہیں یا نہیں؟ اور اللہ عالم الغیب ہے' وہ جانتا ہے کہ آدمی عبادت کی معراج کو پہنچے تو سجدے میں گردن کٹوا لیتا ہے اور یہی آدمی اپنی انتہائی کمینگی کو پہنچے تو

سجدہ کرنے والے مومن کی گردن اتار دیتا ہے۔" سب واہ واہ کے انداز میں سر دھننے لگے۔ انہوں نے فرمایا "خدا اور بندوں کے درمیان بھی "کچھ دو اور کچھ لو" کا اصول کارفرما ہے۔ تم مکمل ایمان سے دینی احکامات پر عمل کرو گے پھر اس سے کچھ مانگو گے تو وہ دے گا۔ خدا سے کچھ لینے کے لیے اس کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہے لیکن تمام عمر کسی آدمی کی خوشنودی حاصل کرتے رہو' وہ کچھ نہیں دے گا۔ ہمارے علاقوں کے کاشتکار' مزدور اور بے روزگار مقروض دن رات ہماری اتنی خدمت اور تابعداری کرتے ہیں مگر آخری سانس تک کچھ نہیں پاتے۔ مرنے کے بعد اپنے قرضے اور غلامی اولاد کے نام لکھ جاتے ہیں۔ اس لیے عوام کسی خاص معتبر آدمی کو کچھ دے کر بدلے میں کچھ لے نہیں پاتے۔ آدمیوں میں دو اور لو کا معاملہ صرف برابر کی حیثیت والوں میں ہوتا ہے۔ جیسے یہاں حب' ونڈر' اور تھل کے مل مالکان' وڈیرے سائیں اور معزز سردار تشریف رکھتے ہیں۔ ان سے سیاسی پارٹیاں کچھ لیتی ہیں تو کچھ دیتی ضرور ہیں۔ اگر نہ دیں تو سردار حاکم علی جیسا باغی مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ باغی ایک ہوتا تو ہم اس سے نمٹ لیتے لیکن وہ چار سیٹیں لے جانے والا ہے۔ اسے کہاں تک کامیابی حاصل ہوگی؟ اس سلسلے میں میرا علم نجوم کہتا ہے کہ ان کے مقدر میں بڑی حد تک کامیابیاں ہیں مگر کچھ رکاوٹیں بھی ہیں۔ خصوصاً سردار حاکم علی کی کامیابی مشکوک ہے۔ کوئی ایسی رکاوٹ پیدا ہوگی کہ شاید وہ انتخابی معاملات سے دستبردار ہو جائے گا۔"

سب لوگ خوش ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ سردار جنید نے اپنی جگہ سے اٹھ کر وڈیرے شاہ صاحب کے ایک ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر اس نے ہتھیلی کی پشت کو بوسہ دے کر کہا۔ "آپ سچے پیر ہیں۔ جو کہتے ہیں' وہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا کانٹا وہی ہے۔ وہ نکل جائے تو ہم مرجانہ اور اجل سے نمٹ لیں گے۔"

"مرجانہ بڑی زیرک اور زبردست ہے۔ پھر بھی سرکش گھوڑی قابو میں آجاتی ہے۔ اس کے ستارے کہہ رہے ہیں کہ کہیں وہ کمزور پڑے گی۔ آخر عورت ذات ہے۔ اسے لگام دی جاسکتی ہے لیکن ایک معاون سیارہ اس کے ساتھ ہے۔ جب تک وہ ساتھ رہے گا' مرجانہ کی نحوستیں دور ہوتی رہیں گی۔"

وہ بولا "حضور شاہ صاحب! وہ کمبخت اجل نواز اس کے ساتھ ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس کا زائچہ بنا کر اس کے مقدر کی خرابیاں معلوم کریں۔"

شاہ صاحب نے کہا۔ "جس روز اس نے سیاسی قبرستان کی ابتدا کی تھی' اسی رات تم نے اس کے متعلق بتایا تھا لیکن صرف نام بتانے سے اس کا زائچہ نہیں بنے گا۔ اس کی

تاریخ پیدائش اور والدین وغیرہ کا نام معلوم ہونا چاہیے۔"

"اس نے قومی اسمبلی کے امیدوار کی حیثیت سے جو کاغذات داخل کیے ہیں، آدمی ان کی ایک نقل لے آیا ہے۔ اس کے والد کا نام عبدالخالق ہے۔ وہ سات ج انیس سو باسٹھ (۱۹۶۲-۷-۷) کو پیدا ہوا تھا۔"

وڈیرے شاہ صاحب سوچتی ہوئی نظروں سے خلا میں تکنے لگے۔

☆==========☆==========☆

مرجانہ اپنی بہن کی قبر پر پھول چڑھانے اور اس کے لیے مغفرت کی دعائیں ما آئی تھی۔ اس کے ساتھ اجل بھی تھا۔ درجنوں مزدور قبرستان کے احاطے کی چاردیوا تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔ وہ دونوں گاڑی سے دو فولڈنگ چیئر لا کر فرزانہ اور بچے قبروں سے ذرا دور بیٹھ گئے تھے۔ مرجانہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہاں ک قدر خاموشی ہے۔ آج دو قبریں ہیں کل دو ہزار قبریں ہوں گی، تب بھی ایسی ہی خاموشی ر گی۔"

اجل نے کہا۔ "دنیا والے اسے شہرِ خموشاں کہتے ہیں لیکن یہ دنیا کے تمام قبرستانو سے مختلف ہے۔"

"ہاں مختلف ہے یہ تو تم کہہ چکے ہو کہ یہ سیاسی قبرستان ہے۔ بائی دی و قبرستان کوئی سا ہو، وہاں موت کی خاموشی لازمی ہوگی۔"

"یہی تو بات ہے کہ یہاں خاموشی نہیں ہے۔ یہاں ایک سیاسی پارٹی کا خفیہ اجلا ہو رہا ہے۔"

مرجانہ نے اسے تعجب سے دیکھ کر پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کہاں ہو رہا اجلاس؟"

"ابھی تمہیں نظر آئے گا۔ اس سے پہلے یہ سمجھ لو کہ اگر اس دنیا کا ایک شخص اپنے مکان کے آرام دہ صوفے پر بیٹھا کسی کی بربادی کا منصوبہ بنا رہا ہے تو وہ دراصل ا صوفے پر نہیں، یہاں اپنی خالی قبر پر بیٹھا ہے، اسے پُر کرنے کے عمل کی پلاننگ کر ہے۔ اگر کوئی سیاسی پارٹی اپنے ڈرائنگ روم کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے خ باتیں کر رہی ہے اور ان خفیہ سازشی باتوں کو محض ایک اجلاس کہہ رہی ہے تو وہ ا سازشی عزائم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں نہیں، اسی سیاسی قبرستان میں ہے اور وہ پا یہاں بیٹھی اپنی دانست میں عوام کی قبریں کھود رہی ہے مگر حقیقتاً اپنے کارکنوں، کرا کے غنڈوں، مالی امداد دینے والے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی یہاں گورکنی کر ر

ہے۔ وہ دیکھو مرجانہ! وہ سامنے اونچی مسند پر بڑی سی پگڑی سر پر رکھے ان علاقوں کا پیر وڈیرا شاہ صاحب بیٹھا ہوا ہے۔ مسند کے اطراف جو صوفے ہیں۔ ان پر مالی امداد دینے والے سرمایہ دار، سودے بازی کرنے والے وڈیرے اور سردار بیٹھے ہوئے ہیں۔ الیکشن لڑنے والے پارٹی کے امیدوار کرسیوں پر نظر آ رہے ہیں اور جان پر کھیلنے والے کارکن قالین پر ہیں۔"

اجل بولتا جا رہا تھا۔ اسی کے مطابق مرجانہ کو ہر فرد دکھائی دے رہا تھا اور وہ صاف طور پر خود کو اس خفیہ اجلاس میں موجود پا رہی تھی۔ وہاں کی ایک ایک بات سن رہی تھی۔ اپنے اور اپنے حاکم بابا کے سلسلے میں انہیں جو پریشانیاں تھیں، ان میں انہیں مبتلا دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ اجل کا ہاتھ تھام کر بولی "قبرستان ایسی جگہ ہے جہاں کوئی نہیں مسکراتا۔ میں بے اختیار مسکرا رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "تم میرا ہاتھ پکڑتی ہو تو مجھے انسانی زندگی کی حرارت ملتی ہے۔ پلیز مجھے میری خاصیت کی طرح سرد رہنے دو۔"

اس نے اجل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس کا سرد ہاتھ زندگی کے درجۂ حرارت کو کم کرنے لگا تھا۔ اس وقت وڈیرا شاہ صاحب علم نجوم کے حساب سے کہہ رہے تھے کہ سردار حاکم علی کی کامیابی مشکوک ہے اور یہ کہ مرجانہ سرکش گھوڑی ہے۔ اگرچہ اسے لگام دی جا سکتی ہے لیکن ایک معاون سیارہ اس کی نحوستیں دور کر رہا ہے۔ مرجانہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "مجھے بتاؤ اجل! کیا بابا پر کوئی مصیبت آنے والی ہے؟"

وہ بولا "ابھی خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہو۔ ان کمبختوں نے میری ولدیت اور تاریخ پیدائش بھی معلوم کی ہے۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "حالانکہ تم نے فرضی ولدیت اور تاریخ پیدائش لکھی ہے۔"

"میں نے نامزدگی کے کاغذات میں جو کچھ لکھا ہے اس میں معنویت ہے۔ جب ولدیت پوچھی جاتی ہے تو یہی پوچھا جاتا ہے کہ ہمیں کس نے پیدا کیا؟ تم دنیاوی رشتے سے باپ کا نام لیتی ہو۔ میں دینی حوالے سے خدا کا نام لیتا ہوں۔ اس لیے میں نے ولدیت کے خانے میں عبدالخالق لکھا۔ یعنی میں سارے جہان کے خالق کا بندہ ہوں۔"

"اچھا وہ جو اپنی فرضی تاریخ پیدائش لکھی ہے، اس میں کیا معنویت ہے۔"

"یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ اس اجلاس میں بیٹھے ہوئے حماد کو دیکھو، اس کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔"

مرجانہ نے دیکھا۔ حماد پریشان ہو گیا تھا۔ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ پھر وہ اپنی

کرسی سے اٹھ کر سردار جنید سے بولا "بابا! آپ نے ابھی کیا کہا ہے؟ وہ.......... وہ آ
نے اجل نواز کی تاریخ پیدائش کیا بتائی ہے؟"

باپ نے کہا۔ "سات جولائی انیس سو باسٹھ (۱۹۶۲-۷-۷)

"بابا! یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ میرے باپ ہو کر بھول رہے ہیں۔ یہ میری تار
پیدائش ہے۔"

"آں؟" باپ نے چونک کر سوچنے کے انداز میں بیٹے کو دیکھا۔ پھر کہا "واقعی می
نے اجل نواز کے کاغذات میں یہ تاریخ پیدائش دیکھی۔ خود اپنی آنکھوں سے پڑھی مگر یا
نہیں آیا کہ تم اسی سال' اسی جولائی کی سات تاریخ کو پیدا ہوئے تھے۔"

بڑے وڈیرے شاہ صاحب نے کہا۔ "یہ محض اتفاق ہے کہ تم دونوں اسی دن' ا
مہینے اور اسی سال پیدا ہوئے۔ یہ کوئی عجیب سی بات نہیں ہے۔ ایک ہی دن ایک
وقت میں بے شمار پیدا ہوتے ہیں اور اسی لمحے میں بے شمار مرتے ہیں۔"

حماد کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ نڈھال سا ہو کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا اجل نے پوچھا۔ "جا
ہو مرجانہ! اس پر کیا گزر رہی ہے؟"

"میں جاننا چاہوں گی۔"

"میں نے فرزانہ کے کتبے کے دوسری طرف جو تاریخ لکھی ہے' وہ اس کی تار
وفات ہے۔ یہ تمہیں بتا چکا ہوں اور وہ بھی یہ سمجھ رہا ہے۔ اس نے آپریشن سے پہ
اسپتال کے فارم کو پُر کرکے دستخط کیے۔ وہ قانونی طور پر آپریشن کے لیے شوہر کا اجازت
نامہ تھا اور غیر قانونی طور پر اس نے فرزانہ کو قتل کرنے کی اجازت دی تھی اور میں یہاں
تاریخ وفات لکھتے وقت سب کے سامنے کہہ چکا ہوں کہ قاتل یہاں چل کر آئے گا یا ج
کاندھوں پر اپنے کتبے تک پہنچے گا۔"

مرجانہ نے پوچھا۔ "لیکن وہ تمہاری تاریخ پیدائش سن کر کیوں پریشان ہو گیا ہے؟"

"اس کے دماغ میں کتنے ہی سوالات کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ پہلا سوال یہ ک
جس پرانی حویلی میں تمہیں قید کیا گیا تھا' وہاں میں کیسے پہنچ گیا؟ دوسرا یہ کہ جس بریف
کیس کے لاک کے اعداد کسی کو معلوم نہیں تھے' وہ مجھے کیسے معلوم ہو گئے تھے؟ پھر م
نے اسی لاک کے اعداد کو اس کی تاریخ وفات کے طور پر کتبے پر لکھ دیا ہے اور اب
میری تاریخ پیدائش ہے' وہی اس کی ہے۔"

"جب کہ تمہاری تاریخ پیدائش نامعلوم ہے۔"

"جب اس کرہ ارض پر آدم کا پہلا قدم پڑا تب بھی میں موجود تھا.........."

"اوہ خدایا! تم کب سے جی رہے ہو اور زندگی کو مارتے آ رہے ہو۔ تم مارتے مارتے
جاتے ہو گے لیکن ہستی پیدا ہونے سے باز نہیں آ رہی ہے۔"

"ہاں یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ ابھی یہ تماشا دیکھو کہ میں نے مختلف حیلوں
اس کی تاریخ پیدائش اور وفات لکھ کر کس طرح اندیشوں میں مبتلا کیا ہے۔ اس کا
ھی اندر سے سہما ہوا ہے۔ وہ بیٹا اور پوتا چاہتے تھے۔ اب سردار جنید کو اپنے بیٹے کی
لاحق ہو گئی ہے۔"

سردار جنید کہہ رہا تھا۔ "محترم شاہ صاحب! یہ اجل نواز کوئی عامل یا ساحر ہے۔ اس
بڑے یقین سے کتبے پر تاریخ وفات لکھی ہے۔ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ وہ
پُراسرار نوجوان ہے۔"

شاہ صاحب نے کہا۔ "تاریخ وفات لکھ دینے سے کوئی اسی تاریخ کو نہیں مرجاتا۔ تم
ہ مخواہ اندیشے میں جکڑے ہوئے ہو۔"

"حضور شاہ صاحب! وہ غیب کی باتیں جانتا ہے۔ جہاں مرجانہ کو قید کیا گیا تھا' اس
اڈے تک وہ پہنچ گیا تھا۔ آپ سوچیں گے کہ وہ ہمارے کسی آدمی کا تعاقب کرکے
ں پہنچا ہوگا لیکن میں حماد کا باپ ہوں' میں اس کے بریف کیس کو کھولنے کے لاک نمبر
ں جانتا تھا مگر اجل کو معلوم ہو گیا تھا۔"

حماد نے کہا۔ "ابھی ایک اور بات یاد آ رہی ہے۔ ہم نے مرجانہ' اجل اور حاکم علی
اسپتال کا نام اور پتا نہیں بتایا تھا لیکن مرجانہ وہاں پہنچ گئی تھی۔ کیا ان تمام واقعات سے
ر نہیں ہوتا کہ اجل غیب کی باتیں جانتا ہے۔ کوئی زبردست عامل یا ساحر ہے۔"

وڈیرے شاہ صاحب نے کہا۔ "تم باپ بیٹے بہت زیادہ اندیشوں میں گھر گئے ہو۔
نہ کرو۔ میں اجل کا زائچہ تیار کروں گا۔ آج رات مجھ سے ملاقات کرو۔"

سردار جنید نے کہا۔ "آپ کی مہربانی ہوگی۔ ہم ضرور آئیں گے۔ میں اپنے بیٹے کی
متی اور کامیابی چاہتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے حماد کا بھی زائچہ تیار
یں۔ آپ کے علم سے ہمیں کچھ معلوم ہوگا تو ہم اجل کے ہر عمل کا توڑ کریں گے۔"

اجلاس برخاست ہونے والا تھا۔ اجل نے کہا "مرجانہ! آنکھیں بند کرو اس کے بعد
لو۔" مرجانہ نے پہلے آنکھیں بند کیں پھر کھولیں۔ اس بار وہ ڈرائنگ روم اور صوفے
سیاں دکھائی نہیں دیں۔ البتہ اجلاس کے تمام شرکاء ایک ایک قبر پر بیٹھے ہوئے تھے اور
ا بے خبر تھے جیسے اپنی آرام دہ نشستوں پر ہوں۔ اجلاس کی کارروائی ختم ہو چکی تھی۔
اپنی اپنی قبر سے اٹھ کر جا رہے تھے اور مرجانہ کی نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔

اجل نے مرجانہ سے پوچھا۔ "تم نے اس وڈیرے کو دیکھا تھا' جو اپنی مونچھوں پر
کر کہہ رہا تھا کہ ہمارے پُرکھوں کی قبریں جہاں ہیں' ہم بھی ایک دن اسی آبائی
میں جائیں گے' کس کی مجال ہے کہ کوئی ہمیں اس بکواسی قبرستان میں لے جائے۔
وہ بولی "ہاں' میں اس وڈیرے کو جانتی ہوں۔ اس کا نام جمال الدین بھوٹانی
اس کی اپنے پڑوسی قبیلے کے سردار خلیل کمالی سے ٹھنی رہتی ہے۔ ان کے وفا
دن ایک دوسرے پر فائرنگ کرکے یہ ثابت کرتے رہتے ہیں کہ ان میں سے کسی
اسلحہ اور گولہ بارود کی کمی نہیں ہے۔"

اجل نے کہا "ہاں' یہ جمال الدین بھوٹانی شکار کھیلنے جا رہا ہے۔ لسبیلہ میں جو
ہیں' وہاں بڑے لوگ بڑا دلچسپ شکار کھیلتے ہیں۔"

عام طور پر شکار کا مفہوم ہے کہ جانوروں کو پکڑو یا مارو۔ جبکہ آدمی بھی آدمی
کھیلتا ہے۔ جانی دشمنی ہو تو یہ آدمی اسلحہ سے شکار کھیلتا ہے۔ کسی کو غلام بنانا ہو
سے نہیں صرف زنجیروں سے جکڑتا ہے۔ کسی حسینہ کو شکار کرنا ہو تو اپنی مردانگی کا
کرتا ہے۔ کہتے ہیں' مرد کسی کو پھانسے تو اسے بازاری بنا دیتا ہے اور بازاری عورت
پھانسے تو اسے اپنے در کا دلال بنا کر چھوڑتی ہے۔ دانا کہتے ہیں' سب سے کامیا
ہتھیار یا طاقت سے نہیں' حکمتِ عملی سے کھیلا جاتا ہے۔ جو صحیح گھات لگاتا ہے
گرفت سے شکار کبھی نہیں نکلتا لیکن گھات لگانے کے لیے صبر کے امتحان سے گز
ہے۔ مہینوں اور برسوں تاک میں رہتے رہتے' ایک مناسب اور مخصوص وقت
کی گردن ہاتھ میں آتی ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے شکاری گزرے ہیں لیکن ازل
تک اور ابھی تک اجل سے بڑا کوئی شکاری نہیں گزرا۔ ورلڈ بک آف ریکارڈز
ایسا شکار نہیں ہے جو اس شاطر سے بچ نکلا ہو۔

سردار جنید نے بیٹے سے کہا۔ "شاہ صاحب ہمارے روحانی پیشوا ہیں۔ انہ
حاکم علی کی شکست خوردگی کی پیش گوئی کی ہے۔ آج رات مرجانہ اور اجل کے خل
ہمیں حوصلہ دیں گے۔ تم اپنے دل سے اندیشوں کو ختم کرو اور دوسرے معاملات
دو۔"

وڈیرے جمال الدین بھوٹانی نے کہا "برخوردار حماد! میرے ساتھ شکار پر چلو
پریشانیاں بھول جاؤ گے۔ موسم بدل رہا ہے۔ شمالی سرد علاقوں سے پرندے خاصی
ادھر آتے ہیں۔ انہیں زندہ پکڑنے میں بڑا مزہ آئے گا۔"

وہ اپنی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات بھلانا چاہتا تھا۔ اس لیے جمال الدین

ساتھ ہو گیا۔ ان کے ساتھ تین گاڑیاں اور سات مسلح وفادار تھے۔ وہ فاریسٹ ورکنگ
ب ڈویژن اوتھل کے مقام پر آئے۔ وہاں ڈسٹرکٹ فاریسٹ آفیسر نے عاجزی سے
"آپ تو جانتے ہیں۔ ان دنوں شکار پر عارضی پابندی ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ اگلے ہفتے
خلیجی ریاست کے شیخ اپنے شکاریوں کے ساتھ شاہین پکڑنے آرہے ہیں۔ آپ سمجھ
ہیں کہ ہماری حکومت کو ایسے بیرونی ممالک کے شکاریوں سے خاصا زرمبادلہ ملتا

بھوٹانی نے کہا "ہمیں نہ سمجھاؤ۔ کیا ہم حکومت سے باہر ہیں؟ میں اپوزیشن میں
مگر میرا بھائی تو حکومتی پارٹی میں ہے۔ کیا ابھی فون کروں اسے؟"

ڈسٹرکٹ فاریسٹ آفیسر کو کلاس ون مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں لیکن
اختیارات دینے والوں کے خلاف اپنی زبان تک نہیں ہلا سکتا۔ وہ بھوٹانی کو شکار کھیلنے
نہ روک سکا۔ اس نے دستور کے مطابق جنگل میں اس کی راہنمائی کے لیے دو
ٹ گارڈز اور ایک گیم واچر کو ان کے ساتھ کر دیا۔ وہ فاریسٹ گارڈز جنگل کے چپے
سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ شکاریوں کو کن راستوں سے گزرنا چاہئے؟ کہاں
پائے جاتے ہیں اور کہاں خطرات زیادہ ہوتے ہیں؟ گیم واچر اس بات کا حساب رکھتا
کن جانوروں کا اور کتنے جانوروں کا شکار کھیلا گیا ہے۔ وہ شام پانچ بجے تک جنگل
ہنستے بولتے پرندوں کے پیچھے دوڑتے بھاگتے رہے۔ سیاہ و سفید تیتروں اور تلوروں کو
کرتے رہے' پھر ایک دوراہے پر جمال الدین بھوٹانی نے کہا "حماد! تم ادھر جاؤ۔ میں
رجاتا ہوں۔ یہ راستے میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ ہم آگے جا کر ملیں گے۔"

وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ حماد اپنی دو گاڑیاں اپنے مسلح وفاداروں کے ساتھ
گیا۔ جمال الدین بھوٹانی اپنی ایک گاڑی میں دو مسلح وفادار اور ایک فاریسٹ گارڈ کے
ایک طرف چل پڑا۔ وہ کم از کم ایک شاہین کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ وہ جنگل کے ان
ں میں پہلے بھی ایک بار شاہین کا شکار کھیل چکا تھا۔ جب وہ ان راہوں سے گزرنے لگا
پتہ چلا' وہاں اور بھی کئی شکاری ہیں اور وہ جانوروں کو نہیں' انسانوں کو شکار کرتے
اچانک ہی دائیں بائیں سمتوں سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ بھوٹانی اسٹیئرنگ سیٹ
تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ اس کے وفادار جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔ اگلی
پر بیٹھا ہوا فاریسٹ گارڈ سمجھ گیا تھا کہ قبائلی جنگ شروع ہو چکی ہے۔ وہاں کے لوگ
تے تھے کہ کون قبیلہ کس قبیلے سے نبرد آزما رہا کرتا ہے۔ فاریسٹ گارڈ نے موقع دیکھتے
چلتی گاڑی سے ایک ڈھلان کی طرف چھلانگ لگا دی۔ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ زخمی تو

ہوا ہوگا' مگر اس نے اپنی جان بچالی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں گارڈز خ
اپنے آقا کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے تعاقب کرنے والوں پر گولیاں چلا ر
انہوں نے ایک دشمن کو مار گرایا۔ مگر ان کی قضا بھی جنگل میں آئی تھی۔ وہاں م
موت لکھی تھی۔ لہٰذا وہ بھی گولیاں کھاتے ہوئے پچھلی سیٹوں سے باہر کی طرف
گئے اس گاڑی میں جمال الدین بھوٹانی تنہا رہ گیا۔ اس نے کئی بار کوششیں کیں
راستہ اختیار کرے' جہاں سے آگے جاکر حماد سے ملاقات ہو جائے پھر اس کے
کی تعداد بڑھ جائے گی اور وہ دشمنوں کو اسی جنگل میں ختم کردے گا لیکن دائیں با
پیچھے سے تعاقب کرنے والے گھڑسوار اور ایک جیپ کار میں بیٹھے ہوئے لوگ
دوسری طرف ہانک رہے تھے۔

بھوٹانی کے پاس ایک گن تھی وہ اندھادھند ڈرائیونگ کے دوران فائرنگ
کرسکتا تھا۔ ایسے میں جان بچانے کے لیے دور بھاگ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔
پھیلتی ہوئی تاریکی میں ہیڈلائٹس کی روشنی دور تک راستہ دکھا رہی تھی۔ وہ گ
سے نکل آیا تھا اور ایک سمت آندھی طوفان کی رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا لیکن د
ارادے کے پکے تھے۔ ان کی کئی گولیاں گاڑی کی باڈی پر لگ رہی تھیں اور کھڑ
شیشے توڑتی جارہی تھیں۔ کوئی ایک اندھی گولی اسے بھی آکر لگ سکتی تھی۔ اسی کو
مرضی کہتے ہیں کہ دو گھنٹوں تک جانے کتنے کلومیٹر کی دوڑ اور فائرنگ جاری رہ
محفوظ رہا۔ پھر دشمنوں کی گولی سے ایک پہیہ برسٹ ہو گیا۔ بھوٹانی کی گاڑی
دھماکے سے ایک احاطے کی دیوار سے ٹکرا کر رک گئی۔ دیوار کا وہ حصہ بھی ٹو
کیونکہ وہ دیوار ابھی کچی تھی۔ شام ہی کو اس کی اینٹوں کی چنائی کی گئی تھی۔

وہ گاڑی سے نکل کر اپنی گن سے فائرنگ کرتا ہوا احاطے کے اندر بھاگنے
وقت اس کے ایک پیر میں گولی لگی۔ وہ اچھل کر گرا۔ پھر لڑھکتا ہوا ایک درخت
آیا۔ وہاں بھی گولیاں آرہی تھیں لیکن درخت کے تنے سے لگ رہی تھیں۔ ب
پاس سے گزر رہی تھی۔ اس نے تنے سے لگ کر ہانپتے ہوئے دیکھا۔

چاردیواری کے اندر دور تک سپاٹ میدان تھا۔ وہاں صرف دو قبریں
تھیں۔ ایک بڑی اور ایک چھوٹی قبر تھی۔ بڑی قبر کے پیچھے جو تاریخ وفات لکھی
اسے پڑھتے ہی جمال الدین بھوٹانی چونک گیا۔ اس نے آج ہی صبح کے اجلاس میں
اجل نواز نے ایک کتبے کے پیچھے کسی کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ اس نے
نظروں سے اس کتبے کو دیکھا۔ اگرچہ وہ اس کی تاریخ وفات نہیں تھی لیکن

آگیا کہ وہ دشمنوں سے اپنی جان بچاتا ہوا قبرستان میں پہنچ گیا ہے۔ ہر سو رات کی گہری
تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی کی ہیڈلائٹس کے باعث وہ قبریں اور کتبے دکھائی دے رہے
تھے۔ دن کو چاردیواری تعمیر کرنے والے مزدور فائرنگ کی آوازوں سے سہم کر اپنی
جھگیوں کے اندر زمین پر لیٹ گئے تھے تاکہ گولیاں ادھر آئیں تو اوپر سے گزر جائیں۔ کسی
بے چارے میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ سر اٹھا کر باہر جھانک کر دیکھتا کہ نئے قبرستان میں
سیاست کے کس خانے سے گولیاں چل رہی ہیں؟

سیاست یہ تھی کہ بلوچستان میں کتنی ہی قیمتی معدنیات کا ذخیرہ ہے جن میں گندھک'
تانبا اور ماربل وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ کوئی چالیس برس پہلے قدرتی گیس دریافت ہوئی تھی۔
ایسی کارآمد گیس اور کئی مقامات سے نکالی جاسکتی تھی۔ ماہرین نے انکشاف کیا تھا کہ پٹرول
کے کنوئیں بھی کھدوائے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں وفاقی حکومت نے جاپانی اور چینی
ماہرین کو بلایا تھا۔ یہ کام سردار خلیل کمالی کے علاقے میں ہو رہا تھا۔ اگر وہاں چینی ماہرین
کامیاب ہو جاتے اور تیل کا کنواں بن جاتا تو ملک کو فائدہ پہنچتا۔ اس کے ساتھ سردار
خلیل کمالی بھی مالا مال ہو جاتا۔ اتنی بڑی کامیابی اور دولت مندی جمال الدین بھوٹانی کو
منظور نہیں تھی۔ اس نے سردار خلیل کمالی سے کہا۔ "جہاں کھدائی ہونے والی ہے' وہاں
ہماری زمین کا بھی کچھ حصہ ہے۔ لہٰذا زمین کا جو خزانہ اوپر آئے گا اس میں ہمارا بھی حصہ
ہوگا۔"

سردار خلیل کمالی نے کہا۔ "بھوٹانی! تم بکواس کر رہے ہو۔ میں اسلام آباد سے
کھدائی کے منصوبوں کے تمام بلیو پرنٹس لے آیا ہوں۔ یہاں سے تمہیں کوئی حصہ نہیں
ملے گا۔"

اس انکار کے دوسرے ہی دن دو چینی ماہرین کا اغوا تمام پاکستانیوں کے لیے باعثِ
شرم تھا لیکن منافع خوری' شرم اور غیرت کو کھا جاتی ہے۔ صوبائی اسمبلی سے قومی اسمبلی
تک درپردہ یہ معلومات رہی کہ کس کے اشارے پر اغوا کیا گیا ہے مگر کوئی بھوٹانی کو الزام
نہ دے سکا۔ کیونکہ اس نے خود ایسا نہیں کیا تھا بلکہ کرایا تھا۔ ایک تو کرائے جانے کا ثبوت
نہیں تھا۔ دوسرے بھوٹانی اسمبلی میں ایک چھوٹی مگر مضبوط اکثریت رکھتا تھا۔ اس کا نام
اخبارات میں شائع ہوتا تو وڈیرے شاہ صاحب کی پوری سیاسی پارٹی بدنام ہو جاتی۔ تاوان
کے طور پر کئی لاکھ روپے کی ادائیگی کے بعد وہ دونوں ماہرین رہا کر دیئے گئے لیکن وہ توبہ
کرتے ہوئے پاکستان سے چلے گئے۔ اب کوئی بھی ملک یہاں اپنے ماہرین بھیجنے سے پہلے
ان کی سلامتی کی ضمانت چاہتا ہے۔ آئے دن کی دہشت گردی' اغوا اور ڈکیتی کے پیش نظر

کوئی حکومت ضمانت نہیں دے سکتی۔ ضمیر کے بغیر ضمانت ممکن نہیں ہے۔ جب تک عوا
کا سیاسی شعور بیدار نہیں ہوگا تب تک بلوچستان کی زمین میں خزانے چھپے رہیں گے
خزانہ نکالنے کے لیے زمین کی کھدائی سے پہلے موجودہ سیاسی ملبہ ہٹانا ہوگا۔ پتا نہیں کو
ہٹائے گا؟

سیاسی قبرستان کے سناٹے میں سردار خلیل کمالی کی آواز گونجی۔ وہ گرج کر کہہ ر
تھا۔ "جمال الدین بھوتانی! تُو درخت کے پیچھے ہے........ سامنے نہیں آجائے گا تو اب
گولیاں نہیں چلیں گی صرف ایک دستی بم پھینکوں گا تو وہ درخت اکھڑے گا اس اکھڑ
ہوئی جگہ تیری قبر بن جائے گی۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر بھوتانی درخت کے پیچھے سے لنگڑاتا ہوا نگاہوں کے
سامنے آیا پھر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن ایک طرف پھینک کر بولا "سیاست میں کو
بات آخری نہیں ہوتی۔ سمجھوتے اور سودے بازی کے کئی راستے نکل آتے ہیں۔"

احاطے کے اندر دس گھوڑوں پر دس مسلح سوار بیٹھے ہوئے تھے۔ جیپ میں آ
والے چار مسلح وفاداروں کے آگے سردار خیل کمالی گن لیے کھڑا تھا۔ اس نے وسیع
عریض احاطے کی چار دیواری کو دیکھ کر کہا۔ "مجھے کل ہی پتا چلا کہ حاکم علی اور اس کی بی
کے ایک مشیر نے یہاں ایک سیاسی قبرستان بنایا ہے۔ میں اس مشیر کو داد دیتا ہوں۔ بڑ
اچھوتا خیال ہے اور بڑا اچھا خیال ہے۔ تمہارے جیسے کمینے کو یہیں دفن ہونا چاہیے۔"

بھوتانی نے پوچھا۔ "مجھے ہلاک کرو گے تو میری ہڈی اور گوشت بھی نہیں ملے گا
سب یہاں دفن کرکے چلے جاؤ گے۔ کچھ پانے کی اور لینے دینے کی باتیں کرو۔"

"مجھے چھپانے والی باتیں پسند ہیں۔ جیسے زمین میں خزانہ چھپا ہوا ہے جیسے تیرا جر
چھپا ہوا ہے۔ جیسے تاوان کے سلسلے میں حاصل کیے ہوئے لاکھوں روپے تُو نے چھپا رکے
ہیں۔ جیسے تُو نے پاکستانی اور بلوچی غیرت کو اپنے چینی دوستوں کے سامنے مٹی میں ملا
ہے۔ اسی طرح میں تجھے مٹی کے اندر چھپا دینا چاہتا ہوں۔" اس نے گن سیدھی کی پھ
کہا۔ "جب تک تیرے رازدار' تیرے حواری اور تیری سیاسی پارٹی والے تیرے چھ
ہوئے جرم کو ظاہر نہیں کریں گے' تب تک یہ بھی ظاہر نہیں ہوگا کہ تجھے اس سیا
قبرستان کی مٹی کے اندر چھپایا گیا ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے تڑاتڑ فائرنگ کی۔ بھوتانی گولیوں سے چھلنی ہوتا ہوا' چکراتا ہو
گرا پھر دم توڑنے لگا۔ اجل اس کے سرہانے کھڑا پوچھ رہا تھا۔ "کیا اتنی گولیاں کھانے کے
بعد بھی دم نہیں نکل رہا ہے؟ کوئی بات اٹکی ہوئی ہے؟ ہاں تیرا ایک دعویٰ اٹکا ہوا ہے کہ

تُو اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوگا۔ یہاں سیاسی قبرستان میں نہیں........" اس کا دم
نکل گیا۔ "پہنچی وہیں پہ خاک' جہاں کا خمیر تھا۔"

سردار خلیل کمالی اپنے وفاداروں کو حکم دے رہا تھا کہ اسے دفن کرکے زمین کو
ہموار کردو۔ قبر کا کوئی نشان نہ رہے۔ ایسے آثار بھی نہ چھوڑو کہ یہ کبھی سیاست کے
قبرستان سے نکل سکے۔

☆=========☆=========☆

مرجانہ' اجل اور حاکم علی' سلام آباد پہنچے ہوئے تھے۔ ان کا تعلق کسی چھوٹی بڑی
سیاسی پارٹی سے نہیں تھا۔ اس کے باوجود تینوں کی خوب پذیرائی ہو رہی تھی۔ کوئی پارٹی
انہیں عشائیہ پر مدعو کر رہی تھی' کوئی ظہرانے پر بلا رہی تھی۔ کوئی انہیں مری کی سیر کرانا
چاہتا تھا' کوئی انہیں منگلا ڈیم دکھانے لے جا رہا تھا۔ دس بارہ دنوں تک اتنی مصروفیات
رہیں کہ انہیں صرف رات کو سونے کے وقت تنہائی نصیب ہوئی تھی۔ اگرچہ الیکشن کوئی
چالیس دن بعد تھے۔ نتائج سے پہلے ہر امیدوار اپنی کامیابی کے سلسلے میں پُریقین رہتا ہے
اور نتائج کے بعد ناکامی کا منہ بھی دیکھ لیتا ہے لیکن قبائلی سرداروں کے آزاد امیدواروں
کی کامیابی کبھی مشکوک نہیں ہوتی۔ انتخابات سے پہلے ہی ان کی جیت مصدقہ ہوتی ہے۔
اس لیے ہر چھوٹی بڑی سیاسی پارٹی کے بڑے بڑے رہنما محبت اور گرمجوشی سے مصافحہ
کرنے کے بہانے ان کے ہاتھ تھامے رہتے ہیں۔ کیونکہ اسمبلیوں کے اکھاڑے میں یہی
آزاد پہلوان کسی پارٹی کی ہار کو جیت میں بدل دیتے ہیں۔

مرجانہ محض سیاسی مقاصد کے لیے نہیں آئی تھی۔ جب سے اس نے وڈیرے شاہ
صاحب کی یہ پیش گوئی سنی تھی کہ حاکم علی شاید الیکشن میں حصہ نہیں لے سکے گا۔ کوئی
رکاوٹ پیدا ہو جائے گی' تب سے بیٹی کو باپ کی فکر ہوگئی تھی۔ وہ اپنے بابا کے میڈیکل
چیک اپ کے لیے اسلام آباد کے بہت بڑے اور معروف ڈاکٹر کے پاس آئی تھی۔
سردار حاکم کے کئی طرح کے میڈیکل ٹیسٹ ہو چکے تھے۔ وہ اس بڑھاپے میں بھی خاصا
صحت مند تھا اور اسے کوئی تشویشناک بیماری نہیں تھی۔ اس پہلو سے اطمینان ہوگیا تھا کہ
اس کا حاکم بابا الیکشن کے مرحلے سے گزرتے وقت صحت مند رہے گا۔ بشرطیکہ اچانک کوئی
بیماری لاحق نہ ہو۔ دوسرا پہلو یہ سمجھ میں آرہا تھا کہ دشمنوں کی طرف سے رکاوٹیں پیدا
ہوسکتی ہیں۔ مرجانہ نے اجل سے کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں۔ کیا تمہیں میری پریشانیوں
کا احساس نہیں ہے؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "اپنے دل سے پوچھو کہ میں تمہارا کتنا خیال رکھتا ہوں اور تم

میرے ساتھ رہ کر خود کو کس قدر محفوظ سمجھتی ہو۔"

"بے شک تمہاری دوستی کے باعث میری آخری سانس تک مجھ پر کوئی آنچ
آئے گی لیکن تم یہ خوب سمجھتے ہو کہ میں اپنے بابا کے لیے پریشان ہوں۔"

"کیا پریشان ہونے سے کوئی مصیبت ٹل جاتی ہے؟"

"مگر تم جانتے ہو کہ میرے بابا پر کس طرح کی مصیبت آنے والی ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو' مجھے معلوم ہوتا تو میں ضرور تمہارے بابا کے کام آتا۔ مجھے
بات کا علم نہیں ہوتا ہے۔ ہر بات کا جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔"

"پھر تم بہت سی باتیں قبل از وقت کیسے بتا دیتے ہو؟"

"جیسے تم نے پچھلی بار کچھ باتیں آگہی کے حوالے سے بتائیں۔ جیسے علم نجوم
ماہرین کچھ بتا دیا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مستقبل کو جاننے کے لیے کچھ علوم' کچھ ذرا
دیئے ہیں۔ مجھے بھی کچھ معلوم ہو جاتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں ورنہ بے بس ہوں' خامو
رہتا ہوں۔"

"تم اس لیے بھی خاموش رہتے ہو کہ حکمِ خداوندی کے پابند ہو۔ زبان بندی کا
ہو تو کچھ نہیں کہتے۔"

"یہ بھی درست ہے۔ کیا تم مسلمان ہو کر کہو گی کہ میں اللہ تعالیٰ کے احکامات
خلاف کچھ کہہ دوں۔"

"کچھ نہ کہو۔ خدا ہم سب کو توفیق دے کہ ہم اس کے تمام احکامات پر عمل کر
رہیں لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ کی مرضی سے خوشی یا صدمات کے قدرتی اشارے ملتے ہیں۔
بھی کہا جاتا ہے کہ صدقہ دینے سے بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ تم اتنا ہی بتا دو' کیا مجھے صدقہ
خیرات یا کوئی بڑی نیکی کرنی چاہیے۔"

وہ ہنس کر بولا۔ "نیکی کبھی پوچھ کر نہیں کی جاتی اور خیرات کا تعلق دریا دلی سے ہے
رہ گیا صدقہ تو وہ اپنی سلامتی کی امید سے دیا جاتا ہے۔"

"میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔ تم باتیں بنا رہے ہو مگر میرے بابا کی سلامتی کے
لیے کوئی اشارہ نہیں دے رہے ہو۔"

"تم اپنے بابا کے لیے کیا کر سکتی ہو؟"

"اپنی جان دے سکتی ہوں۔"

"جان دینا آسان ہے۔ دم رکا' روح گئی' قصہ تمام ہوا۔ میں اجل ہوں۔ یہ خو
سمجھتا ہوں کہ جان کبھی مشکل سے جاتی ہے کبھی آسانی سے دم نکل جاتا ہے لیکن

ے مشکل کام ہے زندہ رہ کر قربانی دینا۔"

"میں اپنے بابا کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔"

"تو پھر سمجھ لو کہ تمہارے بابا پر آنے والی مصیبت ٹل جائے گی اور ان کا سایہ
تمہارے سر پر رہے گا۔"

"آخر اتنی بحث کرنے کے بعد تم نے اگل دیا کہ تم بہت کچھ جانتے ہو۔"

"بہت کچھ نہیں' صرف اس حد تک جانتا ہوں' جس حد تک کہ تمہاری ذات کا
تعلق ہے۔ یوں سمجھو کہ میں نے صرف تمہاری تقدیر کی لکھی ہوئی کتاب پڑھی ہے۔ اس
کتاب میں جو کچھ ہے۔ اس کے مطابق تمہیں کبھی راستہ دکھانا ہے' کبھی اشارے دینے
ہیں۔ یہ بھی ایک اشارہ ہے کہ تمہیں اپنے باپ کی خاطر قربانی دینا چاہیئے۔"

"میں تیار ہوں۔ مجھے بتاؤ' بابا کے لیے کیا قربانی دینا چاہیئے؟"

"تم تیار ہو' تمہارے اندر حوصلہ ہے۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ ابھی انتظار کرو۔
قربانی کا وقت آنے دو۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ میرے اندر تجسّس بھڑکا کر میری نیندیں اڑانا چاہتے ہو؟"

وہ چونک کر بولا۔ "اوہ صرف تین سیکنڈ رہ گئے ہیں۔ مجھے ایک روح قبض کرنی
ہے۔"

یہ کہتے ہی وہ چلا گیا۔ مرجانہ نے غصے سے خلا میں گھونسا دکھا کر کہا۔ "بہت عیار ہو'
جی چاہتا ہے تمہارا منہ توڑ دوں۔ اب مجھے نیند کیسے آئے گی؟"

وہ صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اس نے یونہی محبت سے غصے کا اظہار کیا تھا۔ ورنہ
سوچ کر پیار آ رہا تھا کہ اس نے اس کے بابا کی سلامتی کا یقین دلایا تھا۔ رہ گئی قربانی تو وہ
دے گی۔ خواہ کیسی ہی قربانی ہو۔ وہ ایک شاندار ہوٹل کے کمرے میں تھی۔ دوسرے
کمرے میں اس کے حاکم بابا سو رہے تھے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ اس نے بھی لائٹس
آف کر دیں۔ آرام دہ بستر پر آ کر لیٹ گئی پھر سرہانے کے بیڈ لیمپ کو بھی بجھا دیا۔ کمرے
میں گہری تاریکی چھا گئی۔ یہی اس کی عادت تھی۔ جب تک گہری قبر جیسی تاریکی نہ چھا
جاتی' اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بے شک تمام دن سورج کی
دھوپ اور بجلی کی روشنی میں رہنے کے بعد سوتے وقت تاریکی نصیب ہو تو آنکھوں کو
ٹھنڈک پہنچتی ہے اور دماغ کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ ایسے میں نیند کا لطف آتا ہے اور
ایسے میں اسے سو جانا چاہیے تھا لیکن اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ اس
کی آنکھیں چند لمحوں کے بعد کھل گئیں تھی یا چند گھنٹوں کے بعد وہ بیدار ہوئی تھی۔

ویسے آنکھ کھلنے کے اصطلاحی معنی ہیں' عقل آجانا۔ جو بات ناقابلِ فہم رہی ہو' وہ قابلِ فہم ہو جائے۔ صرف آنکھ کھلے اور نظر آئے تو اسے بصارت کہتے ہیں مگر آنکھ' دل کی بینائی سے کھلے تو اسے بصیرت کہتے ہیں۔ مرجانہ نے گہری تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں کشفِ آگہی سے کھلی تھیں اور وہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی قبر کے اندر دیکھا۔ وہ ایک بچے کی قبر تھی۔ اس کی گہری دہشت ناک تاریکی میں وہ ننھا سا نوزائیدہ بچہ رو رہا تھا اور اپنی زندگی کی اطلاع دے رہا تھا۔

یا حیرت! زمین پر ہونے والے حیران کن تماشے چشمِ فلک دیکھتی ہے لیکن چشمِ فلک یہ تماشا کیا دیکھے گی جسے زمین نے بھی نہیں دیکھا کہ اس کے اندر کبھی کسی انسانی زندگی نے حرکت کی ہو۔ وہ کوئی زیرِ زمین مکان یا تہہ خانہ نہیں تھا' قبر تھی۔ دائیں سے' بائیں سے' آگے سے' پیچھے سے۔ نیچے سے اوپر سے بند۔ وہاں زندگی کبھی سانس نہیں لے سکتی تھی لیکن وہ بچہ سانسیں لے رہا تھا اور قبر کی چاردیواری میں لوٹ پوٹ کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔

کشفِ قبور' صوفیوں کا وہ درجہ کمال ہے کہ اس درجہ کو پہنچ کر انہیں مُردے کی قبر سے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ مرجانہ کوئی اللہ والی نہیں تھی کہ اسے کشفِ قبور حاصل ہوتا۔ یہ تو اللہ جانتا ہے کہ اسے جو نظر آرہا تھا' وہ کیوں نظر آرہا تھا اور اس آگہی کے پسِ پردہ کیا معنی اور مطالب تھے؟ وہ لرز رہی تھی۔ کوئی بھی اس معصوم بچے کو قبر کے اندر سے باہر نکلنے کی جدوجہد کرتا ہوا دیکھ کر تڑپ جاتا' لرز جاتا۔ اس نے لرزتے ہوئے چیخ ماری۔ "اجل! تم کہاں ہو؟"

اندھیرے میں محبت کی مٹھاس سنائی دی۔ "میں تمہارے پاس ہوں۔ یہ دیکھو۔"

یکبارگی روشنی ہوگئی۔ اجل سوئچ بورڈ کے پاس کھڑا تھا۔ مرجانہ نے سکون کی ایک لمبی سانس لی۔ پھر سرہانے سے دوپٹا اٹھا کر چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھنے لگی۔

اجل نے کہا۔ "تم تو کہا کرتی ہو کہ مجھ سے دوستی ہونے کے بعد اب کسی معاملے میں خوفزدہ یا پریشان نہیں ہوتی ہو۔ پھر یہ پسینہ کیوں آرہا ہے۔ تمہارے زور زور سے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز میں سن رہا ہوں۔"

وہ تنبیہہ کے انداز میں اسے انگلی دکھا کر بولی۔ "تم انجان بن کر باتیں کرتے ہو تو مجھے غصہ آتا ہے۔ تم سب جانتے ہو۔ میں نے ایک ننھے سے' معصوم سے' پیارے سے بچے کو قبر کے اندر زندہ دیکھا ہے۔ وہ باہر آنا چاہتا تھا اور خبردار! یہ نہ کہنا کہ میں خواب دیکھ رہی تھی۔"

"ہرگز نہیں کہوں گا۔"

"کیا نہیں کہو گے؟"

"یہی کہ تم خواب دیکھ رہی تھیں۔ تمہیں پھر ایک آگہی ملی ہے۔"

وہ ایک صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ فوراً ہی بستر سے اتر کر تیزی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آئی پھر اسی صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ "یہ کیا ماجرا ہے؟"

وہ ہنس کر بولا۔ "حیات و موت کا ماجرا ہے۔ ذرا غور کرو۔ انسان اپنی موت کے ساتھ زمین کے اوپر بھی تو ساری عمر موت کے ساتھ رہتا ہے۔ ہاں یہ ایک عجیب سی بات لگتی ہے کہ زندگی جب زمین کے اوپر موت کے ساتھ چلتی ہے تو کیا زمین کے اندر موت کے ہمراہ زندگی نہیں ہو سکتی؟ کون جانتا ہے کہ

جس عجب تماشے میں زندگی گزرتی ہے
کیا عجب تماشا ہے زندگی کا ہونا بھی"

وہ جھنجلا کر بولی۔ "یہ تمہاری بہت بری عادت ہے۔ اتنی باتیں کیوں بناتے ہو۔ سیدھی سی بات کیوں نہیں کرتے۔ خدا کے لئے بتاؤ۔ اس آگہی میں کتنی صداقت ہے۔"

"صداقت ہی صداقت ہے۔"

"یعنی یہ سچ ہے کہ کسی قبر میں اس بچے کو زندہ دفن کر دیا گیا ہے۔ یا آئندہ اسے مُردہ سمجھ کر دفن کر دیا جائے گا اور وہ بیچارہ زندہ رہ کر باہر نکلنے کے لیے مچلتا رہے گا؟"

"ہاں کچھ ایسی ہی باتیں ہیں۔"

وہ اس کا منہ تکنے لگی۔ انتظار کرنے لگی کہ وہ آگے بولے گا۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ "خدا کے لیے یوں نہ دیکھو۔ میں تمہیں پہلے سمجھا چکا ہوں کہ مجھے کچھ حقائق معلوم ہوتے ہیں اور کچھ معلوم نہیں ہوتے۔ اب میں تمہیں ادھوری باتیں کیا بتاؤں اور کیا سمجھاؤں؟"

"مجھے ادھوری باتیں بتاؤ' میں جس قدر سمجھ پاؤں گی سمجھ لوں گی۔"

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا "ایک بچہ ہے' جو قبر میں پہنچے گا۔"

"رک جاؤ۔ دروازے کی طرف کیوں جا رہے ہو؟"

"تم بہت پریشان کرتی ہو۔ میں جتنا جانتا ہوں' اتنا کہہ کر جا رہا ہوں۔"

وہ تیزی سے سامنے آکر اس کا راستہ روک کر بولی۔ "میرے سوال کا جواب دو۔ تم اجل ہو' اس معصوم کو مارو گے' تب ہی وہ قبر میں پہنچے گا۔"

وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا "قسم کھاتا ہوں' اسے ہلاک نہیں کروں گا' تم عقل سے

سوچو' میں اسے ہلاک کروں گا تو پھر وہ قبر میں زندہ اور متحرک کیسے رہے گا؟"

"اوہ خدایا! وہ بچہ ابھی کہاں ہے؟ کیا ہم اس کی حفاظت نہیں کر سکتے۔"

"ہم حفاظت کر سکتے ہیں۔ اس طرح کہ میں اس کی روح قبض نہیں کروں گا اور تم' صرف تم اسے قبر سے زندہ سلامت نکالو گی۔"

وہ خوش ہوگئی کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے گی۔ اجل نے اسے ایک طرف ہٹا کر باہر جانے کے لیے دروازہ کھولا' وہ بولی۔ "پلیز' ایک اور سوال کا جواب دے دو۔ وہ کس کا بچہ ہوگا؟"

"تم شاید میری بات کا یقین نہ کرو یا میرے جواب کو گول مول سمجھو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سیاسی بچہ ہوگا۔" یہ کہتے ہی اجل نے دروازے کو باہر سے بند کیا اور نظروں سے گم ہوگیا۔

☆=========☆=========☆

وڈیرے شاہ صاحب نے اپنے علم کی روشنی میں اجل کا زائچہ بنایا۔ کئی بار اس میں کاٹ چھانٹ کی۔ کبھی ولدیت کے حوالے سے اور کبھی تاریخ پیدائش کے ذریعے متضاد باتیں سمجھ میں آتی رہیں۔ رات کو حسبِ وعدہ سردار جنید ان کے سامنے حاضر ہوا۔ اس نے پوچھا۔ "حضور! کیا اس کا زائچہ تیار ہوگیا؟"

شاہ صاحب نے کہا "میں کوشش کر رہا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار کسی عجیب سے شخص کو پا رہا ہوں۔ یہ کبھی کچھ اور کبھی کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ کیا آج تک تم نے یا کسی نے کسی شخص کا نام اجل سنا ہے؟"

"نہیں' یہ عجیب سا نام ہے۔ اجل تو موت کو کہتے ہیں۔"

"اور اس کے باپ کا نام عبدالخالق ہے۔ خالق پیدا کرنے والے کو کہتے ہیں۔"

"آپ کا علم کیا کہتا ہے؟"

"میں کبھی اس کے نام کے اعداد سے' کبھی تاریخ پیدائش کے حساب سے اعداد جوڑتا ہوں تو مجھ سے کہیں نہ کہیں جوڑنے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ میں اس غلطی کو درست کرتا ہوں تو کسی دوسرے حساب میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔"

"حضور! آپ نے تو ماشاءاللہ ولایت سے تعلیم حاصل کی ہے۔ پھر بھی حساب میں غلطی ہو جاتی ہے؟"

"یہاں بات تعلیم کی نہیں ہے۔ کوئی نادیدہ رکاوٹ ہے جو مجھے اس کا زائچہ بنانے سے روک رہی ہے۔ تم نے اجلاس میں کہا تھا کہ وہ کوئی ساحر ہے۔ اب مجھے بھی شبہ

ہونے لگا ہے۔"

"حضور! اس کمبخت ساحر کی وجہ سے میرے بیٹے کی کمزوریاں حاکم علی کے ہاتھ لگ گئی ہیں۔"

"تمہارا بیٹا حماد کہاں ہے؟"

"وہ سردار جمال الدین بھوٹانی کے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے اس نے فون پر بتایا ہے کہ بھوٹانی کے دو محافظوں کی لاشیں جنگل میں پائی گئی ہیں۔ فاریسٹ گارڈ کی رپورٹ کے مطابق کئی دشمنوں نے بھوٹانی پر حملہ کیا تھا۔ جنگل میں چیزنگ ہوتی رہی تھی۔ پھر پتا نہیں چلا کہ جمال الدین بھوٹانی کہاں چلا گیا ہے۔"

"کیا دشمنوں کے متعلق معلوم ہوا وہ کون تھے؟"

"حماد انہیں دیکھ لیتا تو پہچان جاتا۔ وہ جنگل کے دوسرے حصے میں شکار کے لیے گیا تھا۔"

"ہماری مخالف پارٹی کے سردار خلیل کمالی سے کئی بار بھوٹانی کی کاؤنٹر فائرنگ ہو چکی ہے۔"

"حضور! ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ ہمارے لیے کوئی عمل کریں۔ وہ اجل میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ کیا آپ اپنے علم سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس نے کتبے میں جو تاریخ لکھی ہے' وہ میرے حماد کی ہے؟"

شاہ صاحب نے ہنس کر کہا "اجل خواہ کتنا ہی بڑا ساحر یا عامل ہو۔ وہ کسی کی موت کا وقت معین نہیں کر سکتا۔ ہر ذی روح کی موت کا علم صرف کاتبِ تقدیر اور موت کے فرشتے کو ہوتا ہے۔ تم ناحق پریشان ہوتے ہو۔"

"کیا کروں۔ ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کی ماں کے مرنے کے بعد کئی شادیاں کیں کسی نے بیٹا پیدا نہیں کیا تو طلاقیں دیتا رہا۔ نصیب میں یہی ایک بیٹا ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ تمہارے بیٹے کے نصیب میں خوشحالی اور کامیابیاں ہیں۔"

"آپ کی زبان مبارک ہے۔ آپ دعا کریں۔ مشورہ دیں۔"

"تم نے پھر کوئی بیٹا پیدا نہیں کیا۔ حماد کی شادی کرو۔ اسے بیٹا اور تمہیں سردار پوتا ملے گا۔"

"آپ کا اقبال بلند رہے۔ میرے بیٹے کی شادی کے لیے آپ کسی شریف زادی کا انتخاب کریں تو ہماری مرادیں ضرور پوری ہوں گی۔"

"میں اپنے علم کی روشنی میں دیکھوں گا۔ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ کس

سے حماد کا ازدواجی رشتہ ہو کہ مراد بر آئے اور بیٹا وجود میں آئے۔" سردار جنید نے
کر وڈیرے شاہ صاحب کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ پھر یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ شاہ صا
حماد کی شادی کے سلسلے میں جس دن طلب کریں گے' وہ بیٹے کے ساتھ حاضر ہو جائے
دوسرے دن سے جمال الدین بھوٹانی کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ چونکہ وہ صر
سردار ہی نہیں سیاسی شخصیت کا مالک بھی تھا اس لیے لسبیلہ کی کئی پولیس پارٹیاں ا
تلاش کر رہی تھیں اس کی وہ گاڑی جسے وہ ڈرائیو کرتا ہوا' جان بچانے کے لیے بھاگتا
سیاسی قبرستان تک لے گیا تھا۔ سمندر کے ساحل پر ملی تھی۔ خلیل کمالی کے آدمیوں
اس گاڑی کو سیاسی قبرستان سے دور لے جا کر ایک اونچے ٹیلے سے سمندر میں گرا د
تاکہ کسی بھی تلاش کرنے والے کو بھوٹانی کی لاش وہاں سے نہ ملے اور وہ کبھی اپنے آ
قبرستان نہ پہنچایا جائے۔ مرجانہ' اجل اور حاکم علی اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ سردار
نے پارٹی لیڈر سے کہا "یہ اچھا موقع ہے' بھوٹانی کی گمشدگی یا موت کا الزام اجل نوا
لگاؤ۔ وہ ہمارے راستے کا بہت بڑا کانٹا ہے۔"

جس رات بھوٹانی کو قتل کر کے اس کی لاش چھپائی گئی تھی اس کی صبح اجل' مر
اور حاکم علی اس علاقے سے کراچی اور پھر اسلام آباد گئے تھے۔ اجل کو قاتل ثابت کر
کی کوششیں ہونے لگیں۔ پولیس انکوائری میں سوالات دور تک گئے کہ وہ کون ہے
کہاں سے آیا ہے؟ اور سردار جنید کے حلقے سے کس اعتماد سے الیکشن لڑنے والا ہے
پارٹی لیڈر اور وڈیرے شاہ صاحب نے پولیس افسران کو سیاسی دباؤ میں رکھا پھر بتایا کہ اج
دراصل حماد کی کچھ کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس حلقے سے کامیاب ہونا چاہتا ہے۔
اجل کو یہ کبھی نہ معلوم ہو کہ باپ بیٹے اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ وہ تینوں با
دنوں کے بعد واپس آئے تو انسپکٹر نے اجل کا محاسبہ کرنا چاہا۔ سردار حاکم علی نے کہا "جو
میں آئے ہو تو کچھ کھا پی کر جاؤ اور اپنی افسری صرف تھانے اور عوام تک رکھو۔ اگر جما
الدین بھوٹانی غائب ہو گیا ہے یا قتل کیا گیا ہے تو پہلے اس کی لاش دریافت کرو یا اجل کے
خلاف گرفتاری کا وارنٹ لے کر آؤ۔"

حاکم علی نے انسپکٹر کو حویلی سے بھگا دیا۔ انسپکٹر نے پارٹی لیڈر کے پاس آ کر کہا
"آپ لوگ اجل کے خلاف تحریری بیان دیں۔ میں اس کی گرفتاری کا وارنٹ حاصل
کر لوں گا۔"

لیڈر نے کہا "ہم کھل کر بیان نہیں دے سکیں گے۔ یہ حاکم علی سمیت تین سیا
مہرے کسی وقت ہمارے کام آ سکتے ہیں۔ ہمیں اس معاملے سے الگ رکھ کر کسی طرح اجل

کو مرڈر کیس میں پھانس لو۔"

انسپکٹر نے کہا "اجل کے خلاف نہ کوئی ثبوت ہے' نہ کوئی کھل کر گواہی دینے والا
ہے اور نہ ہی بھوٹانی کی لاش مل رہی ہے۔ آخر میں اسے کس طرح پھانسوں؟"

وہ پارٹی لیڈر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔
لیڈر نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو! کون ہے؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "بارہ دنوں سے ایک سیاستداں کی لاش ڈھونڈ رہے
ہو۔ لعنت ہے تم لوگوں کی عقل پر' کیا اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ سیاستداں کی
لاش سیاسی قبرستان میں ہی ملے گی۔"

لیڈر نے کہا۔ "تم نے ہم پر لعنت بھیجی ہے مگر اپنی بات سے چونکا دیا ہے۔ وہاں
لاش مل سکتی ہے۔ تم کون ہو؟ میں نے تمہاری آواز کہیں سنی ہے؟"

"پھر ایک بار لعنت بھیج رہا ہوں۔ آواز سن کر بھول جاتے ہو۔ ارے میں وہی
ہوں' جس نے سیاسی قبرستان بتایا ہے۔ کیا اب نام بھی بتاؤں کہ میرا نام اجل نواز ہے۔"

لیڈر نے فوراً ہی ریسیور رکھ کر کہا۔ "بھوٹانی کی لاش مل جائے گی۔ انسپکٹر' سپاہیوں
کو لے کر تم سیاسی قبرستان جاؤ۔ میں بھوٹانی کے رشتے داروں اور اپنے آدمیوں کے ساتھ
وہاں پہنچوں گا۔"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "یہ سیاسی قبرستان کیا ہوتا ہے؟ اور یہ ہے کہاں؟"

پارٹی کے ایک بندے کو انسپکٹر کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ ٹیلی فون اور ہرکاروں کے
ذریعے سیاسی پارٹی کے اور علاقے کے بڑے لوگوں کو لاش مل جانے کی اطلاع دے دی
گئی۔ تمام علاقوں میں ایک کھلبلی سی پیدا ہو گئی۔ تمام بڑے لوگ اپنے مسلح محافظوں کے
ساتھ اپنی گاڑیوں اور گھوڑوں پر بیٹھ کر تیز رفتاری سے اس سیاسی قبرستان میں پہنچے۔ وہاں
اچھا خاصا مجمع لگ رہا تھا' جیسے سیاسی جلسہ ہونے والا ہو۔ وسیع و عریض احاطے کے اندر
وہی فرزانہ اور اس کی بچے کی قبریں تھیں۔ کوئی تیسری قبر کسی کو نظر نہیں آئی۔ البتہ
ایک جگہ بڑا سا گڑھا تھا۔ وہاں جھانکنے سے اس کی گہرائی میں ایک جوتا نظر آیا۔ ایک
شخص نے گڑھے میں اتر کر اس جوتے کو اٹھایا' اس پر خشک لہو کی پپڑی سی جمی ہوئی تھی۔
بھوٹانی کے بھائی نے کہا۔ "یہ میرے بھائی کا جوتا ہے۔ میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اسے
ڈان کارلوس کے جوتے پسند تھے۔"

سردار خلیل کمالی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "کمال ہے کہ جوتے بھی پسند کیے جاتے
ہیں۔ وہ لاش ایک جوتا چھوڑ کر دوسرے کو سر پر رکھ کر یہاں سے فرار ہو گئی ہے۔"

بھوٹانی کے بھائی نے گن سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ "تم میرے مقتول بھائی کی
کر رہے ہو' میں تمہیں.........."

اس کی فائرنگ سے پہلے سردار کمالی کے وفادار نے اس کے بازو پر گولی ماری۔
بھوٹانی کے بھائی کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے اسی گڑھے میں جا
اس کے وفادار بھی اِدھر اُدھر چھلانگیں لگاتے ہوئے فائرنگ کرنے لگے۔ دوسری طرف
سے بھی دوڑتے ہوئے چھپتے ہوئے فائرنگ ہونے لگی۔ وہاں چھپنے کے لیے نہ کوئی د
تھی نہ پتھر نہ ٹیلے تھے۔ چند درخت تھے۔ پولیس والوں کی مصیبت ہوگئی تھی۔ وہ ا
انسپکٹر کے ساتھ زمین پر اوندھے لیٹ گئے تھے۔ اندھا دھند فائرنگ سے بچنے کے لیے
ایک طریقہ رہ گیا تھا۔ اگر انہیں محاذ بنا کر دونوں پارٹیوں کو روکنے کا موقع ملتا' تب بھی
انہیں قانون ہاتھ میں لینے سے روک نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس فرنگیوں ک
زمانے کی بندوقیں تھیں اور سرداروں وڈیروں کے وفادار سیون ایم ایم' کلاشنکوف جیسے
ہتھیاروں سے کھیل رہے تھے اور یہ کھیل ان کے آباواجداد بھی کھیلتے آئے تھے او
پولیس والے برسہا برس سے قبیلوں کی ایسی خونی جنگوں کے تماشائی بنتے آئے تھے۔ وہاں
بھوٹانی اور کمالی کے قبیلوں کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے سردار اور وڈیرے بھی تھے۔ ان
میں سردار جنید سالاری اور حماد بھی تھے۔ دونوں باپ بیٹے ایک تناور درخت کے پیچھے پ
لیے ہوئے تھے۔ جنگ صرف بھوٹانی اور کمالی کے درمیان جاری تھی۔ دوسرے قبیلے
والے چیخ چیخ کر انہیں فائربندی کے لیے کہہ رہے تھے۔ اوندھا پڑا ہوا انسپکٹر بھی انہیں
قانون کا واسطہ دے رہا تھا۔ آخر اس لڑائی کو اختتام تک پہنچنا تھا۔ دونوں پارٹیوں کے
کارتوس کم سے کم ہوتے جا رہے تھے اور فیصلہ کن نتیجہ حاصل کرنے کے لیے کچھ
کارتوس بچا کر رکھنا لازمی تھا۔ اس لیے فائرنگ بند ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک وہاں خاموشی
رہی۔ پھر ایک درخت کے پیچھے سے سردار کمالی کی سیاسی پارٹی کے لیڈر نے بھوٹانی کی
سیاسی پارٹی کے لیڈر کو مخاطب کر کے کہا۔ "میں بھی اپنے معزز سردار کمالی سے درخواست
کرتا ہوں' تم بھی اپنے آدمیوں سے کہو اب ایک گولی بھی نہ چلے۔ کچھ اندازہ نہیں ہے
کہ یہاں کتنے مارے گئے ہیں۔"

دوسری پارٹی کے لیڈر نے کہا۔ "اگر ہم دونوں سیاسی راہنما خالی ہاتھ سب کے
سامنے آجائیں تو پھر کسی پارٹی کا کوئی بندہ گولی نہیں چلائے گا۔ کیونکہ تم پر گولی چلے گی تو
جواباً مجھ پر بھی چلے گی۔"

وہ دونوں ایک ہی فیصلہ کرتے ہوئے اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے درختوں کے پیچھے

ے نکل آئے۔ مقتول بھوٹانی کا بھائی گڑھے کے اندر دبکا ہوا تھا۔ وہ بھی زخمی بازو کو تھام
کر کراہتا ہوا باہر آگیا۔ زمین پر لیٹے ہوئے بیشمار لوگ یوں اٹھنے لگے جیسے عارضی مُردے
تھے' اب اپنی قبروں سے اٹھ رہے تھے۔ صرف سترہ مُردے عارضی نہیں تھے۔ کھلے
میدانِ جنگ میں بچ نہیں پائے تھے۔ ایک دوسرے کی گولیوں سے ہلاک ہو کر گورستان
بے گور و کفن پڑے ہوئے تھے۔ انسپکٹر نے اپنی وردی سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔
"آپ علاقے کے بڑے لوگ ہیں۔ بڑی ذہانت بھی رکھتے ہیں مگر جوش اور جنون میں آکر
کیا حاصل کرتے ہیں؟ کچھ نہیں' ایک دوسرے کی تباہی' انسانی لاشیں اور بس۔"

مقتول بھوٹانی کے زخمی بھائی نے کہا۔ "ہم یہاں اپنے بھائی کی لاش لینے آئے تھے۔
یہ وقت سردار کمالی کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

سردار کمالی نے کہا۔ "کیوں نہیں آنا چاہیے تھا؟ یہ ایک سیاسی قبرستان ہے۔ ہم
سب ہی سیاسی لوگ یہاں آسکتے ہیں۔ اعتراض کی معقول وجہ بتاؤ۔"

ایک نے پوچھا۔ "یہاں تمہارے کس عزیز کو دفن کیا گیا ہے کہ فاتحہ پڑھنے آئے
ہو؟"

سردار کمالی نے کہا "مجھے فون پر اجل نواز نے اطلاع دی تھی کہ ادھر جمال الدین
بھوٹانی کی لاش بے کفن دفنائی گئی ہے۔ بھوٹانی اپنی زندگی میں میرا دشمن تھا۔ پھر بھی میں
اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا تھا۔ یہ نیکی اور انسانیت ہے۔ کیا اس پر بھی اعتراض کرو
گے؟"

"لیکن ہمارے بھائی کی لاش کہاں ہے؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ میں تم لوگوں کے بعد یہاں آیا ہوں۔"

سردار جنید اور پارٹی کے لیڈروں نے کہا۔ "ہمیں بھی اجل نے فون پر اطلاع دی
تھی کہ لاش اس نئے قبرستان میں ہے۔ وہ تو کوئی موت کا فرشتہ لگتا ہے۔ اس نے ہم
سب کو لڑانے اور مرنے مارنے کے لیے یہاں اکٹھا کیا ہے۔"

ایک لیڈر نے کہا "آپ نے اور ہمارے لوگوں نے لڑنے مرنے کی ابتدا کی اور یہ
انتہا پائی۔ اسے خواہ مخواہ موت کا فرشتہ کہا جا رہا ہے جبکہ اس نے درست اطلاع دی تھی۔
وہ گڑھا بتاتا ہے کہ مقتول کو وہاں دفن کیا گیا تھا۔"

دوسرے لیڈر نے کہا "لیکن یہاں لاش نہیں ملی۔ صرف ایک جوتا ملا ہے۔"

کمالی نے کہا "جب کچھ نہ ملے تو جوتے ہی ملتے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا "پلیز' کمالی صاحب! آپ پھر طیش دلانے والی باتیں کر رہے ہیں۔

ہمیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ اجل نواز کو کیسے معلوم ہوا کہ یہاں مقتول کو دفن ہے۔"

ایک نے سوال کیا۔ "اگر اجل نے اطلاع دی تھی تو اسے بھی یہاں موجو چاہیے تھا۔ یہاں لسبیلہ اور خضدار کے تمام اکابرین موجود ہیں۔ صرف سردار حاکم اجل نواز نہیں ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "واردات کرنے والے جائے وارات پر گرفتار ہونے آتے۔"

اسی وقت ایک پجیرو قبرستان کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس میں مرجانہ' اور حاکم علی بیٹھے ہوئے تھے۔ پیچھے کی دو گاڑیاں ان کے مسلح وفاداروں سے بھری تھیں۔ وہ گاڑیاں ایک جگہ آکر رک گئیں۔ وہ تینوں پجیرو سے باہر آکر لاشوں کو لوگوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ انسپکٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔ "مسٹر اجل! آپ ہم سب کو اطلاع دی کہ یہاں مقتول جمال الدین بھوٹانی کی لاش ہے اور آپ اطلاع د والے سب سے آخر میں آرہے ہیں۔"

اجل نے پوچھا۔ "کیا میں نے اطلاع دی تھی؟ آپ ہوش و حواس میں تو ہمیں خود کسی نے فون پر بتایا تھا کہ سیاسی قبرستان میں زبردست گولیاں چل رہی چونکہ ہم نے اس قبرستان کے لیے یہ جگہ مخصوص کی ہے اس لیے ہم یہاں فائرنگ وجہ معلوم کرنے آئے ہیں۔"

سردار جنید کی سیاسی پارٹی کے لیڈر نے بھی یہی کہا "مسٹر اجل' آپ نے مجھے فون کہا تھا کہ یہاں بھوٹانی کی لاش پائی جاسکتی ہے۔"

دوسری پارٹی کے لیڈر نے کہا "مسٹر اجل' آپ نے مجھے فون پر کہا تھا کہ یہا بھوٹانی کی لاش پائی جاسکتی ہے۔"

سردار جنید نے بھی کہا۔ "اجل! تم میرے بیٹے جیسے ہو۔ میں جھوٹ نہیں کہوں تم نے مجھے بھی فون پر یہاں بلایا تھا؟"

اجل نے کہا "اگر میں یہ کہوں کہ آپ کے بیٹے نے مجھے فون کرکے یہاں بلایا کیا یہ سچ ہوگا؟"

حماد نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ میں نے تمہیں کوئی فون نہیں کیا تھا۔"

اجل نے کہا۔ "میں نے بھی کسی کو فون نہیں کیا تھا۔ میرے خلاف ایسی سازش جارہی ہے' جس کا نتیجہ سازش کرنے والوں کے حق میں برا نکلے گا۔ میرا کچھ نہیں بگڑ

ا کوئی ثابت نہیں کرسکے گا کہ فون پر بولنے والا میں ہی تھا۔"

سردار حاکم علی نے کہا۔ "سردار جنید! تم اور تمہارے بیٹے کو اجل کے خلاف کچھ لے وقت یہ دیکھ لینا چاہیے کہ پیروں تلے زمین رہے گی یا نہیں؟"

سردار جنید نے گھبرا کر کہا۔ "میں اجل کے خلاف نہیں بول رہا ہوں۔ مجھے فون پر ی نے اجل کا نام لے کر دھوکا دیا ہوگا۔"

یاسی پارٹی کے لوگ بھی کھل کر اجل کے خلاف کچھ نہیں بول سکتے تھے۔ سب نے ی کہا کہ کسی نے اجل کا نام لے کر فون پر غلط اطلاع دی تھی۔ مقتول بھوٹانی کے زخمی ائی نے کہا "لیکن اطلاع غلط نہیں تھی۔ یہاں ہمارے بھائی کو دفن کیا گیا تھا۔"

"تو پھر لاش کہاں گئی؟"

"شاید کسی نے گرفتاری کے خوف سے اس جگہ کو دوبارہ کھود کر لاش غائب کردی ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "خوف قتل کے وقت ہوتا ہے یا لاش چھپاتے وقت اور جب وہ یک جگہ چھپادی جاتی ہے تو قاتل کبھی اسے وہاں سے کھود کر دوسری جگہ منتقل کرنے کا رہ مول نہیں لیتا۔"

مقتول بھوٹانی کے ایک عزیز نے کہا "ہمارے خاندان کے لوگ مرنے کے بعد اپنے ائی قبرستان میں دفن کیے جاتے ہیں۔ ہمارے بھائی کی لاش کا سراغ لگانا ہوگا۔ اسے ایک سے کھود کر دوسری جگہ لے جایا گیا ہے۔ ہمارے ایک خاندانی بزرگ کی میت خراب ارہی ہے۔"

زخمی بھائی نے کہا۔ "دشمنی زندگی تک ہی رہے تو اچھا ہے لیکن جو موت کے بعد ہمارے بھائی کی میت خراب کررہا ہے' میں اس سے سمجھوتا کرنا چاہتا ہوں۔"

اجل نے کہا "میں نے اسی لیے یہ سیاسی قبرستان بنایا ہے۔ یہاں سیاسی سمجھوتے ہو ہیں۔"

مقتول بھوٹانی کے زخمی بھائی نے سوچتی ہوئی گہری نظروں سے سردار کمالی کو دیکھا' کہا "میں تنہائی میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

کمالی نے کہا "مجھے انکار نہیں ہے۔ یہ قبرستان بہت وسیع و عریض ہے' آؤ ہم ادھر لتے ہوئے چلیں لیکن اپنے اپنے ایک دوست کو ساتھ رکھیں تو بہتر ہوگا۔" دو سیاسی یوں کے دو لیڈر ان کے ساتھ ہوگئے۔ وہ چاروں مجمع سے دور جانے لگے۔ وہاں کی ین پر سترہ سیاسی کارکنوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی مائیں بہنیں' بیویاں اور

معصوم بچے گھروں میں ان کے منتظر ہوں گے۔ اپنے آقاؤں اور وڈیرے سیاستدا قربان ہونے والے کارکنوں کی لاشیں وہیں پڑی رہیں گی۔ وہ اپنے اپنے گھر یا علاقے نہیں جائیں گی کیونکہ ایسے جاں نثاروں کا کوئی آبائی قبرستان نہیں ہوتا۔ ان عزیزواقارب ماتم کرتے ہوئے اسی سیاسی قبرستان میں انہیں دفن کریں گے۔ می خاندانی وڈیروں اور سرداروں کا ہوتا ہے۔ اپنے قبیلے کا سردار اپنے آبائی قبرستا آخری نیند نہ سوئے تو سردار قبیلے کی برتری خاک میں مل جاتی ہے۔ ہمیشہ یہ کانٹا چبھ ہے کہ ہماری ایک عزیز ترین چیز دشمن کے قبضے میں ہے۔ خواہ وہ لاش ہی کیوں نہ مقتول بھوٹانی کا زخمی بھائی اور سردار کمالی اپنے اپنے لیڈر کے ساتھ مجمع سے دور چلے پھر زخمی بھائی نے کہا۔ "میرے بھائی کا قتل تم پر قرض رہے گا۔ جب میرا وقت آئے یہ قرض وصول کر کے رہوں گا۔ فی الحال مجھے بھائی کی لاش چاہیئے۔"

سردار کمالی نے کہا۔ "یہاں ہم چاروں کے درمیان جو بات ہوگی' وہ سیاسی لب ہوگی۔ کیونکہ جمال الدین بھوٹانی کا قتل سیاسی معاملہ ہے۔"

بھوٹانی کے ساتھی سیاسی لیڈر نے کہا "آپ اس معاملے کی وضاحت کریں۔"

سردار کمالی نے کہا۔ "میرے علاقے میں ماہرین نے تیل کے ذخیرے کی تصدیق دی تھی۔ وفاقی حکومت نے چینی ماہرین کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ایسے میں جمال ال بھوٹانی اس جھوٹ پر اڑ گیا کہ جہاں تیل کے کنوئیں کی کھدائی ہونے والی ہے وہا زمینوں کا کچھ حصے کا مالک وہ بھی ہے۔ لہٰذا تیل کی دولت میں اس کا بھی حصہ ہوگا۔"

لیڈر نے کہا۔ "ہم یہ باتیں جانتے ہیں' تم نے زمین کے اور کنوئیں کی کھدائی بلیو پرنٹ بھوٹانی کو دکھائے تھے۔ وہ قائل ہو گیا تھا کہ تیل کی دولت میں اس کا حصہ رہے گا۔ یہ بات ختم ہو چکی تھی۔"

"سیاست کی کوئی لڑائی آخری لڑائی نہیں ہوتی۔ بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس چینی ماہرین کو اغوا کیا تھا۔ تاوان کی رقم وصول کی تھی۔ ماہرین کو خوفزدہ ہو کر یہاں جانے پر مجبور کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیل کی دولت ابھی تک زمین کے اندر اس نے ملک کی دولت کو جس میں میرا بھی کچھ حصہ تھا' باہر آنے نہیں دیا۔"

سردار کمالی جو کہہ رہا تھا' اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ چینی ماہرین کا وفاقی حکومت سے تھا۔ بڑے پیمانے پر انکوائری کی گئی تھی.......... جمال الدین بھوٹانی ثابت ہو رہا تھا۔ مگر سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے باعث جرم کے ثبوت مٹا دیئے گئے تھے کمالی نے مجرم کو معاف نہیں کیا۔ اسے کتے کی طرح دوڑا دوڑا کر مار ڈالا۔ مقتول کے

بھائی نے کہا۔ "تم نے جو کرنا تھا' وہ کر لیا۔ اب لاش واپس کر دو۔"

"کیسے واپس کروں؟ وہ زمین کے اندر ہے' اسے باہر کیسے نکالوں؟"

لیڈر نے پوچھا۔ "اسے باہر نکالنے میں کیا دشواری ہے؟ کیا کوئی رکاوٹ ہے؟"

"ہاں۔ وہی رکاوٹ جو تیل کی دولت کو باہر لانے میں ہے۔ کنوئیں کی کھدائی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ جس دن کھدائی شروع ہوگی اور تیل نکل آئے گا تو میں تمہارے بھائی کی لاش بھی زمین سے نکال کر تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

وہ غصے سے بولا۔ "یہ.......... یہ سراسر بدمعاشی ہے۔"

"بدمعاشی کا دوسرا نام سیاست ہے۔ تم لوگوں نے زمین کی تہہ میں میری دولت چھپائی ہے۔ میں نے تمہارے ایک بزرگ کی میت چھپائی ہے۔ اگر چاہتے ہو کہ میت خراب نہ ہو اور بزرگ کے شایان شان اسے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے تو اپنے سیاسی لیڈر کے ساتھ اسلام آباد دوڑنا شروع کر دو۔ میرے کنوئیں کی جو فائلیں مُردہ خانے میں ڈال دی گئی ہیں' انہیں زندہ کراؤ۔ پہلے دو پھر لو۔" سرار کمالی یہ کہہ کر اپنے لیڈر کے ساتھ مجمع کی طرف جانے لگا۔ اس نے وہاں پہنچ کر کسی سے بات نہیں کی۔ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اجل' مرجانہ اور حاکم علی بھی جا چکے تھے۔ سردار کمالی نے دو گھنٹے بعد فون پر رابطہ کر کے کہا "مسٹر اجل نواز! تمہارا شکریہ تم نے بروقت اطلاع دی اور میں نے بھوٹانی کی لاش وہاں سے ہٹا دی۔"

اجل نے کہا۔ "میں نے تمہارے سیاسی مقاصد کو پیشِ نظر رکھا۔ تم بھی میرے سیاسی قبرستان کو پیشِ نظر رکھو۔"

"بے شک میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ میرے آدمی آج رات پھر بھوٹانی کی لاش اس سیاسی قبرستان میں لا کر دفن کریں گے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا کہ لاش کہاں سے کہاں سفر کرتی ہوئی پھر اپنی جگہ آگئی ہے۔" وہ فاتحانہ انداز میں قہقہہ لگا کر بولا۔ "مسٹر اجل! یہ تو بتا دو' تمہیں کیسے معلوم ہوا تھا کہ ہم نے بھوٹانی کو تمہارے قبرستان میں چھپایا تھا؟"

"کیسا بچگانہ سوال کیا ہے تم نے؟ بھئی میرے گھر میں کچھ چھپاؤ گے تو کیا مجھے معلوم نہیں ہوگا؟"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ مرجانہ نے کہا۔ "مجھے اس مرنے والے پر ترس آ رہا ہے۔ موت کے بعد اس کا ٹھکانا نہیں ہے۔"

وہ بولا۔ "آدمی کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ زندگی کی ہر رات اپنے لیے بستر

بچھاتا ہے لیکن اس کا آخری بستر دنیا والے بچھاتے ہیں۔ اگر تم دنیا کو پھول دے کر جاؤ تو وہ پھول بچھائیں گے اور اگر کسی کے پیروں تلے سے زمین کھسکا کر جاؤ گے تو تمہارا م بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ کھسکتا رہے گا۔ مستقل الاٹمنٹ نصیب نہیں ہو گا۔"

☆==========☆==========☆

وڈیرے شاہ صاحب گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بول رہے تھے۔ ان کے سامنے فر نشست پر سردار جنید، حماد اور ان کی سیاسی پارٹی کے لیڈر اور مشیر بیٹھے ہوئے تھے اور ا کی گفتگو سر جھکائے سن رہے تھے۔

انہوں نے کہا۔ "میں نے سردار جنید سے وعدہ کیا تھا کہ علم نجوم کی روشنی میں ا کا ایک خاندانی مسئلہ حل کروں گا۔ یوں دیکھا جائے تو یہ محض حماد کی شادی کا مسئلہ ہے۔ ایک اعلیٰ خاندانی لڑکی سے شادی ہو جائے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے لیکن میں اپنے علم آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ شادی کا یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ دکھائی دے رہا ہے۔"

سردار جنید نے کہا۔ "حضور! میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ یہی آئندہ بیٹے پیدا کر سکتا ہے۔ شادی مسئلہ بنے گی تو کیا ہو گا؟"

شاہ صاحب نے کہا "مجھے تمہارے خاندانی مسئلے پر تنہائی میں گفتگو کرنا چاہئے لیک میں نے پارٹی کے اہم افراد کو اس لیے بلایا ہے کہ حماد کی شادی سیاسی چالوں سے ہی سکتی ہے۔"

سب نے سوالیہ نظروں سے پارٹی کے چیئرمین روحانی پیشوا کو دیکھا۔ انہوں نے کہا "حماد کے ستارے مرجانہ سے مل رہے ہیں۔" سب چونک پڑے۔ حماد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ اس کی ضد تھی اور وہ ضد ایسے حواس پر چھائی تھی کہ اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے اغوا بھی کیا تھا۔ اپنی بہت سی کمزوریاں اس کے ہاتھوں میں دے بیٹھا تھا۔ اب اس کے حصول سے باز آجانا چاہئے تھا اور وہ کسی حد تک مایوس بھی ہو چکا تھا لیکن شاہ صاحب کی بات نے دل دھڑکا دیا اور سوئی ہوئی ہوس جگادی۔ وہ جہاں بیٹھا تھا وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا اس لیے پہلو بدل رہا تھا۔ سردار جنید نے حیرانی سے پوچھا "حضور! کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے مرجانہ کو بہو بنانا چاہیے؟"

"میں بھی کہتا ہوں۔ ستارے بھی کہتے ہیں اور سیاست کا تقاضہ بھی یہی ہے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ مرجانہ اور حاکم علی کو پورا یقین ہے کہ ہم نے کسی چالاکی سے فرزانہ کو قتل کیا ہے۔ جب ایک قتل ہوئی تو کیا وہ دوسری کو میری بہو بنانا گوارا کریں گے؟"

"کیا فرزانہ کو واقعی قتل کیا گیا تھا؟"

"آں؟" باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر سردار جنید نے کہا "حضور! ہم آپ کے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ فرزانہ میری بہت اچھی بہو اور حماد کی ایک محبت کرنے والی وفادار بیوی تھی۔ ہمارے پاس آپریشن کی میڈیکل رپورٹ ہے۔ ایسے ٹھوس ثبوت کے ساتھ ہم نے حاکم علی کو قسم کھا کر بھی اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کی مگر اجل نے انہیں ہمارے خلاف بھڑکایا ہے۔"

پارٹی لیڈر نے کہا۔ "اجل نے ان باپ بیٹی کے ساتھ رہ کر کچھ ایسا رول ادا کیا ہے کہ وہ ہمارے دشمن ہو گئے ہیں۔"

"حماد نے مرجانہ کو اغوا کرکے دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ لہٰذا صرف اجل کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔"

حماد نے یہ بات کہنے والے کو گھور کر دیکھا۔ شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بات نہ بڑھاؤ۔ ہمارے پارٹی لیڈر کا یہ مشیر درست کہہ رہا ہے۔ تمہاری ایک غلطی نے اجل کو باپ بیٹی کی نظروں میں بہت اہم بنا دیا ہے۔ پھر جو ہو چکا ہے اس پر بحث کرنے سے صرف وقت ضائع ہو گا۔ آگے جو ہونا ہے اس پر بات کی جائے۔"

پارٹی لیڈر نے کہا۔ "آپ نے حماد اور مرجانہ کے رشتے کی بات کی ہے تو یقیناً درست ہی کی ہے۔ سیاسی تقاضا بھی یہی ہے۔ سردار جنید مرجانہ کو نہیں قومی اسمبلی کی ایک سیٹ کو بہو بنا کر لائے گا۔"

"مگر بلی کے گلے میں حماد کے نام کی گھنٹی کیسے باندھی جائے گی؟"

ایک نے پوچھا۔ "حضور! اس سلسلے میں آپ نے بھی غور کیا ہو گا؟"

"ہاں غور کیا ہے۔ ستارے بھی کہتے ہیں کہ کسی طرح اجل کو ان سے دور کر دیا جائے۔ ایسا کرنا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ اس کے بغیر باپ بیٹی کی ذہانت اور سیاست آدھی رہ جائے گی۔"

حماد نے کہا۔ "حضور، آپ نے فرمایا تھا کہ وہ کمبخت ساحر ہے یا کوئی پُراسرار علم جانتا ہے۔ ایسے شخص کو قابو میں کیسے کیا جائے گا؟"

سردار جنید نے کہا۔ "مرجانہ کو جس خفیہ اڈے میں قید کیا گیا تھا، وہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ فرزانہ کس اسپتال میں ہے، یہ کسی کو نہیں بتایا گیا تھا مگر اس نے مرجانہ کو اس اسپتال میں پہنچا دیا تھا۔ اس نے دو روز پہلے ہم سب کو فون کرکے بتایا تھا کہ بھوٹانی کی لاش سیاسی قبرستان میں ہے۔ اگرچہ لاش نہیں ملی لیکن بھوٹانی کے زخمی بھائی نے ہمیں بتادیا ہے کہ

لاش کو سردار کمالی نے اس سیاسی قبرستان سے نکال کر کسی دوسری جگہ چھپایا ہے۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اجل بہت ہی پُراسرار بندہ ہے اور اس نے ابھی سے سردار کمالی کی پارٹی سے گٹھ جوڑ شروع کر دیا ہے۔ وہ باپ بیٹی کو ہماری طرف مائل نہیں ہونے دے گا۔"

حماد نے کہا۔ "جب ہمارے پاس دشمن کو زیر کرنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا ہے تو اسے گولی مار دیتے ہیں۔"

"تم مرجانہ کے سلسلے میں ایک نادانی کر چکے ہو۔ اجل کے معاملے میں دور رہو۔ ہم اس کا علاج سوچیں گے۔"

"سوچنے کا زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ الیکشن سے پہلے شادی ہوگی تو دونوں باپ بیٹی کی سیٹیں ہمیں ملیں گی۔"

پارٹی لیڈر کو سیٹیں حاصل کرنے کی فکر تھی۔ سردار جنید اپنے ایک بیٹے سے بیٹے پیدا کروانے کے لیے بے تاب تھا۔ حماد کی شادی کر کے ایک پوتے کو دنیا میں لانے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ میرا خاندانی اور ہم سب کا سیاسی تقاضا ہے۔ بدمعاشی کرنی ہی ہوگی۔ حماد نادان تھا مگر ہم نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔"

لیڈر نے تائید کی۔ "ہاں سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔ ایک بات یہ عقل میں آرہی ہے کہ اگر وہ خفیہ اڈوں تک پہنچ جاتا ہے۔ زمین میں چھپی ہوئی لاش کی رپورٹ تمام لوگوں کو فون کے ذریعے دیتا ہے تو اپنی موت کی خبر کسے دے سکے گا؟"

حماد نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یہ ہوئی عقل کی بات۔ وہ خود کو اجل کہتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ ایک گولی لگے تو اپنے ہی سیاسی قبرستان میں لیٹ جائے گا۔ بس اسی طرح اس سے پیچھا چھڑایا جاسکتا ہے۔"

وڈیرے شاہ صاحب نے کہا۔ "جیسا کہ میرا علم کہتا ہے اور حالات بھی کہتے ہیں کہ وہ کوئی ساحر یا پُراسرار عامل ہے۔ لہٰذا ہم میں سے کوئی اس کے خلاف کچھ نہ کرے۔ ورنہ ناکامی کی صورت میں وہ ہماری پارٹی کے لیے اور مصیبت بن جائے گا۔"

"حضور! ہم اپنے طور پر کچھ نہیں کریں گے۔ آپ حکم دیں' کیا ہونا چاہیے؟"

"واردات کرنے والوں کا تعلق نہ ہماری پارٹی سے ہو' نہ ہمارے صوبہ سے ہو۔ وہ دوسرے صوبے سے آئیں گے۔"

وہ آہستہ آہستہ بولنے لگے۔ سب سر جھکائے کان لگا کر سننے لگے۔ دریائے سندھ اور قومی شاہراہ کے کنارے جو جنگلات ہیں' وہ لاکھوں ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔

جنگلات کے بعض حصے اس قدر گھنے ہیں کہ وہاں سورج کی روشنی بھی نہیں پہنچتی ہے۔ دن کے وقت بھی نیم تاریکی چھائی رہتی ہے۔ جنگلات کے ایسے حصوں میں ڈاکوؤں نے اڈے بنا رکھے ہیں۔ شہری' دیہاتی اور سیاسی زندگی گزارنے والے جاگیردار وڈیرے جانتے ہیں کہ یہ ڈاکو کہاں پائے جاتے ہیں۔ کچھ تو ان کی حویلیوں میں مہمان بھی رہتے ہیں۔ کوئی خطرہ درپیش ہو تو مہمان جنگلوں میں چلے جاتے ہیں۔ جدید ہتھیار' جیبی ٹرانسمیٹر اور موبائل فون وغیرہ نے شہروں اور جنگلوں کے درمیان لمحاتی فاصلہ قائم کر دیا ہے۔ پولیس کرپٹ ہو یا دیانتدار' وہ اس وقت تک کسی ڈاکو پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی جب تک کہ کسی وڈیرے یا کسی بااثر سیاستدان کا تعاون نہ ہو۔ سردار جنید کی دوستی ایک زمیندار اللہ رکھیو سے تھی اور زمیندار اللہ رکھیو سے ڈاکو مراد ماچھی کا بڑا دوستانہ تھا۔ ان کے درمیان اجل کے معاملے میں سودا ہوگیا۔ سردار جنید نے کہا۔ "ایک اجل کو اغوا کرنا یا گولی مار دینا مراد ماچھی کے لیے کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں لڑکی کے باپ کو بھی یرغمال بنا کر رکھا جائے۔"

اللہ رکھیو نے کہا "سائیں! تم جو چاہو گے وہ ہو جائے گا۔ بس ہمیں خبر دیتے رہو کہ اجل' مرجانہ اور حاکم علی کب شہر جاتے اور آتے رہتے ہیں۔"

"میں اطلاع دیتا رہوں گا لیکن مراد ماچھی کو سمجھا دینا کہ وہ مرجانہ کو ہاتھ نہ لگائے۔ وہ میرے بیٹے کی بیوی اور میرے پوتوں کی ماں بننے والی ہے۔"

"مراد ماچھی عورتوں کے معاملے میں پکا بدمعاش ہے مگر میں جس کے لیے منع کردوں' اسے ہاتھ کبھی نہیں لگائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہاری ہونے والی بہو میری بیٹی کی طرح ہے۔"

اس نے مطمئن ہو کر زمیندار کو مرجانہ' اجل اور حاکم علی کی تصویریں دے دیں اور دوسرے صوبے سے اپنے صوبے میں چلا آیا۔ اپنے وفاداروں کو جاسوسی پر لگا دیا کہ وہ سب اجل وغیرہ پر نظر رکھیں۔ ایک دن پتا چلا کہ اجل اور حاکم علی کراچی گئے ہیں۔ مرجانہ پہلے ہی کراچی میں تھی۔ توقع تھی کہ تینوں ایک ساتھ واپس آئیں گے۔ مراد ماچھی کو الرٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنے حواریوں کے ساتھ ایسے مقام کی ناکہ بندی کیے ہوئے تھا' جہاں سے وہ تینوں بچ کر نہیں جاسکتے تھے۔ پھر یہی ہوا مرجانہ کی پجیرو ادھر سے گزری تو گھیرلی گئی۔ اجل اور حاکم علی اپنی مدافعت نہ کرسکے۔ ان کے وفاداروں کو بھی ہتھیار پھینکنا پڑے۔ مراد ماچھی نے ان سب کو بے بس کرنے کے بعد گاڑی کے اندر دیکھا۔ پھر حاکم علی سے پوچھا۔

"تمہاری بیٹی کہاں ہے؟"

حاکم علی نے کہا "وہ یہاں ہوتی تو نظر آتی۔ وہ شہر میں ہے۔ تم اپنی ضرورت بتاؤ؟"

"گاڑی یہاں چھوڑ دو اور ہمارے ساتھ پیدل چلو۔ جہاں ہمیں جانا ہے ادھر ایسی گاڑیوں کے لیے راستے نہیں ہیں۔"

انہیں گاڑی چھوڑ کر ان کے ساتھ جانا پڑا۔ حاکم علی نے راستے میں پوچھا۔ "کیا ہمارے لیے کسی سے سودا ہوا ہے؟"

"یہی سمجھو اور زیادہ باتیں نہ کرو۔"

"باتیں کرنے سے راستہ کٹ جاتا ہے۔ پھر تم جان سے نہیں مارو گے اس لیے جنگل میں لیے جا رہے ہو۔ دو ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمیں قیدی بنا کر تاوان حاصل کرو گے یا پھر دشمن ہماری قیمت دے چکے ہیں۔"

اجل نے کہا۔ "تیسری بات بھی سمجھ میں آ رہی ہے۔ یہ ڈاکو بھائی وہاں مرجانہ کو پوچھ رہا تھا۔ جن لوگوں نے ہمارا سودا کیا ہے۔ وہ مرجانہ کے سلسلے میں مایوس ہو جائیں گے۔"

سردار جنید حماد اور پارٹی کے خاص لوگ وڈیرے شاہ صاحب کے آس پاس موجود تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ تب فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سردار جنید نے ریسیور اٹھایا۔ اس کی توقع کے مطابق زمیندار اللہ رکھیو نے کہا۔ "تمہارا کام ہو گیا ہے۔ مراد ماچھی نے سردار حاکم علی اور اجل نواز کو قیدی بنا کر جنگل کے ایک تاریک حصے میں رکھا ہے لیکن وہ لڑکی نہیں ہے۔"

سردار جنید نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟ کیا وہ شہر سے واپس نہیں آئی ہے؟"

"نہیں آئی۔ تب ہی تو کہہ رہا ہوں۔ تمہارے دو ہی آدمیوں کو قیدی بنایا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں ابھی پانچ منٹ بعد فون کروں گا۔"

وہ ریسیور رکھ کر بولا "حضور شاہ صاحب! مرجانہ شہر میں محفوظ ہے۔ وہ آزاد رہ کر مصیبت بن سکتی ہے۔ اجل اور اپنے باپ کو تلاش کرنے اور حقائق جاننے کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہے۔"

سب سوچ میں پڑ گئے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ تینوں کو گھنے جنگل میں قیدی بنا کر رکھا جاتا۔ مرجانہ کی آنکھوں کے سامنے اجل کو گولی ماری جاتی اور اس کے باپ پر ایسا تشدد کیا جاتا کہ وہ باپ کی سلامتی کے لیے حماد سے نکاح پڑھوانے پر راضی ہو جاتی۔ پھر حماد جنگل

میں منگل مناتا رہتا۔ تھانے میں یہ رپورٹ درج کرائی جاتی کہ صرف مرجانہ اور حاکم علی ہی نہیں سردار جنید کے بیٹے حماد کو بھی اغوا کیا گیا ہے اور مخالف سیاسی پارٹی نے ان کے حلقوں سے الیکشن جیتنے کے لیے انہیں یا تو غائب کرا دیا ہے یا ہلاک کر ڈالا ہے۔ لہٰذا ان حلقوں کے انتخابات ملتوی کیے جائیں۔ ان افراد کی بازیابی کے بعد ضمنی انتخابات کرائے جا سکتے ہیں۔

یہاں سردار جنید نے اپنی پارٹی کے لیڈر سے اختلاف کیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "میرا بیٹا اتنے عرصے تک جنگل میں رہے گا، جب تک کہ ایک بیٹے کا باپ نہ بن جائے۔"

لیڈر نے پوچھا۔ "اگر جلد باپ نہ بن سکا تو ضمنی انتخابات کے وقت آپ ہماری پارٹی کے امیدوار کو اپنے علاقے سے کامیاب کرائیں گے۔ آپ اپنے بیٹے کو پوتے کا باپ بنائیں گے یا اسمبلی کا رکن؟"

"میں اپنے بیٹے کی جگہ ضمنی انتخابات جیت لوں گا مگر بیٹے کو جنگل سے آنے نہیں دوں گا کیونکہ مجھے ہر حال میں ایک پوتا چاہیے۔"

ایک سوال کیا گیا "کیا باپ بننے کے بعد حماد صرف بیٹے کو لے کر جنگل سے لوٹے گا؟ اس بچے کی ماں نہیں ہو گی؟"

سردار جنید نے کہا۔ "حاکم علی کی پہلی بیٹی زچگی کے کیس میں مر گئی تھی۔ دوسری بھی مر جائے گی۔ حماد کا بیان ہو گا کہ وہ ڈاکوؤں کے چنگل سے نکل بھاگا تھا۔ اسے کسی بستی میں ایک عورت نے پناہ دی تھی۔ ڈاکوؤں سے چھپ کر رہنے کے لیے اس نے اس عورت سے شادی کر لی۔ بیچاری پناہ دینے والی عورت زچگی کے بعد مر گئی۔ حماد وہاں سے چھپتا چھپاتا اپنے بچے کو لے آیا ہے۔" ایسا دنیا میں ہوتا ہے لیکن یہ سراسر ایک فلمی کہانی جیسی تھی۔ سردار جنید اپنے نر بچے سے آئندہ نر بچہ پیدا کرانے کے لیے ایسا باؤلا ہو رہا تھا کہ پارٹی کو اپنے علاقے سے کامیاب کرانے کے لیے اپنے اس منصوبے کو ان سے منوا رہا تھا اور اس پر عمل کروا رہا تھا۔ وڈیرے شاہ صاحب نے واضح طور پر اس منصوبے کی حمایت نہیں کی تھی مگر یہ کہا تھا کہ حماد اور مرجانہ کے ستارے مل رہے ہیں۔ یہ شادی ہو گی۔ خواہ یہ شادی بعد میں مضحکہ خیز کہلائے یا سنجیدگی اختیار کر لے اور اس شادی کو سنجیدگی اختیار کرنا چاہیے۔ ورنہ اسمبلیوں تک پہنچنے میں ناکامی کے امکانات زیادہ ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ جو فلمی قسم کا منصوبہ بنایا گیا تھا، وہ پورا نہ ہو سکا۔ قدرتی بہاؤ میں بچگانہ منصوبے بہہ جاتے ہیں۔ ہوتا ہے وہی جو مقدر میں لکھا جاتا ہے۔ سردار جنید جس سے سردار بیٹا چاہتا تھا، وہی گرفت میں نہیں آئی۔ اس نے پوچھا۔ "حضور! اب کیا ہو گا؟"

دلہن تو شہر میں رہ گئی۔ آپ نے فرمایا تھا وہ میری بہو بنے گی۔“

حضور شاہ صاحب کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے پھر سے زائچہ بنانے لگے۔ ستاروں کی چال کو سمجھنے لگے۔ ان سے کہیں غلطی ہو گئی تھی۔ وہ غلطی تلاش کر رہے تھے۔ ان کے آس پاس بیٹھے ہوئے افراد ایک دوسرے سے زیرلب گفتگو کر رہے تھے۔ بڑی دیر بعد شاہ صاحب نے کہا۔ ”میرا حساب درست ہے۔ شادی ہو گی۔“

حماد نے خوشی اور اطمینان کا سانس لیا۔ شاہ صاحب نے کہا۔ ”سردار جنید اپنے دوست اللہ رکھیو کو مرجانہ کا موبائل فون نمبر دو۔ بیٹی کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا باپ اغوا کر لیا گیا ہے اور اجل کو گولی ماردی گئی ہے۔“

”پھر تو وہ غیظ و غضب میں آ جائے گی۔“

”آنے دو۔ کس پر غصہ دکھائے گی؟ اس سے فون پر مراد ماچھی باتیں کرے گا اور اسے فون پر اس کے باپ کی آواز سنائے گا‘ اسے باپ کی زبان سے معلوم ہو گا کہ اجل کو گولی ماردی گئی ہے۔ پھر اس کے بعد باپ کو گولی مارنے کی دھمکی دی جائے گی تو وہ کسی بھی شرط پر باپ کو بچانے کے لیے راضی ہو جائے گی۔“

سردار جنید نے کہا ”ایسے وقت اسے صاف طور پر کہنا ہو گا کہ وہ میرے حماد سے شادی کرے تب اسے ساری حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ ہم یہ چالیں چل رہے ہیں۔“

”حقیقت معلوم ہونے دو۔ کیا وہ ہمارے خلاف کوئی ثبوت پیش کر سکے گی؟ کیا وہ ہمارے خلاف آواز اٹھا کر اپنے باپ کو مرنے دے گی؟“

وہ سب ایسے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگے۔ یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ تن تنہا رہ گئی ہے۔ دشمنوں کے خلاف کوئی ثبوت کوئی گواہ نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے کہا۔ ”سردار جنید! تم چاہتے تھے‘ وہ جنگل میں تمہارے بیٹے کے ساتھ رہے۔ دیکھو کہ چال کیسے بدل جائے گی۔ یہی مرجانہ دنیا والوں کے سامنے تمہارے بیٹے سے نکاح پڑھوائے گی۔“

”اگر ایسا کرے گی تو اس شرط پر کہ باپ اس کی شادی میں یا شادی کے بعد بیٹی کے پاس زندہ سلامت آئے۔“

”نہیں‘ تمہاری شرط یہ ہو گی کہ جس دن وہ تمہارے پوتے کو جنم دے گی۔ اسی دن اس کے باپ کو زندہ حاضر کر دیا جائے گا اور جب تک باپ سے سامنا نہیں ہو گا تب تک ہفتے میں ایک بار وہ باپ سے فون پر گفتگو کر سکے گی۔“

”واہ شاہ صاحب! زبردست پلاننگ ہے۔ میں ابھی اپنے دوست اللہ رکھیو سے رابطہ کرتا ہوں۔“ اس نے فون پر رابطہ کیا۔ پھر اسے موجودہ منصوبہ پوری تفصیل سے سمجھایا۔

اللہ رکھیو نے فون پر مراد ماچھی سے رابطہ کیا۔ پھر وہ منصوبہ ہجے کر کے اس کے دماغ میں ٹھونسا اور کہا ”جو بات سمجھ میں نہ آئے‘ اسے دس بار پوچھو مگر غلطی نہ کرنا۔ اگر غلطی ہو جائے تو فوراً مجھ سے رابطہ کرنا۔ میں تمہارے فون کا انتظار کرتا رہوں گا۔ مرجانہ جواباً جو کچھ کہے‘ اس سے مجھے آگاہ کرتے رہنا۔“

مراد ماچھی گھنے جنگل میں ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ سامنے ایک درخت سے حاکم علی اور دوسرے درخت سے اجل بندھا ہوا تھا۔ بھلا موت کو کب کس نے باندھا ہے کہ ایک ڈاکو اسے یوں جکڑ دیتا۔ دراصل موت ایک مخصوص وقت تک خود اپنے ہاتھ باندھے رکھتی ہے اور ان کھلے ہاتھوں کو دیکھتی ہے‘ جو اپنی زندگی کا سامان سو برس تک کرتے رہتے ہیں۔ دن کا وقت تھا۔ پھر بھی جنگل میں اندھیرا سا تھا۔ اندھیرا دور کرنے کے لیے لالٹین اور مشعلوں کے علاوہ ٹارچ اور چارجر لائٹیں بھی تھیں۔ ان میں سے جس کی ضرورت ہوتی تھی اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ وہاں درختوں کو کاٹ کر ان کی لکڑیوں اور پتوں سے چھوٹی بڑی جھگیاں بنائی گئی تھیں جن میں مراد ماچھی کے دس مسلح حواری رہتے تھے۔ چھوٹے شہروں اور گوٹھوں سے لوٹا ہوا اناج بے حساب تھا۔ گوشت کے لیے درجنوں گائے اور بکرے ایک باڑے میں نظر آ رہے تھے۔ مراد ماچھی نے موبائل فون کو آف کرنے کے بعد سردار حاکم علی کے پاس آ کر کہا ”اب میں تیری بیٹی سے بات کرنے والا ہوں۔ کیا اس کا فون نمبر بتائے گا؟“

حاکم علی نے کہا۔ ”میں نہیں بتاؤں گا۔ میری بات مان لے۔ مجھ سے سودا طے کرے گا تو فائدے میں رہے گا۔ تجھے اب جتنا مل رہا ہے‘ اس سے زیادہ ملے گا۔“

وہ بولا۔ ”ہم مال کی کمی بیشی نہیں دیکھتے۔ اپنے سائیں وڈیرے کی سرپرستی کو دیکھتے ہیں اور مانتے ہیں۔ ہماری طرف قانون کا ہاتھ کبھی نہیں بڑھتا۔ کبھی ہم پر آنچ نہیں آتی۔ دیکھو‘ اس نے کتنے عیش و آرام سے ہمیں یہاں رکھا ہے۔“ وہ نمبر ملا رہا تھا‘ رابطہ ہونے پر بولا۔ ”بی بی مرجانہ سے بولو اس کا باپ بات کرے گا۔“ پھر وہ ہنستے ہوئے حاکم علی سے بولا۔ ”تم نے نمبر نہیں بتائے مگر دیکھ لو ہمارا سائیں بڑا پہنچا ہوا ہے۔ اب اس کے اندر سے تمہاری بیٹی بولے گی۔“

اس نے فون کو حاکم علی کے کان سے لگا دیا۔ اسی وقت مرجانہ کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو بابا! کیا آپ ہیں؟“

وہ بڑی ہی شکستہ سی آواز میں بولا ”ہاں بیٹی! میں بول رہا ہوں۔ تم تو بڑے حوصلے والی ہو نا؟ مصیبت کے وقت بیٹا بن کر باپ کا حوصلہ بڑھاتی ہو نا؟“

”ہاں بابا! مگر بات کیا ہے۔ آپ کی آواز میں بڑا درد ہے۔ کوئی پرابلم پیش آ ہے۔“

مراد ماچھی نے فون اپنے کان سے لگا کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں انگریزی نہیں جانتا پرابلم کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ تو بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہے۔ تیرے باپ کے اوپر بڑا ہے۔ یہ میری قید میں ہے۔“

مرجانہ نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہو تم؟ فون بابا کو دو۔“

وہ بولا ”تجھے اس بڈھے کی آواز سنائی دی۔ تجھے یقین کرادیا کہ یہ میری قید ہے۔ اب دوسری آواز سن لے۔ کہتے ہیں کہ یہ تیرا مشیر ہے مگر میری کھوپڑی کہتی تیرا یار ہے۔“

اس نے دوسرے درخت کے پاس آکر فون کو اجل کے کان سے لگا دیا۔ اجل کہا۔ ”ہیلو مرجانہ! آئندہ تم بڑے آزمائشی دور سے گزرنے والی ہو۔ ایک بات اچھی طر سمجھ لو کہ تم دشمنوں کے خلاف کوئی ثبوت‘ کوئی گواہ پیش نہیں کرسکو گی۔ لہٰذا دماغ غصہ اور گرمی نکال دو۔ یہ لوگ تم سے جو بات منوانا چاہتے ہیں‘ وہ مان لوگی تو تمہارے زندہ سلامت رہیں گے۔“

مراد ماچھی نے فون اپنے کان سے لگا کر کہا۔ ”یہ تمہارا سچا مشیر ہے۔ اس مشورے پر عمل کرو‘ اپنے بابا کو بچالو۔“

مرجانہ نے پوچھا۔ ”کیا چاہتے ہو۔ اپنے مطالبات پیش کرو۔“

”ہم تو جنگل کے بادشاہ ہیں۔ یہاں روپیہ پیسہ کام نہیں آتا۔ زندگی گزارنے کا سامان وہ نیلی چھتری والا دے دیتا ہے۔ میرا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ تھانے میں اپنے باپ مشیر کے گم ہونے کی رپورٹ ابھی لکھوا دو اور یہ بیان یقین سے دو کہ سردار کمالی سیاسی پارٹی والوں نے دونوں کو اغوا کیا ہے۔“

مرجانہ ذرا الجھ سی گئی۔ انتخابات کے نتیجے میں کامیابی ہوتی تو وہ باپ بیٹی سردار کما کی پارٹی سے گٹھ جوڑ کرسکتے تھے۔ پھر یہ کہ سردار کمالی اس کے حاکم بابا کی بہت عزت کر تھا۔ وہ بولی۔ ”میں ایسا بیان دوں گی تو تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟ یہ بات سمجھ میں آرہی کہ ایسا کون چاہتا ہے لیکن میرے بابا اور اجل کی رہائی کی ضمانت کیا ہے؟“

”ضمانت یہ ہے کہ ہم یہاں سے تیرے باپ کی آوازیں ہر دوسرے تیسرے سناتے رہیں گے۔ اس طرح تجھے اس کی زندگی کا ثبوت ملتا رہے گا۔“

”میں اپنے بابا کی واپسی چاہتی ہوں۔“

”اس کے لیے دوسرا مطالبہ پورا کرنا ہوگا۔ تم سردار جنید کے بیٹے حماد سے شادی کرو گی۔“

”یہ کیا بکواس ہے۔ شادی کا تعلق میری پسند اور ناپسند سے ہے۔ میں اس کمینے سے شادی نہیں کروں گی۔“

”نہیں کرو گی تو یہ دونوں قیدی زندہ نہیں رہیں گے۔“

”تم فضول سی دھمکی دے رہے ہو۔ یہ کوئی مطالبہ نہیں ہے کہ میں خواہ مخواہ ایک شیطان سے شادی کرلوں۔“

”میں ایک جاہل گنوار ڈاکو ہوں مگر گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر عقل کی بات آخری بار سمجھاتا ہوں۔ کبھی کبھی انسان کو بچانے کے لیے شیطان کی ساگن بن جانا چاہئے پھر وہ بے چارہ انسان تو تمہارا باپ ہے۔“

وہ بولی ”میرا پیغام حماد تک پہنچاؤ کہ شادی کی بات نہ کرے۔ باقی جو مطالبات چاہے منوالے۔“

”شادی کے سوا کوئی دوسری بات نہیں ہوگی۔ تم ابھی اسی لمحہ میں رضامندی ظاہر نہیں کرو گی تو ایک منٹ کے اندر اجل کو گولی ماردی جائے گی۔“

پھر اس نے اپنے چار حواریوں کو حکم دیا۔ ”اجل کا نشانہ لو۔ میں گھڑی دیکھ رہا ہوں۔“

مرجانہ پریشان ہو کر فون کے ذریعے یہ باتیں سن رہی تھی۔ ان لمحات میں یہ غصہ تھا کہ اسے حماد سے شادی کے لیے مجبور کیا جارہا ہے۔ دوسرا دھڑکا یہ لگا تھا کہ اس کے بابا کو بھی گولی ماردی جائے گی۔ ایسی پریشانیوں اور بدحواسیوں میں وہ بھول گئی تھی کہ اجل تو پھر اجل ہے۔ اسے بھلا کون مار سکتا ہے؟ مراد ماچھی فون پر کہہ رہا تھا ”تو اپنی گھڑی دیکھ رہی ہوگی۔ آدھا منٹ گزر چکا ہے۔ آدھے منٹ کے اندر شادی کے لیے راضی ہو کر حماد سے رابطہ کرلے تو یہ مشیر بچ جائے گا۔ ورنہ اس کی موت کے ایک گھنٹے بعد تیرے باپ کو بھی گولی ماردی جائے گی۔ یہ دیکھ پانچ سیکنڈ رہ گئے ہیں۔ چار سکنڈ۔ تین ۔ دو ایک فائر.........“

تڑتڑا تڑ کی آوازیں فون پر سنائی دیں۔ مرجانہ نے چیخ کر کہا۔ ”نہیں‘ اسے نہ مارو۔ اس پر رحم کرو۔ وہ بہت اچھا دوست ہے۔ اجل! مجھ سے بولو۔ تم خیریت سے ہو نا؟ اجل! اجل.........“

مراد ماچھی نے فون حاکم علی کے کان سے لگادیا۔ تب مرجانہ نے باپ کی ڈوبتی ہوئی

آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "آہ! مرجانہ میری ان بوڑھی آنکھوں نے ایک سچے دوست مشیر کو گولیوں سے چھلنی ہوتے دیکھا ہے۔ میری بچی! یہ درندے ہیں۔ انہوں نے اسے ڈالا ہے۔"

مرادماچھی نے فون پر کہا۔ "تمہارے باپ نے اس کی موت کی تصدیق کر دی اب ایک گھنٹے کے اندر مجھے حماد نے فون پر نہ بتایا کہ تم اس سے شادی کے لیے را ہوگئی ہو تو تمہارے بابا کی موت کی تصدیق اس فون پر اس کی آخری چیخوں سے ہوگی اس نے فون بند کرکے مسکراتے ہوئے اجل کو دیکھا۔ وہ درخت سے بندھا ہوا ایک جان مُردہ تھا۔ اس کے دیدے پھیل کر ساکت ہو گئے تھے۔ گردن ایک طرف ڈھلک گ تھی۔ جب حواریں نے اس کی رسی کھولی تو اس کا بے جان جسم جو درخت کے تنے لگا ہوا تھا' وہ الگ ہو کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ سردار حاکم علی درخت سے بندھا تھا۔ اس نے منہ پھیر کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اجل جیسے وفادار کی لاش دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ بڑے دکھ سے سوچ رہا تھا۔ اس کی ہلاکت نے میری بیٹی کو لرزا دیا ہوگا وہ اب ٹوٹ جائے گی۔ باپ کے لیے ٹوٹ جائے گی اور دشمنوں کے قدموں میں خاک ہوتی رہے گی۔ ادھر مرجانہ نے فون پر کئی بار چیخ چیخ کر اجل کو مخاطب کیا پھر پتا چلا کہ فون بند کر دیا گیا ہے۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ حاکم بابا نے اجل کی موت کی تصدیق کی تھی۔ باپ جھوٹ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے اجل کی لاش دیکھی تھی اور مرجانہ نے فون پر گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں۔ ان تمام حقائق نے اسے اجل کی موت کا یقین دلایا لیکن ریسیور رکھنے کے بعد وہ چونک گئی اسے اچانک یاد آیا کہ اجل انسان دوست ہے۔ ہمیشہ انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ میرے ساتھ رہتا آیا ہے مگر وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ جب تک کرہ ارض پر ایک بھی زندگی ہے' وہ بھی زندہ رہے گا۔

اسے اجل کی آواز سنائی دی "تم اپنی جگہ درست سوچ رہی ہو اور میں اپنی جگہ درست کہہ رہا ہوں کہ میں مرچکا ہوں۔"

"تو پھر یہ کیسے بول رہے ہو؟"

"اپنی آواز تمہیں سنا رہا ہوں مگر آئندہ کبھی تم وہ جسم نہیں دیکھ سکو گی' جس میں سما کر آیا تھا۔ اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا ہے۔ وہ لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے دور لے جا رہے ہیں پھر کہیں گڑھا کھود کر اسے گاڑ دیں گے۔"

"کیا تم پھر اس جسم میں سما کر میرے پاس نہیں آؤ گے؟"

"خدا کو منظور ہوا تو آؤں گا۔ میں تو ایک پل میں ہزاروں بھیس بدلتا ہوں۔ جس

درخت سے بندھے ہوئے اجل نواز کو ہلاک کیا جا رہا تھا۔ اس لمحہ میں ان حواریوں بھیس میں بھی موت تھا۔ ان کی ایک ایک گن کے ایک ایک کارتوس کے اندر میں تم بچپن میں دیکھ چکی ہو۔ میں ماں کے دودھ میں بھی مل کر ننھے بچے کے حلق میں اتر ہوں۔ تمہارے دو بھائی اسی طرح مارے گئے تھے۔ پانی ہو' دودھ ہو' شراب ہو' ہو یا گلاب ہو' یا تیر ہو' تلوار ہو یا بندوق کی گولی ہو۔ میں ہر روپ میں انسان کے آتا ہوں۔"

"اجل! میں تمہیں صرف انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے تمہاری بہت ورت ہے۔"

"میری ضرورت صرف خودکشی کرنے والوں کو ہوتی ہے اور ابھی تمہیں زندہ رہ کر کچھ کرنا ہے۔"

"تم پھر باتیں بنا کر مجھے ٹال رہے ہو۔ میرے پاس کسی دوسرے روپ میں آؤ۔"

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ کاتبِ تقدیر کو منظور ہو گا تو ضرور آؤں گا۔ کیا یہ کم کہ میں نہ ہوتے ہوئے بھی ہوں اور تمہارے لیے مشیر کے فرائض انجام دے رہا ہ۔"

"تو پھر مشورہ دو۔ میں اپنے بابا کو کیسے زندہ سلامت واپس لاؤں۔"

"تمہیں یاد ہے مرجانہ! ایک بار تم اپنے بابا کے لیے بہت پریشان تھیں۔ وڈیرے صاحب کی پیش گوئی سے معلوم ہوا تھا کہ تمہارے بابا پر بہت بڑی مصیبت آنے والی اور تم نے مصیبت کو دور کرنے کی تدبیر مجھ سے پوچھی تھی۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ تم نے مجھ سے پوچھا تھا' کیا میں بابا کی سلامتی کے لیے قربانی ے سکتی ہوں۔"

"ہاں یہی وہ قربانی کا وقت ہے۔ اپنے بابا کی سلامتی کے لیے تمہیں حماد سے شادی نا چاہئے۔"

وہ تقریباً چیخ کر بولی "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ میری بہن کا قاتل ہے۔ تمہارا قاتل ہے۔ اس نے تمہارے ایک وجود کو مجھ سے دور کر دیا اور اب بابا کو بھی ہلاک کر ڈالنا چاہتا ہے۔"

"انہیں ہلاک نہ ہونے دو۔ اپنی پسند اور ناپسند نہ دیکھو۔ اس سے نفرت کرو مگر دی کرلو۔"

"اوہ اجل! میں کس دل سے ایسا کروں۔ تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ اگر تم

میرے بابا کی روح قبض نہیں کرو گے تو دشمن انہیں نہیں مار سکیں گے۔"

"میں تمہارا بہت اچھا دوست ہوں۔ تمہارے لیے بہت کچھ کر رہا ہوں لیکن
قبض کرنے کا حکم جیسے ہی نازل ہو گا' مجھے اسی ساعت میں تعمیل کرنی ہو گی۔ چونکہ
کے بدلتے ہوئے راستے دیکھ رہا ہوں کہ تم کس راستے پر چل کر اپنے بابا کو زندہ
رکھ سکتی ہو' اس لیے وہی راستہ دکھا رہا ہوں۔"

"کیا میں فون پر حماد سے شادی کی رضامندی ظاہر کروں گی تو وہ بابا کو ر
گے۔"

"اس سوال کا جواب بعد میں دوں گا۔ پہلے تم فون کرو۔ ایک گھنٹا پورا ہو
پہلے باپ کو بچاؤ۔"

مرجانہ نے فون پر حماد سے رابطہ کیا۔ اسے سردار جنید کی آواز سنائی دی۔ "
مرجانہ! یہ تم ہو؟ بولو کیسی ہو؟ اور کیا چاہتی ہو؟"

"اپنے بابا کی رہائی چاہتی ہوں۔"

"شرائط تو تمہیں بتا دی گئی ہوں گی؟"

"ہاں ابھی میں رپورٹ درج کراؤں گی کہ سردار کمالی کی سیاسی پارٹی کے غنڈ
میرے حاکم بابا اور اجل کو اغوا کیا ہے۔ ویسے تم لوگوں نے اجل کو قتل کرا کے بہت
کیا ہے۔"

"میری بچی! ایسا مجبوری میں ہو جاتا ہے۔ تم دوسری شرط کی بات کرو۔ کیا میر
بننے کو تیار ہو؟"

"اس ڈاکو نے ایک گھنٹے کا وقت دیا تھا۔ وہ پورا ہونے والا ہے۔ وہ انہیں مار
گا۔ پہلے اسے ہلاکت سے روکو۔ ورنہ بابا نہ رہے تو میں.........."

وہ بات کاٹ کر بولا "تم کچھ نہیں کر سکو گی۔ کیونکہ ہم تمہارے بابا اور اجل
خبر ہیں۔ چاہو تو انٹرپول کے جاسوسوں کو بلوا کر اپنے باپ کو تلاش کروالو۔"

"میں بات نہیں بڑھانا چاہتی۔ تمہارے بیٹے سے شادی کے لیے راضی
آدھے گھنٹے بعد فون کروں گی۔ مجھے بابا کی سلامتی کی ضمانت ملنی چاہیے۔"

"تمہیں ضمانت مل جائے گی۔ شہر چھوڑو اور دلہن بننے کے لیے یہاں چلی آؤ۔"

مرجانہ نے رابطہ ختم کر دیا۔ ریسیور کریڈل پر پٹخ کر غصے سے پیچ و تاب کھا
سردار جنید اسے اپنے بیٹے کی دلہن بنانے کے لیے بلا رہا تھا۔ کیا سیاسی بدمعاشی
اسے اغوا نہیں کیا جا رہا تھا' خود چل کر کسی کے بیڈ روم میں پہنچنے پر مجبور کر دیا گیا

تھام کر بولی "اجل! میرے حاکم بابا نے سیاست میں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس کی
مجھے مل رہی ہے۔"

"سیاست کی بازی ایسی ہی ہوتی ہے کبھی جیتی جاتی ہے کبھی ہاری جاتی ہے اور کبھی
تے ہارتے پھر جیت لی جاتی ہے۔"

"ہم تو ہار چکے ہیں۔ تمہارے وجود کے ساتھ ہماری اسمبلی کی ایک سیٹ چلی گئی۔
سردار جنید اور اس کی سیاسی پارٹی کے شکنجے میں رہوں گی اور میری وجہ سے بابا بھی
رہا کریں گے۔"

"ہاں ایسا ہو رہا ہے مگر حوصلہ رکھو گی' ذہانت سے کام لو گی' سیاسی داؤ پیچ آزماتی رہو
تو ہارتے ہارتے جیت جاؤ گی۔"

"حماد کے آگے ہارنے کے بعد جیتنے کے لیے کیا رہ جائے گا؟"

"ایک سیاسی خاندان کی بیٹی دوسرے سیاسی خاندان میں آ کر ہارتی نہیں' بلکہ جیت
لے نئی راہیں نکالتی ہے۔ تمہاری ذرا سی شناخت بدلے گی۔ ابھی مرجانہ حاکم ہو' اس
بعد مرجانہ حماد کہلاؤ گی مگر سیاسی چالیں بدل جائیں گی۔ وقت بہت بڑا استاد ہے' تمہیں
ں چلنا سکھا دے گا۔"

"تم میرے بابا کے متعلق بتاؤ۔ کیا وہ خیریت سے ہیں؟"

"ہاں' ابھی ڈاکو مراد ماچھی سے کہا گیا ہے کہ تم تمام شرائط مان گئی ہو۔ تمہارے بابا
ایک درخت سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اب انہیں کھول دیا گیا ہے اور ایک جھگی انہیں
ے کے لیے دی گئی ہے۔"

"مجھے ان سے کب ملایا جائے گا؟"

"جب تم سردار جنید کے خاندان میں ایک بیٹا پیدا کرو گی۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟ کیا میں مہینوں اور برسوں اپنے بابا سے مل نہیں سکوں گی؟"

"میرے حساب سے گیارہ ماہ بعد مل سکو گی۔"

"گیارہ ماہ بہت ہوتے ہیں۔ کیا تب تک بابا کو قیدی بنا کر رکھا جائے گا؟"

"تم مستقبل کی باتیں بہت پوچھتی ہو' جبکہ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کچھ جانتا
بہت کچھ نہیں جانتا۔ گیارہ مہینوں میں بہت سی تبدیلیاں آ سکتی ہیں۔ فی الوقت وہ جو
ہیں' وہی کرتی رہو۔ ابھی سردار کمالی سے رابطہ کر کے اسے اپنے حالات بتاؤ۔"

اس نے رابطہ کیا۔ پھر کہا "کمالی صاحب! میں مرجانہ بول رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم نے مجھے فون پر یاد کیا ہے۔ میرے لائق

کوئی خدمت بتاؤ؟"

وہ اسے تمام روداد سنانے لگی۔ سردار کمالی نے تمام روداد سن کر کہا "مجھے ا
کی موت کا سخت صدمہ ہے۔ وہ ہمارے بہت کام کا آدمی تو تھا ہی مگر ایک اچھا ان
تھا۔"

"ان کی پہلی شرط یہی ہے کہ میں اپنے بابا اور اجل نواز کے اغوا کی
لکھواؤں اور اس سلسلے میں آپ کی پارٹی کے خلاف بیان دوں۔"

"ان کی شرط مان لو۔ ہمارے خلاف بیان دو۔ ہم دشمنوں سے اور پولیس وال
نمٹنا جانتے ہیں۔"

"میں مانتی ہوں۔ آپ سب سے نمٹ لیں گے۔ کیا آپ حماد سے میری جا
چھڑا سکیں گے؟"

"مرجانہ! میں اپنے دل کی بات کہہ دوں۔ سوچ رہا تھا کہ تم سے شا
درخواست کروں۔ ہم دونوں اس علاقے میں مضبوط سیاسی قوت بن سکیں گے۔ مجھے
پر غصہ آرہا ہے۔ مجبور ہوں کہ اسے کوئی نقصان پہنچاؤں گا تو جواباً تمہارے بابا
نقصان پہنچے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے ان کے شکنجے سے کیسے نکلوں؟"

"جب تک تمہارے بابا کا سراغ نہیں ملے گا اور جب تک ہم انہیں زندہ
واپس نہیں لائیں گے' تب تک ان کے خلاف کچھ نہیں کرسکیں گے۔ تم بہت بڑا
پھنس گئی ہو۔ پھر بھی میں اپنے تمام وفاداروں کو پورے صوبے میں پھیلادوں
تمہارے بابا کو تلاش کریں گے۔"

"پتا نہیں بابا کو کب تک تلاش کیا جائے گا۔ وہ مجھے فوراً بیلہ آکر دلہن بنے
کررہے ہیں۔"

"تمہیں اپنے باپ کی خاطر آنا ہی پڑے گا۔ تم چلی آؤ۔ میں کوئی ایسی تدبیر کر
کہ حماد تمہیں شریکِ حیات بنانے سے باز آجائے۔ میں تمہارے لیے ضرور کچھ کر
اور تم سے رابطہ رکھوں گا۔"

مرجانہ نے فون بند کرکے کہا۔ "اجل! تمہارے مشورے پر میں نے سردار کما
مدد طلب کی ہے۔ کیا وہ میرے لیے کچھ کرسکے گا؟"

"سردار کمالی تمہیں دل وجان سے چاہتا ہے۔ میں جاکر دیکھتا ہوں وہ کیا کرتا
تم بیلہ پہنچو پھر میرے اور اپنے بابا کے اغوا کی رپورٹ درج کراؤ۔ میں تھوڑی

آؤں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی "کیا واقعی میرے پاس آؤ گے؟"

"سوری' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ صرف آواز کے ذریعے رابطہ ہوگا۔"

وہ کراچی سے بیلہ روانہ ہونے کے لیے تیار ہونے لگی۔ سردار کمالی اپنی سیاسی پارٹی کے لیڈر اور مشیروں کو بتا رہا تھا کہ سردار جنید اور اس کی سیاسی پارٹی والے کس طرح مرجانہ کو بے بس کرچکے ہیں اور انتخابات میں اجل اور حاکم علی کی جگہ اس پارٹی کے امیدوار کامیاب ہوسکتے ہیں۔

لیڈر نے کہا۔ "جب تک اغوا ہونے والے بازیاب نہیں ہوں گے اس حلقے کے انتخابات ملتوی ہوسکتے ہیں۔ بعد میں ہم بھی اس حلقے سے فائٹ کریں گے۔ ہمارے لیے مسئلہ یہ ہے کہ مرجانہ کو اس گھر کی بہو بننے سے کیسے روکا جائے۔ وہ ہماری حمایتی ہے' اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔"

سردار کمالی نے کہا "مخالف پارٹی ایسی چالیں چل رہی ہے کہ ہم ان کے خلاف نہ قانونی کارروائی کرسکتے ہیں اور نہ ثبوت اور گواہ پیش کرسکتے ہیں۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "ایک چال چلی جاسکتی ہے کمالی صاحب! مقتول بھوٹانی کے اس زخمی بھائی بلال بھوٹانی سے رابطہ کریں۔ وہ اپنے مقتول بزرگ کی لاش آپ سے حاصل کرنے کے لیے بے چین ہے۔ آپ اس سے معلوم کریں کہ اگر وہ لاش اس کے حوالے کردی جائے تو کیا وہ حماد کو مرجانہ کے حصول سے باز رکھ سکے گا۔"

مشیر کے اس مشورے میں وزن تھا۔ مقتول بھوٹانی کا بھائی بلال بھوٹانی اور سردار جنید وغیرہ ایک ہی سیاسی پارٹی سے وابستہ تھے اور ان کے مفادات بھی ایک دوسرے کے مرہون منت تھے۔ سردار کمالی نے بلال بھوٹانی سے رابطہ کیا پھر پوچھا "کیا اپنے بزرگ کی لاش حاصل کرنے کے لیے سودا کرو گے؟"

"ہاں' میں ہر قیمت پر وہ لاش اپنے آبائی قبرستان میں لانا چاہتا ہوں۔ بولو کس طرح سودا ہوگا؟"

"اپنی پارٹی کے ایک امیدوار حماد کو مرجانہ سے شادی نہ کرنے دو۔"

"مرجانہ اور حماد کی شادی ہوگی تو ہماری پارٹی کو استحکام حاصل ہوگا۔ پارٹی کا کوئی شخص اس بات پر راضی نہیں ہوگا کہ میں اپنے بزرگ کی لاش کا ایک جذباتی معاملہ نمٹانے کے لیے بہت بڑی جیت کو ہار میں بدل دوں۔"

"اگر مرجانہ اس بات کی ضمانت دے کہ سردار حاکم علی کے حلقے سے تمہارے قومی

اور صوبائی اسمبلیوں کے امیدواروں کو بلا مقابلہ کامیاب کرایا جائے گا تب تو پارٹی کا کو
شخص اعتراض نہیں کرے گا؟"

"ایسی کامیابی حاصل ہو جائے تو پھر ہماری پارٹی کی واہ واہ ہے۔ میں ابھی اپنی پا
کے اہم افراد سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔ اس کے بعد رابطہ کروں گا۔"

مرجانہ بیلہ آرہی تھی اور ادھر وڈیرے شاہ صاحب' سردار جنید اور بلال بھوٹانی
درمیان گرما گرم بحث شروع ہو گئی تھی۔ یہ بات واقعی پارٹی کے حق میں تھی کہ ان کے
امیدوار حاکم علی کے حلقے سے بلا مقابلہ کامیاب کرائے جائیں گے اور بلال بھوٹانی کا جذبا
مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اسے اس کے بزرگ کی لاش مل جائے گی لیکن یہ کامیابیا
سردار جنید کے حق میں نہیں تھیں۔ اسے سیاست سے نہیں اپنے ہونے وا
سردار پوتے سے دلچسپی تھی۔ شاہ صاحب نے بھی پیش گوئی کی تھی کہ مرجانہ اور حماد
ستارے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو گا۔ ہر انسان کی اپنی اپنی ایک الگ ضرورت ہو
ہے۔ حکومت بنانے کے لیے اسمبلی میں ایک ووٹ بھی اہم ہوتا ہے۔ اسی طرح سردا
قبیلوں میں ایک بیٹے کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ فرزانہ سے ہونے والے بیٹے
موت نے سردار جنید کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ جلد ہی حماد کی دوسری شادی کرائی جا
اور سرداری کے لیے نر بچے پیدا کیے جائیں۔ شاہ صاحب نے نوید سنائی تھی کہ مرجا
سے بیٹا ہو گا۔ اس لیے سردار جنید نے پارٹی کے تمام افراد کے سامنے صاف طور پر کہہ

"مرجانہ ہر حال میں میری بہو بنے گی۔ مجھے اپنے بیٹے کا بیٹا چاہیے۔"

بلال بھوٹانی نے کہا "تم کسی بھی خاندان کی شریف زادی کو بہو بنا کر ایک
حاصل کر سکتے ہو۔ مرجانہ کو بہو نہ بنا کر مجھ پر احسان کرو گے۔ میرے بھائی کی لاش
مل جائے گی اور ہماری پارٹی ایک حلقے سے بلا مقابلہ جیت جائے گی۔"

سردار جنید نے کہا "ہماری پارٹی ویسے بھی حاکم علی کے حلقے سے جیتے گی۔ مرجا
میری بہو بن کر اپنے باپ کی سلامتی کے لیے اس حلقے سے ہمیں کامیاب کرائے گی
بلال! تم سردار کمالی کی سیاست کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ اجل مر چکا ہے۔ حاکم علی غائب
اور غائب رہے گا۔ ایسی حالت میں مرجانہ اپنے حلقے کی بہت بڑی سیاسی قوت ہے۔
بڑی چالاکی سے یہ قوت چھین لینا چاہتا ہے۔"

وڈیرے شاہ صاحب نے تائید کی۔ "واقعی مرجانہ ابھی اپنے حلقے میں اپنا اثر و رسو
رکھتی ہے۔ وہاں کے تمام ووٹ سردار کی بیٹی کے حکم پر ڈالے جائیں گے۔ بلال بھو
تم ذرا صبر سے کام لو۔ ہمارے آدمی کھوج لگا رہے ہیں کہ تمہارے مقتول بھائی کی لا

کہاں چھپائی گئی ہے۔"

بلال بھوٹانی نے کہا "کل رات میری والدہ نے خواب دیکھا تھا کہ مقتول جمال الدین بھوٹانی کی روح بے چین ہے اور کہہ رہی ہے' اماں! میں تمام عمر اپنی حویلی میں رہا۔ مرنے کے بعد مجھے اپنے باپ دادا کے پاس جگہ کیوں نہیں مل رہی ہے۔"

پارٹی لیڈر نے کہا۔ "اسلام آباد میں متعلقہ شعبے سے ہمارا رابطہ ہے۔ ہم کمالی کی یہ شرط پوری کریں گے کہ اس کے تیل کے کنوئیں کی کھدائی کا کام شروع ہو جائے اور تمہارے بھائی کو جہاں چھپایا ہے' وہاں سے کھود کر لے آئے مگر تم سمجھ سکتے ہو یہ وفاقی معاملہ ہے۔ اب یہ کام الیکشن کے بعد ہی ہو سکے گا۔"

بلال بھوٹانی کا سر جھک گیا۔ وہ سیاست کے سامنے اپنے گھر والوں کے جذبات کی اہمیت نہیں منوا سکتا تھا۔ اس کے پورے خاندان میں ماتم کی بنیاد یہ تھی کہ خاندانی بزرگ کی میت کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ پتا نہیں دشمن نے اسے کس گٹر میں ڈال رکھا ہے۔ مُردہ بہ دست زندہ والی کہاوت صادق آرہی تھی۔ یہ سوچ کر انتقامی شعلے بھڑکتے تھے کہ وہ ظالم سردار کمالی نہ جانے ان کے محترم بزرگ کی لاش کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہو گا؟ وہ سردار کمالی کے خلاف جوابی کارروائی کر سکتا تھا۔ خون کی ندیاں بہا کر کمالی کی لاش کی بھی مٹی پلید کر سکتا تھا مگر وڈیرے شاہ اور سیاسی پارٹی کی پابندیاں اسے ٹھنڈا کر رہی تھیں اور سمجھا رہی تھیں کہ انتقامی کارروائی کے نتیجے میں ہو سکتا ہے کہ وہ کمالی کو قتل کر دے لیکن مقتول بھائی کی لاش اسے نہیں ملے گی۔ وہ اپنے مقتول بزرگ کو سمجھوتے کے ذریعے ہی حاصل کر سکے گا۔ صبر تو کرنا ہی تھا مگر اس خیال سے دل کڑھتا تھا کہ پتا نہیں لاش کب حاصل ہو گی؟ کیا تب حاصل ہو گی' جب وہ قبر کے عذاب سے گزر چکی ہو گی اور صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی ہو گی؟

"اے لوگو! تم کیا ہو؟ تمہیں آج نہیں تو کل معلوم ہو گا' جب تمہارا سفر زیر زمین شروع ہو گا۔"

☆========☆========☆

آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں ٹیبل لیمپ کی روشنی میں میز پر جھکا لکھ رہا تھا۔ کہانیوں کے خاکے' آئیڈیاز اور ان کی تفصیلات ایسے ہی وقت وارد ہوتی ہیں اور میں فجر کی اذان کے وقت تک لکھتا رہتا ہوں۔ اس رات میں تنہا تھا۔ بیوی بچے کچھ دنوں کے لیے ایک شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ تقریباً ایک بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کون؟"

دھیمی سی آواز سنائی دی۔ "میں وہ ہوں' جس کے لیے کوئی انسان دروازہ
کھولتا۔"

میں مسکراتا ہوا اٹھ گیا۔ ظاہر ہے کہ اجل کے لیے کوئی دروازہ نہیں کھولتا۔ نہیں کھولنا چاہیئے تھا لیکن کھولنے کے بعد پچھتانے کی گھڑی آئی۔ میرے سامنے ایک رائفل تانے کھڑا ہوا تھا۔ ڈھیلی شلوار اور لانبی قمیض پر کارتوسوں کی پیٹی بندھی تھی۔ سر پر ایک پگڑی تھی۔ اس نے پگڑی کے صافے سے اپنے نصف چہرے کو چھپا تھا۔ میں سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اندر آکر دروازے کو بند کیا پھر اپنے چہرے پگڑی کے صافے کو ہٹایا۔ چہرہ پوری طرح سامنے آگیا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ اس مسکرا کر کہا "میں اجل ہوں۔"

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جھجکتے ہوئے مصافحہ کیا۔ تب موت کی ٹھنڈی لہ تصدیق کردی۔ اس نے کہا "مجھے تمہارے جسم کی حرارت مل رہی ہے اور تمہیں؟"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا کر پوچھا "تمہاری یہ صورت' یہ حلیہ بالکل مختلف ہے۔ وہ جیسے تعلیم یافتہ اور اسمارٹ اجل نواز دکھائی نہیں دے رہے ہو۔"

"ہاں پہلی ملاقات میں جو چہرہ اور جو شناخت تھی' وہ نہیں رہی۔ ڈاکوؤں نے ا پہلے جسم کو گولیوں سے چھلنی کرکے' گڑھا کھود کر اسے مٹی میں دبا دیا ہے۔"

"کیا اب اس طرح ڈاکو بن کر رہنے میں کوئی مصلحت ہے؟"

"ہاں' پچھلی بار میں نے مرجانہ کے حالات جہاں تک سنائے تھے' وہیں سے تر وار سناؤں گا تو میرا موجودہ بہروپ سمجھ میں آئے گا۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے الماری سے کیسٹ ریکارڈر نکال کر اس کے سا رکھ دیا۔ پہلے بھی وہ مرجانہ کی روداد اسی طرح سناتا رہا تھا اور میں اسے کیسٹوں م محفوظ کرتا رہا تھا۔ اس بار وہ بہت عرصے کے بعد آیا تھا۔ تقریباً سات ماہ گزر چکے تھ اس نے بتایا کہ سردار حاکم علی کو قیدی بنا کر کس طرح مرجانہ کو حماد کی دلہن بننے پر مجبو گیا تھا۔ سردار کمالی نے حتی الامکان کوششیں کی تھیں کہ حاکم علی کا سراغ مل جائے ا مرجانہ دلہن بن کر دوسری پارٹی میں نہ جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ مرجانہ سردار کی بہو اور حماد کی دلہن بن کر اس کی حویلی میں چلی گئی۔ جب اجل ریکارڈر کے سا بولتا رہتا تھا تو میں اسے درمیان میں کبھی ٹوکتا نہیں تھا مگر یہ سن کر بہت افسوس ہوا مرجانہ جیسی ضدی اور تیز طرار لڑکی ہار گئی۔ اس قاتل کی سیج پر چلی گئی' جہاں اس کی بھا ماری گئی تھی۔ یہ مجبوریاں بڑی ظالم ہوتی ہیں' قاتلوں کے سائے میں زندگی گزار

رضامند کرتی رہتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "وہ کیسی ہے؟ کیا اس نے حالات سے سمجھوتا کرلیا ہے؟"

"سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ آدمی اپنی مرضی سے برے حالات کو قبول کرتا ہے۔ اسے قبول کرنا پڑتا ہے۔ ایسا نہیں کرے گا تو جائے گا کہاں؟ کیا جان پر کھیل جائے گا؟"

"مرجانہ جان پر کھیلنے والی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے وہ آخری سانس تک لڑے گی۔ اجل! میرے دوست تم نے پہلی ملاقات میں مجھ سے کہا تھا کہ مرجانہ نامی جو لڑکی مجھ سے دفتر میں ملنے آرہی ہے' وہ ایک دن میرے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے گی۔"

"ہاں' میں نے ایسا کہا تھا۔ مگر اس کی موت کا کوئی دن یا وقت نہیں بتایا تھا۔ ابھی وہ زندگی کی بہت سی بہاریں دیکھے گی۔"

"میری دعا ہے کہ وہ طبعی عمر پوری کرے لیکن بحیثیت ایک مصنف میری مجبوری یہ ہے کہ میں مہینوں اور برسوں اس کی داستان جاری نہیں رکھ سکوں گا۔ میں چاہوں گا کہ اگلی بار تم کسی نئے کردار کی ہسٹری مجھے بتاؤ۔"

"میری بھی مجبوری ہے کہ میں مرجانہ کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکوں گا۔ جب اس کی آخری گھڑی آئے گی تو اس کے پاس جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "ابھی وہ مجبور ہے۔ بے یارومددگار ہے۔ کیا ایسی حالت میں اسے چھوڑ دو گے؟"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو مقدر میں ہمارا ساتھ لکھا ہوا ہے۔ جس طرح خوشی سدا نہیں رہتی اسی طرح بدنصیبی بھی عارضی ہوتی ہے۔ بظاہر وہ اپنا میکا ہار چکی ہے' اپنے حلقے کی کامیابی حماد کو دے چکی ہے' پوری طرح سیاست میں پٹ چکی ہے لیکن اچانک ہی اس علاقے کی سیاسی بساط کو الٹنے اور فتح کو اپنا مقدر بنانے والی ہے۔"

میں نے مسرت اور حیرانی سے پوچھا "کیا واقعی اس کے اچھے دن آئیں گے؟ لیکن اس کے پاس چال چلنے کے لیے ایک بھی کام کا مہرہ نہیں ہے۔"

"ہاں' اس کے پاس کوئی قوت نہیں ہے۔ بازی جیتنے والا کوئی ہتھیار نہیں ہے مگر اب سے کوئی آٹھ ماہ پہلے ہم اسلام آباد گئے تھے۔ ایک رات اسے آگہی حاصل ہوئی۔ میں اس آگہی کے پیش نظر کہہ سکتا ہوں کہ مرجانہ اپنے تمام مخالف مہروں کو مات دیتی ہوئی بہت بڑی بازی جیت لے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا اسے پھر آگہی حاصل ہوئی ہے؟"

اس نے کہا "مجھے ایک ترتیب سے بولنے دو۔ اس بار تم کچھ زیادہ ہی سوالات کر رہے ہو۔"

"اچھی بات ہے۔ اب میں بالکل خاموش رہوں گا۔ تم بولتے رہو۔"

ریکارڈر آن تھا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر بولنے لگا۔ میرا خیال تھا میں بڑے تحمل اور سکون سے سن سکوں گا لیکن جب اس نے ایک ننھے بچے کا ذکر کیا' جو قبر کے اندر تھا تو میرے اندر بے چینی پیدا ہو گئی۔ وہ بچہ زندہ تھا اور لوٹ پوٹ کر اس قبر سے نکلنا چاہتا تھا۔ میرے اندر ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"اجل! میری قوتِ برداشت کو نہ آزماؤ۔ میں پھر سوال کرنے پر مجبور ہوں۔ پلیز مجھے بتاؤ' کیا ایسا ہونے والا ہے؟"

"ہاں' اس علاقے کی سیاست کا تقاضا ہے کہ ایسا ہو۔ کیونکہ اس صوبے میں معدنیات کے خزانے زمین کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ وہ خزانے' وہ تیل کے چشمے اپنی قبر سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن وہاں کے چند سیاستدان ملکی خوشحالی کے لیے خزانے نکالنے کے بجائے اپنے عزیزوں کی لاشیں ایک قبر سے دوسری جگہ منتقل کرنے والی عداوت میں الجھے ہوئے ہیں۔"

"یار اجل! تم بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہے ہو۔ صرف اتنا بتا' کیا کسی معصوم بچے کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے؟"

"ہاں ایسا ہو رہا ہے اور اس بچے کو صرف مرجانہ ہی اس قبر سے نکالے گی۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ اجل نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔ "میں سماجی' معاشرتی اور سیاسی موضوعات پر کہانیاں لکھتا ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں لکھتا جسے انسانی ذہن تسلیم نہ کرے۔ تم جو کہانی ریکارڈ کرا رہے ہو اور جسے میں لکھ کر پیش کرنے والا ہوں' اسے کیا پڑھنے والوں کا ذہن تسلیم کرے گا؟"

"بے شک تسلیم کرے گا۔ تم حیات ہو' میں موت ہوں۔ حیات کبھی قبر میں نہیں جاتی اس لیے وہ نہیں دیکھ پاتی' جو تمہارا یہ اجل دیکھ لیتا ہے۔ مرجانہ کو جو آگہی یا کشف قبور کی ایک جھلک ملی ہے' جب وہ واقعہ اپنی صحیح ترتیب سے ظہور پذیر ہو گا تو اسے ہر ذی شعور تسلیم کرے گا۔ دنیا کی ہر شے کے بننے پھر اس کے فنا ہونے میں ایک قدرتی ترتیب ہے۔ مرجانہ کی تقدیر اسے اپنی مخصوص ترتیب سے گزار رہی ہے۔ وہ حماد اور اس کے باپ جنید کے زیر اثر ہے۔ اس لیے الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد ان کی ہی سیاسی پارٹی سے وابستہ ہو چکی ہے مگر ان باپ بیٹے سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اس کے باوجود

اس لیے انہیں برداشت کرتی ہے کہ وہ ہفتے میں ایک بار اس کے حاکم بابا سے فون پر گفتگو کراتے ہیں اور اس کے بابا کی زندگی اور سلامتی کا ثبوت پیش کراتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا تم اس کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہو؟"

"اب تک اسے حوصلہ دیتا رہا ہوں۔ اس کے بابا کی خیریت سے آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ لیکن اب بہت کچھ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اس لیے پھر ایک انسان بن کر آگیا ہوں۔"

"انسان بن کر یا ڈاکو بن کر؟"

"مجھے ڈاکوؤں کے درمیان جانا ہے۔ اس لیے شریف آدمی بن کر نہیں جا سکتا۔ سردار حاکم علی پچھلے سات ماہ اور دس دن سے مراد ماچھی کی قید میں ہے۔"

"کیا یہ مراد ماچھی کوئی ڈاکو ہے؟"

"ہاں اور میں ہوں ڈاکو قلندر کھوسو۔ میں ان نامی گرامی ڈاکوؤں میں سے ایک ہوں' جنہیں گرفتار کرنے یا گولی مارنے پر دس لاکھ روپے انعام رکھے گئے ہیں۔ سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ سندھ میں حالیہ آپریشن کے دوران تمام ڈاکو مارے گئے ہیں۔"

"تو پھر تم زندہ کیسے ہو؟"

"ایسے کہ اصل ڈاکو قلندر کھوسو زندہ ہے۔ کیا اخبارات میں خبریں شائع ہونے سے ڈاکو یا دوسرے جرائم پیشہ افراد مر جاتے ہیں؟ جب تک اس ملک میں ڈاکو بنانے والی مشینیں اور فیکٹریاں موجود ہیں۔ تب تک یہ خبروں میں مرتے ہیں' قبروں میں نہیں مرتے۔"

"تم یہاں میرے سامنے ہو۔ پھر اصل ڈاکو قلندر کھوسو کہاں ہے؟"

"میں ہی اصل ہوں۔ دراصل میں نے اس جسم کے اندر قلندر کھوسو کو گہری نیند سلا دیا ہے۔ جب تک میں تمہارے پاس ہوں یا جب تک مرجانہ حاکم علی کے معاملات میں مصروف رہوں گا تب تک وہ قلندر کھوسو غافل رہے گا۔ میری مصروفیات ختم ہو جائیں گی تو یہ اپنی جگہ بیدار ہو جائے گا۔"

"یہ اپنی کون سی جگہ بیدار ہو گا؟ یہ کہاں چھپا ہوا ہے؟"

"ایک بہت ہی بااثر شخص کی پناہ میں ہے۔ اب اس بااثر شخص کا نام نہ پوچھنا۔ یہ ایسے پردہ نشین ہیں' جنہیں حکومت بھی بے پردہ کرنے کی جرأت نہیں کرتی۔"

"درست ہے۔ ایسی باتیں رہنے دو۔ یہ بتاؤ' سردار حاکم علی کب تک قیدی بنا رہے گا؟"

"سردار جنید کے دماغ میں خناس ہے کہ بیٹے کا بیٹا پیدا ہو۔ حماد نے بھی مرجانہ سے

کہا ہے کہ ایک بیٹے کی خوش خبری سناؤ گی تو تمہارے بابا سے تمہیں ملا دیا جائے گا۔"

"کیا وہ ایسی کوئی خوش خبری سنانے والی ہے؟"

"ہاں۔ سات ماہ ہو چکے ہیں۔ وہ چالیس دن بعد ایک بیٹے کو جنم دے گی۔ سردار جنید کو ایک سردار پوتا ملنے والا ہے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پوچھا "کیا جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ سردار حاکم علی کے مقدر میں جو قید لکھی ہوئی تھی اس کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ اب رفتہ رفتہ بازی پلٹنے والی ہے۔"

میں ریکارڈر کو آف کر کے اس کے ساتھ دروازے تک آیا۔ اس نے رخصت ہوتے وقت مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے مسکرا کر کہا "کیوں میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کرنا چاہتے ہو۔ ابھی مجھے ان انگلیوں میں قلم پکڑ کر لکھنا ہے۔" وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر لیا۔

☆=========☆=========☆

صبح منہ اندھیرے سردار جنید کی آنکھ کھلی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی نے جگایا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کر ناگواری سے فون کی طرف دیکھا۔ پھر ریسیور اٹھا کر اسے کان لگا کر بیزاری سے بولا "کون ہے؟ اتنی رات کو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے کہ نیند حرام کر رہے ہو؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "اب تو نیند حرام ہی ہوا کرے گی۔ آنکھیں مل کر دیکھو، رات نہیں صبح ہونے والی ہے۔"

آواز جانی پہچانی تھی۔ پھر بھی سردار جنید کو یقین نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ "تم؟ تم؟........"

"ہاں، میں ہوں سردار حاکم علی۔ تمہاری اجازت کے بغیر یہ موبائل فون میرے ہاتھ نہیں آتا تھا اور میں اپنی بیٹی سے باتیں کرنے کے لیے ترستا رہتا تھا۔"

"یہ فون تمہیں کیسے مل گیا؟ مراد ماچھی کہاں ہے؟ اسے کہو کہ مجھ سے بات کرے۔"

"کیسے بات کرے گا؟ فوجی آپریشن ہوا ہے۔ وہ اپنے حواریوں کے ساتھ حراست میں ہے۔ ہمارے مشیر اجل نواز کی لاش برآمد کر لی گئی ہے۔ فوج کا ایک افسر وڈیرے اللہ رکھیو کا محاسبہ کرنے گیا ہے۔ تمہاری بھی باری آنے والی ہے۔ پیشگی اطلاع اس لیے دے رہا ہوں کہ میرے سمدھی ہو۔ میری بیٹی کے سسر ہو۔ چلو اٹھ جاؤ بستر سے۔ اپنے بچاؤ کی فکر کرو۔"

وہ بولا "سردار حاکم علی! میرے خلاف کوئی کیس بنانے سے پہلے یہ نہ بھولنا کہ تمہاری بیٹی میرے گھر میں ہے اور میرے حماد کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

"اگر میں تمہارے خلاف کوئی کارروائی کروں گا تو تم میری بیٹی کا کیا بگاڑ لو گے؟"

"تمہاری پہلی بیٹی فرزانہ کا جو انجام ہوا تھا، وہی تمہاری دوسری بیٹی مرجانہ کا بھی ہو سکتا ہے۔"

"صرف میں ہی نہیں۔ تمہارا دوست وڈیرہ اللہ رکھیو اور ڈاکو مراد ماچھی یہ بیان دے رہے ہیں کہ تم نے ہمیں اغوا کروایا تھا اور اجل کو قتل کرایا تھا۔"

"ایک ڈاکو اور اس کے وڈیرے سرپرست کے بیان سے مجھ جیسا خاندانی سردار مجرم نہیں کہلائے گا۔ تمہاری اور مرجانہ کی بہتری اسی میں ہے کہ دشمنی بھول جاؤ اور رشتے دار بن کر رہو۔"

یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ دوسری طرف سردار حاکم علی ہاتھ میں موبائل فون لیے سردار کمالی کی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فون کو آف کر کے کہا۔ "کمالی! میں نے تمہارے مشورے سے اسے فوجی آپریشن ہونے کی دھمکی دی ہے جبکہ اس جنگل میں اور وڈیرے اللہ رکھیو کے خلاف کوئی آپریشن نہیں ہوا ہے۔"

کمالی نے کہا "لیکن سردار جنید اور اس کی پارٹی کے لوگ یہی سمجھیں گے۔ ہمارے جھوٹ کو سمجھ نہیں پائیں گے۔ انہیں سچ بتانے والے وڈیرے اللہ رکھیو، مراد ماچھی اور اس کے تمام حواری مارے گئے ہیں۔ پتا نہیں آپ کی مدد کے لیے وہ موت کا فرشتہ کہاں سے آ گیا تھا؟"

"میری دعائیں قبول ہوئی ہیں۔ پورے سات ماہ سے پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا رہا اور اپنی رہائی کے لیے دعائیں مانگتا رہا۔ میری جگہ کوئی بھی قیدی ہوتا تو اس گھنے تاریک جنگل میں مایوس ہو جاتا۔ اس علاقے میں پولیس تو کیا پولیس کا کتا بھی نہیں گزرتا ہے۔ آج میرا یہ ایمان پختہ ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو وہاں سے بھی بخیریت گزار دیتا ہے، جہاں سے ہوا کا بھی گزر نہیں ہوتا۔"

"آپ کہتے ہیں، وہاں ڈاکو قلندر رکھوسو آیا تھا۔ جبکہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ جس ڈاکو قلندر رکھوسو پر دس لاکھ کا انعام رکھا گیا تھا، وہ آپریشن میں مارا گیا ہے۔"

"اخبار والوں کو سرکاری ذرائع سے جو خبر ملی وہ چھاپ دی گئی۔ میں نے ڈاکو قلندر رکھوسو کی تصویر ایک بار اخبار میں دیکھی تھی۔ اسے اچھی طرح پہچانتا نہیں ہوں لیکن مراد ماچھی جیسے ڈاکو تو اسے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔" سردار حاکم علی نے بتایا کہ وہ اس

جنگل کی ایک جھگی میں نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگ رہا تھا تب ہی ایک حواری زخمی حالت میں گرتا پڑتا مراد ماچھی کے پاس آیا اور بولا۔ "وہ.......... وہ اسی طرف آرہا ہے۔"

وہ شاید کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ ان کا سردار ڈاکو مراد ماچھی تنہا رہ گیا۔ اس نے اپنی گن سنبھالتے ہوئے بلند آواز سے پوچھا "کھوسو! کیا تم دشمنی کر رہے ہو؟ پھر کہیں سے گولی چلی۔ مراد ماچھی کا ہاتھ زخمی ہوا۔ اس کے ہاتھوں سے رائفل گر پڑی۔ اس نے جھک کر اٹھانا چاہا تو پھر گولی چلی۔ اس بار اس کے قدم اکھڑ گئے۔ اس کے ایک پیر میں گولی لگی تھی۔ اچھل کر دور جا گرا۔ اپنی رائفل سے دور ہوگیا۔ تب اس نے قد آور قلندر کھوسو کو دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا آرہا تھا۔ مراد ماچھی نے زخموں کی تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا "کھوسو! ہم ڈاکو اپنی زبان سے نہیں پھرتے مگر تم پھر گئے ہو۔ تم نے زبان دی تھی کہ اپنے حصے کی رقم لے کر روپوش ہو جاؤ گے۔"

قلندر کھوسو نے کہا "ہاں زبان دی تھی۔ ہمارے درمیان طے پایا تھا کہ مجھ پر دس لاکھ روپے کا انعام ہے۔ اگر مجھ سے ذرا سی بھی مشابہت رکھنے والے کو قلندر کھوسو بنا کر گولی مار دی جائے تو ہم آسانی سے فوج اور حکومت کو دھوکا دے کر دس لاکھ وصول کر سکتے ہیں۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ "اور یہ رقم وصول کی گئی تھی۔ تمہیں ایک لاکھ دے دیئے گئے تھے۔ وڈیرے اللہ رکھیو نے دو لاکھ لیے تھے۔ مجھے دس ہزار روپے دیے گئے تھے۔ باقی چھ لاکھ نوے ہزار پولیس والوں نے رکھ لیے تھے۔ اس کے عوض ایک بہت بڑا افسر تمہیں پناہ دیتا ہے۔ تم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ فوجی آپریشن ختم ہونے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا مگر تم دشمن بن کر آئے ہو۔ آخر کیوں؟"

سردار حاکم علی ان کی باتیں سن رہا تھا اور یہ جانتا تھا کہ سندھ کے جنگلوں اور گوٹھوں میں ایسی مشینوں کے مالکان وڈیرے' جاگیردار اور بڑے افسران ہیں۔ وہ ان مشینوں میں ایک طرف سے انڈے ڈال کر دوسری طرف سے چوزے نکالتے ہیں۔ ایک طرف سے فرضی ڈاکو مار کر دوسری طرف سے انعامات کے لاکھوں روپے حاصل کرتے ہیں۔ پھر جب حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ نئی بیوروکریسی آجاتی ہے تو پھر ان مُردہ ڈاکوؤں کو زندہ کر لیتے ہیں۔ ڈاکو قلندر کھوسو نے کہا۔ "میں مانتا ہوں کہ مجھے اپنے حصے کی رقم لینے کے بعد تم لوگوں سے دشمنی نہیں کرنا چاہئے مگر ایک بوڑھا شخص پچھلے سات مہینوں سے میرے اندر نماز پڑھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہا ہے۔"

مراد ماچھی نے گڑگڑاتے ہوئے پوچھا۔ "ارے کھوسو! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے تو کبھی نماز نہیں پڑھی؟"

"ہاں کبھی نہیں پڑھی۔ مگر جب بھی نماز کا وقت ہوتا تھا تو وہ میرے اندر نیت باندھ کر استقامت سے کھڑا ہو جاتا تھا۔ کیا تم نے اس بوڑھے قیدی کو اس جھگی میں عبادت کرتے نہیں دیکھا تھا؟ تم تو دن رات اسے محوِ عبادت دیکھتے تھے۔"

"ہاں مگر اس قیدی کا تم سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق قیدی سے نہیں' اس کی نماز سے ہے۔ وہ پڑھتا جھگی میں ہے مگر اس کے سجدے میرے ضمیر کے معبد میں ہوتے رہے ہیں۔ اذان کے معنی ہیں' کانوں تک خبر پہنچانا' تم شیطان کو سنتے رہے۔ میں اذان کو سنتا رہا تو اذنِ خداوندی ملا کہ میں یہاں آؤں اور تم سب کا کام تمام کرکے اس بزرگ عابد کو رہائی دلاؤں۔"

اس نے اپنی گن سیدھی کی۔ مراد ماچھی کا نشانہ لیا۔ پھر کہا۔ "اجل کو معلوم ہے تیری صرف دو سانسیں رہ گئی ہیں۔ ایک.......... دو.........."

سانسوں کے لیے تیسری گنتی کی رعایت نہیں تھی۔ اس لیے ٹھائیں سے گولی چلی۔ پھر مراد ماچھی ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہوگیا۔ سردار حاکم علی جھگی سے باہر آکر وہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ قلندر کھوسو کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ "میرے مالک! میرے معبود! آج معلوم ہوا کہ نماز کتنی دور تک جاتی ہے ایک ڈاکو کو منصف بنا کر لے آتی ہے۔" اجل نے مراد ماچھی کا موبائل فون اٹھا کر سردار حاکم علی کو دیتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے کسی ایسے قابلِ اعتماد شخص سے رابطہ کرو' جو فوراً" تمہاری مدد کے لیے ہزاری گوٹھ پہنچے۔ کیونکہ اس گھنے تاریک جنگل میں کوئی آئے گا تو بھٹک جائے گا۔"

حاکم علی نے پوچھا۔ "ہزاری گوٹھ کہاں ہے؟"

"وہ جو سامنے درخت سے گھوڑا بندھا ہوا ہے وہ تمہیں گوٹھ تک پہنچادے گا۔"

"میرے محسن میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟"

"تم خدا کا شکریہ ادا کرتے رہا کرو۔ میں احکاماتِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائض ادا کرتا رہوں گا۔ تمہاری اطلاع کے لیے یہ بتادوں کہ مراد ماچھی کے سرپرست وڈیرے اللہ رکھیو کو بھی اللہ نے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ میرا جو سرپرست قانون سے کھیل رہا ہے' اسے بھی میں ٹھکانے لگانے جا رہا ہوں۔ باقی رہا میں تو میرے لیے بھی فنا لکھی ہوئی ہے۔ قیامت تک صرف اجل کو رہنا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے رائفل اپنے کاندھے پر رکھی۔ پھر پلٹ کر چلا گیا۔ سردار حاکم علی

نہ جان سکا کہ وہ کہاں جا چکا ہے۔ درخت سے بندھے ہوئے اس گھوڑے نے حاکم علی کو ہزاری گوٹھ پہنچایا تھا اور وہاں، پہنچنے سے پہلے ہی وہ سردار کمالی کو فون کے ذریعے اس گوٹھ میں بلا چکا تھا۔ سردار جنید اور اس کی پارٹی کے خلاف یہ الزام ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انہوں نے اجل اور حاکم علی کو اغوا کرایا تھا اور اجل کو قتل کرایا تھا۔ اس لیے حاکم علی نے سردار جنید کو فوجی آپریشن کے حوالے سے خوفزدہ کرنے اور اپنے دباؤ میں لانے کی کوشش کی لیکن جواباً سردار جنید کی یہ بات بھی درست تھی کہ اگر فوجی آپریشن ہو رہا ہے تو ان کی پارٹی سے انصاف ہو گا کیونکہ قانون کو ہاتھ میں لینے والے وڈیروں اور ڈاکوؤں کا بیان ایک ایسی پارٹی کے خلاف درست تسلیم نہیں کیا جائے گا جو صوبائی اسمبلی میں اکثریت کی حامل ہے۔ سردار حاکم علی نے پھر سردار جنید سے فون پر رابطہ کیا۔ پھر کہا ”ابھی تم نے مشورہ دیا تھا کہ دشمنی بھول جاؤں اور رشتے داری یاد رکھوں۔ بے شک معقول مشورہ ہے۔ تم بھی اس پر عمل کرو اور میری بیٹی سے بات کراؤ۔“

”پہلے یقین تو ہو کہ تم ہمارے ہو اور اپوزیشن والوں سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ پھر تم بیٹی کی آواز بھی سن لو گے۔“

”سیاست میرا ذاتی معاملہ ہے۔ رشتے داری ایک الگ جذبہ ہے۔ مجھے اپنی بیٹی سے ملنے اور باتیں کرنے کا حق ہے۔ اگر مجھے یہ حق دینے سے انکار کرو گے تو بات بڑھ جائے گی۔ میں یہ ثابت کروں گا کہ میری بیٹی کو بہو بنا کر حبس بے جا میں رکھا گیا ہے۔“

وہ قہقہہ لگا کر بولا ”حاکم علی! تیرا دماغ چل گیا ہے۔ اس لیے ایک بیٹی کی موت کو بھول گیا ہے۔ وہ اجل جس نے تیری ایک بیٹی کے قاتل کی تاریخ وفات لکھی تھی اس تاریخ سے پہلے وہ خود ہی لقمۂ اجل ہو گیا۔ تیری دوسری بیٹی کے قاتل کی تاریخ وفات کون لکھے گا؟ وہ بھی ماں بننے جا رہی ہے۔ کیا تو چاہتا ہے وہ بھی آپریشن تھیٹر میں جائے یا کسی اور طرح کی اتفاقی موت مرے؟“

حاکم علی کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اس گھونسے نے سمجھایا کہ دوسری بیٹی بھی مرنے کے لیے اس خاندان میں گئی ہے۔ اس نے فون بند کر دیا۔ پھر سردار کمالی کو دشمن کی دھمکیوں کے متعلق بتانے لگا۔

مرجانہ سسرالی خوابگاہ میں تھی۔ بستر پر لیٹی ہوئی اجل کی آواز سن رہی تھی۔ وہ اسے باپ کی رہائی کی خوشخبری بھی سنا رہا تھا اور باپ کی شکست خوردگی کی تفصیل بھی بیان کر رہا تھا۔ وہ بولی ”یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ میں بابا کی سلامتی اور رہائی کے لیے ان جلادوں کے گھر بیاہ کر آئی ہوں۔ اب بابا رہا ہو گئے ہیں تو ان سے مل بھی نہیں سکتی۔ ان سے باتیں بھی

نہیں کر سکتی۔“

”تمہارے بابا کل تک قیدی تھے۔ تم ہفتے میں ایک بار ان سے گفتگو کر لیا کرتی تھیں اور ذرا مطمئن ہو جایا کرتی تھیں۔ آج تمہارے بابا آزاد ہیں۔ پھر تم مطمئن کیوں نہیں ہو؟“

”مجھے ان کی رہائی کی خوشی ہے لیکن ان کی کمزور پوزیشن سے دل ٹکڑے ہو رہا ہے۔ وہ برے حالات سے بری طرح ٹوٹ رہے ہیں۔ اگر میں بیٹا ہوتی تو کیا آج وہ ایسے مجبور ہوتے؟“

”ہاں ایسے وقت بیٹا ہونے کی اہمیت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ویسے تم بیٹا بن کر رہنے اور باپ کا سر اونچا رکھنے کی بھرپور کوششیں کرتی رہی ہو۔ تم نے باپ کی سلامتی کی خاطر بہن کے قاتل سے شادی کر کے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ خدا پر بھروسا رکھو‘ یہ قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ آج تمہارے جو دشمن سر اٹھا رہے ہیں‘ کل تمہارے سامنے سر جھکائیں گے۔ ذرا صبر کرو۔ وہ کل‘ کل نہیں آئے گا مگر جلد ہی آئے گا۔“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اگرچہ حویلی میں اس پر طرح طرح کی پابندیاں تھیں لیکن حماد کی پارٹی اور اسمبلی کے رکن ہونے کی حیثیت سے کچھ آزادی بھی تھی۔ وہ کسی سیاسی سرگرمی کے دوران اپنے بابا‘ یا سردار کمالی سے کسی بہانے ملاقات یا بات کر سکتی تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ ان دنوں اسمبلی کے اجلاس نہیں ہو رہے تھے۔ پھر زچگی کے دن قریب تھے۔ حماد اسے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ دوسرے دن اس نے حماد سے کہا۔ ”میں اپنے میکے جانا چاہتی ہوں۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیوں جانا چاہتی ہو؟ وہاں اب تمہارے لیے کیا رکھا ہے؟“

”وہاں میرا بچپن تھا۔ وہاں میری بہت سی یادیں اور محبتیں ہیں۔ آج بھی وہ علاقہ میرا ہے اور میں صرف تمہاری بیوی ہی نہیں‘ سردار حاکم علی کی بیٹی بھی کہلاتی ہوں۔“

”اتنی لمبی تقریر نہ کرو۔ تم وہاں نہیں جاؤ گی۔ میں تمہیں بتا دوں کہ تمہارا باپ وہاں آ گیا ہے۔“

”پھر تو میں ضرور جاؤں گی۔“

”باپ بیٹی کا ملن ایسے نہیں ہو گا۔ ہم جیسا چاہتے ہیں‘ ویسے ہو گا۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”تم نے ہماری شرائط کے مطابق سردار کمالی کے خلاف رپورٹ درج کرائی تھی کہ اس نے اجل کو اور تمہارے بابا کو اغوا کیا ہے۔ اب وہ کسی طرح رہا ہو کر آ گیا ہے تو اسے

سردار کمالی کے خلاف قانونی کارروائی کرنا چاہیے لیکن وہ تمہارا بددماغ باپ کمالی کا حمایتی بنا ہوا ہے۔ ہماری پارٹی کے خلاف ہے۔ اسے ہماری خاطر نہ سہی' تمہاری خاطر تو ہماری پارٹی میں آنا چاہیے۔"

"میرے بابا کی مخالفت سے تمہارا کوئی سیاسی نقصان نہیں ہو رہا ہے۔ میں تو تمہاری پارٹی میں ہوں۔ باپ بیٹی کی محبت کو سیاست کی دلدل میں کیوں گھسیٹ رہے ہو؟"

"محبت کیا ہوتی ہے مرجانہ؟ تم یہاں محبت سے نہیں نفرت سے سہاگن بن کر میری سیج پر آئی تھیں اور اب نفرت سے میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔"

"یہ تو میں نے سہاگ رات کو کہا تھا کہ میرے بابا تمہاری کمینگی کے باعث کبھی قیدی بن کر صعوبتیں جھیل رہے ہیں۔ اس لیے تم مجھے پھولوں کی سیج پر لا کر بھی میری محبت حاصل نہیں کر سکو گے۔ جس بچے کو جنم دینے والی ہوں' اس سے مجھے بہت محبت ہے کیونکہ میں ایک ماں ہوں لیکن جتنی محبت بچے سے ہے' اس سے کئی گنا زیادہ نفرت ا سے ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "زمیندار جانتے ہیں کہ کسان ان سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر ا نفرت کو نہیں اس فصل کو مسکرا کر دیکھتے ہیں' جو نفرت کرنے والے اگاتے ہیں۔ مجھے ا میرے بابا کو بھی صرف ایک بیٹے کی فصل چاہیے۔ خواہ تم اسے کتنی ہی نفرتوں کے ب پیدا کرو۔" اس نے حویلی کے اندر اور باہر سخت پہرا لگا دیا۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ دیے تاکہ اس کی عدم موجودگی میں باپ بیٹی سے رابطہ نہ ہو سکے۔ ان باپ بیٹے کے پاس موبائل فون تھے۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اب زچگی ہونے تک مرجانہ کو باہر کی ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔ انہوں نے وڈیرے شاہ صاحب' پارٹی لیڈر اور مشیروں کو بتایا کہ کس طرح مرجانہ کو پابندیوں میں رکھا گیا ہے لیکن یہ کب تک ممکن ہے؟ اسے زچگی کے بعد آزادی دینی ہوگی تاکہ پارٹی کے اجلاس میں اور اسمبلی میں جاتی آتی رہے۔ کیا ایسے وقت سردار حاکم علی اپوزیشن والوں سے مل کر کوئی چال نہیں چلے گا؟ سوال پیدا ہوتا ہے کیا چال چلے گا؟ کیا بیٹی کو سسرال سے چھڑا کر میکے میں بٹھا لے گا؟ کیا ایک ماں اپنا سسرال میں چھوڑ کر میکے جا سکے گی؟ سردار جنید اور حماد بچے کو کبھی اس کے پاس ر نہیں دیں گے۔

شاہ صاحب نے کہا "بعض مائیں سنگدل ہوتی ہیں۔ آج ہی کے ایک اخبار کی خ پڑھو' لکھا ہے کہ ایک عورت اپنے چار بچوں اور شوہر کو چھوڑ کر اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

سردار جنید نے کہا "جب فرزانہ میرے پوتے کی ماں بننے والی تھی تو ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ بچے کو زندہ رہنا چاہیے۔ ماں مرجائے گی تو دوسری آجائے گی۔ اسی طرح مرجانہ اپنے باپ کے پاس پہنچ کر سوچ سکتی ہے کہ بچہ گیا کوئی بات نہیں' وہ حماد سے طلاق لے کر دوسرے شوہر سے بچوں کی ماں بن سکتی ہے۔"

پارٹی لیڈر نے کہا "مرجانہ جائے گی تو پارٹی کا نقصان ہوگا۔ ہم آئندہ سردار حاکم علی کے علاقے سے دو سیٹیں حاصل نہیں کر سکیں گے۔"

سردار جنید نے کہا "ابھی آپ اس علاقے کی سیٹوں کی باتیں نہ کریں۔ ہم برسراقتدار پارٹی کے ساتھ ہیں۔ صوبے میں بھی ہماری حکومت ہے۔ ہم پانچ برس تک ضرور حکومت کریں گے۔"

لیڈر نے کہا "آپ ملکی حالات سے پوری طرح باخبر نہیں ہیں۔ یہ سیاسی بحران ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ آپ پانچ برس کی بات کرتے ہیں۔ یہ حکومت پانچ مہینے چل جائے تو بڑی بات ہوگی۔ ہو سکتا ہے مارشل لاء نافذ ہو جائے یا اسمبلی ٹوٹ جائے اور نئے سرے سے انتخابات ہوں۔ اگر پھر سے انتخابات ہوئے تو ہمیں حاکم علی کے علاقے کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے مرجانہ کو اپنے قابو میں رکھنا ہوگا۔"

شاہ صاحب نے تائید کی "بے شک' بیٹی کو باپ کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ باپ کو بیٹی کی طرف یعنی ہماری طرف جھکنا چاہیے۔"

حماد نے کہا۔ "میں مرجانہ کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار رہا ہوں اور اس کی نفرت کو خوب سمجھ رہا ہوں۔ وہ موقع ملتے ہی مجھ سے رشتہ توڑ کر بھاگ جائے گی۔"

سردار جنید نے کہا "آپ لوگ ملکی سیاست کی بات کرتے ہیں۔ میں علاقائی سیاست کی بات کر رہا ہوں۔ آپ حضرات غور کریں۔ سردار حاکم علی کا کوئی وارث نہیں ہے۔ وہ مرے گا تو میرے حماد کا بیٹا اپنے نانا کے علاقے کا مالک و مختار ہوگا۔"

"مگر حاکم علی مرے گا کیسے؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ میری پہلی بہو ایک ہتھکنڈے سے گئی۔ دوسری بہو دوسرے ہتھکنڈے سے چلی جائے گی۔ میرا سردار پوتا میرے پاس رہ جائے گا۔ اب یہ آپ لوگ سوچیں کہ حاکم علی دنیا سے کیسے اٹھے گا؟"

قبائلی سردار جب بھی اقتدار اور برتری حاصل کرنے کے لیے سوچتے ہیں تو عقل سے نہیں بندوق کی گولیوں سے سوچتے ہیں۔ لیڈر نے کہا "پہلی بار مرجانہ کو اور دوسری بار حاکم علی کو اغوا کرنے کی چالیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اگرچہ ہم ایسی چال سے ان کی سیٹیں

لے گئے ہیں تاہم حاکم علی کو قتل کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ حالات اور بگڑ جائیں گے کیونکہ وہ اپوزیشن والوں کی پناہ میں ہے۔"

ایک مشیر نے کہا "ابھی ہم سیاسی طور پر مضبوط ہیں۔ کل کیا ہو گا کہہ نہیں سکتے سیاسی استحکام ہمیشہ نہیں رہتا۔ اگر سردار جنید اپنے رویے میں لچک پیدا کریں۔ حاکم علی کا قتل مقصود ہے تو میٹھی چھری بن جائیں۔ باپ بیٹی کی ملاقات کرائیں۔ انہیں مضبوط اور بے غرض رشتے داری کا یقین دلائیں تو........."

حماد نے ہاتھ اٹھا کر کہا "تو کچھ نہیں ہو گا۔ آپ بہت اچھی طرح سیاست کو سمجھ کر مشورے دیتے ہیں لیکن ہمارے خاندانی حالات کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ آپ ان باپ بیٹی کے تیور کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ دونوں پچھلے بیس دنوں سے خاموش ہیں نہ وہ فون پر بیٹی سے ملنے کا تقاضا کرتا ہے۔ نہ بیٹی میرے سامنے اب اپنے باپ کے سلسلے میں کوئی بات کرتی ہے۔"

سردار جنید نے کہا "بظاہر یوں لگتا ہے جیسے باپ بیٹی نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان دونوں کو بڑی رازداری سے کسی کامیابی کی ضمانت مل گئی ہے۔ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ وہ جلد ہی ایک دوسرے سے ملنے اور ہمیں کوئی نقصان پہنچانے والے ہیں۔"

شاہ صاحب نے کہا "ہم جس انداز میں زندگی گزارتے ہیں' اس میں خدشات اور خطرات محسوس ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جب تم نے سخت پہرا لگا دیا ہے۔ وہ حویلی سے باہر بھی نہیں جاسکتی ہے تو پھر اپنے دل سے خدشات نکال دو۔"

"حضور شاہ صاحب! پرسوں الٹراساؤنڈ کے لیے اسے اسپتال لے جانا ہو گا۔"

"تم باپ بیٹے اتنے محتاط ہو کہ زچگی بھی حویلی میں کرانا چاہتے ہو۔ پھر الٹراساؤنڈ کے لیے کیوں لے جا رہے ہو؟ کیا صرف اس لیے کہ زچگی سے پہلے معلوم ہو جائے کہ بیٹی ہو گی یا بیٹا؟"

"حضور! آپ نے پیش گوئی کی ہے۔ بیٹا ہی ہو گا۔ بس ذرا دل کی تسلی کے لیے اور جشن منانے کے لیے اس جدید طبی مشین سے ایک بیٹا حاصل کرنے کی تصدیق کریں گے۔"

حماد نے کہا "ویسے ہم نے بڑے سخت انتظامات کیے ہیں۔ جس گاڑی میں مرجانہ کو لے جائیں گے۔ اس کے آگے پیچھے گاڑیوں میں کوئی پچیس تیس مسلح وفادار ہوں گے پھر پولیس کے اعلیٰ افسر سے حفاظتی انتظامات کی درخواست کی ہے۔ ہم مرجانہ کو اسپتال کے

جس حصے میں لے جائیں گے' وہاں پولیس والے کسی اجنبی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

انہوں نے اپنے طور پر بڑے سخت اور اطمینان بخش انتظامات کیے تھے۔ اگر نہ کرتے' تب بھی سردار حاکم علی ایک ماں بننے والی بیٹی کو چھین لے جانے کے لیے کشت و خون کا بازار گرم نہ کرتا۔ وہ تو دعائیں مانگ رہا تھا کہ بیٹی بخیریت ماں بن جائے۔ وہ کسی سیاسی فائدے کے لیے ان حالات میں اپنی بیٹی کو کسی ذہنی کرب مین مبتلا کرنے کی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حماد کا ایک سردار بیٹا اور جنید کا سردار پوتا ہونے والا تھا۔ آئندہ قیامت تک جاری رہنے والی سرداری نسل کا معاملہ تھا اس لیے وہ ہر حفاظتی پہلو پر توجہ دے رہے تھے۔ اسپتال کے جس حصے میں الٹراساؤنڈ کے انتظامات تھے' وہاں مرد حضرات نہیں جاسکتے تھے۔ شوہر کو بھی اجازت نہیں مل سکتی تھی اس لیے انہوں نے ایک مسلح لیڈی انسپکٹر اور دو لیڈی پولیس کانسٹیبل کا بھی انتظام کیا تھا۔ لیڈی انسپکٹر کا نام شہامت خاتون تھا۔ شہامت کے معنی دلیری اور شجاعت کے ہیں۔ وہ اسم بامسمیٰ تھی۔ صرف دلیر اور بے باک ہی نہیں' نہایت سنگدل بھی تھی۔ ایسی بے حس' بے رحم اور بے ضمیر تھی کہ صرف اس کے ڈیپارٹمنٹ کے لوگ ہی نہیں' جرائم پیشہ لوگ بھی اسے شہامت نہیں شامت خاتون کہتے تھے۔ ویسے بھی یہ نام زبان سے ادا کرتے وقت شہامت نہیں شامت سنائی دیتا تھا۔ اسے مخاطب کرتے وقت یوں لگتا تھا جیسے شامت کو پکارا جا رہا ہے اور شامت تو وہی ہے' جو موقع بے موقع سر پہ سوار ہو جاتی ہے۔ یہ وہی ہے' جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ موت ایک بار آتی ہے مگر شامت بار بار آتی ہے۔ بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ موت سے پہلے شامت آتی ہے۔ تب ہی موت کی دھمکی دیتے وقت پوچھا جاتا ہے' کیا تمہاری شامت آئی ہے؟ اور اجل پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ شامت اس کی سہیلی یا معاون ہے۔ موت کی آمد سے پہلے اپنی حرکتوں سے سمجھاتی ہے کہ سنبھل جاؤ یا پھر ہمیشہ کے لیے لڑھک جاؤ۔

وہ باپ بیٹے شہامت خاتون کو نہیں' شامت کو لائے تھے تاکہ الٹراساؤنڈ کے شعبے کی طرف کوئی آئے تو اس کی شامت آجائے لیکن ایک ہتھیار کا کیا بھروسا؟ وہ اپنی سلامتی اور دشمن کی فنا کے لیے ہوتا ہے مگر اس ہتھیار کا رخ پھر جائے تو دشمن کی سلامتی اور اپنی فنا مقدر بن جاتی ہے۔ مرجانہ کو بڑی سخت نگرانی میں اسپتال پہنچا دیا گیا۔ حویلی سے اسپتال تک مرجانہ کے ساتھ شہامت خاتون گاڑی میں بیٹھی رہی۔ الٹراساؤنڈ کے کمرے میں بھی لیڈی انسپکٹر شہامت موجود رہی۔ دروازے کے باہر زنانہ کانسٹیبل کھڑی ہو گئیں۔ اندر

اسے بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ اس کے سرہانے وہ مشین تھی جو ایک بیٹے کی پیش گوئی کرنے والی تھی۔ جو چیز سرہانے ہوتی ہے' وہ نظر نہیں آتی۔ مرجانہ بھی کچھ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ بعد میں رپورٹ پڑھنے والی تھی۔ پھر کمرے کی ایک ایک لائٹ بجھنے لگی۔ اندھیرا ہونے لگا۔ الٹراساؤنڈ ریڈنگ کے دوران بالکل ہی تاریکی نہیں ہوتی دھیمی دھیمی سی روشنی رہتی ہے لیکن ان لمحات میں اچانک ہی مرجانہ کے حواس پر تاریکی چھاگئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ چند ساعتوں تک وہی تاریکی رہی۔ پھر وہ ننھا سا بچہ قبر کے اندر دکھائی دیا۔ وہ بے چین تھا۔ اِدھر سے اُدھر کروٹ بدل کر جیسے باہر کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ تب اسے اجل کی آواز سنائی دی۔ "دیکھو۔ بچے کو غور سے دیکھو۔ تم نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

وہ دیدے پھیلائے اسے توجہ سے دیکھنے اور یاد کرنے لگی۔ اجل نے کہا "تمہیں اس کی صورت یاد نہیں رہی' تم نے اسے ایک ہی بار اسپتال میں دیکھا تھا۔ پھر اسے فرزانہ کے پہلو میں دفن کردیا گیا تھا۔"

"اوہ خدایا! اب یاد آیا۔ یہ میری بہن کا بیٹا ہے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ بچہ ابھی قبر میں زندہ ہے؟"

"نہیں' یہ انہونی اور بچگانہ سی بات ہے۔ جسے موت آگئی تو پھر آہی گئی۔ اسے زندگی واپس نہیں ملتی۔"

"پھر یہ بچہ زندہ کیوں نظر آرہا ہے؟ یہ آگہی کیا ہے؟"

"یہ زندہ اس لیے ہے کہ یہ حماد کا بیٹا ہے۔ فرزانہ مرچکی ہے۔ وہ حماد کی سانس لینے والے بیٹے کی ماں نہیں بن سکتی۔ تم زندہ ہو اور اس کے بیٹے کی ماں بن رہی ہو۔ یہ تمہارا بچہ ہے' جو قبر میں لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔"

"نہیں۔" وہ تڑپ کر بولی "نہیں اجل! مجھے جو آگہی مل رہی ہے' اس کی وضاحت یوں نہ کرو۔"

"یہی وضاحت ہے۔ دنیا کا ہر انسان حیات و موت کی ابتدا سے انتہا تک دو قبروں سے گزرتا ہے۔ پہلی قبر ماں کا پیٹ ہے' جہاں اسے بیداری ملتی ہے۔ دوسری قبر زمین کا پیٹ ہے جہاں وہ دائمی نیند سوتا ہے۔ تم آگہی کے دوران جو قبر دیکھتی آئی ہو' وہ دراصل تمہارے پیٹ کی گہری تاریکی تھی۔ یہاں حماد کے بیٹے کو آنا تھا۔ وہ آگیا ہے۔ دیکھو بچے کی وہی صورت ہے' جسے تم اسپتال میں دیکھ چکی ہو۔ حماد نے اس بچے کو حاصل کرنے کے لیے ایک قبر کا پیٹ چاک کرایا تھا۔ وہ دوسرا بیٹا بھی قبر سے باہر آنا چاہتا ہے۔ بولو یہ کیسا

آئے گا؟ خدا کی رضامندی سے یا بندے کی کمینگی سے؟"

☆=========☆=========☆

کمرا روشن ہوگیا۔ اس روشنی میں آگہی کا منظر گم ہوگیا۔ اسے گم ہونا تھا۔ کیونکہ حقیقی واقعات کی صحیح ترتیب مرجانہ کی سمجھ میں کچھ آگئی تھی اور کچھ آرہی تھی' کچھ اسے اپنے طور پر کر گزرنا تھا۔ یہ رپورٹ باپ بیٹے کو ملی کہ وہ آج رات کسی وقت اپنے بیٹے کو جنم دینے والی ہے۔ اسپتال کے باہر ڈھول بجنے لگے۔ مسلسل ہوائی فائرنگ ہونے لگی۔ اگرچہ اسپتال کے قریب شوروغل کی ممانعت ہوتی ہے۔ کمزور دل کے مریضوں کی تکالیف میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ مگر وہ بیٹا پیدا ہونے کی خوشی میں فائرنگ کر رہے تھے۔ پولیس افسر منع کر رہا تھا لیکن اس کی بھی کوئی نہیں سن رہا تھا۔ آخر وہ قافلہ مرجانہ کو اسپتال سے لے کر حویلی کی طرف روانہ ہوا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر مرجانہ کے ایک طرف حماد اور دوسری طرف لیڈی انسپکٹر شہامت خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اگلی سیٹ پر سردار جنید بیٹھا مسکراتا ہوا موبائل فون کے ذریعے رابطہ کر رہا تھا۔ جب رابطہ قائم ہوگیا تو بلند آواز سے بولا تاکہ پیچھے بیٹھی ہوئی مرجانہ بھی سنتی رہے۔ اس نے کہا "ہیلو سردار حاکم علی! بہت بڑی خوش خبری ہے۔ کیا اس فون کے ذریعے فائرنگ کی آوازیں سن رہے ہو؟"

وہ ذرا خاموش ہوا۔ دوسری طرف کی باتیں سنتا رہا۔ پھر بولا۔ "ہاں درست سمجھ رہے ہو۔ تم نانا بننے والے ہو اور میں ایک سردار پوتے کا دادا کہلانے والا ہوں۔"

وہ پھر خاموش ہوا۔ حاکم علی کی باتیں سنتا رہا پھر بولا۔ "ہاں یہ تمہاری بدنصیبی ہے کہ تمہارے ہاں کبھی بیٹا پیدا ہونے کے بعد زندہ نہیں رہا۔ ویسے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تمہاری دونوں بیٹیوں نے میرے خاندان میں آکر بیٹے پیدا کیے۔ پہلا تو خیر ہمارے نصیب میں نہیں تھا مگر یہ دوسرا سلامت رہے گا۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق نارمل زچگی ہوگی۔ کوئی اندیشہ نہیں ہے۔"

وہ قافلہ حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ حماد نے اپنے باپ سے فون لے کر کہا "ہیلو سسر صاحب! میں تمہارا داماد بول رہا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ تم نے آج تک مجھے داماد نہیں دشمن سمجھا۔ ویسے نہ سمجھنے سے کیا فرق پڑ رہا ہے۔ تمہاری بیٹی میرے قدموں ہی میں رہے گی اور میرے بچے پیدا کرتی رہے گی ہاہاہاہا۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

وہ فون پر قہقہے لگا رہا تھا۔ مرجانہ کے دماغ پر وہ قہقہے ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ وہ دانت پر دانت جمائے ہونٹوں کو سختی سے بھینچے اپنی اور اپنے باپ کی توہین برداشت کر رہی تھی۔ حماد کہہ رہا تھا "سسر صاحب! آج میں بہت خوش ہوں اور اسی

خوشی میں تمہاری بیٹی سے تمہاری گفتگو کرانا چاہتا ہوں۔ کیوں مرجانہ! بات کرو گی اپنے باپ سے؟"

اس نے فون اس کی طرف بڑھایا۔ ریسیور سے باپ کی آواز آ رہی تھی۔ "ہاں میں اپنی بچی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہیلو' ہیلو حماد! کیا واقعی مرجانہ سے میری بات کراؤ گے؟"

وہ فون کو کان سے لگا کر بولی۔ "بابا اسلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام بیٹی! خدا تمہیں سلامت اور خوشحال رکھے اب تو میرے پاس تمہیں دینے کے لیے دعائیں رہ گئی ہیں۔"

"نہیں بابا! دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں۔ اس خوشی میں آپ سے کچھ مانگوں گی تو کیا آپ انکار کریں گے؟"

"ہرگز نہیں۔ میری تمام دولت اور جائداد کے ساتھ جان بھی مانگو گی تو دے دوں گا۔ بولو کیا چاہتی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں' آپ اپنی تمام زمینیں اور دیگر جائداد وغیرہ اپنے نواسے کے نام لکھ دیں۔ اس طرح دشمنی ختم کرکے دوستی کی ابتدا کریں۔ لیکن ...."

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ باپ بیٹے یہ سن کر خوش ہو رہے تھے کہ لا سردار حاکم علی کا پورا علاقہ ہونے والے بچے کے نام لکھوا رہی ہے۔ اپنے باپ کو ان کے سامنے جھکا رہی ہے لیکن اس کے بعد اس کے "لیکن" نے تجسس پیدا کر دیا۔ دوسری طرف سے باپ نے پوچھا۔ "بیٹی! تم نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ بات کیا ہے؟ صاف صاف بولو۔ اور کیا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔ "میں آپ سے کوئی حتمی معاملہ طے کرنے سے پہلے اپنے شوہر اور سسر سے کچھ ضروری باتیں کروں گی۔"

سردار جنید اگلی سیٹ پر گھوم کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بولا۔ "ہاں' ہم سے بات کرو۔ ہم سب یہاں موجود ہیں۔"

وہ فون بند کرکے بولی۔ "میں اپنے حاکم بابا کا پورا علاقہ اپنے بیٹے کو یعنی تمہارے سردار پوتے کو دینے والی ہوں۔ اس سلسلے میں بات یہاں نہیں' حویلی میں پہنچ کر تنہائی میں ہوگی۔" بات معقول تھی۔ ایسی باتیں تنہائی میں ہوتی ہیں۔ مرجانہ نے ان باپ بیٹے کو حویلی پہنچنے تک اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ ایک نہ ایک دن سردار حاکم علی کا سب کچھ مرجانہ اور اس کی اولاد کے نام ہونے والا تھا لیکن وہ دن کب آتا؟ ہو سکتا ہے' اس دن کے آنے تک حالات بدل جاتے۔ علاقے کی سیاست بدل جاتی۔ مرجانہ نے یہ بات ابھی

چھیڑ کر باپ بیٹے کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ حاکم علی نواسا پیدا ہونے کی خوشی میں اپنا سب کچھ بیٹی اور نواسے کے نام لکھ دے گا تو باپ بیٹے کو دو علاقوں کی سرداری مل جائے گی اور سیاست کے میدان میں دو حلقوں کی چار سیٹیں ہمیشہ پکی رہیں گی۔ حویلی کے احاطے میں قافلہ رک گیا۔ لیڈی انسپکٹر شہامت خاتون کو بھی باہر چھوڑ دیا گیا۔ وہ باپ بیٹے مرجانہ کے ساتھ حویلی کے اندر آئے سردار جنید اپنے بیٹے اور بہو کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ پھر بولا۔ "مرجانہ! تم نے فون پر اپنے باپ سے بڑی دانشمندی کی بات شروع کی تھی۔ یہاں تنہائی ہے۔ پوری بات بولو۔"

مرجانہ نے آگے بڑھ کر دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں بالکل تنہائی چاہتی ہوں۔ دروازہ بند رہے گا تو کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔"

باپ بیٹے ایک ایک صوفے پر آرام سے بیٹھ گئے۔ مگر پھر ایک دم سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ مرجانہ نے دروازے کے پاس سے پلٹ کر اپنے لباس کے اندر سے ایک ریوالور نکال لیا تھا۔ سردار جنید نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ........ یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

وہ بولی۔ "سیاست میں آج سب سے اچھی بات یہ لگی کہ ہارس ٹریڈنگ ہو جاتی ہے۔ سردار کمالی نے تمہاری لیڈی انسپکٹر شہامت خاتون کو پچاس ہزار روپے میں خرید لیا تھا۔ یہ ریوالور مجھے پچاس ہزار کا پڑا ہے اور وہ شہامت تمہارے لیے شہامت بن کر آئی تھی۔"

حماد نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ "کک........ کیا تم سمجھتی ہو' ہمیں قتل کر کے زندہ بچو گی؟ کیا اپنے بچے کے باپ کو قتل کرو گی؟ مم........ میں تمہارا مجازی خدا ہوں۔"

"تم ہکلا رہے ہو حماد! وہ قہقہے لگاؤ جو میرے بابا کو فون پر سنا رہے تھے۔"

سردار جنید نے کہا۔ "مرجانہ! اس ریوالور سے گولیاں چلا کر تم کیا حاصل کر سکو گی؟ اگر ہم باپ بیٹے مریں گے تو کیا ہمارے وفادار تمہیں یہاں سے زندہ جانے دیں گے؟"

"سردار جنید! میں نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ تمہیں گولی ماروں گی۔ تم مر جاؤ گے تو پھر تمہارے سردار پوتے پر کون فخر کرے گا۔ تمہیں قیامت تک سرداری نسل چلانے کے لیے نر بچے کی ضرورت ہے۔ میں ایک شرط پر اپنا بیٹا تمہیں دوں گی۔"

"مجھے اپنے پوتے کے لیے ہر شرط منظور ہے۔ بولو کیا چاہتی ہو؟"

"میرا تقاضا سیاست کا بنیادی تقاضا ہے۔ دو اور نو' میں تمہارا ایک بیٹا لوں گی اور اپنا ایک بیٹا دوں گی۔ تمہارا مرے گا اور میرا زندہ رہے گا۔"

"تم پاگل کی بچی ہو۔ میں اپنے بیٹے پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

سردار جنید نے ایسا کہتے ہوئے جیسے ہی بیٹے کے لیے ڈھال بننے کی کوشش کی مرجانہ نے ٹھائیں سے گولی چلادی۔ حماد کے حلق سے چیخ نکلی۔ گولی شانے پر لگی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ مرجانہ نے کہا "دوسری بار ڈھال بننے کی کوشش کرو گے تو اسے جان سے مار ڈالوں گی۔ دور ہٹو۔"

اسے بیٹے کو زندہ دیکھنے کے لیے پیچھے ہٹنا پڑا۔ بہو کے تیور نے سمجھا دیا کہ بیٹے کا وجود فی الوقت شیشے کا ہے' ایک پتھر سے ٹوٹ جائے گا۔ وہ سردار جنید سے بولی۔ "فون اٹھاؤ اور سردار کمالی سے رابطہ کرو۔"

وہ فون اٹھاتے ہوئے بولا "مرجانہ! میں ابھی نمبر ملاتا ہوں مگر خدا کے لیے کمالی سے نہیں مجھ سے سمجھوتا کرو۔ جتنی شرائط منوانا چاہو منوالو۔"

"وقت ضائع نہ کرو۔ تمہارے بیٹے کو طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

اس نے زخمی بیٹے کو بے بسی سے دیکھا پھر رابطہ قائم کرنے کے بعد بولا "ہیلو سردار کمالی! میں جنید بول رہا ہوں۔ میری بہو مرجانہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔" وہ فون دینے کے لیے قریب آنا چاہتا تھا۔ مرجانہ نے کہا "دور رہو۔ میرے قریب آنے کی حماقت نہ کرنا۔ سردار کمالی کو یہاں کے حالات بتاؤ۔"

وہ شکست خوردہ سی آواز میں بولا "سردار کمالی! میرا بیٹا حماد بری طرح زخمی ہے' مرجانہ کے سر پر خون سوار ہے۔ اسے سمجھاؤ۔ میں بڑی سے بڑی شرط پر اپنے بیٹے کی زندگی چاہتا ہوں۔"

مرجانہ نے پوچھا۔ "کیا صرف بیٹا چاہتے ہو۔ اپنا پوتا نہیں لو گے؟"

"ہاں لوں گا۔ وہ میرے بیٹے کا بیٹا ہے۔ تم اسے جنم دینے والی ہو۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں' سردار کمالی سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ یہاں جو بات بگڑ رہی ہے اسے بنالے۔"

سردار کمالی نے کہا "بات اسی وقت بنے گی جب حویلی کے باہر کھڑے ہوئے تمہارے تمام وفادار ہتھیار ڈال دیں گے۔ ان سے کہو' احاطے کے باہر ایک سرخ رنگ کی سوزوکی کھڑی ہے۔ وہ اپنے تمام ہتھیار اس سوزوکی میں ڈال کر احاطے میں آئیں اور مرغے بن جائیں۔ میں وہاں آکر مرجانہ کو صحیح سلامت نکال لے جاؤں گا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان سودے بازی ہوگی۔"

سردار جنید نے کھڑکی کھول کر نیچے احاطے میں دیکھتے ہوئے اپنے وفاداروں کو وہاں

حکم دیا جس کی ہدایت کی گئی تھی۔ وہ سب حکم کے بندے تھے۔ انہوں نے باہر جاکر ایک سرخ سوزوکی میں تمام ہتھیار ڈال دیئے۔ پھر احاطے میں آکر جھکتے ہوئے مرغے بن گئے۔ تھوڑی دیر بعد سردار کمالی تقریباً تیس مسلح افراد کے ساتھ نظر آیا۔ وہ لوگ حویلی کا محاصرہ کر رہے تھے۔ پھر دروازے پر دستک کے ساتھ آواز سنائی دی۔ "مرجانہ! میں ہوں کمالی! دروازہ کھولو۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ کمالی نے اندر آکر کہا۔ "سردار جنید! تم یہ بھول گئے تھے کہ حاکم علی کی بیٹی تمہارے بیٹے کے پاس ہے تو اس بیٹی کے ساتھ تمہارا بیٹا بھی دن رات رہتا ہے۔ جسے کسی وقت بھی کانٹا چبھ سکتا ہے۔"

مرجانہ نے کہا "اگر میں یہ کہوں کہ تمہارے بیٹے سے طلاق لے کر جا رہی ہوں تو تم بیٹے کی سلامتی کے لیے بہو کے رشتے سے آزاد کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ گے۔ بولو منظور ہے؟"

"میں اپنے بیٹے کے لیے تمہاری ہر بات منظور کروں گا۔"

"اس لیے منظور کرو گے کہ بیٹا سلامت رہے گا تو دوسری آجائے گی۔ اس دوسری سے پوتا ہو جائے گا۔ میری بہن فرزانہ کو قتل کرتے وقت یہی سوچا گیا تھا لیکن اس وقت قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ میری بہن کے ساتھ تمہارا پوتا بھی مر گیا۔ آج صورتِ حال دوسری ہے۔ آج تمہارا بیٹا مرجائے تو تمہاری نظروں میں میری اہمیت ہوگی کیونکہ میں تمہارے سردار پوتے کو جنم دینے والی ہوں۔ میرے بعد تمہارے ہاں سردار بننے والا کوئی پیدا نہیں ہو سکے گا۔"

وہ عاجزی سے بولا "خدا کے لیے میرے بیٹے کے مرنے کی بات نہ کرو۔"

"تمہارا بیٹا تو ضرور مرے گا کیونکہ اس کے بعد ہی میرے بیٹے کی اہمیت تمہاری نظروں میں ہوگی۔ تمہیں سرداری کے لیے وارث چاہیے۔ وہ وارث میں دوں گی مگر دینے سے پہلے لوں گی۔ دو اور لو۔ دو' ایک مطالبہ ہے اور لو' ایک پیشکش ہے۔ دیتے وقت اپنی چیز ہاتھ سے چھوڑتے ہیں۔ لیتے وقت ہاتھ سے پکڑتے ہیں۔ وہ نادان ہیں' جو دیتے وقت ہاتھ خالی کر لیتے ہیں۔ وہ دانا ہیں' جو خالی ہاتھ بھرنے کے بعد دیتے ہیں۔ بڑی لے دے کے بعد دو اور لو کا سمجھوتا ہوتا ہے۔ دو اور لو کی اس دنیا میں موت کچھ نہیں دیتی۔ بس لے کر چلی جاتی ہے۔" یہ کہتے ہی مرجانہ نے نشانہ لیا اور حماد کو گولی مار دی۔

جنید تڑپ کر بیٹے کی لاش سے لپٹ گیا۔ پچھاڑیں کھانے اور سر پٹخنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "رولے' خوب جی بھر کے آنسو بہالے۔ اپنے اندر کا سارا غبار نکال لے۔ پھر رفتہ

رفتہ تجھے صبر آئے گا کہ تیرا بیٹا زندہ ہے۔ میرے اندر زندہ ہے۔ آج رات کسی وقت مجھے لینے والا ہے۔ میں نے تجھ سے لیا ہے تو تجھے دوں گی بھی مگر لینے سے پہلے یاد رکھ۔ تیرے بیٹے کے قتل کا الزام مجھ پر نہ آئے ورنہ تیرا سرداری نظام آگے نہیں چل سکے گا اور تو اپنے بیٹے کے بیٹے کی خاطر بہت سی شرائط تسلیم کرے گا۔ ان میں سے آخری شرط یہ ہوگی کہ تیرے مقتول بیٹے کی تجہیز و تکفین سیاسی قبرستان میں ہوگی۔"

وہ قبرستان آباد ہوتا جا رہا تھا۔

بہت سے لوگ ایک جنازہ اٹھائے آ رہے تھے۔ پھر انہوں نے جنازے کو اسی جگہ رکھ دیا' جہاں پہلے سے ایک قبر کھدی ہوئی تھی۔ اس قبر پر پہلے سے جو کتبہ نصب کیا ہوا تھا اس پر سیاہ مارکر سے چھ ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ "ون' ون' ون' نائن' نائن' ٹو"

وہ پہلی جنوری انیس سو بیانوے (۱۹۹۲-۱-۱) کی شام تھی۔ اس کتبے کے پاس کھڑا ہوا اجل زیرِ لب کہہ رہا تھا۔

ایک نگر کے نقش مٹادوں ایک نگر ایجاد کروں
ایک طرف سناٹا کردوں ایک طرف آباد کروں

☆==========☆==========☆

عدل و عدول

عدل و انصاف اور دیانت کی سربلندی کے لیے کام کرنے والے اس جج کی کہانی جس کو اپنے پیشے کا تقدس بے حد عزیز تھا۔ اپنے لیے راستی کی راہ چُننے والے دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی مصائب کا شکار تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے متعلقین بھی اس کے ہم عذاب تھے۔ معاشرے کی بُرائیاں دُور کرنے کی' اپنی ہر کوشش کے جواب میں اُس نے ایک نیا چرکا پایا۔ ہر روز مر مر کے جئے جانے پر مجبور وہ شخص آزمائشوں اور کٹھنائیوں کا سفر طے کرتا راہِ زندگی پر بڑھا چلا جا رہا تھا جس پر چلنے والے ایک نہ ایک روز منزل پر پہنچ کر رہتے ہیں۔

خاتمہ سب کے لیے ہے اور سب کو یہ سوچنا اور طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ کن راہوں سے گزر کر اپنے خاتمے تک پہنچیں گے؟

زندگی صحیح ترتیب سے گزاری جائے تو سفرِ حیات دشوار نہیں ہے' لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان کی مقرر کردہ ترتیب کے دوران مشکلات یا غیر متوقع حالات پیش آجاتے ہیں۔

زیرِ نظر کہانی بھی کچھ ایسے ہی حالات کے گرد گھومتی ہے جو انسان کو غیر متوقع طور پر پیش آجاتے ہیں۔

مجھے کسی فلائٹ میں شاید اس لیے جگہ نہیں ملی کہ میں موت کی ٹرین میں سفر کرنے والا تھا۔ اپنا مختصر سا سامان لے کر ریلوے اسٹیشن پر آگیا۔ وہاں بھی حاجی صاحبان کا ہجوم تھا۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ ریلوے بکنگ آفس سے پندرہ دن بعد کے ٹکٹ مل رہے تھے لیکن یہ میں کیا' ایک دنیا جانتی ہے کہ ٹکٹ بکنگ آفس میں نہیں' قلیوں کی جیبوں میں ہوتے ہیں جو تھوڑی سی رشوت دے کر حاصل کئے جاسکتے ہیں مگر اس روز ایسا رش تھا کہ قلیوں کی جیبیں نوٹوں سے بھر گئی تھیں اور ٹکٹوں سے خالی ہو گئی تھیں۔

میرے قریب ہی ایک عمر رسیدہ صاحب اپنی فیملی کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ بڑے پریشان تھے۔ مجھ اکیلے کو ایک سیٹ نہیں مل رہی تھی پھر ان کی پوری فیملی کو کیسے جگہ مل جاتی؟

ان کی بیگم برقع میں تھیں۔ ایک جوان بیٹی نے چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ دو بیٹے تھے' ایک جوان تھا دوسرا کوئی دس برس کا تھا۔ جوان بیٹے نے کہا "اباجان! کل آپ کی چھٹی کا آخری دن ہے۔ پرسوں ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہے۔ ان حالات میں آپ اپنے رتبے سے کام لے سکتے ہیں۔"

بیگم نے کہا "آپ اسٹیشن ماسٹر کے پاس جائیں۔ اپنی شناخت کرائیں۔ ہمیں ٹرین میں کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے گی۔"

بزرگ نے کہا "جب ٹرین میں ایک بھی سیٹ خالی نہیں ہے تو اسٹیشن ماسٹر کیا کرے گا؟"

ٹرین کا گارڈ قریب سے گزر رہا تھا۔ کچھ مسافر اس کے آگے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اس جوان نے گارڈ کا راستہ روک کر کہا "جناب! یہ بزرگ میرے والد ہیں' کل تک ان کا کراچی پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

گارڈ نے بزرگ اور ان کی فیملی کو دیکھا پھر دوسرے مسافروں کو جھڑک کر وہاں سے بھگا دیا اور اس سے پوچھا۔ "کتنے بندے ہیں؟"

جوان نے کہا۔ "ہم پانچ ہیں۔"

میں نے فوراً کہا۔ "پانچ نہیں' چھ ہیں۔ میرا بھی کراچی پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

بزرگ نے مجھے دیکھا پھر کہا۔ "انسان کو اپنی مصیبت کے آئینے میں دوسروں کی مصیبت کا عکس دیکھنا چاہیے۔ آپ نے خود کو میری فیملی میں شامل کیا ہے۔ میں آپ کی نامعلوم مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہوں۔"

گارڈ نے کہا۔ "آپ لوگ میرے ساتھ آئیں۔"

ہم سب نے اپنا اپنا سامان اٹھایا پھر اس کے پیچھے چلتے ہوئے ایک ایسے کمپارٹمنٹ کے پاس پہنچے جو پولیس والوں کے لیے ریزرو تھا۔ وہاں چاک سے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا "ریزرو فار پولیس" دروازے پر ایک سپاہی کھڑا ہوا تھا۔ گارڈ نے اس سے کہا "انہیں جانے دو۔ اپنے بندے ہیں۔"

بزرگ نے گارڈ سے پوچھا "برادر! ہمارے پاس ٹکٹ نہیں ہیں۔ اصولاً پہلے ٹکٹ اور سیٹ نمبرز ہونے چاہئیں۔"

گارڈ نے کہا "بزرگو! آرام سے جا کے بیٹھو۔ جب ٹرین چلے گی تو میں آکر ٹکٹ بناؤں گا۔"

ایسا اکثر ہوتا ہے۔ سفر کے دوران جن کے پاس ٹکٹ نہیں ہوتے' گارڈ اور چیکر آکر ان سے منزلِ مقصود تک کی رقم لے کر باقاعدہ ٹکٹ کی ریلوے پرچی لکھ دیتے ہیں۔ ہم سامان سمیت کمپارٹمنٹ کے اندر آگئے۔ اندر کچھ اور مسافر عورتیں' بچے اور مرد تھے۔ وہاں ساٹھ مسافروں کی گنجائش تھی جن میں صرف دس پولیس والے تھے۔

بزرگ کچھ بے چین اور پریشان سے تھے۔ انہوں نے ایک سپاہی سے کہا "یہ کمپارٹمنٹ پولیس والوں کے لیے ہے۔ کہیں ہمیں راستے میں نہ اتار دیا جائے۔"

سپاہی نے کہا "ہم پولیس والے صرف ملتان تک جا رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ

کمپارٹمنٹ عام مسافروں کے لیے رہے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آرام سے سفر کریں۔"

یہ بات اطمینان بخش تھی کہ ملتان کے بعد وہ کمپارٹمنٹ عام مسافروں کے لیے رہے گا اور اس کی ذمے داری ایک گارڈ نے بھی لی تھی۔ ہمیں بیٹھنے کے لیے آمنے سامنے دو برتھ ملے۔ ہر برتھ چار مسافروں کے لیے تھی۔ چونکہ ہم چھ تھے اس لیے ہمارے برتھ پر دو اور مسافر آگئے۔

ٹرین چھوٹنے سے پہلے پلیٹ فارم پر ایک شور سا ہوا۔ کتنے ہی لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ کچھ تالیاں بجا رہے تھے۔ پتا چلا چار خسرے تھے۔ بڑی سج دھج کے ساتھ زنانہ بھڑکیلے لباس میں آئے تھے اور وہ ہمارے ہی کمپارٹمنٹ میں آئے تھے۔ وہاں درمیانی حصے میں خواتین تھیں۔ ان کی طرف چار نشستیں خالی تھیں۔ سپاہی وہ سیٹیں ان خسروں کو دینا چاہتا تھا۔ خواتین کے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد نے اعتراض کیا۔ "انہیں یہاں نہیں، وہاں مردوں کے پاس جگہ دو۔"

وہ خسرے تماشا بنے ہوئے تھے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے منچلے کھڑکیوں کے پاس آکر کمپارٹمنٹ کے اندر دیکھتے ہوئے آوازے کس رہے تھے۔ انہیں طرح طرح سے چھیڑ رہے تھے۔ بے چاری عورتیں اپنا منہ چھپا رہی تھیں۔

سپاہی نے اعتراض کرنے والے مرد سے کہا "ناراض کیوں ہوتے ہو؟ یہ نہ مرد ہیں نہ عورت۔ اس لیے عورتوں کے سامنے والی سیٹوں پر ان کے بیٹھنے سے کیا فرق پڑے گا؟"

وہ بولا "یہ مرد ہیں۔ زنانہ لباس پہن لینے سے عورتیں نہیں کہلائیں گے۔"

ایک خاتون نے کہا "یہ ریلوے والے مردانہ اور زنانہ کمپارٹمنٹس بناتے ہیں۔ ان خسروں کے لیے بھی ایک الگ کمپارٹمنٹ کیوں نہیں بناتے؟"

سپاہی نے کہا "آپ لوگوں کو اعتراض ہے تو اتر جائیں۔ مسافروں کی کمی نہیں ہے یہ پولیس کے لیے ریزرو ہے۔ ہم یہاں کسی کو بھی بٹھا سکتے ہیں۔"

اعتراض کرنے والوں کو چپ سی لگ گئی۔ انہیں پولیس والوں کی مہربانیوں سے ہی جگہ ملی تھی۔ ان خواتین نے اپنے سامنے والی سیٹوں پر خسروں کو قبول کر لیا۔ پھر ٹرین چل پڑی۔

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے بزرگ لاحول پڑھ رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں خسروں کو دیکھ کر لوگوں کی حسِ مزاح پھڑک اٹھتی ہے۔ نوجوان اور اوباش قسم کے لوگ انہیں چھیڑنے لگتے ہیں۔ کمپارٹمنٹ مسافروں سے بھر گیا تھا۔ چلنے پھرنے کے راستے پر بھی مسافر بیٹھے

کھڑے ہوئے تھے۔ اس پر یہ تماشا تھا کہ دوسرے کمپارٹمنٹ کے لوگ تفریح کی خاطر ان خسروں کو دیکھنے آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ بالآخر گاڑی چل پڑی۔

میں نے ان بزرگ کے صاحب زادے سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا "سید کاشف جاہ۔"

میرا خیال تھا وہ اپنے متعلق کچھ اور کہے گا۔ سفر طویل ہو تو اجنبیت گراں گزرتی ہے۔ ہمسفر افراد کو کسی حد تک ایک دوسرے سے متعارف ہونا اور باتیں کرنا چاہیے۔ اس طرح وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ میں نے بات آگے بڑھانے کے لیے اپنا نام اور کام بتایا۔ وہ "اچھا" کہہ کر خاموش رہا۔ اسے مجھ جیسے مصنف وغیرہ سے دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے پوچھا "یہ بزرگ جو سامنے بیٹھے ہیں، آپ کے والد ہیں؟"

"جی ہاں۔ میرے والد ہیں۔"

"بہت مختصر سا جواب دیتے ہو۔ کیا مجھ جیسے اجنبی سے گفتگو گوارا نہیں ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔ میرے ابو کی ہدایت ہے کہ جتنا سوال ہو، اتنا ہی جواب دیا کرو۔"

"معقول ہدایت ہے لیکن طویل سفر میں وقت گزارنے کے لیے تم اپنی طرف سے بھی کچھ کہہ سکتے ہو۔"

"آدمی اس وقت بولتا ہے جب اس کے اندر کوئی سوال یا تجسس پیدا ہوتا ہے۔"

جب ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے چلتی ہے تو بڑا شور مچاتی ہے۔ کھٹ کھٹ کے شور کے دوران دو قریب بیٹھے ہوئے مسافروں کو اونچی آواز میں بولنا پڑتا ہے۔ ادھر کی گفتگو ادھر سامنے والی برتھ پر بمشکل سنائی دیتی ہے۔ بزرگ کی قوتِ سماعت قدرے تیز تھی۔ انہوں نے اپنے صاحب زادے کی بات سن کر کہا "میرے اندر سوال پیدا ہو رہا ہے کہ یہ چند پولیس والے ہیں۔ یہ دو یا تین برتھ ریزرو کرا کے ملتان تک جا سکتے ہیں۔ پھر انہوں نے پورا کمپارٹمنٹ کیوں ریزرو کرایا ہے؟"

میرے قریب بیٹھے ہوئے مسافر نے کہا "یہ جی، کھانے پینے کے دھندے ہیں۔"

بزرگ نے کہا "ہمیں اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ کسی پر یونہی الزام نہیں دھرنا چاہیے۔ یہ گارڈ باریش ہے۔ پیشانی پر سجدوں کا نشان ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر ایمان کا نور دیکھ کر ہی اس کمپارٹمنٹ میں سفر کرنا منظور کیا ہے۔"

میں نے کہا "خدا کرے کہ وہ ایمان دار ہو لیکن ہم اپنی ضرورت اور کراچی جلد از

جلد پہنچنے کی اہمیت کے پیشِ نظر سفر کر رہے ہیں۔"

بزرگ نے کہا "ضرورت آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ ٹرین کا سفر ہو یا زندگی کا، وہ غلط طریقے سے کرے اگر ہم ضرورت کے دباؤ میں نہ آئیں تو کبھی غلطی نہ کریں۔"

"آپ کے صاحب زادے فرما رہے تھے کہ کل آپ کا کراچی پہنچنا اور پرسوں ڈیوٹی پر حاضر ہونا ضروری ہے۔ کیا آپ ایسی صورت میں قلی کو یا گارڈ کو کچھ زیادہ رقم دے کر صاف لفظوں میں رشوت دے کر سفر نہ کرتے؟"

"میں ایسا ہرگز نہ کرتا۔ خدا معاف کرے۔ کبھی زندگی میں بھول ہوئی ہو تو مجھے یاد نہیں ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ رشوت حرام ہے۔ نہ کسی کو دینا چاہیے نہ کسی سے لینا چاہیے۔"

"لیکن آپ کے لیے ڈیوٹی پر حاضر ہونا ضروری ہے۔"

"میں ٹیلی گرام کے ذریعے دو چار دن کی چھٹیاں بڑھا لیتا۔ چھٹیاں منظور نہ ہوتیں تو تنخواہ سے تھوڑی رقم کٹ جاتی۔ اگر ہم اپنی ذات پر تھوڑی سی تکلیف برداشت کر سکیں تو رشوت دینے اور لینے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔"

ایک مسافر نے کہا "آپ بزرگ ہیں چاچا جی! اچھی باتیں سمجھا رہے ہیں مگر بات صرف آپ کی ڈیوٹی کی نہیں ہے۔ آپ چھٹیاں لے سکتے ہیں لیکن وہاں میری والدہ اسپتال میں ہیں، ابھی فون سنتے ہی دوڑا آیا ہوں۔ ایسے میں کوئی مجھ سے دوگنی رشوت لے کر ملتان تک پہنچائے تو میں اسے راشی نہیں محسن سمجھوں گا۔"

"بیٹے! تم نے بڑی جذباتی بات کہہ دی۔ سننے میں اچھی لگی پھر بھی ناجائز طریقہ کار سے بچنے کا راستہ نکالنا چاہیے۔ دیانت داری مقصود ہو تو ہائی وے سے بس اور کوچ میں سفر کر سکتے ہو۔ اس ٹرین سے بیس گھنٹوں میں کراچی پہنچو گے، ہائی وے کے راستے ہو سکتا ہے دو چار گھنٹے زیادہ لگ جائیں لیکن اس طرح بھی والدہ کے پاس پہنچ جاؤ گے۔"

"آپ ماں کے لیے ایک بیٹے کی بے قراری کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔"

"سمجھ رہا ہوں۔ کتنی ہی ٹرینیں دو چار گھنٹے لیٹ پہنچا کرتی ہیں۔ تب بے قراری کا کیا عالم ہوتا ہے؟ میں ساری دنیا کی مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ مگر اپنے ملک کے لوگوں کی یہ بگڑی ہوئی عادت اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ وہ ہمیشہ عجلت میں رہتے ہیں۔ قطار میں سکون سے کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اپنی باری کا انتظار نہیں کر سکتے۔ قطار کے آخر میں ہوں تو کچھ دے دلا کر پہلے نمبر پر آجاتے ہیں۔"

اب سے کوئی بیس بائیس برس پہلے سینما ہال میں قومی پرچم و ترانہ فلم کے اختتام پر

دکھایا جاتا تھا لیکن ڈھائی تین گھنٹوں تک مزے لے لے کر فلمیں دیکھنے والے فلم کا آخری سین دیکھتے ہی ہال سے نکلنے لگتے تھے۔ انہیں واپس جانے کی اتنی جلدی ہوا کرتی تھی کہ وہ سکرین پر پاکستانی پرچم کے سامنے احترام سے کھڑے رہ کر وقت ضائع نہیں کرتے تھے، ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے سینما ہال سے باہر نکلتے تھے۔

آج بھی یہی حال ہے لیکن ماضی کی کسی حکومت یا انتظامیہ نے سوچا کہ پاکستان کی عوام سے پرچم کا احترام کرایا جائے پھر یہ طے کیا کہ قومی ترانہ اور پرچم فلم شروع ہونے سے پہلے اسکرین پر پیش کیا جائے کہ قومی پرچم کا احترام آپ پر لازم ہے اس کے لیے باادب کھڑے ہو جائیں۔

ہم لوگوں کے لیے اس سے زیادہ ندامت کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ قیام پاکستان کے چھیالیس سال بعد بھی ہمیں اپنے پرچم کے سامنے احترام سے کھڑے ہونے کا درس دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہال میں نصف سے زیادہ تماشائی احتراماً کھڑے نہیں ہوتے بے حس بنے بیٹھے ہی رہتے ہیں۔

پاکستانی باشندوں کے قومی جذبات کب جاگتے ہیں اور کب تک خوابیدہ رہتے ہیں، یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ ہمارے ملک کے ایک انسپکٹر جنرل (ریٹائرڈ) پولیس جناب ایم ایم حسن نے اپنی ایک کتاب "چھتیس برس" میں پاکستانی باشندوں کے سچے قومی جذبات اور پھر مضحکہ خیز رویے کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس آزمائش کی گھڑی میں ہماری قوم نے ایسے صبر و ضبط، تحمل اور تنظیم کا مظاہرہ کیا کہ اپنے تو کیا غیر بھی عش عش کرنے لگے۔ جنگ کے دوران جرائم یکسر ناپید ہو گئے۔ کیا مجال ہے کہ رات کو بلیک آؤٹ کے دوران کسی گھر سے روشنی کی کوئی کرن نظر آجاتی۔ محلے والے خود کڑی نگرانی رکھتے اور ضوابط کی خلاف ورزی کرنے والوں کا محاسبہ کرتے۔

پھر ایک دن کھلبلی مچ گئی کہ بھارت کی چھاتا بردار فوج نازل ہو گئی ہے اور عوام کی لاٹھیاں ڈنڈے، ہاکی اور مختلف قسم کے ہتھیار جو فوری طور پر ہاتھ لگے لے کر چھاتا بردار بھارتی فوجیوں کی تلاش میں نکل پڑیں۔ رات کے وقت ہر سڑک پر گزرنے والی گاڑی کو روک کر جانچ ہوتی۔ اگر کوئی ڈرائیور روکنے میں پس و پیش کرتا تو گاڑی کی ڈنڈوں سے تواضع ہوتی۔ ہر گداگر اور فاترالعقل راہ گیر سے پوچھ گچھ ہوتی کہ مبادا کوئی بھارتی فوجی بھیس بدل کر آگیا ہو۔ ذرا بھی کسی پر شک ہوتا تو اسے قریب کے تھانے پہنچا دیا

جاتا۔

اس سلسلے میں بہت سے لطیفوں نے جنم لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص کو کچھ فرض شناس پاکستانیوں نے بھارتی بہروپیا سمجھ کر پکڑ لیا۔ مشتبہ آدمی نے اپنے پاکستانی مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا مگر گرفتار کنندگان نے باور نہ کیا اور اس کے ایمان کی آزمائش شروع کر دی۔ اسے حکم دیا گیا کہ وہ کلمہ سنائے۔ جب اس نے پہلا کلمہ صحیح پڑھا تو اس سے کہا گیا کہ دوسرا کلمہ پڑھے۔ وہ بھی اس نے درست سنایا پھر ہدایت ہوئی تیسرا کلمہ سنائے۔ یہاں بھی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ آخر کار فرمان ہوا "اچھا بتاؤ چوتھا کلمہ کیا ہے؟" جب یہ بھی یاد نکلا تو سامعین کے کان کھڑے ہوئے اور ان کا شک یقین میں بدل گیا کہ وہ شخص ضرور تربیت یافتہ بھارتی فوجی ہے۔ کیونکہ اتنے کلمے تو اکثر پاکستانی مسلمانوں کو بھی یاد نہیں.........."

اس اقتباس سے جہاں پاکستانی مسلمانوں کی حب الوطنی اور فرض شناسی کے ثبوت ملتے ہیں، وہاں یہ سچی طنزیہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ اکثر مسلمانوں کو پورے کلمے یاد نہیں رہتے اور یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ سینما ہال میں فلم کے اختتام پر پاکستانی پرچم لہراتا تھا مگر تماشائی احتراماً نہیں رکتے تھے، ہال سے باہر نکل آتے تھے۔ ہماری عادات میں عجیب تضادات ہیں۔

تضاد یہ ہے کہ ہم اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں لیکن اس وطن کے ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لیے رشوت کو فروغ دیتے ہیں اور ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ہم نہ کسی ضرورت کے دباؤ میں رہتے ہیں۔

بزرگ کی باتوں نے مجھے یہ سب کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ میری سوچ کے دوران بارلیش گارڈ آگیا تھا اور دو سپاہیوں کے ساتھ چلتا ہوا ایک ایک مسافر سے کرایہ وصول رہا تھا۔ وہ ہماری طرف بھی آیا۔ اس نے بزرگ سے کہا "آپ اپنی فیملی کے ساتھ ہیں یا یہ صاحب بھی ہیں؟"

اس نے میری طرف اشارہ کیا، میں نے کہا "میں اپنا کرایہ خود ادا کروں گا۔ یہاں سے کراچی کے کتنے دوں؟"

میں نے جیب سے سو سو کے دو نوٹ نکالے اس نے کہا "فی مسافر سو روپے۔"

اس نے مجھ سے دو سو لیے اور پچاس کا ایک نوٹ واپس کیا۔ پھر بزرگ سے
"آپ پانچ بندوں کے ساڑھے سات سو روپے بنتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ میں کرایہ ادا کروں گا لیکن آپ ٹکٹ نہیں دے رہے ہیں۔"

گارڈ نے مسکرا کر کہا "ٹکٹ ریلوے اسٹیشن کے کاؤنٹر پر ملتے ہیں۔ آپ کرایہ نکالیں اور آرام سے سفر کریں۔"

بزرگ نے کہا "بے شک ٹکٹ کاؤنٹر سے ملتے ہیں لیکن ٹکٹ نہ ہو تو سفر کے دوران کرائے کی رسید لکھ کر دی جاتی ہے۔"

وہ بولا "میں گارڈ ہوں۔ ریلوے کا قانون جانتا ہوں۔ یہاں کوئی مسافر مجھے قانون نہیں سمجھا رہا ہے۔ آپ ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔ کرایہ نکالیں۔"

"کرایہ نکالوں یا رشوت نکالوں؟ کیا یہ آپ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں؟ گارڈ کے معنی ہیں محافظ۔ آپ اس ٹرین کے محافظ ہیں۔ ایک محافظ کے منہ کو حرام لگ جائے گا تو وہ اپنی ٹرین کی اور اپنے ملک کی کیا حفاظت کرے گا۔"

گارڈ حیرت سے بڑے میاں کا منہ تکتا رہا اور سپاہی غصے سے گھورتے رہے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ کوئی مسافر اتنی بے باکی سے بولے گا۔ ایک سپاہی نے کہا "بزرگو! لیڈر مت بنو۔ یہ ڈبا مسافروں کے لیے نہیں ہم پولیس والوں کے لیے ہے۔"

دوسرے سپاہی نے کہا "ایک تو ہم آپ کو پورے خاندان کے ساتھ آرام سے لے جا رہے ہیں۔ پھر ٹکٹ کی رقم سے زیادہ نہیں لے رہے ہیں۔ جو کرایہ آپ کاؤنٹر پر دیتے، وہ یہاں دے رہے ہیں۔ پھر اس میں بے ایمانی اور رشوت کیا کیا بات ہے؟"

"تم لوگ ملکی قانون اور ریلوے قانون کے خلاف یہ حرکتیں کر رہے ہو اور یہ لوگ جو ٹکٹ یا رسید لیے بغیر کرائے کی رقم دے رہے ہیں، یہ بھی جرم کر رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، میری پوری قوم کی اجتماعی ذہنیت کیا ہے؟ کیا اس کمپارٹمنٹ کے تمام مسافروں کو کراچی آج ہی جانے کے لیے اور وہاں جلد پہنچنے کے لیے رشوت دینا لازمی ہو گیا ہے؟"

ان کی باتیں سن کر پتا نہیں کتنے مسافروں کو شرم آئی ہوگی۔ میرا سر ندامت سے جھک گیا کیونکہ میں نے ریلوے کی رسید لیے بغیر گارڈ اور سپاہیوں کو ڈیڑھ سو روپے دیئے تھے۔ مجھے دوسرے دن کراچی پہنچ کر لکھنے کا کچھ کام کرنا تھا تو میں ہائی وے سے ائرکنڈیشنڈ کوچ میں رشوت دیئے بغیر جا سکتا تھا۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ ڈیڑھ سو روپے دیتے وقت ذہن کے کسی گوشے میں رشوت دینے والی بات نہیں تھی۔ ہم سب اپنا کام کسی طرح کر گزرتے وقت قطعی بھول جاتے ہیں کہ ہم سے کوئی ناجائز حرکت سرزد ہو رہی ہے۔ ہمارے زندگی گزارنے کے سسٹم میں

بہت سے غلطیاں ایسی رچ بس گئی ہیں کہ اب وہ ہمارے رسم و رواج کا حصہ بن گئی ہیں۔ ایسے میں کبھی کوئی ایمان والا دیانت دار ٹکرا جاتا ہے اور کلمۂ حق ادا کرتا ہے تو ان غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔

بزرگ اس گارڈ سے کہہ رہے تھے "ماشاء اللہ آپ نے داڑھی رکھی ہے۔ آپ کی پیشانی پر سجدوں کا نشان ہے اور عمل یہ ہے؟ آپ کو دیکھ کر لوگ نمازیوں کو فریبی سمجھیں گے۔ خدا کے لیے عبادت کے تقدس اور اعتماد کو بحال کریں۔ ابھی اس حرام کی کمائی پر لعنت بھیج دیں۔ ورنہ ایمان والے کہیں گے۔"

تعمیر خانۂ کعبہ کی جب ہو چکی تمام
کچھ سنگ بچ رہا تھا جو اس بت کا دل بنا

گارڈ واقعی نمازی تھا۔ اس لیے جھینپ رہا تھا۔ جواب میں کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ اس دوران سپاہی اپنے افسر کو بلا کر لے آیا تھا۔ اس نے بزرگ کو دیکھ کر پوچھا "تم اس ٹرین میں سفر کرنا چاہتے ہو یا اپنی فیملی کے ساتھ اگلے اسٹیشن پر اترنا چاہتے ہو؟ اتنے ایمان والے ہو تو ٹکٹ کے بغیر اس کمپارٹمنٹ میں کیوں آئے ہو؟"

بزرگ نے کہا "آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ جیسے یہ دوسرے تمام مسافر اس پولیس ریزرو کمپارٹمنٹ میں لائے گئے ہیں۔ اگر تم یہ ثابت کر دو کہ یہ پولیس کے لیے ریزرو ہے تو میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔"

افسر نے غصے سے کہا "اگلا سٹیشن آنے دو۔ میرے سپاہی تمہیں سامان اور فیملی کے ساتھ باہر پھینک دیں گے۔"

"نہیں برخوردار! میں اتنی آسانی سے یہ کمپارٹمنٹ نہیں چھوڑوں گا۔ اس ملک میں اگر قانون کی ذرا سی بھی حکمرانی ہے تو میں تمہیں بھی یہاں سے عدالت تک لے جاؤں گا۔"

افسر کا غصہ قہقہے میں بدل گیا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا "بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں۔ پولیس والوں کو عدالت میں لے جائیں گے۔ میں ایک اشارہ کروں تو یہ تمام مسافر تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔"

ایک مسافر نے کہا "بزرگو! کیوں قانون بگھارتے ہو۔ انسپکٹر صاحب کی مہربانی سے ہمیں جگہ مل گئی ہے۔ کیا آپ اپنے ساتھ ہمیں بھی یہاں سے نکلواؤ گے؟"

دوسری طرف سے کسی مسافر نے کہا "بڈھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کے بیٹے سے کہو، وہ کرایہ دے گا۔"

بزرگ اپنی سیٹ پر سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر سامنے مسافروں کو دیکھتے ہوئے بولے "اگر تم سب یہ فیصلہ سنا دو کہ میں غلطی کر رہا ہوں تو ابھی یہ بحث ختم کر دوں گا۔"

کمپارٹمنٹ میں کئی طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ "ہاں، غلطی کر رہے ہو۔"

"اپنے ساتھ دوسرے مسافروں کے لیے مصیبت بن رہے ہو۔"

"پولیس تمہارے ساتھ ہمیں بھی یہاں سے نکالے گی تو ہم لاہور کے رہیں گے نہ کراچی کے۔"

"اے بڑے میاں! تم کرایہ دینے کو رشوت سمجھتے ہو تو جاؤ، اگلے اسٹیشن پر ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ ہم سب کا فیصلہ سننے کے بعد بحث ختم کر دو گے۔ خدا کے لیے چپ رہو۔ کرایہ دو یا چلے جاؤ۔"

کچھ اور لوگ بھی بول رہے تھے۔ بزرگ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس آگے کچھ نہ کہو۔ میں نے اکثریت کی رائے معلوم کر لی ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اوپری برتھ سے ایک چھوٹی سی اٹیچی اٹھا کر نچلی برتھ پر رکھی اور اسے کھولنے لگے۔ یہی سمجھ میں آیا کہ اکثریت کے آگے دیانت داری ہار گئی اور اب وہ اٹیچی سے کرایہ نکال کر دے رہے ہیں۔

لیکن انہوں نے ایک کاغذ نکالا۔ اس کاغذ پر ان کی تصویر چسپاں تھی۔ انہوں نے اسے انسپکٹر کی طرف بڑھایا۔ انسپکٹر نے ناگواری سے وہ کاغذ لیا۔ پھر اس پر سرسری سی نظر ڈالتے ہی چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے بے یقینی سے بزرگ کو دیکھا۔ پھر یقین کرنے کے لیے کاغذ کو توجہ سے پڑھنے لگا۔ گارڈ بھی قریب آ کر اسے پڑھ رہا تھا۔

وہ جس قدر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے پڑھتے، انہیں وہی نظر آتا کہ ان کے سامنے عدالت عالیہ کا ایک جج سید آصف جاہ کھڑا ہوا ہے۔ معمولی سے سفید سوتی لباس میں، جس کی شلوار کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر تھے۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی اور پیشانی پر سجدوں کا نشان بتا رہا تھا کہ اب ایمان سامنے آیا ہے اور دو دھاری تلوار بن کر آیا ہے۔

یک بیک انسپکٹر نے ایڑی بجاتے ہوئے سیلوٹ کیا۔ اس ایک سیلوٹ نے کمپارٹمنٹ کے تمام مسافروں کو چونکا دیا۔ سب کی نظریں سید آصف جاہ پر جم گئی تھیں۔ تمام سپاہی بھی سیدھے الرٹ ہو گئے تھے۔ دور بیٹھے ہوئے مسافر اپنی سیٹوں پر سے اٹھ کر بزرگ کو دیکھ رہے تھے "کون ہے؟ یہ کون ہے؟"

کچھ لوگ سوچ رہے تھے اور کچھ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ جو ان کے

خلاف بولتے رہے تھے' وہ دور ہو کر بھیڑ میں منہ چھپا رہے تھے۔ کسی نے کہا "یہ شخص پولیس کا سب سے بڑا افسر ہے اسی لیے انسپکٹر نے سیلوٹ کیا ہے۔"

کسی نے اپنے ساتھی سے پوچھا "کیا یہ بوڑھا کوئی ایسا حاکم نہیں لگتا جو نوشیرواں عادل کی طرح بھیس بدل کر اپنی رعایا کے حالات معلوم کرنے آیا ہو؟"

"کیوں صدیوں پرانی باتیں کرتے ہو۔ ہمارے ملک میں ایسا کوئی حاکم پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ جو عوام کے صحیح حالات اور ان کی ضروریات معلوم کرنے کے لیے بھیس بدل کر آئے۔"

پھر یہ بات کانوں کان پہنچی کہ وہ جج ہے۔ منصف ہے مگر کیسا جج ہے؟ فوجداری سے تعلق ہے یا دیوانی سے؟ محتسب ہے یا مجسٹریٹ ہے؟

چونکہ وہ سب ٹرین میں تھے' اس لیے یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ ریلوے کے خفیہ طریقۂ کار کے مطابق اچانک مجسٹریٹ چیکنگ شروع ہوگئی ہے۔ اب تمام بغیر ٹکٹ والے مسافر دھر لیے جائیں گے۔ بھاری جرمانے کے ساتھ کرایہ ادا کریں گے یا پھر جیل جائیں گے۔

ایک مسافر نے سید آصف جاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا "جناب عالی! خدا گواہ ہے' میں نے گارڈ صاحب سے کرائے کی رسید طلب کی تھی مگر انہوں نے............"

سید صاحب نے اس کی بات کاٹ کر کہا "تم خدا کو اپنی سچائی کا گواہ بنا رہے ہو۔ تمہیں اس گواہی کی ضرورت اس لیے پیش آرہی ہے کہ تم نے گارڈ سے ایک جائز بات میری طرح بلند آواز میں نہیں کہی۔ ڈرتے ہوئے ایک بات کہہ دی۔ وہ مانی نہیں گئی تو اس پر راضی ہوگئے۔"

اس شخص نے سر جھکا لیا۔ کلمۂ حق بلند آواز میں ادا کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس تمام مسافروں نے حق کے خلاف بلند آواز میں کہا کہ رشوت لینے والے محسن ہیں' جو انہیں آرام سے منزلِ مقصود تک پہنچا رہے ہیں۔

یہ منزلِ مقصود کیا ہے؟ کہاں ہے؟

وہ چھوٹا سا کمپارٹمنٹ ایک چھوٹا سا پاکستان تھا' جس میں پنجابی' سندھی' سرحدی اور بلوچی سب ہی تھے اور سب ہی کا نظریہ یہ تھا کہ منزل تک پہنچنے کے لیے آسان مگر غلط راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے کتنے ہی مسافروں نے اس نظریے کا اظہار بلند آواز میں کیا تھا اور جو خاموش رہے تھے انہوں نے گویا خاموشی سے تائید کی تھی۔ کسی نے اس بات کی مخالفت نہیں کی تھی کہ اس بوڑھے کو اس کی فیملی اور سامان کے ساتھ

اس منی پاکستان سے باہر پھینک دیا جائے۔

ایمان اور راستی کو باہر پھینک کر پاکستانی مسافر کہاں جا رہے ہیں؟ کیا ہے ان کی منزلِ مقصود؟

سید صاحب اپنی جگہ سے آگے بڑھے۔ انسپکٹر' گارڈ' سپاہی اور دوسرے مسافر اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر انہیں راستہ دینے لگے۔ "تم سب کو کراچی پہنچنے کی جلدی ہے............ لیکن اب جیل جاؤ گے تو جلدی اپنی منزل تک کیسے پہنچو گے۔ کسی کی ماں اسپتال میں بیمار ہے' وہ قانون کی گرفت سے نکل کر ماں کے پاس کیسے پہنچے گا؟ کیا رشوت میں اپنی جان دے کر بھی ماں کے قدموں تک پہنچ سکے گا؟"

پورے کمپارٹمنٹ میں خاموشی تھی۔ صرف پٹریوں اور پہیوں کی کھٹاکھٹ کا شور تھا۔ انہوں نے پھر بلند آواز سے کہا۔ "رشوت بدترین لعنت ہے۔ ماں بیمار ہو تو بیٹا دوائیں اور دعائیں دیتا ہے لیکن یہاں ایک بیٹا اپنی ماں کے لیے رشوت کی لعنت دے کر جارہا ہے۔ کیا لعنت کے بعد خدا اس بیٹے کی دعا قبول کرے گا؟

یہاں کوئی ایسا جوان بھی ہے جسے سرکاری شعبے میں ایک بڑی ملازمت مل گئی ہے۔ وہ کل کراچی پہنچے گا اور پرسوں سے اپنی نئی ملازمت کا آغاز اس رشوت سے کرے گا' جو یہاں دے کر جا رہا ہے اور اب اس طریقۂ کار کے مطابق وہ رشوتیں لیتا رہے گا کیونکہ وہ سرکاری ملازمت کا آغاز بسم اللہ سے نہیں' بہ اسم رشوت سے کر رہا ہے۔

"میری بہنو! بھائیو! اور بچو! ڈیوٹی پر حاضر ہونا میرے لیے بھی ضروری ہے لیکن میں وہاں حاضر ہونے کے لیے متبادل جائز راستے اختیار کر سکتا ہوں' لیکن رشوت دینا یا شرعی احکامات کے خلاف کوئی کام کرنا مجھے گوارا نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور آپ بھی غور کریں کہ آپ اپنی کسی نہ کسی ضرورت کے دباؤ میں آجاتے ہیں۔ کبھی حالات سے مجبور ہو جاتے ہیں۔ آپ سب اگر حالات سے مجبور ہو کر رشوت دے کر جا رہے ہیں تو میں تنہا شخص آپ کی مجبوریاں دور کر کے کسی بے ایمانی کے بغیر آپ کو کراچی لے جاؤں گا۔

دیانت داری سے سفر کرنے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو یہ ہے کہ میں ایک جج کی حیثیت سے حکم دوں اور ٹکٹ چیکر یہاں آکر باقاعدہ سب کو کرائے کی رسیدیں دے۔ آپ کہیں گے کہ میں ایک بڑا عہدے دار ہوں اس لیے آپ سب کے برے حالات بدل رہا ہوں لیکن نہیں' میں ایک عام پاکستانی کی حیثیت سے نیک عمل کا مشورہ دوں گا اور آپ کے ساتھ اس پر عمل کروں گا۔ ہم سب اگلے اسٹیشن پر اتر جائیں گے اور بسوں کے

ذریعے کراچی جائیں گے۔ میں جو اپنے عہدے کے ذریعے اس ٹرین کے ائرکنڈ
کمپارٹمنٹ میں سفر کر سکتا ہوں' نہیں کروں گا' آپ کے ساتھ بس میں تھوڑی سی تک
برداشت کرکے آپ کا ہم سفر رہوں گا۔ کیونکہ رشوت اور بے ایمانی اس وقت ختم
جب ہم تھوڑی بہت تکالیف برداشت کرنا چاہیں گے۔"

ایک خاتون نے اٹھ کر کہا "بے شک' آپ اللہ والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ا
ہمیں بھی ایمان دے۔ مگر آپ سے التجا ہے کہ آپ عورتوں اور بچوں کو بسوں میں
کرنے کا مشورہ نہ دیں۔ آپ ایک منصف کی حیثیت سے انصاف کریں اور اس نام
پولیس کمپارٹمنٹ کو عام مسافروں کے لیے مخصوص کر دیں۔"

سید صاحب نے کہا "بہن! میں یہی کروں گا۔ انصاف کا تقاضا پورا کروں گا۔
بسوں میں سفر کرنے کی بات تو یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ ایمان کی آزمائش ہو تو
سب ٹرین میں سفر کریں گے یا بسوں میں۔"

کئی طرف سے آوازیں بلند ہوئیں "ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

"اگر آپ عام مسافر کی حیثیت سے مشورہ دیں گے تو ہم یہ ٹرین چھوڑ دیں گے
آپ کے ساتھ بسوں میں سفر کریں گے۔"

"آپ کے ایمانی جذبے نے سمجھا دیا ہے کہ ہم دیانت داری سے برے حالات
مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

سید صاحب نے خوش ہو کر تمام مسافروں کو دیکھا پھر کہا۔

ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ حالات بُرے ہیں
حالات نہیں اپنے خیالات بُرے ہیں

"میں آپ سب کو احساس دلانا چاہتا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے احساس
ہے۔ اب میں قانون کے تقاضے پورے کروں گا۔ چونکہ میں عدالت میں اور اپنی ڈیوٹی
نہیں ہوں اس لیے باقاعدہ کارروائی نہیں کر سکتا اور مجرموں کو سزائیں نہیں دے سکتا
لیکن انہیں قانون پر عمل درآمد کے لیے مجبور کر سکتا ہوں۔ گارڈ صاحب سے درخواست
ہے کہ وہ ٹکٹ چیکر کو بلا کر لائیں اور تمام مسافروں کو کرائے کی باقاعدہ رسیدیں جاری
کریں۔"

گارڈ حکم کی تعمیل کے لیے وہاں سے چلا گیا۔ سید صاحب نے انسپکٹر سے کہا "آپ
کے پاس اس کمپارٹمنٹ کے ریزرویشن کے کاغذات ہوں گے۔"

"نو سر! وہ کاغذات تو نہیں لیکن ہم پولیس والوں کے ملتان تک سفر کرنے کا ریلوے

نری پاس ہے۔"

"چلیں آپ کے پاس ریلوے کا پاس ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ یہ نہ بھی ہوتا تو
آپ سے پوچھنے کی جرأت کون کرتا؟ آپ آرام سے بیٹھیں۔ اگلا اسٹیشن ساہیوال ہے۔
وہاں ریلوے پولیس کے دفتر سے میں ملتان فون کروں گا کہ وہاں کے مسافروں کو آپ
ٹرین کی خالی کی ہوئی سیٹیں دی جائیں۔"

انسپکٹر سر جھکائے سوچتے ہوئے ایک سمت جانے لگا۔ سید صاحب نے سمجھا شاید
ٹائلٹ کی طرف جا رہا ہے لیکن وہ ادھر جا رہا تھا جدھر گارڈ گیا تھا۔ ہاتھ آنے والا مال کوئی
نہیں چھوڑتا۔ ڈیڑھ سو روپے فی مسافر کے حساب سے ان چند راشیوں کو ہزاروں روپے
ملنے والے تھے۔ اس چوری کی اجازت ریلوے حکام سے ملی تھی۔ کیونکہ یہ پولیس والے
ان حکام کی بڑی چوریوں کی پردہ پوشی کرتے تھے۔ اوپر سے نیچے تک حرام کمانے کا ایک
مضبوط سلسلہ تھا اور سید آصف جاہ اس مضبوط سلسلے کے لیے چیلنج بن گیا تھا۔ میں نے ان
کے بیٹے کاشف جاہ سے کہا "تم لوگوں کا لباس اور سادگی کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرتا ہوگا
کہ یہ ایک بہت بڑے جج کی فیملی ہے۔"

وہ بولا "ہمارے ملک میں عدلیہ' انتظامیہ کے زیر اثر ہے۔ اس لیے کوئی جج بڑا نہیں
ہوتا۔ انتظامیہ اور نوکر شاہی کے بدلتے ہوئے مزاج کے مطابق جج صاحبان کے فیصلے بھی
بدلتے رہتے ہیں۔"

"یہ میں جانتا ہوں لیکن جج کا ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ ایک شان ہوتی ہے۔ تم لوگوں کو
ابھی ائرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں ہونا چاہیے تھا۔ کیا لاہور کا اسٹیشن ماسٹر تمہارے والد کو
نہیں جانتا تھا؟"

"جی ہاں' ابو نہیں چاہتے تھے کہ اسٹیشن ماسٹر یا ریلوے کا کوئی حاکم انہیں پہچانے اور
دوسروں کی سیٹیں کینسل کرا کے ہمیں دے دے۔ وہ اپنے عہدے کے ذریعے کسی
دوسرے کا حق چھیننا گوارا نہیں کرتے ہیں۔ نہ ہی کسی حاکم کے دباؤ میں آکر کسی بے قصور
کو سزا دیتے ہیں اور نہ کسی مجرم کو رہا کرتے ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ سید آصف جاہ واقعی کسی کے دباؤ میں نہیں
آتا ہوگا۔ اسی لیے لباس اور حلیئے سے اپنے پورے خاندان کے ساتھ معمولی درجہ کا
شہری نظر آرہا تھا۔

ٹرین ساہیوال پہنچ گئی۔ انسپکٹر واپس نہیں آیا تھا۔ سید صاحب نے اپنی جگہ سے
اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی ملتان کے اسٹیشن ماسٹر سے فون پر گفتگو کرکے آتا ہوں۔"

ملتان میں پولیس والے جن سیٹوں کو خالی کرنے والے تھے‘ وہ اس کی رپورٹ چاہتے تھے تاکہ اسٹیشن ماسٹر کے علم میں یہ بات رہے کہ وہ کمپارٹمنٹ کراچی تک پولیس کے لیے ریزرو نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر تیزی سے چلتا ہوا تین سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ سید صاحب کے بیٹے کاشف سے مسکرا کر بولا۔ ”آخر تمہارے ابو مان ہی گئے۔ وہ ادھر اے سی پارلر میں اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ ہیں۔ آپ سب کی سیٹیں ہوگئی ہیں۔ فوراً چلیں ورنہ ٹرین چل پڑے گی۔“

سپاہی ان سے پوچھ کر سامان اٹھانے لگے۔ سید صاحب کی بیگم‘ بیٹی اور دونوں بیٹے اپنے سامان اور سپاہیوں کے پیچھے چلتے ہوئے پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ ایسے وقت میں کاشف جاہ کو حیران و پریشان دیکھا۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اصول پسند‘ ایماندار باپ اے سی پارلر جیسے مہنگے کمپارٹمنٹ میں سفر کرے گا لیکن اسے سوچنے سمجھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ انسپکٹر اور سپاہی جلدی کر رہے تھے اور پھر ٹرین بھی کچھ دیر میں چلنے والی تھی۔

پھر وہ چل پڑی۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا گزرتے ہوئے پلیٹ فارم کو دیکھ رہا تھا۔ تب میں نے کاشف جاہ کی والدہ اور بہن کو پلیٹ فارم پر دیکھا۔ وہ اپنے سامان کے پاس کھڑی ہوئی تھیں۔ پلیٹ فارم کے ایک حصے میں کاشف جاہ تیزی سے چلتا ہوا ادھر اُدھر یوں دیکھتا ہوا جا رہا تھا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ پھر ایک جگہ سید آصف جاہ نظر آئے‘ وہ بھی تیزی سے چلتے ہوئے اپنی بیگم اور بیٹی کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے گزرتی ہوئی ٹرین کی کھڑکی سے یہ مناظر دیکھے۔ اس کے بعد فلم کی طرح یہ تمام مناظر گزر گئے۔ گاڑی تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی ساہیوال کو پیچھے چھوڑ گئی۔ وہ خاندان جو اے سی پارلر میں سفر کرنے والا تھا‘ وہ ساہیوال میں رہ گیا تھا۔ میرے سامنے والی جو سیٹیں خالی ہوگئی تھیں‘ وہاں دوسرے مسافر آکر بیٹھ گئے۔ ایک اور مسافر نے سید صاحب کو پلیٹ فارم پر دیکھا تھا۔ اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا ”ارے وہ دیکھو۔ جج صاحب تو ادھر پلیٹ فارم پر ہیں۔“

دوسرے نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا پھر کہا تھا ”ہاں۔ مگر یہ تو دوسرے کمپارٹمنٹ میں جا رہے تھے۔ یہاں کیوں اتر گئے ہیں؟؟“

میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ انہوں نے پوری فیملی کے ساتھ سفر ملتوی کیوں کر دیا ہے؟

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر اور گارڈ دو سپاہیوں کے ساتھ آگئے۔ انسپکٹر اپنی سیٹ پر جا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ سپاہی مسافروں کے پاس جا کر کہنے لگے ”جن لوگوں نے کرایہ نہیں دیا ہے‘ وہ کرایہ نکالیں۔ وہ رسید مانگنے اور قانون بگھارنے والا بڈھا اب یہاں نہیں آئے گا۔“

ان کی باتوں سے سمجھ میں آگیا کہ رشوت لینے والوں نے اپنے راستے کا کانٹا صاف کر دیا ہے۔ یہ سوچ کر دل کو صدمہ پہنچ رہا تھا‘ کمپارٹمنٹ ایمان سے خالی ہو گیا تھا۔ لوگ کسی ٹکٹ یا رسید کے بغیر کرایہ ادا کر رہے تھے۔ دو چار مسافروں نے دبی زبان سے سید صاحب کے متعلق پوچھا تو انہیں ڈانٹ کر کہا گیا کہ کرایہ دو یا اگلے کسی بھی چھوٹے اسٹیشن پر اتار دیے جاؤ گے۔

میں اچانک ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری سمجھ میں یہ آگیا تھا کہ میں سچائی لکھتا ہوں لیکن کبھی کبھی حالات کے مطابق سچ کو بھول جاتا ہوں۔ سید صاحب کی بات دل کو لگ رہی تھی کہ میں نے بھی ضرورت کے دباؤ میں آکر رشوت دی ہے جبکہ مجھے ضرورت سے مجبور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں تنہا ہوں۔ میرے ساتھ صرف ایک سفری بیگ ہے۔ میں کسی بس یا کوچ میں سفر کر سکتا ہوں۔

میں نے اپنا بیگ اٹھایا پھر گارڈ کے پاس آکر کہا۔ ”آپ ڈیڑھ سو واپس کریں۔ میں جا رہا ہوں۔“

گارڈ نے مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے سپاہی نے پوچھا ”تم نے کرایہ کب دیا تھا؟؟“

”میں نے دیا تھا۔ گارڈ صاحب کو یاد رکھنا چاہیے۔“

گارڈ ہچکچا رہا تھا۔ سپاہی نے کہا ”تم نے دیا ہو گا مگر واپسی نہیں ہوگی۔ اس ڈبے میں سفر کرنا ہے تو کرو۔ ورنہ یہاں سے جاؤ۔“

بات سمجھ میں آگئی اور یہ تو سب ہی سمجھتے ہیں کہ پولیس کی جیب میں جانے والی رقم کبھی واپس نہیں ملتی۔ اس وقت گاڑی کی رفتار سست ہو رہی تھی۔ آگے ریل کی پٹڑی کی مرمت ہو رہی تھی۔ ٹرین رک گئی۔ میں کمپارٹمنٹ سے اتر گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ریلوے پھاٹک تھا۔ میں نے ادھر جانے سے پہلے دیکھا‘ ایک اور مسافر اتر گیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا ”میری والدہ اسپتال میں ہیں۔ بڑے میاں کی یہ بات دل کو لگ رہی ہے کہ میں ماں کی صحت مندی کے لیے دعائیں مانگ رہا ہوں مگر رشوت بھی دے رہا ہوں۔ کوئی بھی لعنت ساتھ ہو تو دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔“

میں نے کہا "ہم اکثر بے خیالی میں یا عجلت میں اخلاق اور تہذیب کے خلاف کام کرتے ہیں۔ بعد میں احساس ہوتا ہے تو پچھتاتے ہیں یا پھر ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں، سب چلتا ہے۔"

سب نہیں چلنا چاہیے۔ چلنے والے عمل کو چلنا اور رکنے والے عمل کو رکنا چاہیے۔ سچ کو ایک سڑک کی طرح آگے جانا اور جھوٹ کو ایک گڑھے کی طرح ایک ہی جگہ ٹھہر جانا چاہیے۔ جسے گرنا ہو گرے۔ جسے بڑھنا ہو وہ گڑھے سے کترا کر بڑھے۔

ٹرین آہستہ آہستہ پھر چل پڑی۔ ہم نے دیکھا۔ تین عورتیں، دو بچوں کے ساتھ اتر گئی تھیں۔ انہوں نے بھی سفر تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔ ان کے پاس کچھ زیادہ سامان تھا۔ ہم نے پاس آکر ان کا سامان اٹھانے میں مدد کی۔ میں نے کہا "آپ یہاں چھوٹے بچوں کے ساتھ اتر گئی ہیں۔ پتا نہیں ادھر سے بسیں گزرتی ہیں یا نہیں؟"

دوسرے مسافر نے کہا "مجھے پتا ہے۔ یہ ریلوے پھاٹک والی سڑک آگے جا کر ہائی وے سے ملتی ہے۔ ہمیں کوئی بس یا کوچ مل جائے گی۔"

ایک خاتون نے کہا "میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں کہ آگے کیا ہوگا۔ بس ان بزرگ کی باتوں سے خوفِ خدا ہوا اور اپنے عمل میں شرمندگی ہوئی۔ اس لیے ٹرین چھوڑ دی۔"

ان میں ایک نواب شاہ اور دوسری دو خواتین رحیم یار خان جانے والی تھیں۔ ان کا ایمان اور حوصلہ قابلِ تعریف اور قابلِ تقلید تھا کہ ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔ آگے سفر کی سہولت کا کوئی علم نہیں تھا، پھر بھی وہ رشوت دینے اور لینے والوں کا قافلہ چھوڑ آئی تھیں۔

سپاہی کبھی میدان نہیں چھوڑتے۔ ہمیں بھی اچھائی کی خاطر بُروں سے لڑنا چاہیے تھا لیکن ہم نے اس لیے میدان چھوڑا کہ ہم بے ہتھیار سپاہی تھے اور وہ لوگ ناجائز اختیارات کے ہتھیاروں سے لیس تھے۔ گارڈ یا چیکر کو یہ اختیار تھا کہ جسے چاہتے کرائے کی رسید دیتے نہ چاہتے تو نہ دیتے۔ نہ دینے کے اختیار کو پولیس والوں نے مضبوط بنایا۔ ان کا فرض چوروں کو پکڑنا تھا مگر انہوں نے چوروں کی پشت پناہی کی اور احتساب کرنے والے جج کو دودھ کی مکھی سمجھ کر نکال پھینکا۔

انہیں یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ جج بعد میں ان کے خلاف کارروائی کرے گا۔ کرے گا تو ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ گواہیاں دینے والے مسافر اپنی اپنی منزل پر پہنچ کر لاپتا ہو جائیں گے۔

میرے ساتھ کمپارٹمنٹ سے اترنے والے چار مسافر جج کی حمایت میں بولیں گے تو

عدالت میں ہماری گواہیوں کو مؤثر اور قابلِ قبول ہونا چاہیے کیونکہ ہم ایک انصاف کرنے والے کے حق میں بولیں گے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں ہماری عدالتوں میں دھاندلیاں ہوتی ہیں۔ قاتل اور دیگر بدترین مجرم رہا کر دیئے جاتے ہیں لیکن موجودہ کیس ایک دیانت دار جج کا تھا۔ عام آدمی سے انصاف نہ ہوتا ہو لیکن عدالت میں انصاف کرنے والے ایک معزز جج سے تو ناانصافی نہیں ہو سکے گی۔

ریلوے پھاٹک کھولنے اور بند کرنے والا ملازم قریب ہی ایک کچے مکان میں رہتا تھا۔ ہم اس مکان کے سامنے ایک سایہ دار درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ ملازم نے بتایا کہ تھوڑی دیر میں کوئی بس آئے گی۔ ہم اس میں ہائی وے تک جا سکیں گے۔

میں نے اپنے ہم سفر ساتھی اور خواتین سے کہا "سید صاحب جج ہیں، وہ انسپکٹر اور گارڈ کے خلاف ضرور قانونی کارروائی کریں گے۔ ایسے میں ہم چشم دید گواہ ان کے کام آسکتے ہیں۔ کراچی پہنچ کر ان سے رابطہ کرسکتے ہیں۔"

وہ سب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ہم سفر ساتھی نے کہا "میں کتب فروش ہوں۔ لاہور کے اردو بازار میں ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ امی کراچی میں بڑے بھائی کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی بیماری نے مجبور کیا کہ میں ایک ہفتے کے لیے دکان بند کرکے امی کی خدمت کرنے جاؤں۔ میں سید صاحب کے کام آنے کے لیے مزید ایک دو ہفتے قیام کرسکتا ہوں لیکن.........."

وہ ایک ذرا توقف سے بولا "عدالتی معاملات پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ لمبی لمبی پیشیاں بھگتنی پڑتی ہیں۔ وہ ایک محترم جج ہیں۔ اگر ایک دو پیشیوں میں انصاف ہو جائے گا تو اچھی بات ہے۔ ورنہ ہر پیشی میں لاہور سے کراچی آنا محال ہوگا۔"

خاتون نے کہا "میں اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ نواب شاہ میں رہتی ہوں۔ کراچی میں ہمارے ایک عزیز ہیں۔ میں جج صاحب سے تعاون کرنے کے لیے کراچی جا سکتی ہوں لیکن یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقدمہ طویل ہوگا تو کسی عزیز کے ہاں کتنے عرصے تک مہمان بن کر یا بوجھ بن کر رہ سکوں گی۔"

دوسری دو خواتین نے بتایا کہ وہ رحیم یار خان میں رہتی ہیں اور کراچی ان کے لیے قطعی اجنبی شہر ہے۔

اگرچہ ہم سب اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے والوں میں سے تھے اور ہم جائز راستہ اختیار کرنے کے لیے ٹرین سے اتر آئے تھے لیکن اس کے بعد کے حالات ایسے تھے کہ ایک ایماندار اور سچے شخص کے مقدمے میں اس سے تعاون نہیں کرسکتے تھے۔

ہم ایک بس میں سوار ہو کر ہائی وے کے ایک اسٹاپ تک پہنچے۔ وہاں سے دوسری
بس میں اپنی اپنی منزل کی سمت روانہ ہوئے۔ میں مستقل کراچی میں رہتا ہوں۔ اس لیے
طے کر لیا کہ وہاں پہنچ کر سید صاحب سے ملاقات کروں گا اگر وہ اپنے ساتھ ہونے والی
زیادتی کے خلاف قانونی کارروائی کرنا چاہیں گے تو میں ان سے تعاون کروں گا۔

میں دوسرے دن کراچی پہنچا۔ رات کو ٹی وی دیکھنے کے لیے آرام سے صوفے پر
بیٹھا لیکن خبرنامے کے دوران ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر اس ٹرین کے
حادثے کی خبر سنائی جا رہی تھی' جس پر میں سفر کر رہا تھا۔ کہیں بھی کوئی حادثہ پیش آئے تو
سرکاری ذرائع سے زخمیوں اور مرنے والوں کی تعداد بہت کم بتائی جاتی ہے۔ اس خبرنامے
میں بھی تعداد کم بتائی جا رہی تھی لیکن اسکرین پر ٹرین کے حادثے کا جو منظر دکھایا جا رہا
تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ مسافر کافی تعداد میں لقمۂ اجل بن چکے ہیں اور زخمی بے شمار ہوں
گے۔

میں سید صاحب کے ساتھ جس کمپارٹمنٹ میں تھا' وہ ٹرین کی پہلی بوگی تھی اور
اس بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی کہ اس کے اندر شاید ہی کوئی صحیح سلامت رہا ہو۔
موت لازمی ہوئی ہوگی اور جو لوگ بچے ہوں گے وہ زخموں سے چُور ہوں گے۔

دوسرے دن کے اخبارات سے مزید تفصیلات معلوم ہوئیں کہ ٹرین کی پہلی بوگی کو
ہی زیادہ نقصان پہنچا تھا اور اس کے پچیس مسافر مارے گئے تھے اور بے شمار زخمی ہوئے
تھے۔ میں اور میرے ساتھ ٹرین سے اترنے والے وہ چار مسافر اور ان کے بچے گویا موت
کی ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ ہم نے گمراہی کو چھوڑ کر راستی کو اپنایا تو اب اپنے اپنے
گھروں میں زندہ سلامت بیٹھے ہوئے تھے اور جنھوں نے بے ایمانی سے سفر جاری رکھا تھا
وہ مر چکے تھے یا معذور ہو چکے تھے۔

تب مجھے قہقہہ سنائی دیا۔ میں نے خلا میں تکتے ہوئے وہ ہنسی سنی پھر کہا "اچھا تو اجل
نواز! تم ہو؟"

"ہاں' میں ہوں۔ تمہیں مبارک باد دے رہا ہوں کہ بال بال بچ گئے۔"

"خواہ مخواہ مبارک باد دے رہے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو' میری موت کا وقت
نہیں آیا تھا۔ آیا ہوتا تو تم مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔"

"اور انہیں بھی زندہ نہ چھوڑتا' جو تمہارے ساتھ ٹرین سے اتر گئے تھے۔ ایسا تو
کبھی نہیں ہوتا کہ ٹرین کے سفر میں یا زندگی کے سفر میں صرف بے ایمان ہلاک ہوتے
ہوں اور ایماندار کسی حادثے سے نہ مرتے ہوں۔ موت سب کے لیے ہے۔ بے ایمان

کے لیے بھی اور ایماندار کے لیے بھی۔

اگر موت صرف بے ایمان کے لیے ہوتی تو دنیا سے شیطانیت ختم ہو چکی ہوتی اور
یہاں صرف ایمان زندہ رہا کرتا۔ اس لیے موت کا تعلق انسان کے اعمال سے نہیں ہے۔
اب چونکہ ایک جج اور اس کی عدالت کا احوال سنانے جا رہا ہوں تو اس تلخ حقیقت کو یاد
رکھو کہ یہ ارضی دنیا ایک ایسی عدالت ہے' جس میں تمام پیش ہونے والوں کو باری باری
سزائے موت دی جاتی ہے۔ یہاں سزائے موت سے کوئی بچا ہے' نہ کبھی بچے گا۔ پھر نیک
اعمال کا فائدہ کیا ہے؟ جب مرنا ہی ٹھہرا تو جائز اور ناجائز' عیش و عشرت کے ساتھ جی کر
مرا جائے۔ اب یہ اپنے اپنے جینے کے ڈھنگ ہیں۔ کوئی ننگا جئے' کوئی لباسِ تہذیب میں
رہے۔ یہ طے کرے کہ دنیا سے کیسے جائے گا؟ عزت اور وقار سے یا لعنت اور پھٹکار
سے۔ ویسے اب تک یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ

کوئی جیا ہے یہاں ننگِ زندگی بن کر
کسی کو موت عطا کر گئی وقارِ حیات

خاتمہ سب کے لیے ہے اور سب کو یہ سوچنا اور طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ کن راہوں
سے گزر کر اپنے خاتمے تک پہنچیں گے؟ بہرحال اس تمہید کے بعد سنو کہ انصاف کے
تقاضے پورے کرنے والا وہ جج کن خاردار راہوں سے گزر رہا ہے؟"

پھر اجل نواز اس منصف سید آصف جاہ کی رُوداد سنانے لگا۔

☆======☆======☆

سید صاحب کی دیانت داری سے ان کی بیوی بچے بھی بیزار اور نالاں تھے۔ ان کی
محدود تنخواہ میں تنگی سے گزارا کرتے کرتے تنگ آ گئے تھے۔ آسمان سے باتیں کرنے والی
مہنگائی کے اس دور میں ایک سیشن جج کی ماہانہ تنخواہ ساڑھے چار ہزار روپے تھی۔ جس
میں وہ ڈیڑھ ہزار روپے مکان کا کرایہ ادا کرتے تھے۔ باقی تین ہزار راشن' کپڑا' بچوں کی
تعلیم اور دکھ بیماری میں ایسے خرچ ہوتے تھے کہ کسی وقت دال روٹی بھی نصیب نہیں
ہوتی ہے۔ باہر کا کوئی شخص یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ان کے گھر کی چار دیواری میں کبھی
فاقے بھی ہوتے ہیں۔

گریڈ اٹھارہ اور انیس کی تنخواہ میں دو وقت کی روٹیاں اور روزمرہ کی ضروریات
پوری نہیں ہوتیں۔ سید صاحب بھی اسی گریڈ میں تھے۔ وہ چاہتے تو ماہانہ ساڑھے چار ہزار
کی جگہ لاکھوں روپے کما سکتے تھے۔ ان کی عدالت میں جو اردلی کھڑا رہتا تھا' وہ روزانہ ہزار
پانچ سو رشوت کی کمائی لے جاتا ہو گا لیکن وہ رشوت کا نام سن کر لاحول پڑھتے تھے۔

ابتدا میں ان کے پاس نوٹوں سے بھرے ہوئے لفافے آئے۔ انہوں نے لفافوں کو ٹھکرا دیا تو بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں آئیں۔ انہوں نے رشوت دینے والوں کے خلاف قانونی کارروائیوں کی دھمکیاں دیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا لیکن کچھ ایسے سنگین مقدمات ہوتے تھے کہ مجرموں کی رہائی کے لیے اوپر سے احکامات آتے تھے اور وہ جواب میں کہتے تھے "ملازمت چھوڑ دوں گا.......... مگر انصاف نہیں چھوڑوں گا۔"

ہر آنے جانے والی صوبائی حکومت کو ان کی سچائی اور دین داری کی رپورٹ ملتی رہتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں پولیس اور انتظامیہ کی شکایات پہنچتی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود ان کی ملازمت اب تک سلامت تھی۔ انہیں کسی دوسرے شعبے میں ٹرانسفر نہیں کیا گیا تھا لیکن دوسرا طریقۂ کار اختیار کیا جاتا تھا۔ ایسا مقدمہ جس میں حکومتی پارٹی کا کوئی بندہ ملوث ہو یا کسی بڑے بااثر شخص کا معاملہ ہو تو ایسے مقدمات کو سید صاحب کی عدالت میں پہنچنے ہی نہیں دیا جاتا تھا اور اگر کوئی مقدمہ ایسا ہو' جو سید صاحب کے تیور سے سنگین نوعیت کا حامل ہونے والا ہو تو اسے مختلف حیلوں بہانوں سے دوسری عدالت کے جج کے پاس منتقل کر دیا جاتا تھا۔

سید صاحب خود یہ چاہتے تھے کہ ان کی عدالت میں کسی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے مجرم کا مقدمہ نہ آئے لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کسی قتل یا ڈکیتی کا مقدمہ ان کی عدالت میں زیر سماعت رہتا۔ اسی دوران حکومت بدل جاتی۔ پتا چلتا کہ اس مقدمے کا ملزم جو قاتل ثابت ہونے والا ہے' وہ نئی حکومت کا بندہ ہے۔ لہٰذا مقدمے کو کمزور بنا کر اسے رہا کرانا ہے اور یہ سید صاحب کی عدالت میں ممکن نہیں ہے۔ تب انہیں مختلف ذرائع سے دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ انہیں طرح طرح سے سمجھایا منایا بھی جاتا تھا لیکن وہ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر سیاہ کو سفید کہنے پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ آخر اس مقدمے کو کسی طرح دوسری عدالت کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔

وہ برسوں سے انصاف کے تقاضے پورے کرتے آ رہے تھے۔ جب صوبائی حکومت کو' انتظامیہ کو' پولیس اور کمشنر وغیرہ کو' محلے والوں اور رشتے داروں کو یہ مکمل یقین ہو گیا کہ وہ عدالت میں کسی سے رعایت نہیں کرتے ہیں تو انہوں نے انہیں ایک احمق مولوی جج تسلیم کر کے ان سے منہ پھیر لیا۔ ان کے چچازاد بھائی کا بیٹا صفدر ایک واردات میں گرفتار ہوا تھا۔ مقدمہ ان کی عدالت میں آیا تھا۔ تمام رشتے داروں کو یقین تھا کہ چچا کی عدالت میں بھتیجا تمام الزامات سے بری ہو جائے گا لیکن ثبوت اور گواہوں کے ذریعے صفدر مجرم ثابت ہوا۔ سید صاحب نے اسے ایک برس قید مشقت اور پچاس ہزار روپے

جرمانے کی سزا سنا دی۔

دوسرے کام آئیں یا نہ آئیں۔ رشتے دار برے وقت میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور اگر کام نہ آئیں تو پھر رشتے داری کیسی؟ بھینس کا گوبر بھی اپلے تھاپنے اور چولہا جلانے کے کام آتا ہے۔ سید صاحب تو گوبر سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔ تمام رشتے داروں نے ان کے دروازے پر آنا چھوڑ دیا۔ ان کی بیگم صفیہ پوچھتی تھیں "ہم کیسی زندگی گزار رہے ہیں؟ کیا ہماری دکھ بیماری میں کام آنے والا کوئی اس دنیا میں ہے؟"

"اللہ ہے۔"

"کیا جس گھر میں اللہ ہوتا ہے' وہاں مہینے کے آخر میں فاقے ہوتے ہیں؟"

"نہیں صفیہ! ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔"

"یہ آزمائش کیا صرف ہمارے لیے ہے؟ کیا آپ نے حساب کیا ہے کہ ہماری بیٹی صائمہ اٹھائیس برس کی ہو گئی ہے اور آج تک کوئی اس کا رشتہ مانگنے نہیں آیا۔"

"اللہ کو منظور ہو گا تو ہماری صائمہ دلہن بنے گی۔"

"کیسے بنے گی؟ آپ نے تمام رشتے داروں کو دشمن بنا رکھا ہے۔ خاندان میں رشتہ ہونے سے رہا۔ باہر والے جانتے ہیں کہ آپ کی بندھی بندھائی تنخواہ ہے۔ ہمارے بدن کے پرانے سوتی کپڑے اور کباڑیے سے خریدا ہوا فرنیچر بتاتا ہے کہ آپ کی اوپری آمدنی نہیں ہے۔ آپ بیٹی کو جہیز تو کیا دیں گے شاید باراتیوں کو کھلا بھی نہیں سکیں گے۔"

ایسے وقت وہ سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیتے تھے اور دعا مانگتے تھے "یا اللہ! میری جوان بیٹی کی عزت رکھ لے۔ بہت وقت گزر گیا ہے۔ بہت عمر ہو گئی ہے۔ اسے دیکھتا ہوں تو سر جھک جاتا ہے۔ بیٹی اور پہاڑ کو سر اٹھا کر دیکھو تو گردن دکھنے لگتی ہے۔"

بڑا بیٹا کاشف پچیس برس کا تھا۔ وہ اسے اپنی طرح وکیل اور جج بنانا چاہتے تھے لیکن دس جماعتوں سے زیادہ نہ پڑھا سکے۔ آگے تعلیم اتنی مہنگی تھی کہ موجودہ تنخواہ اس کی متحمل نہیں تھی۔ کاشف جاہ نے سوچا' بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنی تعلیم جاری رکھے۔ گلشن' سوسائٹی اور ڈیفنس کے علاقوں میں ایک بچے کو پڑھانے کے ہزار دو ہزار روپے مل جاتے ہیں۔ ایک کوٹھی کے مالک کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک معزز جج سید آصف جاہ کا بیٹا ہے تو اس نے کہا "میرے دو بچوں کو پڑھاؤ۔ ماہانہ تین ہزار روپے دوں گا اور ایک چھوٹا سا کام ہے' وہ اپنے ابو سے کرا دو تو میری ایک مشکل آسان ہو جائے گی۔"

"آپ فرمائیں' کام کیا ہے؟"

"ہمارا باورچی ایک بنگالی ہے۔ ایک بار تھانے والوں نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اس سے

کہہ رہے تھے کہ بنگلہ دیش سے آئے ہو تو پاسپورٹ دکھاؤ اور پاکستانی ہو تو ڈومیسائل پیش کرو۔ میں رشوت دے کر اسے چھڑا لایا تھا لیکن آئندہ وہ پھر کسی تھانے میں پکڑا جائے گا۔ اگر تم اس کا ڈومیسائل فارم پُر کرکے اپنے ابو کے دستخط کرالو تو اس بے چارے کو پاکستانی شہریت مل جائے گی۔ پھر کوئی پولیس والا اسے پریشان نہیں کرے گا۔"

اس نے وعدہ کرلیا کہ یہ کام ہو جائے گا۔ مگر اپنے باپ کے مزاج سے بھی واقف تھا۔ امید نہیں تھی کہ ابو اس چھوٹے سے کام کے لیے راضی ہو جائیں گے۔ اس نے گھر آکر پہلے اپنی ماں سے اس سلسلے میں بات کی پھر ماں بیٹے سید صاحب کے کمرے میں آئے۔ بیگم نے کہا "ایک خوش خبری ہے۔ ہمارے کاشف کو ٹیوشن پڑھانے کے ماہانہ تین ہزار روپے ملا کریں گے۔"

"تین ہزار روپے!" انہوں نے حیرانی سے پوچھا "کتنے بچوں کو پڑھاؤ گے؟"

"صرف دو بچوں کو روزانہ دو گھنٹے پڑھایا کروں گا۔ وہ ڈیفنس میں رہتے ہیں۔"

"ہاں۔ وہ کوٹھی والے اتنی رقم دے سکتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ان بڑے لوگوں نے ہی تعلیم کو مہنگا کر دیا ہے۔ ان بڑے لوگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے چھوٹے علاقوں میں انگلش میڈیم اسکول کھل گئے ہیں۔ جبکہ ان اسکولوں میں پڑھانے والے ٹیچر انگریزی بول نہیں پاتے اور ٹیوشن پڑھانے والے ایک بچے کے پانچ سو روپے مانگتے ہیں۔"

صفیہ بیگم نے کہا "آپ پڑھنے اور پڑھانے والوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں کچھ اور کہنے آئی ہوں۔"

"ضرور کہو۔ مگر یہ سوچو کہ ہم مہنگائی کے باعث کاشف کو دس جماعتوں سے آگے نہ پڑھا سکے اور اب یہی کاشف دو بچوں کے تین ہزار روپے لیا کرے گا۔ تعلیم اتنی مہنگی ہوتی جائے گی تو کیا ہماری آئندہ نسل دو حرف بھی پڑھ سکے گی؟"

"خدا کے لیے آپ اس نسل کے بارے میں سوچیں، جو آپ کے سامنے ہے۔ کاشف کو تین ہزار ملا کریں گے تو ہم ایک آدھ برس میں صائمہ کا پورا جہیز تیار کرلیں گے۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگے۔ ایک چھوٹا بیٹا عارف جاہ تھا۔ اس کے اسکول کے اخراجات بڑی مشکل سے پورے ہوتے تھے۔ واقعی یہ خوش خبری تھی کہ جوان بیٹا کمانے کے لائق ہو گیا تھا۔ تین ہزار روپے کی اضافہ آمدنی سے عارف کی تعلیم بھی جاری رہتی اور صائمہ کا جہیز بھی تیار ہوتا رہتا۔ انہوں نے سر ہلا کر کہا "مجھے خوشی ہو رہی ہے تم میرا دایاں بازو بن گئے ہو۔"

"ابو! آپ کی دعاؤں سے مجھے ٹیوشن پڑھانے کے لیے اور دو چار بچے مل جائیں گے۔ اللہ نے چاہا تو ماہانہ آمدنی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ آ.......... آپ.......... میرا ایک چھوٹا سا کام کر دیں۔"

"ضرور کروں گا بیٹے! بولو کیا چاہتے ہو؟"

"ایک شخص کا ڈومیسائل بنانا ہے۔ تاکہ وہ باقاعدہ پاکستانی شہری کہلائے۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اس کا پیدائشی سرٹیفکیٹ اور فارم پُر کرکے لے آؤ۔ میں دستخط کردوں گا۔"

"اس کا برتھ سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ وہ بنگلہ دیش سے آیا ہے۔ جہاں میں ٹیوشن پڑھانے جاؤں گا۔ وہاں وہ بنگالی باورچی کا کام کرتا ہے۔"

سید صاحب پرانی کرسی سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ سیدھے بیٹھ گئے۔ پھر پوچھا "کیا تم نہیں جانتے کہ یہ بنگالی غیر قانونی طور پر سرحد پار کرکے پاکستان آتے ہیں؟"

"جانتا ہوں مگر اسے یہاں کی شہریت مل جائے گی تو اس کی آمد غیر قانونی نہیں رہے گی۔ اسے پولیس والے پریشان نہیں کریں گے۔"

"تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ بھارتی سرحد پار کرکے آنے والے ایک مجرم کو میں قانونی تحفظ دوں گا۔"

"وہ مجرم نہیں ہے۔ ایک سیدھا سادہ سا بنگالی روزگار کے لیے اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آیا ہے۔ عزت سے حلال کی روزی حاصل کر رہا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ ایک شریف آدمی رزقِ حلال حاصل کرے؟"

"بیٹے! مجھ سے اس کے صرف اس عمل کی بات کرو، جس کا تعلق قانون سے ہے۔ اس کی آمد غیر قانونی ہے۔ میرے دستخط سے اسے کبھی پاکستانی شہریت نہیں ملے گی۔"

صفیہ بیگم نے جل کر کہا "آپ کیسے باپ ہیں؟ بیٹے کی تین ہزار کی آمدنی کو لات مار رہے ہیں؟"

"بیگم! میں سمجھ رہا تھا کہ میرے بیٹے کی تعلیمی قابلیت دیکھ کر بچوں کا ٹیوٹر بنایا جا رہا ہے۔ مگر وہ کوٹھی والا ایک غیر قانونی کام مجھ سے کرانے کے تین ہزار دے رہا ہے۔"

"کچھ بھی ہو۔ آپ کے ایک دستخط سے بیٹے کو ماہانہ تین ہزار ملیں گے۔ ہمارے دلدر دور ہوں گے۔ کیا آپ کو بیٹی پہاڑ نہیں لگتی ہے؟"

"بیٹی کی شادی، بیٹے کا روزگار، چھوٹے بیٹے کی تعلیم، ہماری محتاجی، معاشرے میں

ہماری کمتری اور ایسے کتنے ہی دکھڑے تم روتی رہتی ہو۔ دوسرے لفظوں میں تم اپ
آنسوؤں سے ترغیب دیتی ہو کہ میں اپنی روش بدل دوں۔ مگر کیسے بدلوں؟"

سید صاحب نے ایک ذرا توقف سے کہا "تم سب نے اور عدالت میں ایک دنیا
دیکھا ہے کہ میں آخری فیصلے کے کاغذ پر دستخط کرتے وقت دو انگلیوں سے قلم پکڑتا ہوا
میرا قلم ایک انگوٹھے اور ایک کلمہ کی انگلی کے درمیان ہوتا ہے۔ جب میں نماز
التحیات پڑھنے کے دوران لاالہ الا اللہ کہتے وقت کلمے کی انگلی اپنے رب کی طرف ا
ہوں تو اس انگلی کے سائے میں آنے والے قلم سے کبھی کسی غلط کاغذ پر دستخط نہیں ک
اور نہ ہی مرتے دم تک کروں گا۔"

ماں بیٹے کو چپ سی لگ گئی۔ ان کی خاموشی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ سید صاحب
کی ایمان افروز مدلل گفتگو سے متاثر ہو گئے تھے۔ وہ بھلا کیا متاثر ہوتے؟ برسوں سے ا
کی ایمانداری کے نتیجے میں دکھ بیماریاں جھیلتے آ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بیمار پڑتا تو
اس کا علاج سرکاری اسپتال میں ہوتا تھا۔ وہ بازار کی مہنگی دوائیں نہیں خرید سکتے تھے
اسپتال کا ایک ڈاکٹر ایک بار اسقاطِ حمل کرانے کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور سید صاحب
اسے سزا سنانے میں کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ تب سے ڈاکٹروں نے سمجھ لیا تھا کہ آ
بھی کسی ڈاکٹر سے کوئی غلطی ہوگی تو جج صاحب سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا اس
وہ یا ان کی بیوی بچے کبھی علاج کے لیے اسپتال جاتے تو ڈاکٹر بڑی بے رخی سے پیش آ
تھے۔ اسپتال کی سستی دواؤں کے علاوہ بازار کی مہنگی دوائیں ضرور لکھ دیتے تھے۔ ا
سید صاحب کو اپنے اسپتال کی عدالت میں سزائیں دیتے تھے۔

صفیہ بیگم اپنے میاں کا صاف اور کھرا جواب سن کر روتی ہوئی چلی گئیں۔ کاشف
کے کلیجے پر گھونسے لگ رہے تھے۔ کیونکہ باپ ماہانہ تین ہزار روپے کی آمدنی کو خاک
ملا رہا تھا۔ وہ کیسا دشمن باپ تھا کہ بیٹے کو روزگار سے لگتے اور بیٹی کو سہاگ، کی مہن
رچاتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور ان کی ماں کو برسوں سے خون کے آنسو رلا رہا تھا۔

وہ جوان بیٹا' باپ سے نفرت محسوس کرتا تھا لیکن نفرت کے اظہار کو گستاخی سمجھ
خاموش رہتا تھا۔ صفیہ بیگم کو اپنے شوہر پر بہت غصہ آتا تھا۔ ایسے وقت محسوس ہوتا
کہ شوہر پر نہیں ایمان اور سچائی پر غصہ آ رہا ہے اور دیانت داری ان سب کے سروں
ایک بھاری پتھر کی طرح رکھی ہوئی ہے۔

اکثر لڑکیاں اپنے باپ کو آئیڈیل بناتی ہیں۔ اپنے عاشقوں یا شوہروں میں باپ
جھلک دیکھتی ہیں لیکن صائمہ دعائیں مانگتی تھی کہ اسے باپ جیسا دیانت دار شوہر نہ

اور اگر ایسا ہی ملنا ہے تو وہ دولہا بن کر آنے سے پہلے مر جائے۔ جب شوہر بھی ایسا ہی ہوگا
تو باپ کا گھر کیا برا ہے؟

فی زمانہ نیک نامی کی کسوٹی بدل گئی ہے۔ کوئی سچ بول کر اور پورا تول کر نیک نام
نہیں رہ سکتا۔ بلکہ وہ اپنے دشمنوں کی تعداد بڑھا لیتا ہے۔ گھر کی چاردیواری کے اندر
سید صاحب کے محبت اور خون کے رشتے ان سے اندر ہی اندر متنفر تھے یا پھر ان سے
بیزار تھے۔ باہر وہ تمام لوگ ان کے دشمن تھے' جن کے خلاف وہ مقدمات کے فیصلے سناتے
رہے تھے۔ جس علاقے میں ان کی رہائش تھی وہاں بڑے بڑے سیاست داں اور بڑے
بااثر افراد بھی رہتے تھے لیکن کبھی کسی سے پوچھتے بھی نہیں تھے کہ سیّد صاحب کس حال
میں ہیں۔ وہ لوگ ہنستے ہوئے کہتے تھے "سیاست داں کے لیے ایک ایک ووٹ قیمتی ہوتا
ہے لیکن الیکشن جیتنے کے لیے سید آصف جاہ کا ووٹ کبھی حاصل نہیں کرنا چاہیے۔ ان
کے ووٹ میں بھی ایمانداری کے جراثیم ہوں گے۔ یوں سیاست کو ایمان کی بیماری لگ
جائے گی۔"

وہ سیّد آصف جاہ عجیب آزاد مرد تھا۔ اپنے حال میں مست رہتا تھا۔ شراب کا نشہ
شام کو چڑھتا ہے۔ صبح اتر جاتا ہے لیکن ان کے سر سے ایمان کا نشہ کبھی اترتا ہی نہیں
تھا۔ یہ نشہ اس وقت دوگنا ہو جاتا تھا جب بااثر افراد کے ہاتھوں لٹے ہوئے مظلوم انصاف
پاتے تھے۔ انہیں سلام کرنے ان کے دروازے پر آتے تھے اور انہیں اللہ والا سمجھتے
تھے۔

ایسا ہی ایک جوان اپنی ماں کے ساتھ ان کے دروازے پر آیا۔ انہوں نے دستک
سن کر دروازہ کھولا۔ جوان انہیں دیکھتے ہی قدموں میں جھک گیا۔ انہوں نے اسے قدموں
سے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "میاں صاحب زادے! اتنی عقیدت کس لیے ہے؟ تم کون
ہو؟"

"جناب عالی! میرا نام محمد قاسم ہے۔ آپ نے رمضان گوٹھ کی زمینوں کے سلسلے
میں مجھے میرا حق دلایا تھا۔ میرا بڑا بھائی قائم علی مجھے پاگل ثابت کرکے پاگل خانے بھیجنا
چاہتا تھا اور میرے حصے کی زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔"

"ہاں یاد آیا۔ میں نے فیصلہ سنایا تھا کہ تم پاگل نہیں ہو۔ تم ایک نارمل اور سمجھ دار
جوان ہو۔"

قاسم علی کی ماں نے کہا "جج صاحب! ہم آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔"
"اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ میں نے آپ کے بیٹے کی تمام میڈیکل رپورٹس

پڑھنے کے بعد مطمئن ہو کر انصاف کا تقاضا پورا کیا ہے۔ بہن‘ آپ اندر تشریف لائیں۔
وہ انہیں اس کمرے میں لے آئے جہاں کباڑئے سے خریدا ہوا پرانا فرنیچر تھا۔ انہوں نے صفیہ بیگم سے قاسم علی کی ماں کا تعارف کرایا۔ قاسم علی کی ماں نے کہا ”ج صاحب! میں نے سنا ہے کہ آپ کسی سے کچھ نہیں لیتے بلکہ دوسروں کو دیتے ہیں۔ میں بھی ایک ضرورت سے مجبور ہو کر کچھ مانگنے آئی ہوں۔“

”میں بھلا آپ کو کیا دے سکتا ہوں؟ میری اوقات ہی کیا ہے؟ پھر بھی آپ کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔“

خاتون نے کہا ”میں آپ کی بیٹی صائمہ کا رشتہ اپنے قاسم کے لیے مانگنے آئی ہوں۔“

صفیہ بیگم اور سید صاحب نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ کسی گہری یا معمولی واقفیت کے بغیر ہی رشتہ مانگنے آئے تھے۔ خاتون نے کہا ”آپ ہمارے بارے کچھ نہ جاننے کے باوجود اتنا جانتے ہیں کہ میرا بیٹا قاسم ایک نارمل اور شریف نوجوان ہے۔ آپ کے عدالتی فیصلے نے اس کی شرافت اور نیک نامی کی تصدیق کی ہے۔“

صفیہ بیگم نے کہا ”آپ درست فرماتی ہیں لیکن آپ نے ہماری بیٹی کو دیکھا نہیں ہے کچھ دیکھے سنے بغیر اسے بہو بنانا چاہتی ہیں؟“

”بہن! باپ کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد پھر اور کیا دیکھنے اور سمجھنے کو رہ جاتا ہے۔ آپ کی صاحب زادی نے سید صاحب جیسے نیک اور صالح منصف کے سائے میں پرورش پائی ہے۔ وہ جیسی بھی ہوگی‘ میرے بیٹے کے لیے بہترین شریکِ حیات ثابت ہوگی۔ اگر آپ اجازت دیں گی تو صاحب زادی کو ابھی ایک نظر دیکھ لوں گی۔ اس سے تھوڑی گفتگو کرلوں گی۔“

سید صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ خاتون نے کہا ”میں چاہوں گی کہ آپ پہلے رمضان گوٹھ آکر ہمارے متعلق معلومات حاصل کرلیں جب اطمینان ہو جائے تو میری مراد پوری کردیں۔“

سید صاحب اور صفیہ بیگم نے دوسرے کمرے میں آکر مشورہ کیا۔ ان کے لیے خوشی کی بات تھی کہ جب سے رشتے داروں نے ان کا بائیکاٹ کیا تھا‘ تب سے پہلی بار کوئی ان کی بیٹی کو مانگنے آیا تھا۔ سید صاحب نے کہا ”لڑکا تو اچھا ہے لیکن ہماری بیٹی کی عمر اس سے کچھ زیادہ ہوگی۔“

صفیہ بیگم نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا ”آپ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں آپ انہیں صائمہ کی عمر نہ بتائیں بلکہ آپ عمر کا کوئی ذکر ہی نہ کریں۔“

”لیکن لڑکے والے پوچھتے ہیں پھر نکاح نامے میں دلہن کی بھی عمر لکھی جاتی ہے۔ ...تم جانتی ہو‘ نہ میں جھوٹ بولتا ہوں نہ جھوٹ لکھتا ہوں۔“

صفیہ بیگم کا سر چکرانے لگا۔ یااللہ! مجھے بے ایمانوں کی دنیا میں پیدا کیا ہے تو ایمان والا شوہر کیوں دیا ہے۔ یااللہ! میری بیٹی کی قسمت پھوٹنے نہ دے۔ اس کے دلہن بن کر ...نے تک سید صاحب کو گونگا بہرا اور ہاتھوں سے اپاہج بنا دے تاکہ یہ سچ لکھ سکیں‘ نہ بول ...یں اور نہ سن سکیں۔ کوئی محبت اور وفا کرنے والی بیوی اپنے شوہر کے لیے ایسا سوچتی ...ی نہیں ہوگی۔ مگر میں کیا کروں؟ انہیں کیسے سمجھاؤں کہ ایک بار صرف ایک بار مصلحتاً ...وٹ بول دیں۔

وہ بولیں ”آپ میری ایک بات مان لیں۔ بیٹی کے معاملے سے آپ الگ رہیں۔ ...ی کے رشتے کی بات میں کروں گی۔ شادی کے سارے معاملات میں طے کروں گی۔ جب ...ی لڑکے والے آئیں گے‘ آپ گھر سے باہر چلے جایا کریں گے۔“

”تم مجھے یہ درس دے رہی ہو کہ میں اپنے گھر میں ایک جھوٹ کو جاری رکھنے کے ...یے چشم پوشی کروں۔“

صفیہ بیگم رو پڑیں۔ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئیں‘ پاؤں پٹختی ہوئی دوسرے کمرے ...ما آئیں پھر قاسم کی ماں سے کہا۔

”آپ کس گھر میں رشتہ مانگنے آئی ہیں؟ آپ کو پتا ہے کہ ہماری بیٹی اٹھائیس برس ...کی ہو چکی ہے۔ وہ بوڑھی ہو رہی ہے اور آپ کا بیٹا کم عمر لگ رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ ...ہمارے ہاں کبھی کبھی فاقے بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے بدن پر یہ پرانے سوتی لباس ہوتے ...ہیں۔ ہم جیسے لوگ بیٹی کو جہیز تو کیا چار جوڑے کپڑے بھی نہیں دے سکتے۔“

وہ روتے روتے کہہ رہی تھیں اور یہ سب کچھ کہتے وقت آنچل سے اپنا منہ چھپا لیا ...تھا۔ خود اپنی کمتری ظاہر کرتے ہوئے اور اپنی بیٹی کا بھاؤ گراتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ وہ ...ماں بیٹے خاموشی سے مگر ہمدردی سے اس رونے والی کو تکتے رہے۔ پھر خاتون نے کہا ”بہن! ہمیں جج صاحب کی دیانت داری کا اچھی طرح علم ہے۔ ہمیں پتا ہے کہ ایک ...دیانتدار شخص کا گھر ایسے ہی ٹوٹے پھوٹے سامانوں سے کھنڈر بنا رہتا ہے اور ایسے گھر سے ...جہیز نہیں ملے گا۔“

قاسم نے کہا ”آنٹی! آپ آنسو پونچھ لیں۔ آپ کی سچ بیانی نے ہمیں اور بھی ...سید صاحب کا شیدائی بنا دیا ہے اور یہ درست نہیں ہے کہ میں کم عمر ہوں۔ بیماری سے ...اٹھا ہوں اس لیے ایسا لگ رہا ہے۔ میں اپنا برتھ سرٹیفکیٹ پیش کروں گا۔ آپ دیکھیں گی

کہ اس کے مطابق میں اٹھائیس برس چار ماہ کا ہو چکا ہوں۔"

صفیہ بیگم نے منہ پر سے آنچل ہٹا کر قاسم کو دیکھا۔ سید صاحب دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا "دیکھا بیگم! اللہ تعالیٰ سچائی کا انعام دیتا ہے۔ ہماری دنیا میں سچ کی قدر کرنے والے موجود ہیں۔"

صفیہ بیگم آنسو پونچھ کر قاسم کی ماں کو اس کمرے میں لے گئیں جہاں صائمہ کپڑے سی رہی تھی۔ وہ خاتون تو صرف سید صاحب کا کردار دیکھ کر صائمہ کو دیکھے بغیر رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ اسے دیکھ کر خوش ہوئیں پھر صفیہ اور سید صاحب کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر چلی گئیں۔

دوسرے دن ان کا ڈرائیور گاڑی لے کر آیا پھر صفیہ اور سید صاحب کو ان کی گوٹھ لے گیا۔ یوں ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے کا سلسلہ رہا پھر صائمہ اور قاسم کا رشتہ طے ہو گیا۔

ایک ہفتے بعد سید صاحب کا چچازاد بھائی نادر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ آیا۔ سید صاحب نے کہا "میں عرصے کے بعد اپنے بھائی اور بھاوج کو دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں اور حیران بھی ہوں۔"

نادر نے کہا "رشتے داروں میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جو ہو چکا اسے ہم بھلانے آئے ہیں۔ آپ نے میرے بیٹے کو ایک سال قید بامشقت کی سزا دی تھی۔ وہ سزا پوری کرکے آگیا ہے۔"

صفیہ بیگم نے کہا۔ "ہمیں خوشی ہے کہ اسے رہائی مل گئی ہے۔ آپ ان کے ... ہیں۔ ان کی انصاف پروری کو ایک زمانے سے جانتے ہیں۔ پھر بھی پورا خاندان ہم سے ناراض رہا ہے۔"

بیگم نادر نے کہا۔ "میرے بیٹے سے پہلے سید بھائی نے اپنی بہن کو ناراض کیا۔ ان کی ایک سفارش سے بہن کے بیٹے کو ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا تھا لیکن......"

سید صاحب نے کہا۔ "میں پہلے بھی کہتا تھا اب بھی کہتا ہوں۔ میرے بھانجے کے مارکس بہت کم تھے اور جن طلباء کے مارکس زیادہ تھے میں ان کی حق تلفی کرنے کے ... ایک نااہل لڑکے کی سفارش نہیں کر سکتا تھا۔ خواہ وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہوتا۔"

نادر نے کہا۔ "چلیں پچھلی باتوں کو رہنے دیں۔ ابھی ہم یہ کہنے آئے ہیں کہ ہمارے بیٹے صفدر کی رہائی کے بعد اس کی سوسائٹی میں وہ پہلی جیسی عزت نہیں رہی ہے۔ اس پر کوئی اعتماد نہیں کرتا جہاں وہ ملازمت کرتا تھا وہاں سے اسے نکال دیا گیا ہے۔ اس ...

اور کیریکٹر سرٹیفکیٹ کے ساتھ ایک سزا کاٹنے والے مجرم کا داغ اس پر لگ چکا ہے۔ یہ داغ کیسے دھلے گا؟"

"یہ ہر شخص کو جرم کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے۔ آپ صفدر کو سمجھائیں کہ وہ اپنی اصلاح کرے۔ اچھی صحبت اختیار کرے۔ اچھی سوسائٹی اختیار کرکے پولیس کو بھی یقین دلائے کہ اب وہ سدھر گیا ہے۔ ورنہ تمہارے علاقے میں واردات ہوا کرے گی تو شبہ میں اسے پکڑا جاتا رہے گا۔"

"بھائی جان! یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے۔ نہ آپ اسے سزا دیتے نہ وہ معاشرے میں مجرم سمجھا جاتا۔ یہ داغ آپ نے لگایا ہے۔ آپ ہی اسے دھو سکتے ہیں۔"

"میں اس کی بھلائی کے لیے کچھ کر سکتا ہوں تو ضرور کروں گا۔ بولو' کیا چاہتے ہو؟"

"جیل جانے سے پہلے ایک بڑے دولت مند گھرانے میں اس کا رشتہ ہوا تھا۔ ان کی لڑکی سے شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھی لیکن آپ کے فیصلے کے بعد اس کے مجرم ثابت ہوتے ہی انہوں نے رشتہ توڑ دیا۔"

"اگر وہ اپنا چال چلن درست رکھے تو میں لڑکی والوں کے پاس جاؤں گا اور اس کی نیک چلنی کی ضمانت دوں گا۔"

"اس کا وقت گزر چکا ہے بھائی جان! انہوں نے لڑکی کی شادی کہیں اور کر دی ہے۔"

"یہ مکافاتِ عمل ہے نادر! ایسے سمجھو کہ کسی مجرم کو صرف عدالت سے ہی نہیں' معاشرے سے بھی سزا ملتی ہے۔ اسے اپنے دامن پر لگے ہوئے دھبے کو دھونے میں بڑا وقت لگتا ہے۔"

"آپ اسے گلے لگا کر یہ داغ دھو سکتے ہیں۔ جب ایک سزا دینے والا جج مجرم کو اپنائے گا تو پھر دنیا والے بھی اسے عزت دیں گے۔"

"بے شک' وہ میرا بھتیجا ہے۔ میرا اپنا ہے۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔"

"صرف جاننے سے نہیں ہوگا۔ ہم صائمہ کو مانگنے آئے ہیں۔ آپ ہمارے صفدر کو بیٹا بنائیں گے' اسے داماد بنائیں گے تو پھر دنیا ایک جج کے داماد کو کبھی مجرم نہیں کہے گی۔"

وہ اپنے طور پر بڑی معقول بات کہہ رہے تھے۔ صفیہ بیگم نے کہا۔ "اچھا تو اب معلوم ہوا کہ برسوں بعد ہمارا خیال کیوں آیا ہے۔ ہماری دکھ بیماریوں میں کسی نے جھوٹے منہ نہیں پوچھا۔ اب اپنے گھر کا میل دھونے کے لیے ہمارے گھر سے صابن مانگنے آئے ہیں۔"

نادر نے کہا "صرف مانگنے نہیں آئے ہیں۔ یہ پوری برادری کا فیصلہ ہے کہ
جان نے جو داغ صفدر پر لگایا ہے اسے یہ خود ہی دھوئیں گے ورنہ پوری برادری
محاسبہ کرے گی۔"

سید صاحب نے پوچھا۔ "کیا محاسبہ کرے گی؟ ہماری روزی چھین لے گی۔
زندگی چھین لے گی۔ برسوں سے کسی نے پلٹ کر نہیں پوچھا۔ عید بقر عید پر میرے
بیٹے جس کے ہاں جاتے تھے' دروازے سے لوٹا دیئے جاتے تھے۔ میں پوری برادری
بزرگ سمجھا جاتا ہوں۔ کوئی مجھ سے ملنے نہیں آتا تھا۔ کہاں ہے میرا خاندان؟
برادری کہتے ہیں؟ تم میں سے کس کی اتنی مجال ہے کہ کوئی یہاں میرا محاسبہ کرنے آئے

نادر اپنی بیگم کے ساتھ چپ بیٹھا رہا۔ ہونٹوں کو بھینچ کر دانت پیستا رہا۔ سید صا
نے کہا۔ "تمہاری اور پوری برادری کی اطلاع کے لیے یہ بتادوں کہ رمضان گوٹھ
ایک زمیندار لڑکے سے صائمہ کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔"

نادر نے ناگواری سے کہا۔ "وہ کسی گوٹھ کا زمیندار ہے۔ اس کا مطلب ہے آ
کسی سندھی سے اپنی بیٹی کی شادی کر رہے ہیں؟"

"میری عدالت میں سندھی اور مہاجر دونوں ہی آتے ہیں اور میں دونوں کے سا
انصاف کرتا ہوں۔ وہ سندھی جوان بھی ایک ملزم کی حیثیت سے میری عدالت میں آیا
لیکن وہ بے قصور تھا۔ مجرم ثابت نہ ہو سکا اور تمہارا بیٹا مجرم ثابت ہو گیا۔ اگر تمہار
دل کے کسی گوشے میں انصاف ہے تو بولو مجھے کسے داماد بنانا چاہیے؟"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم چور بدمعاش ہوتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ سندھیوں میں بھی ڈاکو اور قاتل ہو
ہیں۔ ہر قوم میں گھوڑے ہوتے ہیں تو گدھے بھی ہوتے ہیں۔ انسان بھی ہوتے ہیں ا
شیطان بھی۔ اگر تم تعصب کی زبان سے مجھے طعنہ دے رہے ہو کہ میں مہاجروں کو چو
بدمعاش کہہ رہا ہوں تو پھر میں بھی مہاجر ہوں۔ مجھ جیسے انصاف پرور جج کے متعلق تمہارا
کیا خیال ہے؟"

وہ میاں بیوی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ بیگم نادر نے کہا۔ "آپ نے میرے بیٹے کی
زندگی برباد کی ہے۔ اللہ نے چاہا تو آپ کے بیٹے بھی برباد ہوں گے۔ یہ ایک دل جلی ما
کی بددعا ہے۔"

نادر نے کہا۔ "بیگم! بددعا سے دشمنوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دی
پڑتا ہے۔ چلو یہاں سے۔ میں دیکھوں گا کہ یہ اپنی بیٹی کو دلہن کیسے بنائیں گے۔"

وہ اپنی بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ صفیہ بیگم نے پریشان ہو کر
کہا۔ "یہ بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت آگئی ہے۔ ان لوگوں نے سارے رشتے توڑ دیئے تھے۔
اب خواہ مخواہ پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

سید صاحب نے کہا۔ "میں جن کے خلاف فیصلے سناتا ہوں' ان کی طرف سے بڑی
دھمکیاں ملتی ہیں۔ ایک دھمکی اپنے رشتے داروں کی سہی۔ فکر نہ کرو۔ اللہ بڑا کارساز
ہے۔"

دوسرے دن خاندان کے دوسرے بزرگوں نے کچہری میں سید صاحب سے ملاقات
کی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "بھائی صاحب! ہم نے نادر کو آپ کے گھر بھیجا تھا۔ اسے
یہ نہیں کہا تھا کہ آپ سے کوئی بدتمیزی کرے اور دشمنوں کی طرح چیلنج کرے۔"

دوسرے نے کہا۔ "صائمہ بیٹی کی شادی طے ہوگئی ہے۔ اب نادر یا کوئی بھی کسی
طرح کی رکاوٹ پیدا کرے گا اور یہ شادی نہیں ہو سکے گی تو صرف آپ کی نہیں پورے
خاندان کی بدنامی ہوگی۔"

ایک اور عزیز نے کہا۔ "ہم نے نادر کو بڑی باتیں سنائی ہیں۔ وہ کل کے رویے پر
شرمندہ ہے۔ ہم نے اسے سمجھایا ہے کہ اگر صفدر یہاں ایک سزا یافتہ مجرم کہلا رہا ہے تو
کوئی بات نہیں' وہ لاہور چلا جائے۔ وہاں اسے کوئی نہیں جانتا ہے۔ وہ کہیں ملازمت
حاصل کرکے وہاں نئے سرے سے زندگی گزار سکتا ہے۔"

سید صاحب نے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ آپ لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا
ہے۔ آپ نے صفدر کو بھی مناسب مشورہ دیا ہے۔ وہ لاہور جا کر نئے سرے سے ایک
اچھے شہری کی حیثیت سے زندگی گزار سکتا ہے۔"

دل کی کدورتیں مٹنے لگیں۔ وہ سب سید صاحب سے گلے ملنے لگے۔ جب وہ شام
کو گھر پہنچے تو صفیہ بیگم نے بتایا کہ آج اپنے خاندان کی تین خواتین آئی تھیں۔ ان میں
سید صاحب کی ہمشیرہ بھی تھیں۔ جن کے بیٹے کے لیے انہوں نے میڈیکل کالج میں داخلے
کی سفارش نہیں کی تھی۔ وہاں بھی ان خواتین نے نادر اور بیگم نادر کے رویے کی مذمت کی
اور پرانی کشیدگی اور ناراضیاں دور کرنے کا مثبت راستہ اختیار کیا۔

یوں رشتے داریاں پھر سے بحال ہوگئیں۔ ایک ہفتہ بعد ہی صفدر روزگار کے سلسلے
میں لاہور چلا گیا۔ ادھر صائمہ کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تمام رشتے داروں نے مل
کر یہ طے کیا کہ ہر عزیز اپنی طرف سے شادی کے تحفے کے طور پر الماری' فرنیچر اور دیگر
گھریلو ضروریات کا سامان دے گا تو اس طرح صائمہ کو جہیز کی صورت میں بہت کچھ مل

جائے گا۔

اگرچہ جج صاحب جہیز کے خلاف تھے لیکن انہیں سمجھایا گیا کہ یہ سب رشتے داروں کی طرف سے تحائف ہوں گے۔ لڑکے والے اسے جہیز سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں۔ سید صاحب رشتے داروں کو تحائف دینے سے منع نہیں کرسکتے تھے اس لیے زیادہ اعتراض نہ کرسکے۔ مدتوں بعد سارا خاندان یکجا ہوا تھا۔ وہ اس محبت اور ماحول کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ پھر وہ اپنے سر سے ایک پہاڑ اترتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے رشتے داروں کو من مانی کی اجازت دے دی۔

جس گھر میں ہمیشہ اداسی' ویرانی اور مایوسی چھائی رہتی تھی وہاں ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت گونجنے لگے۔ سید صاحب کے ہاں دن رات چہل پہل رہنے لگی۔ ایک دن لڑکے والوں کے ہاں سے مہندی آئی۔ دوسری رات لڑکی والے مہندی لے گئے۔ لڑکے والوں کے ہاں عورتوں کے ساتھ مردوں کو بھی کھانے کی دعوت تھی۔ سید صاحب بھی گئے تھے۔ گھر میں صائمہ' چھوٹا بھائی عارف اور ایک بوڑھی خاتون رہ گئی تھیں۔

دشمنوں کو ایسے ہی وقت کا انتظار تھا۔ جب وہ لوگ مہندی کی رسم ادا کرکے واپس آئے تو گھر میں صائمہ نہیں تھی۔ چھوٹا بھائی عارف اور بوڑھی عورت کو بے ہوش پایا گیا۔ انہیں ہوش میں لایا گیا۔ ان سے سوالات کیے گئے۔ عارف نے بتایا کچھ لوگ اچانک گھر میں گھس آئے تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ ان کی ناک پر کپڑا رکھ دیا گیا تھا جس کے نتیجے میں وہ بے ہوش ہوگئے تھے۔ وہ صائمہ کے متعلق کچھ نہ بتا سکے۔

صفیہ بیگم چھاتی پیٹ کر رونے لگیں۔ سید صاحب کے بھی پیروں تلے سے زمین نکل رہی تھی۔ ان کا سر چکرا رہا تھا۔ انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "مجھے فوراً تھانے جاکر اغوا کی رپورٹ درج کرانا چاہیے۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "ایسی حماقت نہ کرو۔ یہ بات لڑکے والوں تک پہنچے گی۔ پہلے خاموشی سے صائمہ کو تلاش کرنا چاہیے.......... کیونکہ اگر یہ بات پولیس سے اخبارات تک پہنچے گی تو ساری دنیا میں رسوائی ہوگی۔"

سید صاحب نے نادر کو گھور کر دیکھا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ کیا مجھ پر یا میرے بیٹے پر شبہ ہے؟"

وہ سرد لہجے میں بولے۔ "ہماری دنیا میں ایمان والے احمق سمجھے جاتے ہیں۔ مجھے احمق نہ سمجھو۔ صفدر کہاں ہے؟"

"وہ لاہور میں ہے۔ آپ اپنے طور پر انکوائری کرا سکتے ہیں۔"

وہ گھر سے باہر آئے۔ ان کے ساتھ کچھ رشتے دار دائیں بائیں اور پیچھے چلتے ہوئے سمجھانے لگے۔ "جلدبازی سے کام نہ لیں۔ اپنوں پر شبہ نہ کریں۔ ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے بیٹی بدنام ہو جائے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے اور لڑکے والے رشتے سے انکار کردیں۔"

انہوں نے کہا "میں عدالت کی ایک معتبر کرسی پر بیٹھتا ہوں۔ تم سب سے زیادہ جانتا ہوں کہ ایسے وقت قانونی کارروائی لازمی ہوتی ہے۔ ایک بیٹی کی بدنامی کا خوف کیا جائے تو سینکڑوں مجرموں کو ایسی واردات کے لیے شہ ملتی ہے۔"

وہ تھانے پہنچ گئے۔ تھانہ انچارج نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ سید صاحب نے اپنا تفصیلی بیان لکھ کر دیا۔ پھر نادر سے پوچھا۔ "تمہارا بیٹا صفدر لاہور میں کہاں رہتا ہے اور کیا کام کرتا ہے اس کا پتا اور فون نمبر بتاؤ۔"

نادر نے اس کا پتا اور فون نمبر لکھ کر دیا۔ سید صاحب نے انچارج سے کہا۔ "اگرچہ میرا بھتیجا ہے لیکن مجھے اس پر شبہ ہے۔ آپ لاہور کے مغل پورہ کے تھانہ انچارج سے رابطہ کریں' اس کے ذریعے تصدیق کریں کہ صفدر نامی جوان وہاں موجود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اسے تھانے بلا کر مجھ سے فون پر بات کرائیے۔ میں اس کی آواز سننا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک معزز جج تھا۔ اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ ایک گھنٹے کے اندر ادھر سے جواب ملا۔ "صفدر نامی بندہ یہاں موجود ہے۔ جج صاحب اس سے بات کریں۔"

سید صاحب نے ریسیور کان سے لگایا۔ پھر کہا۔ "ہاں میں بول رہا ہوں۔ صفدر سے بات کراؤ۔"

چند لمحوں کے بعد صفدر کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو بڑے ابو! میں صفدر بول رہا ہوں۔ آپ نے مجھے تھانے بلوایا ہے۔ بات کیا ہے؟"

سید صاحب نے کہا۔ "تمہاری آواز کچھ بھاری سی ہے۔ کچھ بدلی ہوئی ہے۔"

"جی ہاں' آپ جانتے ہیں' لاہور میں کیسی غضب کی سردی پڑتی ہے۔ ہم کراچی والوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ مجھے کل سے نزلہ ہے' کھانسی بھی تھی لیکن علاج سے کم ہوگئی ہے۔ شاید نزلے کے باعث میری آواز بدلی ہوئی سی لگ رہی ہے۔ ایسے آپ نے مجھے کیوں یاد کیا ہے؟ کیا میرے ابو وغیرہ خیریت سے ہیں؟"

"ہاں ابھی تک تو خیریت سے ہیں۔ ریسیور انسپکٹر کو دو۔"

پھر انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔ سید صاحب نے کہا۔ "یہ صفدر جو ابھی گفتگو کر رہا تھا۔ اس سے اس کی تصویر طلب کرو اور اس کا بائیو ڈیٹا خود اس کے ہاتھ سے لکھواؤ۔ اس کی

تحریر اور تصویر بھی فیکس کے ذریعے بھیجو اور میرے اگلے حکم تک اسے زیرِ حراست رکھو۔"

ان کی باتیں سن کر نادر پریشان ہو رہا تھا۔ بزرگ رشتے داروں سے کہہ رہا تھا "بھائی جان خواہ مخواہ میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ آپ لوگ انہیں سمجھائیں، وہاں میرے بیٹے کو حراست میں رکھا جا رہا ہے۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "سیّد بھائی، آپ اپنے اطمینان کے لیے بے شک کارروائی کریں لیکن اپنوں پر شبہ ظاہر کرتے رہیں گے تو اصل مجرموں کو دور نکلنے کا موقع ملتا رہے گا۔ پولیس کارروائی لاہور میں نہیں، یہاں ہونی چاہیے۔"

اس وقت انسپکٹر پولیس کی موبائل پارٹیوں سے رابطے کر رہا تھا اور سیّد صاحب کا حوالہ دے کر کہہ رہا تھا کہ ہر راستے اور گلی کوچے سے گزرنے والی مشتبہ گاڑیوں کو چیک کیا جائے۔

سیّد صاحب نے دوسرے فون کے ذریعے پولیس کے اعلیٰ افسر کو مخاطب کیا اور اپنی بیٹی کے اغوا کے متعلق بتایا۔ اعلیٰ افسر نے کہا۔ "سیّد صاحب! یاد کریں۔ آپ نے ہماری کیسی کیسی پیشکش ٹھکرائی تھی اور ہمارے کئی بندوں کو جیل پہنچا کر انصاف کا پلڑا بھاری رکھا تھا۔"

انہوں نے کہا۔ "مجھے سب یاد ہے۔ میں نے ان دنوں بھی قانونی تقاضے پورے کیے تھے۔ آج آپ سے بھی یہی چاہتا ہوں۔ کیا آپ اپنا فرض ادا کریں گے؟"

"سیّد صاحب! ایک طویل انتظار کے بعد مجھے آپ سے انتقام لینے کا موقع ملا ہے لیکن افسوس، معاملہ ایک جوان بیٹی کا ہے اور میری ایک نہیں تین جوان بیٹیاں ہیں۔ میں صرف پولیس والا ہی نہیں ایک باپ بھی ہوں۔ ابھی میرے ایک ہاتھ میں ریسیور ہے اور میں دوسرے ہاتھ سے کان پکڑ کر خوفِ خدا سے کہہ رہا ہوں۔ آپ کی نہیں، میری بیٹی اغوا کی گئی ہے۔ میں ابھی پورے شہر میں گشتی ٹیموں کا جال پھیلا دوں گا۔ ہماری بیٹی چند گھنٹوں میں بازیاب ہوگی۔ آپ میرے اگلے فون کا انتظار کریں۔"

تھانے میں فیکس مشین نہیں تھی۔ اگلے ایک گھنٹے کے اندر مغل پورہ سے کراچی پولیس ہیڈکوارٹر میں فیکس کے ذریعے مطلوبہ تحریر اور تصویر بھیجی گئی۔ ہیڈکوارٹر سے اس تھانے یہ چیزیں پہنچائی گئیں جہاں سیّد صاحب انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے تصویر دیکھتے ہی کہا۔ "یہ اس نادر کا بیٹا صفدر نہیں ہے۔ کوئی دوسرا شخص ہے، جو وہاں سے صفدر کا رول ادا کر رہا ہے۔"

انسپکٹر نے نادر سے کہا۔ "تم نے غلط بیانی سے پولیس کو گمراہ کرنا چاہا، اب اگر اپنی اور اپنے بیٹے کی خیریت چاہتے ہو تو فوراً بتاؤ کہ لڑکی کو کہاں پہنچایا گیا ہے؟"

وہ گڑگڑا کر بولا۔ "میں اپنا قصور مانتا ہوں مگر قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے اس جگہ کا علم نہیں ہے جہاں صائمہ کو لے جایا گیا ہے۔"

سیّد صاحب نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "لے جانے والے کا نام اپنی زبان سے لو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مم۔ میرا بیٹا.......... وہ.......... صفدر اسی شہر میں ہے۔ وہی صائمہ کو لے گیا ہے۔"

انسپکٹر نے محرّر سے کہا۔ "اس کا بیان اور دستخط لو۔ پھر اسے حوالات میں رکھو۔"

سیّد صاحب ایک فون کے ذریعے پولیس کے اعلیٰ افسر کو تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگے۔ انسپکٹر نے لاہور فون کر کے کہا۔ "وہ صفدر کا بہروپیا ہے۔ اغوا کرنے والے مجرموں کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس سے تمام حقائق اگلوا کر یہاں کے آئی جی کو رپورٹ دو۔"

سیّد صاحب نے خاندان کے دوسرے بزرگوں کو دیکھ کر پوچھا۔ "کیا اسی شرمناک سازش کے لیے مجھ سے رشتے داری بحال کی گئی تھی؟ آپ سب اس جرم میں شریک ہیں۔"

وہ سب گڑگڑانے لگے۔ خدا رسولؐ کی قسمیں کھا کر اور کلمہ پڑھ کر کہنے لگے کہ وہ نادر اور صفدر کی سازش میں شریک نہیں تھے۔ نادر نے جو تحریری بیان دیا اس میں سیّد صاحب کی اس ہمشیرہ کا ذکر تھا جس کے بیٹے کی سیّد صاحب نے سفارش نہیں کی تھی اور اسے میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں ملا تھا۔ ہمشیرہ کے اس بیٹے کا نام زبیر تھا اور صائمہ کو اغوا کرنے کی واردات میں زبیر بھی صفدر کے ساتھ تھا۔

وہ ہمشیرہ صاحبہ سیّد صاحب کے مکان میں تھیں۔ خاندان کی دوسری خواتین کے ساتھ بیٹھی، اپنی بھابی صفیہ بیگم کو جھوٹی تسلیاں دے رہی تھیں کہ صائمہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ مجرم پکڑے جائیں گے۔ بھائی جان تھانے گئے ہیں۔ جلد ہی بیٹی کو واپس لے آئیں گے۔ پلاننگ اتنی زبردست تھی کہ جرم کبھی ظاہر نہ ہوتا۔ لاہور سے بہروپیے صفدر نے سیّد صاحب کو بڑی اپنائیت سے بڑے ابو کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ فون پر سنی جانے والی آواز سے دھوکا کھایا جا سکتا تھا لیکن سیّد صاحب جج کی کرسی پر بیٹھ کر بھانت بھانت کے مجرموں کو اور ان کے ہتھکنڈوں کو سمجھتے آئے تھے۔ رشتے دار انہیں ایک احمق مولوی سمجھتے تھے جو آمدنی کے وسیع ناجائز ذرائع رکھنے کے باوجود ٹخنے سے اوپر شرعی شلوار پہنتا تھا اور اپنے

گھر والوں کو کبھی کبھی فاقے کراتا تھا۔ پتا نہیں یہ دنیا سچائی کی راہ پر چلنے والوں کو احمق کیوں سمجھتی ہے؟

گھر میں خبر پہنچی کہ دروازے پر پولیس والے آئے ہیں۔ پھر دو زنانہ پولیس کانسٹیبل اندر آئیں۔ ایک سپاہی خاتون نے پوچھا۔ "زلیخا بیگم کون ہیں؟"

سید صاحب کی ہمشیرہ نے کہا۔ "میں ہوں۔ کیا بات ہے؟"

دوسری سپاہی عورت نے کہا۔ "سوال نہ کرو' جواب دو۔ کیا تم سید آصف جاہ صاحب کی سگی بہن ہو؟"

"ہاں۔ یہاں سب جانتے ہیں' میں ان کی سگی بہن ہوں۔"

"کیا تمہیں تمہارے بیٹے کا نام زبیر ہے؟"

"ہاں زبیر ہے۔ مگر وہ صبح سے حیدر آباد گیا ہوا ہے۔"

ایک سپاہی خاتون نے ایک زوردار طمانچہ زلیخا کے منہ پر رسید کیا پھر کہا۔ "تیرے بیٹے زبیر اور صفدر نے سید صاحب کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ تھانے میں سارا بھانڈا پھوٹ گیا ہے۔"

دوسری سپاہی خاتون نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر پوچھا۔ "یہاں صفدر کی ماں کون ہے؟"

بیگم نادر پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بھاگتی ہوئی چیخی۔ "نہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ میرے بیٹے پر الزام ہے۔ ہم نے کچھ نہیں کیا ہے۔"

وہ بھاگ کر کہاں جا سکتی تھی۔ باہر گلی کے دروازے پر پولیس والے تھے۔ ان دونوں کو بھی تھانے پہنچا دیا گیا۔ سید صاحب نے انہیں دیکھ کر کہا۔ "یہ ہے میرا خاندان' میرے خون کے رشتے اور یہ ہے میری ماں جائی بہن۔ ان سب نے مجھے انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی سزا دی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری سچائی اور ایمانداری کے نتیجے میں میرے عزت دار خاندان کی دو خواتین تھانے میں آئیں گی اور حوالات میں جائیں گی۔"

انسپکٹر نے سید صاحب سے کہا۔ "سر! آپ کے معزز خاندان کی عزت کا معاملہ ہے۔ آپ چاہیں تو ان خواتین کو اغوا کے کیس سے الگ رکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کی اجازت سے انہیں چھوڑ سکتا ہوں۔"

"خواتین کا تعلق کسی بھی گھر یا کسی بھی خاندان سے ہو' جب تک ان سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوتا' وہ معزز ہیں۔ جرم کرنے کے بعد پھر وہ معزز نہیں رہتیں خواہ ان کا

تعلق میرے خاندان سے کیوں نہ ہو۔ ہاں اگر یہ دونوں صاف اور سچا تحریری بیان دیں گی تو میں انہیں حوالات میں نہیں جانے دوں گا۔ اپنی ضمانت پر گھر جانے دوں گا۔"

محرر زلیخا اور بیگم نادر کو بھی تحریری بیان کے لیے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ یہ سب تو ہو رہا تھا لیکن صائمہ کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ نادر پر سختیاں کی جا رہی تھیں اور وہ قسمیں کھا کر کہہ رہا تھا کہ اس کے بیٹے صفدر نے کسی خفیہ اڈے کے متعلق باپ کو نہیں بتایا ہے۔ یہ ضرور کہا ہے کہ بعد میں باپ سے رابطہ کرے گا۔

نادر کو بھی اس تاکید کے ساتھ رہا کر دیا گیا کہ وہ اپنے گھر اور محلے سے باہر نہیں جائے گا۔ پولیس والے سادہ لباس میں اس کی نگرانی کرتے رہیں گے اور زلیخا پر بھی نظر رکھیں گے تاکہ صفدر اور زبیر اپنے والدین سے ملاقات کرنے آئیں تو انہیں گرفتار کر لیا جائے۔

نادر نے جاتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان' ہم نے آپ کی عزت خاک میں ملانے کے لیے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ میں جانتا ہوں آج نہیں تو کل میرا بیٹا بھی گرفتار ہو جائے گا۔ اسے سزا ضرور ہوگی لیکن اغوا کے بعد واپس آنے والی لڑکیاں باعصمت نہیں کہلاتیں۔ آپ غصہ تھوک کر ٹھنڈے دماغ سے غور کریں۔ صائمہ واپس آنے کے بعد شاید کسی کی دلہن نہیں بن سکے گی۔ اگر کوئی اسے بیاہ کر لے جائے گا تو ساری عمر اسے بے آبروئی کے طعنے دیتا رہے گا۔"

"ہاں۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ تم لوگوں نے جو دشمنی کی ہے' اس کی سزا میری بیٹی کو عمر بھر ملتی رہے گی اور میں بھی دنیا والوں سے آنکھیں نہیں ملا سکوں گا۔"

"آپ چاہیں تو ہماری دشمنی اور آپ کی بدنامی ختم ہو سکتی ہے۔ صائمہ کا نکاح صفدر سے پڑھوا دیں۔"

سید صاحب نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "نہایت معقول مشورہ ہے۔ میری بیٹی کی ہونے والی بدنامی' نیک نامی میں بدل جائے گی۔ دشمنی بھی ایک مضبوط رشتے داری میں بدل جائے گی۔ یہ ایک رشتہ ہو جائے تو صرف صائمہ ہی نہیں' پورا خاندان ندامت اور بدنامی سے بچ جائے گا۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "واقعی سید بھائی! اگر ایسا ہو جائے تو پورے خاندان پر آپ کا احسان رہے گا۔"

"میں چاہتا ہوں ایسا ہو جائے اور میری بیٹی ساری عمر بے آبروئی کے طعنے نہ سنے۔ مگر ایک جج کہتا ہے کہ کسی بھی جرم پر مصلحت اندیشی اور سمجھوتے کا پردہ نہ ڈالا جائے۔

میرا دین کہتا ہے کہ بیٹی کو اس کے گھر سے مانگ کر لے جاؤ‘ چھین کر نہ لے جاؤ۔ چھین کر لے جانے والے کی نیت مجرمانہ ہوتی ہے۔ ایسی مجرمانہ نیت کو قبول کرنے سے جرائم پھلتے پھولتے ہیں۔“

دوسرے بزرگ نے پوچھا۔ ”آپ کیسے باپ ہیں؟ کیا بیٹی کو ساری عمر بدنامی کے کانٹوں پر گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ آپ کے دینی اور قانونی حوالے درست ہیں لیکن یہ اپنی اولاد سے دشمنی ہوگی۔ نادر‘ صفدر اور زبیر جو دشمنی کر رہے ہیں‘ اس سے کہیں زیادہ عداوت آپ باپ ہو کر بیٹی سے کرنا چاہتے ہیں۔“

سید صاحب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ وہ بولے۔ ”بعض اوقات ایمان ایسے ہی آزمائشی موڑ پر لاتا ہے کہ انسان کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ یااللہ! مجھے حوصلہ دے‘ مجھے حوصلہ دے‘ مجھے حوصلہ.........“

وہ کہتے کہتے رو پڑے۔ دونوں ہاتھوں سے آنسو بھری آنکھوں کو چھپا کر بولے۔ ”میرے مالک! میرے معبود! مجھے ثابت قدم رکھنا۔ میں جان سے جاؤں گا۔ ایمان سے نہیں جاؤں گا۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ پورے تھانے میں ایسی خاموشی اور سناٹا چھا گیا تھا جیسے پولیس‘ قانون اور ایک جج کے کاندھوں پر جوان بیٹی کی میت اٹھنے والی ہو۔

☆======☆======☆

اس نے ہوش میں آتے ہی گہری تاریکی دیکھی۔ اسے فوراً ہی یاد نہیں آیا کہ وہ کہاں تھی اور اب کہاں پہنچائی گئی ہے۔ کچھ یوں لگا جیسے خواب دیکھ رہی ہے۔ اس نے چادر یا لحاف کے لیے ہاتھ پاؤں کو حرکت دی پھر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ چادر اور لحاف تو دور کی بات ہے‘ اس کے بدن پر لباس کی ایک دھجی بھی نہیں تھی۔ اگرچہ وہ تاریکی میں خود کو دیکھ نہیں سکتی تھی‘ تاہم اپنی بے لباسی کے تصور ہی سے چیخ پڑی۔

”نہیں۔ میرے کپڑے‘ میرے کپڑے کہاں ہیں؟ امی! آپ کہاں ہیں؟ یہاں اندھیرا کیوں ہے؟“

تاریکی میں ایک مرد کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ”کیوں چیخ رہی ہو؟ خاموش رہو۔ یہ تمہارا میکا نہیں سسرال ہے۔ تم سہاگ کی سیج پر ہو۔“

تھوڑی دیر کے لیے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اسے یاد آیا‘ وہ ابٹن اور مہندی لگائے اپنے کمرے میں تھی‘ پھر اچانک کسی نے اسے جکڑ لیا تھا اور اس کی ناک پر کپڑا رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ غافل ہو گئی تھی اور اب کسی مرد کی آواز کہہ رہی تھی کہ شادی ہو چکی ہے اور وہ سہاگ کی سیج پر ہے۔

اس نے خود کو آرام دہ بستر پر محسوس کرتے ہی اسے ٹٹولا تاکہ بستر کی چادر کھینچ کر خود کو اس میں چھپا لے مگر بستر پر چادر نہیں تھی۔

وہ مارے شرم کے رونے لگی۔ بستر پر اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر کوئی کپڑا تلاش کرنے لگی۔ تاریکی میں اسے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا لیکن شرم والی کو بے لباسی کا احساس مارے ڈال رہا تھا۔ پھر ایک مردانہ آواز نے یہ جتایا تھا کہ ایک اجنبی اس کے قریب کہیں موجود ہے۔

”وہ لرزتی رہی سنتی رہی۔ اس آواز پر غور کرتی رہی پھر حیرانی سے بولی۔ ”تم صفدر‘ یہ......... یہ تم ہو؟ یہ......... یہ تمہاری آواز ہے؟“

”ہاں میں ہوں اور تمہارا دشمن نہیں ہوں۔“

وہ رو رو کر بولی۔ ”یہ دشمنی نہیں تو اور کیا ہے؟ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟“

"یہ ایسی جگہ ہے کہ یہاں آکر دشمنی ختم ہوگئی ہے۔ یہ تاریکی' یہ تنہائی گواہ ہے ہماری دوستی پکی ہوگئی ہے اور یہ دوستی ایسی ہے کہ یہاں سے میرے بغیر جاؤ گی تو بدنام جاؤ گی اور میری شریکِ حیات بن کر جاؤ گی تو تمہارے باپ کی نیک نامی برقرار رہے گی۔"

اس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بولا۔ "اندھیرے میں آنسو نہیں چمکتے ویسے کب تک روتی رہو گی۔ دو روز یا چار روز' دو مہینے یا چار مہینے پھر صبر آجاتا ہے انسان کو حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ جب تک سمجھوتا نہیں کرو گی اسی حال میں رہو گی۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں حاصل کرنا چاہتا تھا' حاصل کرلیا۔ میں نے ایسی چال چلی تھی کہ کسی کو مجھ پر شبہ نہیں ہوتا مگر تمہارا باپ پکا شیطان ہے۔ خبر ملی ہے کہ اسے میرے جرم کا ثبوت مل گیا ہے۔ وہ میرے باپ کو تھانے میں پریشان کر رہا ہے۔ میں انتظار میں ہوں کہ شاید وہ خود کو اور بیٹی کو بدنامی سے بچانے کی خاطر ہماری شادی کے لیے راضی ہو جائے گا۔ تب تک اس سلسلے میں کوئی حوصلہ افزا خبر ملنے والی ہے۔"

اس کی آواز قریب آرہی تھی اور وہ قریب آنے والے سے دور رہنا چاہتی تھی۔ پیچھے کھسکتے ہوئے پلنگ کے سرے پر آگئی تھی۔ اس سے التجا کر رہی تھی۔ "میرے قریب نہ آؤ۔ مجھ سے دور رہو۔ تمہیں خدا رسولﷺ کا واسطہ دیتی ہوں۔ میرا لباس مجھے دے دو۔"

"لباس ایک پردہ ہوتا ہے اور ہمارے درمیان کوئی پردہ نہیں رہا ہے۔"

وہ پلنگ سے اتر کر جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کی گرفت میں آگئی۔ التجا کرنے لگی گڑگڑانے لگی۔ وہ اس کی التجا سننے کے لیے نہیں لایا تھا۔ ایسے وقت عورت روتی ہے فریاد کرتی ہے تو ظالم کے لیے اور پُرکشش لگتی ہے۔ ہاتھ جوڑتی ہے تو خوشی ہوتی ہے ہاتھ چھڑاتی ہے تو جدوجہد میں مردانگی دکھانے کا مزہ آتا ہے۔ گھر میں صفدر کی ایک ایک جوان بہن تھی۔ ایسے وقت مردانگی دکھانے والے بھول جاتے ہیں کہ بہن بھی کسی سے ہاتھ چھڑانے میں ناکام رہتی ہوگی۔

وہ ناکام رہی۔ صبح سے پہلے وہ چلا گیا۔ دن کی روشنی کمرے میں آنے لگی تو وہ شرم سے رونے لگی۔ وہاں صرف ایک پلنگ تھا اور کوئی سامان نہیں تھا۔ خود کو چھپانے کے لیے کپڑے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ پلنگ پر اسپرنگ کا موٹا سا گدا تھا' جس پر چادر نہیں تھی۔ وہ گدا ایک دبیز کپڑے سے منڈھا ہوا تھا۔ اتنا مضبوط کپڑا تھا کہ چاقو یا قینچی کے بغیر

کاٹ کر اسے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس نے پہلے انگلیوں اور ناخنوں سے اسے پھاڑنے کی کوشش کی۔ پھر دانتوں سے کاٹنے لگی۔ یوں وہ ایک طرف سے ادھڑ گیا اور ہاتھوں سے پھٹ کر گدے سے الگ ہو گیا۔ ایک چادر کی صورت میں نصیب ہوتے ہی اس نے اپنے بدن کو اس سے ڈھانپ لیا۔

وہ آڑی ترچھی پھٹی ہوئی' چادر تھی مگر حیا کا گھر تھی۔ سب ہی چادریں ایک جیسی ہوتی ہیں مگر اسے عداوت سے بچھایا گیا تو وہ گناہ کا بستر بن گئی تھی۔ اسے محبت سے بچھایا جاتا تو سہاگ کی سیج بن جاتی۔ یہ چادر عورت کے لیے ہوتی ہے مگر مرد کے تصرف میں رہتی ہے۔ وہ اسے بہن اور بیٹی کے سروں پر رکھتا ہے۔ باقی سروں سے چھین کر اپنی اوقات دکھاتا ہے۔

اس نے ایک کھڑکی کے پاس آکر اس کے پٹ کھولے۔ پتا چلا وہ کسی مکان کی چھت پر بنے ہوئے ایک کمرے میں ہے۔ اس کا خیال تھا دروازہ باہر سے بند ہوگا۔ اس نے اسے کھولنے کی کوشش میں ہاتھ لگایا تو وہ کھل گیا۔ وہ کمرے میں قید نہیں کی گئی تھی۔ صفدر کو یقین تھا کہ وہ جس حال میں رکھی گئی ہے' اس حال میں باہر نہیں آئے گی۔ اس نے باہر آکر دیکھا کمرے کے چاروں طرف کھلی چھت تھی۔ ایک زینہ نیچے کی طرف گیا تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی منڈیر کے پاس آئی۔ وہ ایسی چادر میں کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دور تک کھیت اور چھوٹی بڑی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ کھیتوں کے درمیان وہ مکان تھا جس کی چھت پر وہ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک درخت کے سائے میں ایک شخص چارپائی پر سو رہا تھا۔ دوسرا شخص ایک رائفل لیے اسی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

پتا نہیں اسے کس علاقے میں لایا گیا تھا۔ وہ زینے کے پاس آئی۔ زینے کے نچلے حصے میں ایک راہداری دکھائی دی۔ دو چار زینے اتر کر کان لگا کر سننے لگی۔ کسی مرد کی آواز نہیں تھی البتہ رونے سسکنے اور کراہنے کی نسوانی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اس نے نیچے آکر دیکھا۔ راہداری کے اطراف کمرے تھے۔ ان کے بند دروازوں اور کھڑکیوں کے پیچھے سے وہ نسوانی آوازیں دھیمی دھیمی آرہی تھیں۔ اس نے ایک کھڑکی کے پاس آکر اس کے ایک پٹ کو ذرا سا کھول کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ کمرے کے اندر چھ جوان لڑکیاں تھیں اور ان سب کو بھی اس کی طرح بے لباس رکھا گیا تھا۔ وہاں کوئی پلنگ یا بستر بھی نہیں تھا۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھیں' شرم سے رو رہی تھیں اور سکڑی سمٹی ہوئی تکلیف سے کراہ رہی تھیں۔ ایسی ہی مظلوم اور مجبور دھیمی آوازیں

دوسرے کمروں سے بھی آرہی تھیں۔

ان کی بے لباسی بتا رہی تھی کہ تمام کمروں کی کھڑکیوں اور دروازوں کو کھلا رکھا گیا ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ حیا والیاں باہر نہیں آسکیں گی۔ ایسا سلوک کرنے والوں کی یہ بے حیائی کی انتہا تھی۔ ایسے بے حیا' بے غیرت لوگ شاید اپنی ماؤں کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ پتا نہیں اس دنیا میں کمینگی کی کوئی انتہا ہے بھی یا نہیں؟ ان دوشیزاؤں کی یہ حالت دیکھ کر ہر حساس آدمی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ صائمہ خود کو بھول کر ان کی بے بسی اور مظلومیت پر رونے لگی۔

اس نے دروازے کے پاس آکر اسے کھولا۔ تمام لڑکیوں نے اسے چونک کر اور سہم کر دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ مردانہ آنکھیں انہیں دیکھنے آگئی ہیں۔ کتنی ہی لڑکیاں شرم سے چیخ پڑی تھیں۔ پھر چادر میں لپٹی ہوئی صائمہ کو دیکھ کر سب کی نظروں میں سوال پیدا ہوا تھا۔ سب کی نظریں اس کی چادر کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ سکڑی سمٹی ہوئی سی تھیں' آہستہ آہستہ اٹھنے لگیں۔ صائمہ کی طرف ایک ایک قدم بڑھنے لگیں۔ ایک نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مجھے بھی اس میں چھپالو۔"

دوسری نے کہا۔ "یہ ہمیں دے دو۔ تم اور کہیں سے لے آؤ۔"

تیسری نے اس کی چادر پکڑلی۔ "یہ مجھے دے دو۔"

دوسری طرف سے چوتھی لڑکی نے چادر کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ کچھ ہاتھ آگے سے آئے' کچھ پیچھے سے۔ وہ سب ضرورت مند تھیں۔ ان کی زندگی کی اور ان کی شرم کی پہلی اور آخری ضرورت وہ چادر تھی۔ جنت میں آدم و حوا کو ستر پوشی کے لیے ایک درخت کے پتے مل گئے تھے۔ وہاں صرف ایک چادر اور سات لڑکیاں تھیں۔ ساتویں نے خود کو ڈھانپ رکھا تھا۔ باقی چھ حیا کا تقاضا کر رہی تھیں۔ وہ تقاضا جارحانہ مطالبے میں بدل رہا تھا۔ "یہ کپڑا مجھے دو۔ یہ چادر مجھے دو۔ خدا کے لیے مجھے اس میں چھپنے دو۔"

چادر اور کپڑے کے الفاظ گونجتے ہوئے دوسرے کمروں میں جا رہے تھے۔ ان کمروں میں چھپی ہوئی عورتوں نے نکل کر صائمہ کو ایک چادر میں دیکھا تو وہ بھی دوڑتی ہوئی آئیں اور اس ایک چادر کو چھیننے لگیں۔ وہ بہت مضبوط کپڑا تھا مگر ہاتھ' ناخن اور دانت بہت سے تھے۔ وہ چادر پھٹنے لگی۔ ٹکڑوں میں بٹنے لگی۔ کسی کو ہاتھ بھر کپڑا ملا۔ کسی کو بالشت بھر اور کسی کو دھجی نصیب ہوئی۔ صائمہ کے بدن پر صرف ناخنوں کی خراشیں رہ گئیں۔ وہ بے لباسی سے گھبرا کر چیختی ہوئی بھاگی پھر زینے کے پاس آئی۔ وہاں سے چڑھتی ہوئی چھت والے کمرے میں پہنچی۔ پھر اس کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کرنا چاہا تو

اندرونی چٹخنی نہیں تھی۔

وہاں کے کسی کمرے میں اندر سے چٹخنی نہیں لگائی گئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اسپرنگ والے گدے کے پاس آئی۔ اس نے گدے کے اوپری کپڑے کو پھاڑ کر چادر بنائی تھی اس کے نچلے حصے میں ابھی ایک چادر کے برابر کپڑا لگا ہوا تھا۔ وہ گدے کو الٹ کر اپنے لیے دوسری چادر حاصل کرنا چاہتی تھی مگر وہ ساری لڑکیاں اس کا پیچھا کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں۔ ان کا خیال درست نکلا کہ صائمہ کے پاس مزید کپڑا ہوگا۔

صائمہ گدے کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر دیوار بن گئی۔ پھر بولی۔ "عقل سے کام لو۔ تم سب نے ایک چادر کو چادر رہنے نہیں دیا۔ اس کے لیے بھی لڑو گی تو ہم میں سے کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

وہ سب اپنے اپنے ہاتھوں میں پھٹی ہوئی چادر کے ٹکڑے دیکھ کر سوچ میں پڑ گئیں۔ صائمہ نے کہا۔ "ذرا سمجھ داری سے کام لو۔ ایک چادر لپیٹی جائے تو اس میں ایک ہی چھپے گی اور اگر چادر کو پردے کی طرح تان دیا جائے' تو اس کے پیچھے ہم سب چھپ سکیں گے۔"

بات سمجھ میں آگئی۔ سب نے اس کا ساتھ دیا۔ گدے کے نچلے حصے سے ایک بڑا کپڑا نکال لیا۔ ٹکڑے ٹکڑے کپڑوں کی ڈور بنا کر اس بڑے کپڑے کو ایک کھڑکی کی سلاخ سے دوسری کھڑکی کی سلاخ تک باندھ کر چادر کی دیوار کھڑی کر دی۔ اسپرنگ کے گدے کو بھی پلنگ سے ٹکا کر کھڑا کر دیا۔ اس حکمتِ عملی سے بائیس عورتوں نے اطمینان کی حد تک خود کو چھپا لیا۔

ویسے سب سمجھ رہی تھیں کہ اطمینان عارضی ہے۔ جب وہ بردہ فروش آئیں گے تو پتا نہیں اس دیوار کو قائم رہنے دیں گے یا نہیں؟ صائمہ نے پوچھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟"

"پتا نہیں ہمیں کس جہنم میں لا کر رکھا گیا ہے۔"

اس نے کہا۔ "میرا ایک چچازاد ذاتی دشمنی کی بنا پر مجھے یہاں لے آیا ہے لیکن تم سب کو یہاں اس حال میں کیوں رکھا گیا ہے۔"

وہ ایک ایک کر کے بتانے لگیں۔ انہیں مختلف شہروں اور قصبوں سے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ ان سے پہلے کچھ اور بھی تھیں جو پچاس ہزار' ساٹھ ہزار اور ستر ہزار میں بیچ دی گئی تھیں۔ روز کوئی نہ کوئی دولت مند عیاش وہاں آتا تھا۔ انہیں دیکھتا تھا پھر جو پسند آتی تھی اس کی مطلوبہ رقم دے کر اسے لے جاتا تھا۔

صائمہ نے کہا۔ "میں نے چھت پر سے دیکھا ہے باہر دو مرد پہریدار ہیں۔ ایک رہا ہے۔ دوسرا جاگ رہا ہے۔"

ایک بولی۔ "انہیں زیادہ پہریداروں کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں یقین ہے کہ اس حال میں فرار ہونے کے خیال سے ہی شرماتی رہیں گی۔"

دوسری نے کہا۔ "اس مکان کا ہر دروازہ کھلا رہتا ہے۔ صرف رات کے وقت بیرونی دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ ہم میں سے کوئی تاریکی میں چھپ کر فرار ہو سکے۔"

ایک لڑکی نے ان سے کہا تھا کہ جب آگے بھی بے حیائی ہے، ننگی آنکھیں ہمیں دیکھنے اور خریدنے آتی ہیں تو پھر یہاں اپنی بے لباسی کو چھپانے کا فائدہ کیا ہے؟ میں یہاں سے جاؤں گی۔ دن کے وقت بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھا کوئی نظر نہیں آیا۔ رات کو ڈیوٹی دینے والا چارپائی پر درخت کے سائے میں سو رہا تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر بھاگنے لگی۔ دوسرا پہریدار مکان کے پیچھے تھا وہ اس کے پیچھے لپکا۔ جب وہ دوڑتی ہوئی چیخنے چلانے اور مدد کے لیے پکارنے لگی تو اس نے اسے گولی مار دی۔ یہ منظر دیکھ کے بعد سب ہی دہشت زدہ تھیں۔ ان سب کو اس لڑکی کی لاش دکھائی گئی تھی اور وارننگ دی گئی تھی کہ فرار ہونے والوں کا یہی انجام ہوگا۔ کسی بھی فرار ہونے والی کے لیے باہر بے حیائی بھی تھی اور موت بھی۔

دن کے دس بجے باہر گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ سب سہم کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ یوں لپٹنے سے ایک دوسرے کو سہارا بھی مل رہا تھا اور کسی حد تک بے لباسی کا توڑ بھی ہو رہا تھا۔

کچھ بھاری بھرکم قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک گرجتی ہوئی آواز نے پوچھا۔ "یہ لڑکیاں کہاں ہیں؟"

پہریدار کی آواز سنائی دی۔ "مالک! تھوڑی دیر پہلے بہت شور مچا رہی تھیں۔ پھر ان سب کے اوپر جانے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ آپ کا حکم ہے کہ ہم ان لڑکیوں کو جھانک کر نہ دیکھیں۔ اس لیے میں دروازے پر کھڑا رہا۔ یہاں سے باہر کوئی نہیں گئی ہے۔ سب اوپر چھت پر ہوں گی۔"

زینے پر قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ چند لمحوں کے بعد پانچ افراد کمرے میں آ گئے۔ ان میں سے چار بردہ فروش تھے۔ چاروں میں سے ایک ان کا سرغنہ تھا اور پانچواں ایک دولت مند گاہک۔ اس سرغنے نے چادر کی دیوار دیکھی تو اسے ہنسی آ گئی۔ پھر

وہ ہنسی قہقہوں میں بدل گئی۔ اس کے ماتحت بھی ہنس رہے تھے۔ گاہک سمجھ رہا تھا کہ اس کمزور اور کچی دیوار کے پیچھے حسن وشباب کے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔

سرغنے نے کہا۔ "یہ صفدر کسی لیڈر کی لڑکی کو اٹھا لایا ہے۔ دیکھو کیسی لیڈری کر رہی ہے۔ اپنے کمرے میں سب کو بلا کر گدے کی چادر میں چھپا رہی ہے۔"

پھر وہ گرج کر بولا۔ "اے باہر آؤ۔ ایک آواز میں چلی آؤ ورنہ میں مجبور کرنا جانتا ہوں۔" ان میں سے کئی لڑکیاں رونے لگیں۔ کئی التجائیں کرنے اور گڑگڑانے لگیں۔ سرغنے نے چادر کے قریب آ کر ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں کے درمیان رکھا۔ پھر لائٹر کے ننھے سے شعلے کو چادر سے لگا دیا۔ چادر کے اس حصے نے آگ پکڑ لی۔ اس نے دوسری طرف شعلے سے اسے جلایا۔ پھر تیسری طرف بھی یہی کیا۔ ننھی سی آگ شعلوں میں بدل گئی۔ لڑکیاں رو رہی تھیں چیخ رہی تھیں اور چادر کی جلتی ہوئی دیوار راکھ ہو کر ان مظلوموں کی بے بسی دکھا رہی تھی۔

آئندہ کبھی چھپنے کے لیے کپڑے کی ایک دھجی بھی نہیں بچی۔ وہ سب ایک دوسرے سے لپٹ کر منہ چھپا رہی تھیں۔ سرغنہ کے حواری ان کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر انہیں کھینچ کر الگ کر رہے تھے اور گاہک کو پسند کرنے اور انتخاب کرنے کا موقع دے رہے تھے۔

وہ انہیں قصائی کی طرح ٹٹول رہا تھا اور جوہری کی طرح پرکھ رہا تھا۔ پھر اس نے سات لڑکیوں کا انتخاب کیا۔ ان میں صائمہ بھی تھی۔ سرغنے نے صائمہ کو پیچھے دھکیل کر گاہک سے کہا۔ "یہ ہمارا مال نہیں ہے۔ دوسرے کی امانت ہے۔ تم کسی اور کو پسند کر لو۔"

وہ بولا۔ "میں سمندر پار لے جانے والا مال خوب سوچ سمجھ کر پسند کرتا ہوں۔ یہ تمہارا طریقہ اچھا نہیں ہے۔ اس کا بھاؤ بڑھانے کے لیے اسے دوسرے کی امانت کہہ رہے ہو۔ جبکہ ہر ایک کے لیے پچاس ہزار طے ہو چکے ہیں۔ کیا ساڑھے تین لاکھ روپے کچھ کم ہوتے ہیں؟"

وہ بولا۔ "میں اپنے گاہکوں سے نہ جھوٹ بولتا ہوں اور نہ دھوکا دیتا ہوں۔ یہ ایک لیڈر کی بیٹی ہے۔ تم کسی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ اس کا معاملہ کچھ پیچیدہ ہے۔ میں تمہیں اندر کی بات نہیں بتا سکوں گا۔"

اس نے صائمہ کو چھوڑ کر دوسری پسند کر لی۔ سرغنہ نے حواریوں کو حکم دیا کہ ان

ساتوں کو مکان کے پچھلے حصے میں لے جا کر لباس پہنائے جائیں۔ حواری ان ساتوں کو دھکے دیتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔

پتا نہیں ان ساتوں کو کتنے دنوں بعد لباس نصیب ہوا تھا۔ وہ ملبوس ہو کر مکان کے سامنے آئیں۔ وہاں ایک لانبی سی کوچ' ایک پجیرو اور ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ آس پاس بہت سے خطرناک گن مین کھڑے ہوئے تھے۔ ان ساتوں کو کوچ میں بٹھایا گیا۔ اس کے آگے پیچھے' دائیں بائیں گن مین بیٹھ گئے۔ پھر وہ قافلہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

صرف وہ ایک جیپ رہ گئی جس میں سرغنہ آیا تھا۔ اس نے صائمہ سے کہا۔ "یہاں کوئی چالاکی دکھاؤ گی تو تمہیں غنڈوں اور موالیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ آئندہ اس چھت سے نیچے آکر کسی لڑکی سے نہ ملنا۔"

اس کے حواری باقی لڑکیوں کو ہانک کر نیچے والے کمرے میں لے جا رہے تھے۔ صائمہ نے کہا "تم نے مجھے پچاس ہزار روپے میں بھی نہیں بیچا۔ یہ تمہارا احسان ہے۔ مجھے اتنا بتادو' تمہیں صفدر سے کیا حاصل ہو رہا ہے؟"

"اس کنگال سے بھلا کیا حاصل ہوگا۔ وہ ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل پر یہاں آتا ہے۔ دراصل میرا اور صفدر کا مشترکہ دشمن تمہارا باپ ہے۔ اس نے مجھے سات سال سزائے قید بامشقت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس علاقے کے ایک بہت بڑے سیاستدان کا ہاتھ میرے سر پر رہتا ہے۔ اس نے میرا مقدمہ دوسری عدالت میں ٹرانسفر کرا دیا تھا۔ اس طرح تمہارے باپ سے جان چھوٹ گئی۔ مگر میں نے قسم کھائی تھی کہ تمہارے باپ کی جان نہیں چھوڑوں گا۔ پھر صفدر سے ملاقات ہوئی۔ ہمارے پیر سیاستدان نے مشورہ دیا کہ بڈھے کی جان نہ لو۔ کسی طرح اسے عدالت کی کرسی چھوڑنے پر مجبور کر دو۔ اب ہم یہی کر رہے ہیں۔"

"تم لوگوں نے اب تک میرے ابو کو نہیں سمجھا ہے۔ وہ جان دے دیں گے لیکن ایمان و انصاف نہیں چھوڑیں گے۔"

"یہ تو آج کل میں پتا چل جائے گا۔ ابھی میں نے تمہیں سمندر پار جانے نہیں دیا کیونکہ اسی ملک میں تمہیں شرمناک تماشا بنا کر اس بڈھے کو ہماری مرضی کے مطابق سمجھوتے پر مجبور کیا جائے گا۔"

وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ دوپہر کو صفدر آیا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ آتے ہی صائمہ کی پٹائی شروع کر دی۔ گالیاں دے کر کہنے لگا۔ "سؤر کی بچی! تیرے باپ نے میری امی کو بھی پکڑوا کر تھانے میں بلایا تھا۔ اس نے میری ماں کی توہین کی ہے۔ میں اسے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ روتی ہوئی بولی۔ "تمہیں ماں کا بڑا خیال ہے اور اپنے ہی خاندان کی ایک بیٹی کو یوں برباد کرتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آ رہی ہے۔"

وہ گلا دبوچ کر بولا۔ "ابھی اور برباد ہوگی۔ میرے ابو کے خلاف آج ہی چالان پیش کر کے انہیں جیل میں بھیج دیا گیا ہے۔ وہاں کے آئی جی پولیس کو بھی ایمان داری کا روگ لگ گیا ہے۔ وہ ہمارے بااثر سیاستداں کے دباؤ میں نہیں آرہا ہے۔ اس نے میری گرفتاری کے لیے کراچی شہر کے باہر بھی پولیس کا جال بچھا دیا ہے۔"

اس نے دھکا دے کر اسے فرش پر پھینک دیا۔ وہ تکلیف سے کراہتی ہوئی بولی۔ "میری عزت آبرو تو گئی۔ ایک جان رہ گئی ہے اسے بھی لے لو۔ اس سے زیادہ اور کیا کر سکو گے؟ خدا کی قسم میرے ابو کو جھکا نہیں سکو گے۔"

وہ اسے جوتوں سے ٹھوکریں مارتے ہوئے بولا۔ "تیرا باپ جھکے گا۔ مجھے اپنا داماد بنانے پر مجبور ہو کر ہمارے خلاف مقدمات واپس لے گا یا پھر تجھے نیپئر روڈ یا ہیرامنڈی کے بازار میں پائے گا اور اس بازار سے تجھے گھر لے جانے کے خیال سے ہی مرجائے گا۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ اس کی پشت پناہی کے لیے بردہ فروش سرغنہ اور ایک بڑا بااثر شخص تھا۔ ان کے آدمی کراچی میں تھے اور فون کے ذریعے سید صاحب کو سمجھاتے بھی تھے اور دھمکیاں بھی دیتے تھے۔ وہ ایک ہی بات کہتے تھے کہ صفدر باقاعدہ نکاح پڑھا کر نکاح نامے کے ساتھ کراچی آئے گا۔ وہ اسے داماد کے طور پر قبول کرلیں اور اس سے پہلے صفدر اور اس کے باپ کے خلاف الزامات واپس لے لیں۔

صفدر تقریباً ایک ہفتہ تک صائمہ کے پاس آکر اسے نوچتا کھسوٹتا رہا۔ ادھر مختلف مقامات سے فون کے ذریعے سید صاحب کو دھمکیاں دی جاتی رہیں اور سید صاحب ایک ہی بات کہہ کر ریسیور رکھ دیتے تھے کہ تم لوگ ایک بیٹی کے باپ کو رانگ نمبر پر فون کر رہے ہو۔ یہ نمبر ایک جج سے جا ملتا ہے۔ خدا تمہیں صحیح نمبر ڈائل کرنے کی ہدایت دے۔ آمین۔

یہ پختہ یقین ہو گیا کہ بڈھا فولادی ستون ہے۔ اسے آسانی سے اکھاڑا نہیں جا سکے گا۔ اسے اس کی بنیاد تک کھود کر اکھاڑ پھینکنا ہو گا۔ صفدر نے کہا۔ "مجھے بڈھے کے مرنے تک یا حکومت بدلنے تک روپوش رہنا ہوگا۔ ہمارا سیاست داں اقتدار میں آئے گا تو بڈھے سے نجات ملے گی۔ بہتر ہے صائمہ کو کسی دلال کے حوالے کر دو۔"

بردہ فروش کے سرغنے نے کہا۔ "اب یہی ہونا چاہیے۔ اس دلال کو تاکید کی جائے

کہ صائمہ کے بازار میں بیٹھنے اور دھندا کرنے کی تصاویر اتاری جائیں اور یہ کیچڑ اچھالا جائے کہ ایک معزز جج کی بیٹی کس طرح بازاری زندگی گزار رہی ہے۔ اس طریقہ کار کے نتیجے میں دوسرے جج صاحبان اپنی توہین محسوس کریں گے اور سید آصف جاہ کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیں گے۔"

صفدر نے گویا صائمہ اور سید صاحب کے مقدر کا فیصلہ سنا دیا۔ لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ دوسروں کی تقدیر لکھتے ہیں اور انہیں اپنے مقدر کا پتا نہیں ہوتا۔ صفدر کو بھی پتا نہیں تھا کہ آگے اجل کی سہیلی شامت کھڑی ہے۔ اس نے مکان سے باہر آکر پرانی موٹر سائیکل سنبھالی پھر اسے اسٹارٹ کر کے روانہ ہوا۔ جہاں وہ روپوش رہتا تھا' وہاں تک پہنچنے کے لیے اسے ایک پہاڑی کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف سے اترنا ہوتا تھا۔ اس شارٹ کٹ کے ذریعے وہ ایک لمبے راستے سے گزرنے اور پولیس کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہتا تھا۔

اُس روز بھی وہ پہاڑی پر آیا لیکن دوسری طرف ڈھلان سے گزرتے وقت کھٹارا موٹر سائیکل میں اچانک کوئی خرابی پیدا ہوئی اور وہ قابو سے باہر ہو گئی۔ صفدر سنبھل نہ سکا۔ ایسا گرا کہ ڈھلان پر کہیں رک نہ سکا۔ کبھی موٹر سائیکل اس پر آتی رہی' کبھی وہ موٹر سائیکل سے لپٹا نیچے جاتا رہا۔ پتا نہیں کس قدر چوٹیں پہنچتی رہیں۔ اس حادثے کا اذیت ناک پہلو یہ تھا کہ اس پہاڑی میں جگہ جگہ زہریلے کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ کئی کانٹے اس کے جسم میں پیوست ہوئے۔ وہ ایسے زہریلے کانٹے تھے جو جان نہیں لیتے تھے اتنا کرتے تھے کہ زخموں کو ناسور بناتے جاتے تھے اور اسے لاعلاج کرتے جاتے تھے۔

چونکہ ابھی اس کی موت نہیں تھی اس لیے اجل تماشائی بنا رہا اور شامت اس کے گلے پڑتی رہی۔ وہ پہاڑی کے نیچے پہنچ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

کراچی سے ایک دلال اپنے تین بندوں کے ساتھ آیا۔ اس نے سرغنے سے کہا "تمہارا پیغام ملتے ہی آیا ہوں۔ لڑکی کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔ اگر ہماری مرضی کے مطابق اسے بازار میں رکھو گے تو سمجھو تمہیں مفت میں ملے گی۔ صرف پانچ ہزار لوں گا۔"

صائمہ کو دلال کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ بولا۔ "یہ تو ہیرا ہے۔ صرف پانچ ہزار میں دے رہے ہو' معاملہ کیا ہے؟"

وہ صائمہ کو دوسرے مرے میں بھیج کر اسے سمجھانے لگا کہ کس طرح اسے

بٹھا کر اس کے باپ کو بدنام کرنا ہے۔

دلال نے کہا۔ "بڑا خطرناک کام ہے۔ بڑے آدمی کی بیٹی ہے۔ جب یہ وہاں سے بازیاب کی جائے گی تو پولیس والے ہمیں بھی گرفتار کریں گے۔"

"پانچ ہزار میں ہیرا خریدو گے تو اس کے لیے کچھ خطرہ بھی مول لینا ہو گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "میں اسے لاہور لے جاؤں گا۔ اسے ہیرا منڈی میں رکھوں گا۔ پولیس کا چھاپا پڑتے ہی وہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔"

اس کے ساتھی نے کہا۔ "استاد! یہاں سے لاہور تک راستے میں گڑبڑ کرے گی۔ بڑا لمبا راستہ ہے۔ ہم اسے کتنے گھنٹوں تک بے ہوش رکھیں گے؟"

بردہ فروشوں کے سرغنے نے صائمہ کی تقریباً دو درجن تصویریں نکال کر اس دلال کو دیتے ہوئے کہا "یہ ایسی شرمناک تصویریں ہیں کہ ان کی موجودگی میں وہ سر نہیں اٹھائے گی۔ اپنے باپ کی بدنامی نہیں چاہے گی۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا اس کے باپ کو ذلیل کرنے کے لیے یہ تصویریں کافی نہیں ہیں؟"

"نہیں صرف یہ تصویریں کافی نہیں ہیں۔ اس کی بیٹی کو دنیا کے سامنے ایک بازاری عورت بنا کر پیش کرنا ہے۔"

"پھر تو اسے لاہور لے جانا ہی مناسب رہے گا۔ میں اسے دوسرے کے حوالے کروں گا۔ اس سے تمہاری شرائط پوری کراؤں گا۔ کوئی خطرہ پیش آئے گا تو وہاں سے نکل بھاگوں گا۔"

معاملات طے ہو گئے۔ وہ صائمہ کو لباس پہنا کر مکان کے باہر لے آئے۔ اتنے دنوں بعد وہ لباس پہن کر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی اور دعا مانگ رہی تھی کہ آئندہ کوئی اس کا لباس نہ اتارے۔

انہوں نے اسے گاڑی میں بٹھا کر انجکشن کی سرنج نکالی۔ وہ بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔ مجھے بے ہوش نہ کرو۔ میں راستے میں شور نہیں مچاؤں گی۔ تم لوگوں کے خلاف کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

ایک نے کہا۔ "یہ بے ہوشی کا نہیں' نشے کا انجکشن ہے۔ تم سرور میں رہو گی اور راستے میں ہم سے ہنستی بولتی رہو گی۔ یوں کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہو گا۔"

اس نے اس کے بازو میں انجکشن لگا دیا۔ پھر گاڑی وہاں سے چل پڑی۔ یوں لگ رہا تو جیسے پہاڑ پر چڑھتے' تھکتے تھکتے' مرتے مرتے اچانک ایک بلندی پر نئی زندگی مل رہی

ہے۔ ایسی زندگی جس میں ظلم کرنے والے نہیں تھے۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے دوست اور اپنے تھے۔

پتا نہیں کتنا طویل فاصلہ طے ہوتا رہا۔ آدھی رات کے بعد وہ سو گئی۔ آنکھ کھلی صبح ہو چکی تھی۔ وہ سیکنڈ ہینڈ ویگن کار ایک چھوٹے شہر کے چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہم سفر انڈے اور پراٹھے کھا رہے تھے۔ انہوں نے اسے بھی ناشتا کرایا۔ چائے پلائی۔ پھر وہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔

وہ جہاں سے گزر رہی تھی۔ وہاں کے مناظر اور وہاں کے لوگوں کو دیکھ کر پتا چل رہا تھا کہ وہ پنجاب کے کسی علاقے میں ہے۔ اس کے اندر پھر فکر اور پریشانی گھر کر رہی تھی کہ پتا نہیں آئندہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ اچھے سلوک کی توقع ان غیرتوں سے کی نہیں جاسکتی تھی۔ وہ اسے بے حیائی کے کسی بازار میں پہنچانے والے تھے۔ اس خیال سے ہی سر میں درد ہو رہا تھا۔ دماغ پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔

وہ عاجزی سے بولی۔ "میرے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مجھ پر مہربانی کرو وہی ٹیکا لگا دو۔ میں تمام صدمات کو بھلا دینا چاہتی ہوں۔"

وہ بھی یہی چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک نے وہی ٹیکا لگا دیا۔ شاید نشہ اسی لیے ایجاد ہوا ہے کہ انسان مستی میں آکر اپنی ہستی بھلا دے اور یوں بھلاتے بھلاتے اپنی شرم اور غیرت کو مٹا دے۔

پھر اس پر سرور چھا رہا تھا۔ فکر و پریشانی کا غبار دماغ سے نکل رہا تھا۔ وہ مستی میں ہنستی ہوئی بولی۔ "کوئی پروا نہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ جب حالات ہمارے قابو میں نہ ہوں تو خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہیے۔"

آگے جا کر گاڑی رک گئی تھی۔ پولیس والوں نے اسے روک لیا تھا۔ ان سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ پتا نہیں کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ میں مست تھی۔ اسے پولیس کا خوف نہیں تھا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ پولیس والے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ سلوک' اخلاق اور تہذیب کی ایسی کی تیسی۔ جب اپنی آبرو کی ایسی کی تیسی ہو چکی ہے تو پھر کوئی کچھ بھی کرتا رہے۔ ہزاروں تہذیب کے علمبردار اور قوم کے راہنما اسے اس کی پارسائی واپس نہیں کر سکیں گے۔

ایک سپاہی گاڑی کے اندر تلاشی لے رہا تھا۔ ایک افسر نے اس کے پاس آکر پوچھا "تم کون ہو؟ ان سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔ "میں جوان ہوں مگر بہن کا رشتہ کسی سے نہیں ہے۔ اگر

بوڑھی ہوتی تو کسی سے ماں کا رشتہ بھی نہ ہوتا۔ ویسے میری معلومات کے لیے کیا بتا سکتے ہو کہ ہمارے ملک میں ماؤں کی خریداری کا بھی بازار ہوتا ہے؟"

افسر نے کہا۔ "تم تعلیم یافتہ اور ذہین ہو۔ تم نے میرے سوال کا سیدھا جواب نہیں دیا مگر ان چاروں دلالوں کی ہسٹری پیش کر دی ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام؟ میرا نام؟ ہاں۔ منصف زادی۔ زادی۔ زا.......... زا.........."

آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ نشہ غالب آگیا تھا۔ وہ غافل ہو گئی تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو چند لمحوں تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہے۔ اس نے خود کو ایک آرام دہ بستر پر پایا۔ کسی کی خواب گاہ تھی۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ ادھر سے کسی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بولنے والی عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دیواروں پر خانۂ کعبہ کی بڑی سی تصویر اور طغرے بتا رہے تھے کہ وہ کہیں بھی ہے مگر کسی جہنم میں نہیں ہے۔

وہ بستر سے اتر کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے پر آئی پھر کوریڈور میں آکر دیکھا۔ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ دو بوڑھی خواتین اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اس کی طرف بڑھتی ہوئی بولیں۔ "ارے تم ہو۔ تمہیں آرام سے لیٹے رہنا چاہیے۔ چلو کمرے میں۔"

وہ اسے تھام کر اسی خواب گاہ میں واپس لے آئیں۔ اسے بستر پر بٹھاتے ہوئے بولیں۔ "میرا بیٹا پولیس افسر ہے۔ آج رائے ونڈ میں اس کی ڈیوٹی تھی۔ وہیں اس کے ابا تبلیغی اجتماع میں گئے ہوئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ بیٹے نے تمہیں چار بدمعاشوں کے ساتھ گرفتار کیا ہے اور ان بدمعاشوں کے بیان کے مطابق تم ایک معزز جج کی بیٹی ہو تو انہوں نے بیٹے کو اجازت نہیں دی کہ تمہیں تھانے لے جائیں۔"

ایک بزرگ نے کمرے میں آکر کہا۔ "بیٹی! میں تمہیں لایا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو تم عزت سے اپنے گھر پہنچو گی۔"

عزت آبرو کی بات پر اچانک آنسو آگئے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ بزرگ سر جھکا کر تسبیح پھیرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ صائمہ کے آنسوؤں نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

خاتون نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! حوصلے سے کام لو۔ جو ہو چکا ہے اسے ایک مضبوط ارادے کے ساتھ نظرانداز کرو گی تو ایک نئے عزم کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر سکو گی۔"

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "مجھ میں حوصلہ ہے۔ مگر میں اپنے ابو سے کیسے آنکھ ملاؤں گی۔ مجھ سے پہلے وہ شرم سے مر جائیں گے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے انتظار میں جی رہے ہوں اور تمہارے بے گھر ہونے والی بدنامی دور تک نہ پہنچی ہو۔"

وہاں دوسری خاتون بھی آگئی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ "تم اپنے بارے میں کم اور والدین کی نیک نامی کے بارے میں زیادہ سوچو گی تو واپس جا کر بگڑی ہوئی بات بنا لو گی۔ ہمارا وعدہ ہے کہ وہاں اگر بدنامی پھیل گئی ہوگی اور والدین تمہیں قبول کرنے سے ہچکچائیں گے تو ہم تمہیں بیٹی بنا کر رکھیں گے۔"

اس کے سامنے تین راستے تھے پہلا یہ کہ پھر دربدر ہو۔ دوسرا یہ کہ کسی شریف خاندان میں پناہ لے کر ایک بوجھ بنے۔ تیسرا یہ کہ بدنامی ہو یا کچھ بھی ہو' اپنی چوکھٹ پر واپس جائے۔ خون کی کشش نے یہی فیصلہ کیا اور اس نے اپنے ابو کا نام اور پتا بتا دیا۔

جب سید صاحب کو یہ اطلاع ملی کہ بیٹی ہاتھ سے بے ہاتھ ہو کر صحیح ہاتھوں میں پہنچی ہے تو وہ لاہور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ صفیہ بیگم نے تڑپ کر کہا۔ "میں بھی چلوں گی۔ پتا نہیں میری بچی کیسے عذاب سہتی رہی ہے۔ میں اسے کلیجے سے لگا کر دلاسا دوں گی۔"

بڑے بیٹے کاشف جاہ نے کہا۔ "میں بھی جاؤں گا۔ ہم سب کو دیکھ کر باجی کو حوصلہ ہو گا کہ وہ مطعون نہیں ہیں۔ ہم سب انہیں عزت سے لینے آئے ہیں۔"

رمضان گوٹھ سے قاسم اپنی والدہ کے ساتھ آیا تھا۔ اس کی والدہ نے سید صاحب سے کہا۔ "بھائی صاحب! آپ زبان کے دھنی ہیں۔ یہ یاد رکھیں کہ آپ نے صائمہ کو میرے بیٹے سے منسوب کر رکھا ہے۔"

وہ بولے "بہن! آپ بڑی دل والی ہیں۔ اللہ آپ کو اور ایمان دے لیکن جب میں نے زبان دی تھی' تب ایک عزت دار بیٹی کا باپ تھا۔ آج وہ نہیں رہا۔ میں جو چیز عزت اور فخر سے پیش نہیں کر سکتا' اسے آپ طلب نہ کریں۔"

قاسم نے کہا۔ "آپ دین کو اور قانون کو ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ میں صرف اتنا سمجھتا ہوں کہ آپ کی بیٹی کی نیک نامی بحال کرنے کا فرض ادا کرنا چاہیے۔ جس دن میں اسے بیاہ کر لے جاؤں گا' اس دن سے دشمنوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔"

صفیہ بیگم نے روتے ہوئے قاسم کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹا! میری دعا ہے ہماری جوان نسل صفدر اور زبیر جیسی نہ ہو' تمہاری جیسی ہو۔ ابھی تو ہم صائمہ کو لینے

رہے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر بہت الجھی ہوئی ہوگی۔ پتا نہیں کس طرح شرم سے مری جا رہی ہوں... آہ! میرے مالک! تو ہمیں کتنے امتحانوں سے گزارے گا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ رونا اس بات پر آرہا تھا کہ بیٹی خواہ کتنی ہی بدنام ہوا سے کسی نہ کسی طرح دلہن بنا کر رخصت کرنا ہوتا ہے اور رونا اس بات پر بھی آرہا تھا کہ قاسم آنکھوں دیکھی مکھی نگلنا چاہتا تھا خواہ وہ کتنے ہی خلوصِ دل سے ایسا کر رہا ہو۔ مگر بیچ احسانات منہ پر جوتے کی طرح لگتے ہیں۔

☆======☆======☆

اب اجل نواز کے فرائض کی ادائیگی شروع ہو رہی تھی۔ اسی لیے اس نے مجھے سید صاحب کے خاندان کو موت کی ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں پہنچا دیا تھا اور وہاں سے صحیح سلامت نکلنے کا موقع بھی دیا تھا۔ کیونکہ ابھی ہمارا آخری وقت نہیں آیا تھا۔

سید صاحب اپنے ایمان اور اپنی طبیعت کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس کی بہت بڑی سزا بھگت کر بیٹی کو لاہور سے واپس لا رہے تھے۔ ایسے میں انہوں نے کمپارٹمنٹ کے پولیس افسر اور گارڈ کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ خود تو رشوت نہیں دے رہے تھے، دوسرے مسافروں کو بھی رشوت کی لعنت کا احساس دلا رہے تھے۔ نتیجہ وہی ہوا، جو مجرمانہ ذہن رکھنے والے افسران سے ٹکرانے کا ہوتا ہے۔ انہوں نے بظاہر ایک معزز جج کا حکم مان لیا کہ وہ تمام مسافروں سے کرایہ لے کر انہیں باقاعدہ ریلوے کی رسیدیں دیں گے۔ گارڈ رسیدیں لینے کے لیے ٹکٹ چیکر کے پاس کسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں گیا۔ اس کے پیچھے انسپکٹر بھی پہنچ گیا۔ وہ دونوں نہیں چاہتے تھے کہ اس کمپارٹمنٹ سے ہونے والی ہزاروں روپے کی آمدنی ماری جائے۔

انسپکٹر نے کہا۔ ”وہ بڈھا جج ٹرین رکتے ہی ریلوے پولیس کے دفتر یا اسٹیشن ماسٹر کے پاس جائے گا۔ وہاں ٹرین زیادہ دیر نہیں رکے گی۔ اتنی دیر میں مَیں اس کے پورے خاندان کو ٹرین سے نکال پھینکوں گا۔“

اس نے اپنے چند سپاہیوں کو بلا کر ہدایات دیں کہ ساہیوال میں ٹرین رکتے ہی انہیں کیا کرنا ہوگا۔ ہر سپاہی نے اپنی ڈیوٹی اچھی طرح سمجھ لی۔ جب وہ ٹرین ساہیوال پہنچی تو انسپکٹر نے سید صاحب کو اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کے پاس آ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آخر تمہارے ابو جان مان گئے۔ وہ ادھر اے سی پارلر میں اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ ہیں۔ آپ سب کی سیٹیں ہو گئی ہیں۔ فوراً چلیں ورنہ ٹرین چل پڑے گی۔“

صفیہ بیگم اور کاشف جاہ کو یقین نہیں آیا کہ سید صاحب ائیر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں سفر کریں گے۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ بیٹی کے معاملے میں بڑے زخم کھا کر اسٹیشن ماسٹر

سمجھوتا کر رہے ہیں۔ سید صاحب کے پاس جا کر حقیقت معلوم کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ٹرین تھوڑی دیر میں چلنے والی تھی۔ اپنے سامان کے ساتھ ہی اِدھر جا کر حقیقت معلوم کی جا سکتی تھی۔

سپاہی ان سے پوچھ کر ان کا سامان اٹھا کر بار بار جلدی چلنے کی تاکید کرنے لگے۔ وہ بے چارے پہلے ہی حالات کے مارے ہوئے تھے۔ اپنے سامان کے ساتھ سید صاحب کی طرف چل پڑے۔ ایک سپاہی نے منصوبے کے مطابق سید صاحب کے دس برس کے بیٹے عارف جاہ کا ہاتھ پکڑا پھر اسے ایک طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ”اِدھر آؤ۔ اُدھر بھیڑ ہے۔ ہم اس دروازے سے اتریں گے۔“

وہ اسے دوسرے دروازے سے اتار کر ایک ٹی اسٹال کے پاس لایا۔ وہاں سے ایک کیک پیس خرید کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ ”بیٹے! اسے کھاؤ تمہارے ابو ادھر سامنے والے ڈبے میں ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔“

وہ اسے پھسلا کر دوسری طرف لے گیا۔ صفیہ بیگم نے ایک بیگ اٹھا کر چلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر پوچھا۔ ”عارف کہاں ہے؟“

کاشف نے کہا۔ ”ہمارا چھوٹا بھائی نظر نہیں آ رہا ہے۔“

انسپکٹر نے سپاہیوں سے کہا۔ ”سامان یہاں پلیٹ فارم پر رکھو اور بچے کو تلاش کرو۔ وہ تو ہمارے ساتھ ہی کمپارٹمنٹ سے اتر گیا تھا۔“

ایک سپاہی نے تائید کی۔ ”جی ہاں۔ ہمارے ساتھ آ رہا تھا۔ بھیڑ میں کہیں رہ گیا ہے۔“

صفیہ بیگم اور صائمہ سامان کے پاس کھڑی رہیں۔ باقی سب عارف کی تلاش میں چلے گئے۔ سید صاحب نے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے نکل کر اپنی بیوی اور بیٹی کو دیکھا پھر قریب آ کر پوچھا۔ ”یہ تم دونوں سامان کے ساتھ یہاں کیوں کھڑی ہو؟“

صفیہ بیگم نے پریشان ہو کر کہا۔ ”عارف کہیں گم ہو گیا ہے۔ کاشف اور انسپکٹر وغیرہ اسے تلاش کرنے گئے ہیں۔“

سید صاحب بھی بیٹے کو تلاش کرنے ایک طرف چل پڑے۔ ابھی اس سوال کا جواب ضروری نہیں تھا کہ بیوی اور بیٹی سامان سمیت کمپارٹمنٹ سے کیوں نکل آئے تھے۔ اہمیت بیٹے کی گمشدگی کی تھی۔ وہ جگر کا ٹکڑا تھا۔ اسے تلاش کیا جا رہا تھا۔

ٹرین چل پڑی۔ انہیں پلیٹ فارم پر چھوڑ کر آگے چلی گئی۔ پلیٹ فارم پر مسافر برائے نام رہ گئے۔ باپ بیٹے مختلف سمت سے عارف کو تلاش کرتے ہوئے صفیہ بیگم اور

صائمہ کے پاس آئے۔ صفیہ بیگم رو پڑیں۔ ”کہاں ہے میرا بیٹا؟“

کاشف نے کہا۔ ”ابو! عارف کہیں ٹرین میں نہ رہ گیا ہو۔“

باپ بیٹے تیزی سے چلتے ہوئے ریلوے پولیس کے دفتر کی طرف جانے لگے۔ عارف کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی جائے اور اگلے اسٹیشن کی پولیس سے گزارش کی جائے کہ اسے ٹرین سے تلاش کرے۔ شاید وہ اسی کمپارٹمنٹ میں ہو۔

وہ دونوں دفتر کے دروازے پر پہنچتے ہی ٹھٹک گئے۔ ایک پولیس انسپکٹر اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ میز کے دوسری طرف عارف ایک کرسی پر بیٹھا کیک کھا رہا تھا۔ کاشف نے آگے بڑھتے ہوئے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”عارف! یہاں کیا کر رہے ہو؟“

اس سے پہلے سید صاحب نے آگے بڑھ کر گھٹنے ٹیک کر عارف کو گلے لگالیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ انسپکٹر نے کہا۔ ”اچھا تو یہ آپ کا بیٹا ہے۔ تعجب ہے آپ لوگ بچوں سے اتنے غافل کیوں رہتے ہیں۔ یہ ہمیں اسٹیشن کے باہر ملا تھا۔“

سید صاحب نے پوچھا۔ ”بیٹے! تم ماں کو چھوڑ کر اسٹیشن کے باہر کیوں گئے تھے؟“

”ابو! ایک سپاہی مجھے لے گیا تھا۔ وہاں مجھے چھوڑ کر پتا نہیں کہاں چلا گیا۔“

وہاں کھڑے ہوئے ایک سپاہی نے کہا۔ ”پتا نہیں‘ یہ کس سپاہی کی بات کر رہا ہے۔ اسے تو میں یہاں لایا ہوں۔“

عارف نے کہا۔ ”وہ دوسرا سپاہی تھا۔“

کاشف نے کہا۔ ”یہ معاملہ کچھ کچھ سمجھ میں آرہا ہے۔ ابو! کیا آپ نے کمپارٹمنٹ والے انسپکٹر سے کہا تھا کہ ہم یہاں سے اے سی پارلر میں سفر کریں گے؟“

”ہرگز نہیں۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ کیا اسی لیے تم سب کمپارٹمنٹ سے اتر آئے تھے؟“

”جی ہاں‘ اگرچہ ہمیں یقین نہیں تھا مگر آپ کے پاس آ کے تصدیق کرنا چاہتے تھے۔“

سید صاحب شکست خوردہ انداز میں کرسی پر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ ”بزرگو! آخر یہ معاملہ کیا ہے؟“

کاشف جاہ نے کہا۔ ”ایک پولیس انسپکٹر نے دھوکا دے کر ہمارے پورے خاندان کو ٹرین سے اتار دیا ہے۔ آپ کے سامنے جو بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں‘ یہ جج ہیں۔ ان کا نام سید آصف جاہ ہے۔ وہ انسپکٹر ایک گارڈ کے ساتھ پورے کمپارٹمنٹ کے مسافروں سے پورا کرایہ لے رہا تھا اور ریلوے کی رسیدیں نہیں دے رہا تھا۔ جب میرے والد

نے رشوت اور بے ایمانی سے روکا تو اس نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔“

انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور سید صاحب کو سلیوٹ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے سن کر افسوس ہو رہا ہے کہ ایک معزز جج کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ آخر وہ انسپکٹر کون تھا۔ اس کا نام کیا تھا؟“

سید صاحب نے کہا۔ ”میں اس کا نام نہیں جانتا۔ آپ لاہور کے اسٹیشن ماسٹر سے دریافت کر سکتے ہیں۔ وہ انسپکٹر چند سپاہیوں کے ساتھ ملتان جا رہا تھا لیکن اس نے پورے کمپارٹمنٹ کو ریزرو کر رکھا تھا اور مسافروں سے کرایہ وصول کر کے انہیں وہاں سیٹیں دے رہا تھا۔“

انسپکٹر نے ریسیور اٹھا کر لاہور کے ایس ایم سے رابطہ کیا۔ اسے وہ تمام باتیں بتائیں جو سید صاحب نے بیان کی تھیں۔ ادھر سے ایس ایم نے کہا۔ ”ہمارے پاس ٹرین کی تمام بوگیوں اور ان کے کمپارٹمنٹ کا چارٹ موجود ہے۔ اس ٹرین میں کوئی کمپارٹمنٹ پولیس کے لیے ریزرو نہیں کیا گیا ہے۔“

انسپکٹر نے یہ بات سید صاحب کو بتائی۔ انہوں نے ریسیور لے کر ایس ایم سے اپنا تعارف کرایا۔ پھر کہا۔ ”میں اپنی فیملی کے ساتھ اس کمپارٹمنٹ سے اتارا گیا ہوں۔ میرے ساتھ فراڈ کیا گیا ہے۔ میں ایک معزز جج ہوں کوئی غلط رپورٹ نہیں دے رہا ہوں۔ اس کمپارٹمنٹ کے کسی مسافر کے پاس ٹکٹ یا ریلوے کی رسید نہیں ہے۔“

ایس ایم نے کہا۔ ”آپ وہاں تشریف رکھیں۔ میں ملتان فون کر رہا ہوں۔ جیسے ہی ٹرین وہاں پہنچے گی‘ وہاں کا ایس ایم اور پولیس والے آپ کے بیان کی تصدیق کریں گے۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ سید صاحب وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ کاشف چھوٹے بھائی کو ماں اور بہن کے پاس لے گیا۔ صفیہ بیگم اسے گلے لگا کر چومنے لگیں۔ کاشف نے کہا۔ ”ابو کی دیانت داری ہم سب کو نئے نئے عذاب میں مبتلا کرتی ہے۔ عارف کو ایک سپاہی پکڑ کر اسٹیشن کے باہر لے گیا تھا۔ دوسرے سپاہی نے اسے یہاں ریلوے پولیس کے دفتر میں پہنچا دیا۔ اتنی دیر میں انہوں نے ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح ٹرین سے باہر پھینک دیا ہے۔“

صفیہ بیگم نے کہا ”ہاں ان رشوت کھانے والوں کی چالاکی سمجھ میں آرہی ہے۔ مگر تمہارے ابو کبھی نہیں سمجھیں گے۔ ہمیں نئی نئی مصیبتوں میں مبتلا کرتے رہیں گے۔“

”امی! وہ وہاں دفتر میں بیٹھے قانونی کارروائی کر رہے ہیں۔ انہیں یقین کیوں نہیں

آتا کہ ہمارے ہاں قانون صرف کتابوں میں پڑھنے کے لیے ہے' کارروائی کے لیے نہیں ہے۔"

وہ سب ویٹنگ روم میں آ گئے۔ جوان بیٹے کے اندر نفرت کی آگ سلگ رہی تھی۔ اس آگ کو اجل نواز بھڑکا رہا تھا۔ یہ اس کا طریقۂ کار تھا کہ کسے' کس طرح' کس مرحلے پر لا کر اس کے قانونِ حیات کو ختم کرنا ہے۔

موت کبھی بہت زیادہ میٹھی ہو کر انسان کے اندر ذیابیطس کا مرض بن جاتی ہے اور کبھی بہت زیادہ تلخ ہو کر کینسر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی انتقام لینے کی ضد میں بے موت مارتی ہے۔ یہ مختلف صورتوں میں انسان کے اندر پرورش پاتی رہتی ہے۔ اجل بھی کاشف جاہ کے اندر نفرت کی پرورش کر رہا تھا۔ باپ کے خلاف نفرت کی ٹھوس وجوہات تھیں باپ کی معمولی سی غلطیوں پر اولاد کہتی ہے کہ بڈھا سٹھیا گیا ہے جبکہ وہ بڈھا جج' بے ایمان معاشرے میں ایماندارانہ غلطیوں کا پلندا تھا۔

بیٹا باپ سے نفرت کرتا تھا مگر اظہار نہیں کرتا تھا کیونکہ تھوڑی محبت بھی کرتا تھا۔ تھوڑا ترس کھاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کیا چیز بنا کر بھیجی ہے۔ بے چارہ طرح طرح کی ذلتیں برداشت کر رہا تھا مگر قانون کی بالادستی قائم رکھنے کی ناکام کوشش کرتا جا رہا تھا۔

ریلوے پولیس کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے تین گھنٹے گزر گئے۔ سید صاحب نے انسپکٹر سے کہا "ٹرین ملتان سے آگے جا چکی ہو گی۔ لاہور کے اسٹیشن ماسٹر نے کہا تھا' میرے بیان کی تصدیق کریں گے پھر مجھے فون کریں گے۔ پلیز آپ رابطہ کریں۔"

انسپکٹر نے رابطہ کیا پھر ریسیور سید صاحب کو دیا۔ انہوں نے اسے کان سے لگا کر کہا "ہیلو' آپ نے فرمایا تھا کہ ٹرین ملتان پہنچے گی تو میرے بیان کی تصدیق کی جائے گی۔ میں یہاں تین گھنٹے سے آپ کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے ایس ایم نے کہا "جناب! آپ نے ملتان کے ایس ایم کو اور پولیس والوں کو خواہ مخواہ پریشان کیا ہے۔ اس ٹرین کی کسی بوگی میں پولیس ریزرویشن والا کمپارٹمنٹ نہیں ہے اور جس کمپارٹمنٹ کی آپ نے نشاندہی کی ہے' وہاں کوئی مسافر بے ٹکٹ نہیں ہے۔ ہمارے ٹکٹ چیکر اور گارڈ فرض شناس ہیں۔ پوری ٹرین میں مسافروں کے پاس ٹکٹ موجود ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ سید صاحب ریسیور کان سے لگائے خلا میں تکتے رہے۔ اب وہ کیا کر سکتے تھے؟ ریلوے کے کس معتبر عہدے دار کو آواز دیتے؟ جب بے ٹکٹ مسافروں کو اور چوروں کو پکڑنے والے ہی چور ہوں اور ایک معزز چشم دید گواہ

کو ٹرین سے باہر پھینک کر چلے گئے ہوں تو پھر وہ کیا کر سکتے تھے؟ ثبوت اور معتبر گواہی کے بغیر عدالت میں بھی مجرم رہا ہو جاتے تھے اور وہ کچھ نہیں کر پاتے تھے۔

انہوں نے ہزار کا ایک نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "تین مرد اور دو خواتین ہیں۔ آپ لاہور سے کراچی کا ٹکٹ بنا دیں۔"

"ٹکٹ تو ساہیوال سے بنے گا۔"

"لیکن میں اپنی فیملی کے ساتھ لاہور سے آ رہا ہوں۔ ابھی ہمیں جس ٹرین سے اتارا گیا ہے' اس کا گارڈ ہمیں کرائے کی رسید نہیں دے رہا تھا۔ بہرحال وہ اس کا عمل تھا لیکن لاہور سے ساہیوال تک کا کرایہ میرے پورے خاندان پر واجب ہے۔"

ایس ایم نے وہ نوٹ لیا۔ پھر چور نظروں سے انسپکٹر کو دیکھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ ایک جج کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کس طرح اس انصاف کرنے والے کو انصاف کرنے کے ناقابل بنا دیا گیا ہے۔ ایس ایم اور انسپکٹر دونوں اس کی ایمانداری اور شرافت سے متاثر تھے کیونکہ بے ایمان بھی ایمان کو محض اس لیے مانتے ہیں کہ وہ مسلمان پیدا ہوتے ہیں اور مسلمان رہ کر مرتے ہیں۔

وہ تھوڑی دیر بعد ویٹنگ روم میں آئے پھر بیگم سے بولے۔ "اگلی ٹرین میں ہماری سیٹیں ہو گئی ہیں۔ انشاء اللہ ہم کل شام تک کراچی پہنچ جائیں گے۔"

بیگم نے پوچھا "ان مجرموں کا کیا بنا" جن کا آپ محاسبہ کر رہے تھے؟"

"وہ ٹرین اتنی دور نکل گئی ہے کہ اب میں انہیں مجرم ثابت نہیں کر سکوں گا۔"

"آپ کو ایسا کر کے کیا ملا؟"

"میں کچھ پانے کے لالچ میں نہیں کرتا۔ صرف فرض ادا کرتا ہوں۔"

"آپ کے فرائض کی ادائیگی نے جوان بیٹی کو اغوا کرایا۔ ابھی چھوٹے بیٹے کو اغوا کیا گیا تھا۔ خدانخواستہ ہمارا عارف ہمیں نہ ملتا تو کیا ہوتا؟"

"خدا کا شکر ادا کرو۔ یہ ہمیں مل چکا ہے۔"

"آپ کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ دشمن انتقام لینے کے لیے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے ہماری اولاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔"

"یہ دشمنوں کی نادانی ہے۔ مکافاتِ عمل سب کے لیے ہے۔ جو میری بیٹی کا برا چاہتے تھے' ان کا انجام دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ نادر جیل میں ہے۔ زبیر گرفتار ہو چکا ہے۔ سفدر پولیس سے چھپنے کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہو گا۔ میری سگی بہن اپنے بیٹے زبیر کے لیے اور نادر کی بیوی اپنے بیٹے صفدر کے لیے دن رات روتی رہتی ہیں۔"

"وہ لوگ جو بھی سزا پا رہے ہوں مگر ہمیں کس جرم کی سزائیں مل رہی ہیں؟"

"جو سزا نیکی کے عوض ملے' وہ سزا نہیں' آزمائش ہوتی ہے۔"

"یااللہ! میں کیا کروں؟ آپ ہر بات کا جواب دین کے حوالے سے دیتے ہیں۔ میں کیسے سمجھاؤں کہ ہماری دنیاداری کو کیسے نقصان پہنچ رہا ہے؟"

"بیگم! ذہن کو ذرا وسعت دو اور غور کرو کہ میری طرح جو دین دار نہیں ہیں' کیا ان کی بیٹیاں اور بہنیں اغوا نہیں کی جاتی ہیں؟ کیا ان کے گھروں سے' اسکولوں سے غازی جیسے بچوں کو لے جا کر یرغمال نہیں بنایا جاتا؟ کیا ہمارے کاشف جیسے ہزاروں لاکھوں جوان بے روزگار نہیں ہیں؟ یہ تنہا ہم جیسے دیانتداروں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ بددیانت لوگوں پر بھی مصائب نازل ہوتے ہیں۔ میں انصاف کرتا ہوں اور جو جج صاحبان اپنے فرائض انجام نہیں دیتے ان کے گھروں میں بیماریاں آتی ہیں' جو رشوت کی مہنگی دواؤں سے بھی نہیں جاتیں۔ حادثہ مجھے بھی پیش آتا ہے اور رشوت کی کاروں میں بیٹھنے والوں کو بھی پیش آتا ہے۔ یہ دنیا مصائب کا گھر ہے۔ یہاں بے ایمان اور ایماندار سب ہی کو دکھ جھیلنا ہے۔ کوئی ذلت سے جھیلتا ہے اور کوئی نیک نامی سے۔ مجھے نیک نامی سے جھیلنے دو۔"

"میں مانتی ہوں کہ بے ایمان لوگوں کی بیٹی بھی اغوا کی جاتی ہے لیکن ہماری صائمہ کے اغوا کے بعد نیک نامی کہاں رہی؟"

"ایک بے ایمان کو دہری ذلتیں ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بے ایمان ہے اور دوسرے یہ کہ لڑکی بدنام ہوئی۔ مجھے ایک ذلت ملی کہ بیٹی بدنام ہوئی مگر میری برسوں کی ایمانداری اور نیک نامی حساس لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ قاسم جیسے فراخ دل جوان نیک نامی کو ترجیح دے کر بدنامی کا داغ دھونے آتے ہیں۔ ہماری جوان نسل بہت ذہین' بہت حساس ہے۔"

قاسم کا نام سن کر صفیہ بیگم کی ڈھارس بندھی۔ یہ اطمینان ہوا کہ ایمانداری کا پھل ملنے والا ہے۔ ان کی بیٹی گھر سے دلہن بن کر جائے گی۔

وہ سب دوسرے دن کراچی پہنچ گئے۔ انہوں نے ریڈیو کے ذریعے اس ٹرین کے حادثے کی خبر سنی۔ ٹی وی اسکرین پر اس حادثے کا منظر دیکھا۔ صفیہ بیگم نے قائل ہو کر کہا "آپ کی دیانت داری نے ہماری جان بچائی ہے۔"

"بیگم! اس سے پہلے بھی حادثات ہوئے ہیں۔ آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ پتا نہیں کتنے لوگ ہلاک ہوتے ہیں۔ ان میں سب ہی بے ایمان نہیں ہوتے۔ موت برحق ہے' اچھوں کو بھی آتی ہے اور بروں کو بھی۔"

جس کمپارٹمنٹ سے وہ اتر گئے تھے۔ اس میں حادثے سے کئی مر گئے تھے اور کئی بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز نے ان کی تصاویر اور ان کے بیانات شائع کئے تھے۔ ان میں سے تقریباً گیارہ زخمی مسافروں نے بیان دیا تھا کہ وہ اپنے اعمال کی سزا پا رہے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ لاہور سے اس کمپارٹمنٹ میں سید آصف جاہ نامی ایک جج اپنی فیملی کے ساتھ سوار ہوئے تھے۔ انہوں نے نیک ہدایات کی تھیں کہ ہمیں نہ رشوت لینا چاہیے نہ دینا چاہیے۔ انہوں نے پولیس اور گارڈ کو مجبور کیا کہ وہ کرائے کی رسیدیں دیں لیکن پولیس اور گارڈ نے بڑی چالاکی سے انہیں ساہیوال اسٹیشن پر اتار دیا۔ ہم ایک جج کی موجودگی سے حوصلہ پا کر رشوت نہیں دے رہے تھے۔ پھر ان کی عدم موجودگی نے ہمیں رشوت دے کر سفر جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ شخص ایک معزز جج نہیں تھے کوئی ولی اللہ تھے۔

ان سب کے بیانات تمام اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہو رہے تھے۔ ریلوے حکام پریشان ہو کر بیان کی تردید کر رہے تھے۔ مبصر حضرات الزام عائد کر رہے تھے کہ ریلوے اس لیے خسارے میں رہتی ہے کہ اس شعبے کے مختلف حصوں میں لوٹ کھسوٹ جاری رہتی ہے۔ روزانہ دو چار ٹرینوں کے پورے کمپارٹمنٹ پولیس یا ریلوے کے نام ریزرو رکھنے کے بہانے مسافروں سے پورا کرایہ لے کر اوپری آمدنی کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے۔

اخبارات والوں نے سید صاحب کو بھی گھیر لیا تھا اور ان کا یہ تفصیلی بیان شائع کیا کہ کس طرح ان سے اور ان کی فیملی سے زیادتی کر کے رشوت کے کاروبار کو جاری رکھا گیا ہے۔

چونکہ رشوت خوری کے گیارہ زخمی چشم دید گواہان تھے۔ پھر ایک معزز جج کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ اس لیے ریلوے حکام نے اس جرم میں شریک رہنے والے پولیس انسپکٹر گارڈ اور ایس ایم وغیرہ کو معطل کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے کا ڈراما کیا اور وقتی طور پر اخبارات والوں سے جان چھڑالی۔

لیکن ریلوے کے اعلیٰ عہدے داروں پر حکومتی پارٹی کا دباؤ بڑھنے لگا کہ اس مقدمے کو کھٹائی میں ڈالا جائے اور پھر رفتہ رفتہ ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ برسرِ اقتدار پارٹی کے چند بااثر افراد کے رشتے دار اور کارندے اس مقدمے میں ملوث تھے۔ سید صاحب کی دیانت داری کا خاصا چرچا تھا۔ یہ سب جانتے تھے کہ وہ کسی بھی مرحلے میں سمجھوتا نہیں

کریں گے۔

ان کی دیانت داری کا تو یہ کیا گیا کہ مقدمہ لاہور کی عدالت میں قائم کیا گیا کیونکہ ٹرین وہیں سے چلی تھی۔ وہیں تمام مجرم تھے اور ریلوے کو نقصان پہنچانے کے جرم کا ارتکاب وہیں سے ہوا تھا۔ اس طرح ایک غریب جج کے لیے یہ مشکلات پیدا کر دی گئیں کہ وہ ہر پیشی میں کراچی سے لاہور آیا کرے۔

کراچی سے لاہور اور پھر لاہور سے کراچی واپسی کا سفر کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ آمدورفت کا کرایہ پھر لاہور میں قیام کرنے کے اخراجات اتنے تھے کہ ایک دو پیشیوں میں ان کی ایک ماہ کی تنخواہ ختم ہو جاتی۔ گھر میں کئی کئی دن کے فاقے رہتے۔ پھر وہ عدالتی ہتھکنڈے سمجھتے تھے کہ ایک دو پیشیوں میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کر کے انہیں برسوں لاہور آتے جاتے رہنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اس بار وہ بری طرح پھنس گئے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئے۔

کاشف نے کہا "ابو! میں آپ کے معاملات میں نہیں بولتا ہوں۔ کیونکہ امی کو بولتے اور ہارتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں لیکن آج کہہ رہا ہوں کہ آپ پر بڑا ترس آ رہا ہے آپ آٹھ سو میل جایا کریں گے اور آٹھ سو میل واپس آیا کریں گے۔ یوں باقی عمر سولہ سو میل گھسٹتے رہنے کی سزائیں پاتے رہیں گے اور ہم سب کو فاقوں سے مارتے رہیں گے۔"

انہوں نے کراچی اور لاہور کے کئی جج صاحبان اور وکلا سے رابطہ کیا۔ ان سے مشورے لیے۔ سب ہی قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ان کے حامی تھے لیکن وہ تمام صاحبان بھی حکومت اور اپوزیشن پارٹیوں کے درمیان سینڈوچ بنے ہوئے تھے۔ اگر کوئی سید صاحب کے کام آنا چاہتا تھا تو دوسرا اس کا توڑ کرتا تھا۔

ایک بزرگ جج نے سمجھایا "سید صاحب! دانش مندی کا تقاضا ہے کہ آپ اس مقدمے کو ختم کریں کیونکہ اس کمپارٹمنٹ میں زندہ بچنے والے گیارہ زخمی گواہان کا تعلق بھی حیدر آباد اور کراچی سے ہے۔ ان میں سے کوئی بھی بار بار پیشی بھگتنے کے لیے لاہور نہیں جائے گا۔ ان کی عدم موجودگی سے کیس کمزور پڑتا جائے گا اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ بااثر افراد ان گواہوں کو خرید نہیں سکیں گے؟"

ایک صبح دو مسافر ان کے دروازے پر آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا "ہم اس کمپارٹمنٹ کے مسافر ہیں اور آپ کی طرف سے گواہ ہیں لیکن ہم گواہی کے لیے پیش نہیں ہو سکیں گے۔ پرسوں مجھے فون پر دھمکی ملی تھی۔ کل کچھ نامعلوم لوگ میرے گھر کے دروازے پر فائرنگ کرتے ہوئے گئے ہیں۔"

دوسرے نے کہا "میری بیوی السر کی مریضہ ہے۔ کل اس کا آپریشن ہے۔ مجھ سے فون پر پوچھا گیا ہے کہ بیوی کو آپریشن تھیٹر سے زندہ واپس لانا چاہتے ہو یا نہیں؟

"حضور! آپ سچے ہیں۔ ایمان والے ہیں۔ ہم آپ کو ولی اللہ کا درجہ دیتے ہیں مگر آپ ہمیں اس مقدمے کے سلسلے میں معاف کر دیں۔"

"حضور! ہم مزید تین ایسے گواہوں سے واقف ہیں، جو شرمندگی کے باعث آپ کے سامنے نہیں آ رہے ہیں۔ شرمندگی یہی ہے کہ وہ عدالت میں حاضر نہیں ہوں گے۔"

سید صاحب نے کہا "کوئی بات نہیں۔ ہر شخص کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ آپ نے پانچ گواہوں کی معذوری و مجبوری بیان کی ہے۔ باقی چھ کے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی حالات پیش آ رہے ہوں گے۔ آپ جائیں، مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

وہ مجرموں کی طرح ندامت سے سر جھکا کر چلے گئے۔ سید صاحب دروازے سے پلٹ کر کمرے میں آئے تو ان کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ وہ ایک منصف ہو کر قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے سلسلے میں پہلے بھی ناکام ہوتے رہے تھے۔

بیگم نے کہا "آپ منصفی چھوڑ دیں، کوئی دوسرا کام کریں۔"

"دنیا کا کون سا ایسا کام ہے، جس میں تھوڑی بہت بددیانتی نہیں ہوتی۔ میں اگر قصائی بن جاؤں تب بھی گاہکوں کو صرف گوشت تول کر دوں گا۔ ہڈیاں اور چھیچھڑے نہیں دوں گا۔ بیمار جانور کا گوشت فروخت نہیں کروں گا۔ بوٹ پالش کروں گا تو تیل، اسپرٹ اور کالا رنگ ملا کر سستی اور نقلی بوٹ پالش سے گاہکوں کے جوتے عارضی طور پر نہیں چمکاؤں گا۔ مجھ سے کسی کام میں، کسی پیشے میں بے ایمانی نہیں ہو گی۔"

کاشف نے کہا "یہی آپ مجھ سے چاہتے ہیں۔ میں پچیس برس کا جوان ہوں۔ دس جماعتیں پاس کرنے کے بعد کہیں ملازمت نہیں مل رہی ہے۔ آپ کو یہ منظور نہیں ہے کہ کسی دکان میں سیلز مین بن کر پچاس روپے کے مال کو سو روپے میں فروخت کروں۔ گھٹیا کوالٹی کو عمدہ کوالٹی کہہ کر گاہکوں کو دھوکا دوں۔ آپ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ مجھے کن ایمان داروں کی جنت میں جا کر روزگار حاصل کرنا چاہیے۔"

"بیٹے! عدالت ایسی جگہ ہے، جہاں قانون کو زیادہ توڑا اور مروڑا جاتا ہے لیکن میں اپنی عدالت میں ایسا نہیں ہونے دیتا کیونکہ میں کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ تم گوشت تولو اس کے ساتھ چھیچھڑے نہ تولو تو منافع کم ہو گا مگر حلال کی روٹی ملے گی اور ایمان سلامت رہے گا۔"

"اگر میں نے ایسا کیا تو اس بازار کے تمام قصائی چھرا لے کر میرے پیچھے دوڑیں۔

گے۔ جس طرح آپ کو ٹرین سے اتار دیا گیا' اسی طرح مجھے بھی ہر بازار سے دھکے ملیں گے لیکن میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اس گھر میں پیدا نہ ہوتا۔ جہاں بھی پیدا ہوتا' وہاں ایمان کے اتنے انگارے نہ بچھے ہوتے جتنے آپ نے ہمارے قدموں تلے بچھا رکھے ہیں۔" وہ اتنا کہہ کر جھنجھلاتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔ سید صاحب اس کے جانے کے بعد بھی کھلے ہوئے دروازے کو تکتے رہے۔ بیٹے نے پہلی بار کھل کر ان کے خلاف کچھ کہا تھا۔ ورنہ بڑی سے بڑی بات پر بے زبان جانور کی طرح چپ رہتا تھا۔

سید صاحب نادان نہیں تھے۔ بیٹے کی خاموشی کے پیچھے چھپی ہوئی ناگواری اور بیزاری کو خوب سمجھتے تھے۔ پھر صفیہ بیگم انہیں بتایا کرتی تھیں کہ جوان بیٹا ان کے پیچھے ان کے خلاف بولنے لگا ہے اور اپنی باجی کے اغوا ہو جانے کا ذمے دار باپ کو ٹھہرا رہا ہے اور ان کی ہٹ دھرمی اور اصول پسندی کے باعث تین ہزار روپے کی ٹیوشن سے محروم ہو کر تلملا رہا ہے۔ سید صاحب کے حساس دل میں یہ صدمہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی اپنا دشمن بنا رہے ہیں۔ ایسے جوان مایوسی کی انتہا کو پہنچتے ہیں اور ذہنی انتشار کے باعث بھٹکنے لگتے ہیں۔ وہ بھی بھٹکنے لگتا تھا۔ پھر باپ کی نیک نامی کے خیال سے سنبھلنے بھی لگتا تھا۔ باپ اگرچہ مزاج کے خلاف تھا مگر بے داغ انسان تھا۔ بھرپور شخصیت کا مالک تھا۔ باپ پھر باپ ہوتا ہے۔ وہ اس کے حواس پر چھایا رہتا تھا۔

ایک شام تو انتہا ہو گئی۔ وہ سب گھر میں تھے۔ صائمہ پھٹے ہوئے دوپٹے کو سی رہی تھی۔ اچانک ہی اسے ابکائی سی آئی۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر اونک اونک کی آوازیں نکالتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔ صفیہ بیگم کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ انہوں نے گھبرا کر اپنے میاں کو دیکھا۔ کاشف نے پوچھا "یہ باجی کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا طبیعت خراب ہے؟"

صفیہ بیگم فوراً ہی اٹھ کر تیزی سے چلتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئیں۔ سید صاحب حواس باختہ سے ہو کر خلا میں تک رہے تھے۔ جب ماں بیٹی کو باتھ روم سے واپس آنے میں دیر ہوئی تو انہوں نے آہستگی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کاشف! دوسرے کمرے میں جاؤ۔"

بیٹا فرمانبرداری سے جانے کے لیے اٹھا پھر رک گیا۔ باتھ روم سے رونے اور سسکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے ماحول خوش گوار تھا۔ اب اچانک ناگوار ہو رہا تھا۔ بیٹے نے باپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو باپ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے چہرے کو

دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ تب کاشف کی سمجھ میں کچھ آیا۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ صفیہ بیگم نے اپنے آنچل سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے باتھ روم سے باہر آکر سید صاحب کو دیکھا۔ وہ جس انداز میں منہ چھپائے بیٹھے تھے' اس سے پتا چل گیا کہ باپ شرم اور غیرت سے مر رہا ہے۔ ماں کے پیچھے صائمہ باتھ روم سے نکلی۔ پھر دوپٹے میں منہ چھپا کر تیزی سے چلتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ دروازہ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی مگر وہاں کاشف کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولا "جو میں سمجھ رہا ہوں اگر وہی ہے تو میں اس کمینے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پولیس اب تک اسے تلاش نہ کر سکی۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ وہ نہ ملا تو اسے پیدا کرنے والی ماں کو قتل کردوں گا۔"

صائمہ روتی اور دوڑتی ہوئی تیسرے کمرے میں چلی گئی۔ ماں نے آکر کہا "بیٹے! جوش میں آکر اتنی اونچی آواز میں نہ بولو۔ محلے پڑوس والے سنیں گے۔ کیا بہن کو تماشا بنانا چاہتے ہو؟"

"اب تماشا بننے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔ کیا ہم اس ذلالت کو اشتہار بننے سے روک سکیں گے؟"

"کچھ تو سوچنا ہوگا۔ کچھ تو کرنا ہوگا۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ اس وقت تمہارے باپ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟"

"کچھ نہیں گزر رہی ہے۔ پتھر کا دل ہوتا ہے نہ احساس۔ دشمنی کی ابتدا ان کے ایمان اور انصاف سے ہوئی ہے۔ نہ یہ صفدر کو مجرم ٹھہراتے اور ایک سال کی سزا سناتے' نہ وہ ایسی شرمناک انتقامی کارروائی کرتا۔ انہوں نے تو اپنی عاقبت سنوار لی مگر بیٹی کی زندگی جہنم بنا دی۔"

ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ اپنے ابو کی شان میں گستاخی کر رہے ہو۔ شرم نہیں آتی؟ اب ان کے خلاف کچھ کہا تو تمہیں بیٹا نہیں کہوں گی۔"

اس نے ایک لمبی سانس کھینچی پھر آہستہ آہستہ سانس چھوڑتے ہوئے بولا "معافی چاہتا ہوں۔ مجھے ابو کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ وہ اپنے معاملات سے نمٹتے آئے ہیں۔ اب میں اپنے معاملے سے خود نمٹ لوں گا۔ دشمنوں کو خاک میں ملا کر رکھ دوں گا۔"

وہ غصے سے جانے لگا۔ ماں نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ "رک جاؤ۔ تم جوش میں آکر بنا ہوا کام بگاڑ دو گے۔"

وہ ماں کا ہاتھ جھٹک کر تیزی سے چلتا ہوا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں اُبل
پھر وہاں سے پاؤں پٹختا ہوا آنگن میں پہنچا۔ سامنے باہر گلی میں کھلنے والا دروازہ تھا۔ اس
نے قریب آکر دیکھا' وہ صرف بند ہی نہیں تھا بلکہ اس پر تالا بھی پڑا ہوا تھا۔ وہ غصے سے
پلٹ کر بولا "یہ تالا کس نے ڈالا ہے۔ اسے کھولو۔"

صائمہ نے ایک کمرے کے دروازے پر آکر کہا "یہ نہیں کھلے گا۔ چابی میرے پاس
ہے۔"

وہ بہن کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "باجی! میرا راستہ نہ روکو۔ میرا خون کھول رہا
ہے۔"

"مجھے باجی مت کہو۔ باپ کی شرافت کو گالی دینے کے بعد مجھ سے بھائی کا رشتہ
نہیں رہ جاتا۔ کیا ابو کی یہ بات بھول گئے کہ جو مصیبت ایک ایمان والے کے گھر آتی ہے'
ویسی ہی مصیبت کسی بے ایمان کے گھر بھی جاتی ہے۔ کیا تم اس شہر کا اور پورے ملک کا
سروے کرکے بتا سکتے ہو کہ کتنے ایمان اور نیم ایمان والوں کی بیٹیاں کنواری مائیں بنی
رہتی ہیں۔ اگر ایسا دوسرے گھروں میں بھی ہوتا ہے تو تم محض ایک ایمان والے کو موردِ
الزام کیوں ٹھہراتے ہو؟"

وہ منہ پھیر کر آنگن میں بچھی ہوئی چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر کوئی کچھ نہ بولا گھر میں
ماتمی خاموشی چھا گئی۔ رات کا اندھیرا گزرتے ہوئے دن کے آخری لمحات پر چھا رہا تھا۔ مگر
کوئی اپنے کمرے کی لائٹ آن نہیں کر رہا تھا۔ صرف ایک چھوٹے سے آخری کمرے میں
روشنی تھی' وہاں عارف اسکول کا سبق پڑھ رہا تھا۔ کاشف کے دماغ میں آندھیاں سی چل
رہی تھیں۔ وہ جوش و جنون میں دشمنوں کو مار ڈالنے کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن مسئلہ پھر
بھی حل ہونے والا نہیں تھا۔ دشمن کو مار ڈالنے کے بعد بھی اس کی کمینگی اس گھر میں جنم
لینے والی تھی۔

وہ بڑی دیر تک آنگن میں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں آیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ماں کی
آواز آئی۔ "آؤ بیٹا! یہ غصے کا وقت نہیں ہے۔ لائٹ آن کرو۔"

اس نے سوئچ آن کیا۔ کمرا روشن ہو گیا۔ سید صاحب ایک سیکنڈ ہینڈ صوفے پر سر
جھکائے بیٹھے تھے۔ کاشف نے قریب آکر ان کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کہا۔ "ابو! مجھے
معاف کردیں۔ میں نے گستاخی کی ہے۔"

وہ بدستور خاموش رہے۔ صفیہ بیگم نے کہا۔ "آپ کب تک خاموش رہیں گے
میں اتنی دیر سے بول رہی ہوں' آپ جواب نہیں دے رہے ہیں۔ کیا اس طرح بیٹھے

رہنے سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے "سوچ رہا ہوں' ان حالات میں کیا کیا جاسکتا ہے؟
کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

صفیہ بیگم بھی اپنے بیٹے کی طرح ان کے قدموں میں آکر بیٹھ گئیں' پھر بولیں "بات
ابھی بگڑی نہیں ہے۔ قاسم کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لیے شادی رک گئی تھی۔ اب
تو چالیس دن گزر چکے ہیں۔ ہم کل ہی رمضان گوٹھ چلیں گے اور اسی ہفتے نکاح پڑھانے
کی تاریخ مقرر کر دیں گے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ہوش میں تو ہو؟ یہ شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"دیکھئے' میں بیٹی کی بھلائی کا واسطہ دے کر کہتی ہوں' آپ ایمان اور شرافت کی
بات نہ کریں۔ مجھے پتا ہے آپ قاسم کو کسی دھوکے میں رکھنا نہیں چاہیں گے۔ اسے
صائمہ کی موجودہ حالت بتائیں گے' اگر آپ ایسا کریں گے تو بیٹی سے دشمنی کریں گے۔"

"بیگم! سچے کے ساتھ ہمیشہ سچا رہنا چاہیے۔ قاسم نے اب تک بڑی فراخ دلی کا
ثبوت دیا ہے۔ ہمیں بھی جواباً فراخ دلی سے سچ بولنا چاہیے۔"

"اگر سچ معلوم ہونے پر وہ شادی سے انکار کرے گا' تب کیا ہو گا؟"

کاشف نے باپ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "ابو! زندگی میں پہلے بار ہماری بات
مان لیں۔ اس سلسلے میں کوئی انکشاف نہ کریں۔ جتنی جلدی ہو سکے' صائمہ باجی کا نکاح
اس سے پڑھا دیں۔"

"بیٹے! قاسم بہت اچھا لڑکا ہے لیکن وہ راضی ہو جائے گا تب بھی بات نہیں بنے
گی۔ کیونکہ حاملہ عورت سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔ یہ عمل دین کے خلاف ہے۔"

وہ بھڑک کر بولیں "آپ کیسے باپ ہیں؟ ہماری عزت پر بنی ہے۔ بیٹی کی ساری
زندگی برباد ہونے والی ہے اور آپ پھر دین ایمان کے مسائل بیان کر رہے ہیں۔"

"بیگم! تمہارے طیش میں آنے سے نہ دین بدلے گا' نہ احکامِ شریعت بدلیں گے۔
ہم مسلمان ہیں۔ شریعت محمدی کے مطابق بیٹی کا نکاح پڑھائیں گے۔"

وہ ان کے قدموں کے پاس سے ہٹ گئیں جیسے وہاں انگارے بچھے ہوں۔ وہاں سے
اٹھ کر دور کھڑی ہو گئیں جیسے سامنے بیٹی کا باپ نہیں دشمن بیٹھا ہو۔ کاشف نے دونوں
ہاتھوں سے ان کے پیروں کو پکڑ کر پوچھا "ابو! کیا اپنی بیٹی کی عزت نہیں رکھیں گے؟"

"بیٹے! میں اسی الجھن میں ہوں کہ عزت کیسے بچائی جائے۔ عزت صرف بیٹی کی
نہیں' ہم سب کی جائے گی۔ ہم محلے والوں کو' رشتے داروں کو اور دنیا والوں کو منہ نہیں

دکھا سکیں گے۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔"

"ابو! دنیا والوں نے کبھی ہماری عزت نہیں رکھی۔ اپنے اور بیگانے سب ہی ہم پر کیچڑ اچھالتے رہے لیکن ہم نے اس لیے پامردی سے مقابلہ کیا کہ ہمارے کردار میں کمزوری نہیں تھی لیکن آج گھر میں ایک کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ آپ حالات کے مطابق اپنے ایمان میں تھوڑی سی لچک پیدا کریں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ آپ باجی کا نکاح قاسم سے باقاعدہ نہ پڑھائیں۔ صرف پردہ داری کے عارضی طور پر ایک نکاح نامہ حاصل کرلیں تاکہ دنیا والوں کا منہ بند ہو سکے۔ پھر ایک ماہ بعد ان کا باقاعدہ نکاح قاسم سے.........."

وہ بات کاٹ کر بولے۔ "نکاح باقاعدہ ہی ہوا کرتا ہے۔ بے قاعدہ کبھی نہیں ہوتا۔ بے قاعدگی ہمیشہ گناہ کو چھپانے کے لیے ہوتی ہے۔"

کاشف نے تڑپ کر کہا "میری باجی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ ان پر دنیا والوں نے کیا کم مظالم ڈھائے ہیں کہ اب آپ باپ ہو کر ان پر ظلم کر رہے ہیں۔"

وہ جھنجلا کر ان کے قدموں سے اٹھ گیا۔ ان سے دور ہو کر بولا "آپ سے...... خدا کی قسم آپ سے ڈر لگتا ہے۔ آپ ہم بچوں پر اور ہماری ماں پر عذاب بن کر مسلط ہو گئے ہیں۔ میری امی یہاں دلہن بن کر آنے کی اور ہم یہاں پیدا ہونے کی سزائیں بھگت رہے ہیں۔ یہ گھر نہیں ہے' آپ کی عدالت ہے اور ہم دن رات کے ہر لمحے میں مجرموں کی طرح آپ کے سامنے پیش ہوتے رہتے ہیں۔ مگر نہیں' اب مجھے آپ کے سامنے پیش ہونا منظور نہیں ہے۔ میں آپ کو دنیا کی کسی بھی عدالت کا جج ماننے سے انکار کرتا ہوں۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کمرے میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ صفیہ بیگم انہیں گھور کر دیکھتی رہیں پھر بولیں "میں ایک دائی کے پاس جا رہی ہوں۔"

انہوں نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے دیکھا' وہ بولیں۔ "صائمہ ڈیڑھ ماہ پہلے اغوا ہوئی تھی۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ یہ دوسرا مہینہ ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ دائی سب ٹھیک کر دے گی۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈانٹ کر بولے۔ "بکواس مت کرو یہ جرم ہے۔ خلافِ قانون ہے۔ ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ جان دینے والا وہ خالقِ کائنات ہے' وہ جان ابھی دنیا میں نہیں آئی ہے اور تم اسے ہلاک کرنا چاہتی ہو۔ کیا تم مشبہ

ابرائی کو سمجھتی ہو؟ تالاب کی دلدل ہو یا گناہ کی دلدل' وہ کیچڑ میں کنول کھلاتا ہے۔ میں نے ہمیشہ گناہ سے دامن بچایا ہے۔ اس کے باوجود میرے گھر میں گناہ مجسم ہو رہا ہے تو یہ قدم رکھتی ہے اور میرے رب نے ہزارہا ذلتوں کے درمیان مجھے نیک نام اور باایمان رکھا ہے اور آئندہ بھی مجھے اسی طرح ثابت قدم رکھے گا۔ اس لیے بیگم! یہ بات دماغ سے نکال دو۔ میں دینی احکامات کے خلاف اس ننھی سی جان کے ساتھ کوئی غیر انسانی سلوک نہیں ہونے دوں گا۔"

صفیہ بیگم برسوں سے اس پہاڑ سے ٹکراتی آ رہی تھیں۔ آخر کب تک ٹکراتی رہتیں۔ کب تک زخم کھاتی رہتیں۔ اس آخری بیٹی کے سلسلے کے ٹکراؤ نے حوصلہ ختم کر دیا تھا۔ وہ چکرا کر گر پڑیں پھر بے ہوش ہو گئیں۔

سید صاحب لپک کر قریب آئے۔ بیگم کو اٹھایا۔ ہولے سے جھنجھوڑ کر آوازیں دیں۔ صائمہ ایک دروازے کی آڑ سے ساری باتیں سن رہی تھی۔ ماں کو فرش پر گرتے دیکھ کر وہ بھی دوڑتی آئی تھی۔ باپ بیٹی نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر دونوں کی نظریں جھک گئیں۔ دونوں نے خاموشی سے بیگم کو اٹھا کر ایک چارپائی پر ڈال دیا پھر انہیں ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد وہ کراہنے لگیں۔ ہوش میں آنے لگیں۔ سید صاحب سرہانے سے اٹھ کر دور ہو گئے تاکہ بیگم آنکھیں کھول کر ایک ناپسندیدہ شخص کو نہ دیکھے۔ بیگم نے آنکھیں کھول کر بیٹی کو دیکھا۔ بیٹی نے سر جھکا لیا۔ دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہیں۔ پھر صفیہ بیگم نے بڑی نقاہت سے کہا "بیٹی! تیرا باپ فولاد ہے۔ شیطانوں سے بھرپور طاغوتی دنیا میں ایمان اسی لیے متزلزل نہیں ہوتا کہ ابھی تیرے باپ جیسے لوگ زندہ ہیں۔"

"امی! آپ ابو کے عزائم کو مانتی ہیں۔ پھر ان سے لڑتی کیوں ہیں؟"

"ہاں' آج لڑائی کی انتہا ہو گئی۔ میرا سر چکرا گیا۔ اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ میں تیرے باپ کے ایمان سے نہیں' تجھ سے ڈر رہی ہوں۔"

"تعجب ہے' آپ مجھ سے کیوں ڈر رہی ہیں؟"

"میرے اندر یہ خوف سمایا ہوا ہے کہ تُو ان حالات میں ہمیں بدنامی سے بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جائے گی۔ خودکشی حرام ہے۔ تیرے ابو یہ حرام موت برداشت نہیں کریں گے۔ مجھ سے وعدہ کر تُو ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔"

وہ آنچل سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ دراصل وہ یہی فیصلہ کر رہی تھی کہ اپنے وجود کے اندر ایک بدنامی کی پرورش کرنے اور والدین اور بھائیوں کے سر جھکانے سے بہتر ہے

جان پر کھیل جائے۔ خودکشی کے بعد بدنامی چھپ جائے گی یا اور پھیل جائے گی۔ یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ وہ صرف اپنے بزرگوں اور بھائیوں کی شرمندگی نہیں دیکھ پا رہی تھی۔

صفیہ بیگم نے کہا "تمہارے آنسو بتا رہے ہیں کہ تم ایسا ہی غلط قدم اٹھاؤ گی اور اپنے باپ کے ایمانی عزائم کو ٹھیس پہنچاؤ گی۔"

وہ انکار میں سرہلا کر بولی "نہیں امی! آپ اپنے جی کو روگ نہ لگائیں۔ میری باتیں ابو بھی سن رہے ہیں۔ میں ابو کے ایمان کی قسم کھا کر کہتی ہوں' خودکشی نہیں کروں گی۔ زندہ رہ کر دیکھوں گی کہ ایک بے قصور کو کیوں سزا ملتی ہے اور کتنی سزا ملتی ہے؟"

وہ بیٹی کی باتیں سن رہے تھے۔ پھر سر جھکا کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔ انہیں صائمہ کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گی لیکن بیٹے کی طرف سے اندیشہ تھا۔ پتا نہیں کاشف غصے میں کہاں چلا گیا تھا؟

☆======☆======☆

وہ دوسرے دن عدالت سے منسلک اپنے چیمبر میں تھے۔ وہاں نادر کی بیوی روتی ہوئی آئی' انہوں نے پوچھا "یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

"میرا بیٹا" وہ روتی ہوئی بولی "میرا صفدر گرفتار ہو گیا ہے۔ وہ سول اسپتال میں تھا۔ میں رازداری سے اس کا علاج کرا رہی تھی مگر وہ پولیس والوں کی نظروں میں آ گیا ہے۔ وہ اسے اپنی کسٹڈی میں جناح اسپتال لے گئے ہیں۔"

"تو پھر جناح اسپتال جاؤ۔ میرے پاس کیوں آئی ہو؟"

"بھائی جان! اسے قدرت سزا دے رہی ہے۔ اس کے جسم میں کئی جگہ زخم ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تمام زخم ایسے ناسور بن گئے ہیں کہ دوائیں اثر نہیں کر رہی ہیں۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے۔"

"میں پھر وہی سوال کروں گا' میرے پاس کیوں آئی ہو؟"

وہ رو رو کر بولی "وہ بڑے کرب اور اذیتوں میں مبتلا ہے۔ ایک بار آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔ میں ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں۔ ایک بار اس سے مل لیں۔"

"تم لوگوں نے میرے گھر میں جو آگ لگائی ہے' اس میں ہم کس طرح جل رہے ہیں' یہ تمہیں معلوم نہیں ہے۔ میں تمہارے بیٹے کو کیا معاف کروں گا' میں تو ایک ناچیز بندہ ہوں۔ معاف کرنے والا خدا ہے۔ میں یہاں عدالت میں بیٹھا ہوں' یہاں کسی مجرم کو معافی نہیں ملتی' سزا ملتی ہے۔"

انہوں نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا پھر اسے کہا "خاتون کو باہر لے جاؤ۔"

نادر کی بیوی' صفدر کی ماں آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی۔ کوئی دو دن پہلے پولیس والوں نے صفدر کو سول اسپتال میں پہچان لیا تھا۔ پھر اسے نگرانی میں رکھ کر اس کا بیان لیا تھا۔ وہ زخموں کی تکلیف سے اچھی طرح بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ پھر بھی ٹھہر ٹھہر کر اس نے صائمہ کو اغوا کرنے کی پوری روداد سنا دی۔ اسے یہ بھی بتانا پڑا کہ اس نے صائمہ کو ایک بردہ فروش کے خفیہ اڈے میں پہنچایا تھا۔ جب پولیس افسر نے اس خفیہ اڈے کے

متعلق انکوائری شروع کی تو کچھ سیاسی پردہ نشینوں کے چہرے سامنے آنے لگے۔ حسین عورتوں کو سمندر پار پہنچانے کے ماہانہ لاکھوں اور کروڑوں روپے سالانہ ملتے تھے۔ اس لیے اس دھندے میں بڑے بڑے ہاتھ تھے۔ یہ کیس اس معمولی پولیس افسر سے لے کر دوسرے بڑے افسر کو دے دیا گیا۔ اس بڑے افسر نے پہلے تو صفدر کو جناح اسپتال فرار کرایا۔ پھر اسے سمجھایا۔ "بیان بدل دو۔ ہمارے ملک میں ایسا کوئی اڈا نہیں ہے جہاں حسین عورتوں کو فروخت کرنے کے لیے انہیں بے لباس رکھا جاتا ہے۔ یہ سب افسانوی باتیں ہیں۔ تم اس لڑکی کو اغوا کر کے لاہور لے گئے تھے۔"

"میں اسے آٹھ سو میل دور لاہور نہیں لے جاسکتا تھا۔ میں اسے یہاں سے اس میل دور..........."

بڑے افسر نے ڈانٹ کر کہا "بکواس مت کرو۔ تم اسے لاہور لے گئے تھے۔ اس باپ اسے وہیں سے واپس گھر لایا ہے۔ تم یہی بیان لکھو اور دستخط کرو۔"

وہ بولا "آفیسر! مجھے اپنا آخری وقت نظر آرہا ہے۔ میرا دل، میرا دماغ کہہ رہا ہے کہ ایک ایمان والے سے دشمنی کرنے کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ اس لیے مجھے بھی ایمان سے سچ بولنا چاہیے۔"

اس نے ماں سے کہا تھا "میں گناہ گار ہوں۔ مجھے سزا مل رہی ہے۔ امی! ایک بار بڑے ابو کو یہاں لے آؤ۔ میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ شاید ان کے معاف کرنے سے قبر عذاب کچھ کم ہو جائے۔"

پولیس کے بڑے افسر نے اپنے بڑوں سے کہا "صفدر کی ماں سید صاحب سے لے گئی ہے۔ اگر وہ ایماندار جج آئے گا تو بڑی گڑ بڑ ہوگی۔ وہ بردہ فروشی کے اڈے تک پہنچ کی کوشش میں بااثر افراد تک پہنچ جائے گا۔"

اوپر سے حکم ملا کہ صفدر کی زبان بند کرو۔ بڑے افسر نے صفدر کے اطراف سے پولیس کا پہرا ہٹا دیا صرف ایک نشہ کرنے والے سپاہی کو ڈیوٹی پر رکھا۔ پھر صفدر کو اسپتال سے اغوا کرانے کے بعد اس سپاہی کو اس الزام میں معطل کر دیا کہ اس کے نشہ کرنے کے باعث ایک مجرم اسپتال سے فرار ہو گیا ہے۔

اغوا کرنے والوں میں اجل نواز تھا۔ وہ اسے بہت دور سمندر کے ایک ویران ساحل پر لے آیا تھا۔ اس نے باقی تین غنڈوں سے کہا "تم لوگ گاڑی واپس لے جاؤ۔ تمہارا کام ختم ہو گیا ہے۔" وہ صفدر کو گاڑی سے اٹھا کر ساحل کی ریت پر پھینک کر چلے گئے۔ پہلے ہی زخموں کی تکلیف کم نہیں تھی، یوں بے دردی سے پھینکنے کے بعد اس کی آدھی جان

نکل گئی۔ اجل نے کہا "مجھے کرائے کا غنڈا سمجھ کر تمہارے ساتھ یہاں بھیجا گیا ہے اور یہ ہتھیار بھی دیا گیا ہے کہ اس سے تمہیں ہلاک کردوں۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا "مجھے ہلاک کردو۔ مگر ایک بار اپنے بڑے ابو سے معافی مانگنے کا موقع دے دو۔"

"ارے نادان! موت کب موقع دیتی ہے۔ وہ تو اس جگہ لے آتی ہے، جہاں آخری سانسیں لکھی ہوتی ہیں۔ معافی مانگنے، توبہ کرنے اور راہِ راست پر چلنے کے لیے کیا پوری زندگی کم ہوتی ہے کہ آخری وقت ایسی باتیں یاد کرتے ہو؟"

"ہاں، جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے، تب ڈوبنے کا پتا چلتا ہے اور تب پانی میں زندگی کی سانس لینے کے لیے ہوا نہیں ملتی۔ اٹھاؤ ہتھیار اور مجھے ختم کردو۔"

اجل نے ہتھیار کو ایک طرف پھینک کر کہا۔ "کاتبِ تقدیر نے تمہاری موت ہتھیار سے نہیں، اس زہر سے لکھی ہے جو تمہیں کانٹوں کے چبھنے سے ملا تھا۔ وہ زہر ناسور بن کر تمہارے جسم میں پھیل گیا ہے۔ کیا تم اس کی تکلیف بیان کر سکتے ہو؟"

"نہیں بیان کر سکتا۔ بہت ہی ناقابلِ بیان اور ناقابلِ برداشت تکلیف ہے۔ اس سے بہتر ہے مجھے گولی مار دو۔"

"مقررہ وقت پر تمہارا دم نکلے گا اور تمہیں تکلیف سے نجات مل جائے گی لیکن جو زہر تم نے صائمہ کے بدن میں بھر دیا ہے، وہ اس ذلت اور رسوائی کو ساری عمر کیسے برداشت کرے گی۔ ایک زہر یہ ہے جو تمہیں مار رہا ہے۔ ایک زہر وہ ہے جو اس کی کوکھ میں انسانی زندگی دے رہا ہے۔ ارے کیا تم لوگ، اس دنیا سے جاتے جاتے بھی دوسرے کو مارنے کا اہتمام کر جاتے ہو۔ لعنت ہو تم پر چلو، نکلو اس دنیا سے۔"

وہ زہر کی جلن سے تڑپنے لگا۔ اس کے اندر جیسے جہنم کی آگ بھر گئی تھی۔ دماغ پھٹ رہا تھا۔ دیدے پھیل کر بصارت سے خالی ہو گئے تھے۔ اجل چند لمحوں تک اس کے تڑپنے کا تماشا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مقررہ لمحے میں اس کی روح قبض کر لی۔

☆======☆======☆

ایک اور زہر تھا، جو کاشف کے اندر بھرا ہوا تھا۔ یہ زہر باپ کے خلاف تھا۔ اس کے اندر یہ بات پک رہی تھی کہ اگر ابو کا وقت پورا ہو جائے۔ وہ اس دنیا سے اٹھ جائیں تو کتنے ہی اہم مسائل حل ہو جائیں گے۔ سب سے بڑا مسئلہ صائمہ کی فوری شادی کا تھا۔ ایسا ہوتے ہی بدنامی کے تمام اندیشے ختم ہو جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ سید صاحب لمبی عمر لکھوا کر دنیا میں آئے تھے۔ نہ ایمانداری چھوڑ رہے تھے نہ گھر والوں کا پیچھا

چھوڑ رہے تھے۔ اگر وہ وفات پا جاتے تو ان کے بعد بڑا بیٹا کاشف ہی گھر کا کرتا دھرتا ہوتا۔ پھر اس گھر کے اصول کچھ بدل جاتے۔ وہاں ایمان ضرور رہتا۔ صرف مصلحتاً تھوڑی ایسی بے ایمانی ہوتی' جس سے کسی کی ذات کو نقصان نہ پہنچتا اور صائمہ کی عزت اور نیک نامی بحال ہو جاتی۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے والد مرحوم کے دیانت دارانہ اصولوں کے مطابق زندگی گزارتے لیکن والد تھے کہ مرحوم نہیں ہو رہے تھے۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ جو بہت سچا اور کھرا ہوتا ہے بہت معزز اور معتبر ہوتا ہے' وہ نہایت غیر ضروری لگنے لگتا ہے۔ معاشرہ تو دور کی بات ہے' وہ اپنے گھر کے کسی بھی خانے میں ٹھیک طور پر فٹ نہیں ہو پاتا۔ ہمیشہ مس فٹ سمجھا جاتا ہے۔

کاشف اس رات باپ سے بری طرح ناراض ہو کر گھر سے نکلا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں جائے گا؟ اور آج کل میں جو بدنامی منہ پھاڑنے والی ہے اسے کیسے روکے گا؟

اس کے لاشعور میں یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ باپ کے خلاف قدم اٹھا کر اس شرمناک مسئلے کو حل کرنا چاہیے۔ شاید اسی لیے وہ سوچتا ہوا ایک بس کے بعد دوسری بس میں سوار ہو کر رات کے گیارہ بجے رمضان گوٹھ پہنچ گیا۔

قاسم نے حیرانی اور خوشی سے کہا "کاشف! اتنی رات کو کہاں سے چلے آرہے ہو؟ آؤ' یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ میں نے ابھی تک روٹی نہیں کھائی ہے۔ اب ہم ساتھ کھائیں گے۔"

وہ ایک چارپائی پر بیٹھ کر بولا "روٹی کی بھوک نہیں ہے قاسم بھائی! ہاں اگر زہر ہے تو کھلا دو۔"

قاسم نے اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا پھر کہا "تمہاری باجی سے میرا رشتہ طے ہوا ہے۔ دشمنوں نے کمینگی دکھائی۔ مہندی کی رات اسے اغوا کرلیا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنے گھر میں بزرگوں کے سائے میں آگئی ہے۔ اگر امی زندہ ہوتیں تو اسے بہو بنا کر لے آتیں مگر تم دل برداشتہ کیوں ہو۔ شادی تو میں ضرور کروں گا۔ کیا تمہیں یقین نہیں ہے۔"

"قاسم بھائی! آپ نہایت شریف اور زبان کے دھنی ہیں لیکن...... لیکن......"

وہ ہچکچانے لگا' قاسم نے پوچھا "لیکن کیا؟ آگے بولو۔ آخر بات کیا ہے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا' کیسے بولوں؟ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے"

"ایسی کیا بات ہے؟ کیا پھر کوئی دشمنی کر رہا ہے؟"

"تقدیر دشمنی کر رہی ہے۔ باجی اب آپ کے قابل نہیں رہی ہیں۔"

"کیوں فضول بات کر رہے ہو۔ وہ تمہاری بڑی بہن ہے۔ میری شریکِ حیات بننے والی ہے۔ ساری زندگی کا فیصلہ کرنے والا میں ہوں۔ میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں کہ وہ قابل ہے یا نہیں؟ کیا گھر سے جھگڑا کر کے آئے ہو؟"

وہ چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بے چینی اور شرمندگی سے منہ پھیر کر ذرا دور ہو گیا۔ قاسم اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب صائمہ اغوا ہونے کے بعد واپس آئی تھی تو صفیہ بیگم نے روتے ہوئے کہا تھا "بیٹے قاسم! اب میری بیٹی تمہارے قابل نہیں رہی ہے۔ تمہیں اور بہت سی عزت دار لڑکیاں مل جائیں گی۔"

اس نے جواب دیا "میں نے آپ کی بیٹی کو ابھی تک نہیں دیکھا ہے۔ صرف آپ کا عزت دار گھرانا دیکھا ہے۔ پھر جو کچھ بھی ہوا اس میں آپ کی بیٹی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ امی اب اس دنیا میں نہیں رہیں لیکن ان کا طے کیا ہوا رشتہ قائم رہے گا۔ میں چالیس دن کے بعد شادی کی تاریخ مانگنے آؤں گا۔"

وہ چالیس دن گزر چکے تھے۔ قاسم نے کاشف کو دیکھ کر کہا "میں وعدے کے مطابق چالیس دن بعد نہیں آیا۔ دراصل زمینوں کے معاملات میں الجھ گیا تھا۔ کیا اس لیے ناراض ہو؟"

"یہ بات نہیں ہے قاسم بھائی! باجی کو اغوا کیا گیا۔ اس کے بعد بھی آپ انہیں قبول کر رہے ہیں لیکن اغوا کا جو نتیجہ اب سامنے آرہا ہے' اسے میں زبان سے کیسے کہوں؟"

قاسم نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اتنا کہہ کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رو رہا تھا۔ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سید صاحب کی صورت گھومنے لگی۔ وہ ان کا معتقد تھا۔ ان کا ممنون تھا۔ ان کی انصاف پروری کے باعث وہ اپنی زمینوں کا مالک بنا ہوا تھا۔ ورنہ سوتیلے بھائی نے اسے پاگل ثابت کر کے پاگل خانے بھیجنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے کاشف کا بازو تھام کر کہا "مرد ہو کر رو رہے ہو۔ آنسو پونچھو۔ آرام سے بیٹھو۔ ہماری دنیا میں بڑی بڑی شیطانی حرکتیں کی جاتی ہیں۔ اگر ٹھوکر لگانے والے کو مار نہیں سکتے تو کوئی بات نہیں' اپنے رومال سے تھوک صاف تو کر سکتے ہیں۔"

وہ دونوں چارپائی پر آ کر بیٹھ گئے۔ قاسم نے کہا "ایک فرشتہ صفت جج صاحب کے

ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' وہ بہت ہی افسوس ناک ہے۔ لوگ اخلاقی طور پر اتنے گر
کہ کسی کی اچھی صفات کی نہ قدر کرتے ہیں' نہ لحاظ مروت کرتے ہیں۔ اس
مجھے یقین ہے کہ نیکی کا صلہ ضرور ملتا ہے۔"

وہ کاشف کی پیٹھ تھپک کر بولا "چلو اٹھو۔ منہ ہاتھ دھولو۔ ہم روٹی کھا کر
گے۔ میں صبح سے پہلے تمہارے ابو سے ملوں گا اور شادی کی تاریخ طے کروں گا۔"

"نہیں قاسم بھائی! ابو راضی نہیں ہوں گے۔"

"کیوں نہیں ہوں گے؟ جب میں راضی ہوں تو انہیں کیا اعتراض ہو گا؟"

"آپ ان کی دین داری کو اچھی طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ مذہبی احکامات
کرنے کے لیے اولاد کی عزت کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں کہ
حالت میں بیٹی کا نکاح جائز نہیں ہے۔"

"سبحان اللہ! واقعی تمہارے والد اللہ والے ہیں۔ وہ درست کہہ رہے ہیں لیکن
جان بچانے کے لیے یا عزت بچانے کے لیے کیا تھوڑا سا جھوٹ نہیں بول سکتے؟"

"ابو جان دے دیں گے۔ ذلت اور رسوائی کے پتھر کھا لیں گے لیکن جھوٹ
بولیں گے۔ وہ کوئی معمولی سا کام بھی غلط طریقے سے نہیں کرتے۔ بیٹی کا نکاح بھی
لیے پڑھانے نہیں دیں گے کہ وہ ہمارے دین کے مطابق درست نہیں ہو گا۔"

"درست نکاح تو ایک برس بعد بھی پڑھایا جا سکتا ہے لیکن صرف بدنامی سے
کے لیے میرا اور تمہاری باجی کا ایک فرضی نکاح نامہ تیار کرایا جا سکتا ہے۔"

"وہ اس حرکت کو خلافِ قانون کہتے ہیں۔"

قاسم سوچ میں پڑ گیا' پھر بولا "ہمیں کچھ کرنا ہو گا۔"

"میری باجی جس حال میں ہیں' اس حال میں انہیں کوئی قبول نہیں کرے گا۔
کو بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ آخر کیا بات ہے کہ آپ انہیں قبول کرنا چاہتے ہیں
آپ نے انہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"تمہارے ابو نیکی' سچائی اور دین داری کی جس انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں' وہاں تک
ابھی نہیں پہنچ سکتے مگر ایک ایمان والے کے نقشِ قدم پر چل کر ہم اور تم ایسا
تھوڑی سی ایمانی خوب صورتی تو دے سکتے ہیں۔ وہ پرانے لوگ جنہیں بے ایمانی کا
گیا ہے' ان کا شاید علاج نہ ہو سکے لیکن ہم نوجوانوں کا لہو گرم ہے' ذہن تازہ
ہماری سوچ اور عمل مثبت تبدیلیاں لا سکتی ہیں۔"

"آپ کی باتوں سے مجھے حوصلہ مل رہا ہے لیکن ہم ابو کے اصولوں کے خلاف

گے؟"

"کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ تمہاری امی اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں؟"

"آپ ایک ماں کے دلی صدمات کو سمجھ سکتے ہیں۔ وہ باجی کے لیے بہت پریشان

"ایسا کرو۔ آج رات میرے پاس رہ جاؤ۔ کل تمہارے ابو اپنی ڈیوٹی پر جائیں گے تو
ان کی عدم موجودگی میں تمہاری امی سے کچھ باتیں کروں گا۔ ہم اس مسئلے کا کوئی حل
گے۔"

وہ دونوں سوچ میں ڈوب گئے۔ قاسم سوچ رہا تھا' اگر گناہ صرف عورت کے بدن
ظاہر نہ ہوتا۔ نو ماہ تک گناہگار مرد کا پیٹ بھی پھولتا رہتا تو کم از کم پچاس فیصد مرد گناہ
کتراتے رہتے اور اگر ہوس سے مغلوب ہو کر گناہ کرتے تو نو ماہ تک دنیا والوں سے
اور پیٹ چھپاتے رہتے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کے اندر کوئی بچہ پرورش پاتا۔ صرف
کے طور پر یہ ہوتا کہ ان کے پیٹ میں گناہ کی ہوا بھرتی رہتی' جو نو ماہ بعد خارج ہو

جب کسی مسئلے کا حل سجھائی نہ دے تو ذہن میں ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں گردش
کرتی رہتی ہیں۔ قاسم بڑے دکھ سے سوچ رہا تھا کہ جب محلے پڑوس والوں کو صائمہ کا
دکھائی دے گا تو کیا سید صاحب شرم سے جی سکیں گے؟ آہ! جس طرح اس کا پیٹ
دکھائی دینے والا تھا' کاش! اسی طرح ایمان کا نور دور تک دکھائی دیتا اور ذہنوں کو متاثر
وہ دوسرے دن کاشف کے ساتھ صفیہ بیگم سے ملنے گیا۔ یہ وہی دن تھا' جب نادر
روتی ہوئی سید صاحب کے پاس ان کے چیمبر میں ملنے آئی تھی اور اسی دن اس
نے صفدر کو اسپتال سے اغوا کرا کے سمندر کے ایک ویران ساحل پر لے جا کر پھینک
عزرائیل نے اس کی روح قبض کر لی تھی۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق صفدر ایک
مجرم تھا۔ موقع پا کر اسپتال سے فرار ہو گیا تھا۔ دوسرے دن اس کی لاش مل گئی
پوسٹ مارٹم کے بعد اس کے رشتے داروں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ صفدر کا
ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا۔ وہ بیٹے کی لاش پر ماتم کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "جسے
للّی جان کہتا تھا' اسی نے عدالت میں میرے بیٹے کو مجرم ثابت کر کے اس کی زندگی
تباہ پھر اسے موت کی گود میں سلا دیا۔ میں خاموش نہیں بیٹھوں گا' اپنے بیٹے کا انتقام
لوں گا۔"

سید صاحب کی بہن زلیخا کا بیٹا زبیر جیل میں تھا۔ وہ صفدر کا انجام دیکھ کر اپنے بیٹے

کے لیے رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی "یہ سید آصف جاہ بھائی نہیں دشمن ہے۔ بدنصیبی سے جج بن گیا ہے۔ یہ میرے زبیر کو بھی مار ڈالے گا۔ ہائے میں کیا کروں؟ ... کا مالک تو خود دشمن ہے۔ میں کس سے انصاف مانگنے جاؤں؟"

ان گھروں میں دشمنی پھر نئی کروٹ لے رہی تھی۔ انہوں نے صفدر کی تدفین کے بعد ایک بہت بڑے وکیل کی خدمات حاصل کیں اور یہ پہلو اٹھایا کہ صائمہ کو بھری ... سے تنہا صفدر نے اغوا نہیں کیا تھا۔ صفدر کے ساتھ پورا ایک گروہ تھا۔ لہٰذا اس ... گرفتار کرنے کے لیے صائمہ سے پوچھا جائے کہ اسے لے جانے والے کتنے تھے اور ... اس کی عزت سے کھیلتے رہے تھے۔ سید صاحب پر کیچڑ اچھالنے کے لیے یہ شرمناک پہلو اٹھایا گیا تھا تاکہ اخبارات میں ایک شریف زادی کی تصاویر شائع ہوں اور پورے ... ملک میں اس کی عزت کی دھجیاں اڑانے والی بات کا چرچا ہوتا رہے۔

بڑی اشاعت والے معروف اخبارات نے صائمہ کی تصاویر شائع نہیں کیں۔ ... کے مالکان ایک تو سید صاحب کی عزت کرتے تھے' دوسرے یہ کہ اغوا کا اصل مجرم تو مر چکا تھا۔ یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ صائمہ اور سید صاحب پر کیچڑ اچھالنے کے لیے مقدمے کو زندہ کیا جا رہا ہے۔

نادر نے کہا "وکیل صاحب! بات نہیں بن رہی ہے۔ ہمارا کلیجا ٹھنڈا نہیں ہو رہا ہے۔"

وکیل نے کہا "ذرا تحمل سے کام لیں۔ میں مقدمے میں اس اعتراض کو پختہ کروں گا کہ صائمہ کے ساتھ بدکاری کا الزام صرف صفدر پر کیوں آیا۔ دوسرے بدکاروں کو بھی صائمہ کے ساتھ عدالت میں پیش کیا جائے۔"

بیگم نادرہ نے کہا "ہماری سب سے بڑی کامیابی یہ ہوگی کہ آپ بیٹی کا مقدمہ اس کے باپ کی ہی عدالت میں لائیں۔ بھری عدالت میں منصف باپ کے سامنے بیٹی کی عزت اچھلتی رہے گی تو میں اپنے بیٹے کی قبر پر گھی کے چراغ جلاؤں گی۔"

وکیل انہیں تسلیاں دیتا رہا کہ ایسا ہی ہوگا لیکن صفدر کے علاوہ کسی نے صائمہ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اغوا کرنے والے کرائے کے دو چار غنڈے تھے' وہ اپنا کام کر کے لے کر چلے گئے تھے۔ صائمہ ان میں سے کسی کو پہچانتی نہیں تھی اور ان میں سے کوئی ایک لڑکی کو اغوا کرنے اور اس سے زیادتی کرنے کا جرم قبول کرنے نادر اور وکیل کے پاس کبھی نہ آتا۔ ایسی صورت میں مقدمے کی کوئی صورت نہیں بن رہی تھی۔ ... انہیں نئے نئے نکتے سمجھا کر نئی امیدیں دلا کر ان سے اچھی خاصی رقمیں وصول کر ...

یوں صفدر کی موت کے بعد چار ماہ گزر گئے۔ دشمن مایوس ہو گئے۔ ایسے ہی وقت مقدر کا ستارہ چمک گیا۔ سید صاحب کے محلے میں رہنے والی ایک بوڑھی عورت نے بیگم نادر کے پاس آکر یہ انکشاف کیا کہ صائمہ کنواری ماں بننے والی ہے۔

نادر اور بیگم نادر کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے وکیل کو یہ بات بتائی۔ وکیل نے کہا "اب مقدمے کا مزہ آئے گا۔ اب میں جو کہوں اسے توجہ سے سنو اور میرے مشوروں پر عمل کرو۔ اگر تم صائمہ کو آبرو باختہ کہہ کر کیچڑ اچھالنا چاہو گے تو کیس مضبوط نہیں رہے گا۔ جلد ہی کمزور پڑ جائے گا کیونکہ وہ کسی کے ساتھ اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی۔ اسے اغوا کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔ وہ عدالت میں مظلوم ثابت ہوگی۔"

نادر نے کہا "وکیل صاحب! آپ تو بالکل مایوس کر رہے ہیں۔"

"آگے سنو اور جو کہہ رہا ہوں' اس پر عمل کرو۔ یہ دعویٰ کرو کہ وہ تمہارے مرحوم بیٹے کی اولاد کو جنم دینے والی ہے۔ وہ جو بچہ پیدا ہونے والا ہے' اس پر تمہارا حق ہے۔"

نادر نے کہا "لیکن باپ زندہ نہ ہو تو اولاد پر ماں کا حق ہوتا ہے۔ ہم دادا دادی بن کر بھی ماں سے اس کا بچہ نہیں چھین سکیں گے۔"

"چھین سکو گے۔ کیونکہ وہ کنواری ماں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی برس تک بچے کو دودھ پلانے کے لیے اسے اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔ اس کے بعد ماں بننے والی وہ کنواری کسی سے شادی کرے گی تو بچے پر دادا دادی کا حق ہوگا۔ کیونکہ یہ وراثت کا مسئلہ ہے۔ وہ ناجائز سہی مگر تمہارے بیٹے کا وارث ہے۔ تمہارے خاندان کی اگلی نسل ہے۔"

بیگم نادر نے پوچھا "اگر صائمہ آئندہ شادی نہیں کرے گی تو کیا ہم اس سے بچہ نہیں لے سکیں گے؟"

"ہاں' بچہ تمہیں نہیں ملے گا لیکن اسے ذلت آمیز زندگی گزارتے دیکھو گی۔ وہ ایک کنواری ماں بن کر اپنے عزت دار باپ کے گھر میں رہے گی۔ ایسے میں باپ بیٹی کتنوں سے آنکھیں چراتے رہیں گے؟ جہاں جائیں گے طعنے ملیں گے۔ جوان بھائی غیرت مند ہوگا تو مر جائے گا ورنہ شہر چھوڑ کر چلا جائے گا اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ سید صاحب عزت کے بغیر جی نہیں سکیں گے۔ کیا یہ انتقام کافی نہیں ہے کہ اس گھر کا ہر فرد ذلت کا زہر لمحہ لمحہ پی کر مرتا رہے گا۔"

بیگم نادر اس تصور سے خوش تھیں کہ بھری عدالت میں دشمن کی بیٹی بڑا سا پیٹ لے کر آیا کرے گی۔ وہاں اخبارات والے بھی ہوں گے۔ اس کی اور اس کے عزت دار

باپ کی تصویریں بھی اتاری جائیں گی اور دنیا انہیں ایک تماشے کے طور پر دیکھتی رہے
گی۔ وکیل نے مقدمے کی تیاریاں کیں اور نادر کی طرف سے درخواست دی کہ یہ مقدمہ
سید آصف جاہ کی عدالت میں پیش کیا جائے کیونکہ اسے سید صاحب کی انصاف پروری پر
اعتماد ہے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے صفدر سے انصاف کے معاملے میں رعایت نہیں کی تھی
لہٰذا یقین ہے کہ وہ بیٹی کے کیس میں انصاف پسند رہیں گے اور انصاف کے تقاضے دیانت
داری سے پورے کریں گے۔

کوئی ضروری نہیں تھا کہ نادر کی یہ درخواست منظور ہو جاتی لیکن سید صاحب نے
اسے منظور کرلیا۔ اس کے وکیل سے کہا "یہ میری بیٹی کا مقدمہ ہے۔ اگر بیٹی کے سلسلے
میں سوالات کئے جائیں گے تو مجھے جواب دینے کے لیے کٹہرے میں جانا ہوگا اور جج کی
کرسی چھوڑنا ہوگی۔ ایسے وقت نادر کی یہ خواہش پوری نہیں ہوگی کہ میں جج کی کرسی پر
بیٹھا رہوں۔"

وکیل نے کہا "ہماری کوشش ہوگی کہ آپ سے کوئی سوال نہ کیا جائے اور آپ
صرف اپنی کرسی پر انصاف کریں۔"

ان حالات میں مقدمہ شروع ہوا۔ پہلے دن مقدمے کی نوعیت اور اس کی تمہید پیش
کی گئی۔ پھر نادر اور بیگم نادر کا یہ دعویٰ پیش کیا گیا کہ صائمہ جس بچے کو جنم دینے والی
ہے' اس بچے کا باپ ان کا مرحوم بیٹا صفدر تھا اور وہ بچہ نادر کے خاندان کا وارث ہے۔

سید صاحب نے تمام تفصیلات سننے کے بعد حکم دیا کہ مدعا علیہا مسمات صائمہ آصف
کو اگلی پیشی میں حاضر کیا جائے۔ دو دن بعد اگلی پیشی تھی۔

اس روز عدالت میں اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کافی تعداد میں آئے تھے۔
صائمہ برقعے میں تھی۔ چہرے پر نقاب تھا۔ جب اسے طلب کیا گیا اور وہ کٹہرے میں آئی تو
نادر کے وکیل نے سید صاحب سے کہا "جناب عالی! میں صائمہ بیگم سے درخواست کروں
گا کہ وہ چہرے سے نقاب اٹھائیں تاکہ یقین ہو کہ ہمارے سامنے مطلوبہ مدعا علیہا صائمہ
بیگم ہی موجود ہیں۔"

ایک نوجوان وکیل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "جناب عالی! نقاب الٹنے سے پہلے
میں عرض کروں کہ یہ خاکسار محترمہ صائمہ بیگم کی طرف سے وکیل ہے۔ یہ اس سلسلے کے
ضروری کاغذات ہیں۔ میری درخواست ہے کہ صائمہ بیگم کی جانب سے مجھے مقدمے کی
پیروی کرنے کی اجازت دی جائے۔"

پیش کار نے وہ کاغذات سید صاحب کو پیش کئے۔ انہوں نے کاغذات پڑھتے ہوئے

عینک کے پیچھے سے نوجوان وکیل کو غور سے دیکھا' پھر کہا "تمہارا نام کچھ عجیب سا ہے اور
تمہیں پہلی بار اپنی عدالت میں دیکھ رہا ہوں۔"

"جی جناب عالی! میں اسلام آباد سے آیا ہوں۔ اس شہر میں یہ پہلا مقدمہ ہے' جس
کی پیروی کرنے آیا ہوں۔"

سید صاحب نے کہا "مسٹر اجل نواز! تمہیں پیروی کی اجازت ہے۔"

اجل نے کہا "شکریہ جناب عالی! میری مؤکلہ صائمہ بیگم ایک عزت دار گھرانے سے
تعلق رکھتی ہیں اور پردے کی سختی سے پابندی کرتی ہیں۔ اگر اس بات کی ضمانت ہو کہ
عدالت میں موجود فوٹو گرافر حضرات ایک پردہ نشین کی تصویریں نہیں اتاریں گے تو یہ
نقاب الٹ دیں گی۔"

سید صاحب نے حکم دیا کہ فوٹو گرافرز اپنے کیمرے باہر چھوڑ کر آئیں یا پھر تصویر نہ
اتاریں۔ ان کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ سب نے اپنے کیمروں کے لینز پر کیپ چڑھا دیئے
اور انہیں اپنے بیگ وغیرہ میں رکھ لیا۔ صائمہ نے برقعے کے نقاب کو الٹ دیا۔ اس کے
چہرے کو سب نے دیکھا مگر انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہوئے باپ کی نظریں جھک گئیں۔ وہ
اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ آج اس عدالت سے ان کی عزت کا جنازہ اٹھنے والا ہے۔
جنازے کے خیال سے موت یاد آئی تو انہوں نے اجل کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ پھر فوراً
سنجیدہ ہو کر بولا "یہ کیس آغاز سے لے کر اب تک میری نظروں میں ہے۔ ابتدا میں مدعی
اور مدعی نے یہ شور مچایا تھا کہ میری مؤکلہ کو صرف ان کے بیٹے صفدر نے نہیں بلکہ ایک
گروہ نے اغوا کیا تھا۔ لہٰذا میری مؤکلہ کے ساتھ جو بھی غیرانسانی سلوک کیا گیا اس کا الزام
صرف صفدر پر نہیں دوسروں پر بھی عائد ہونا چاہیے لیکن اب مدعی کا یہ دعویٰ ہے کہ
میری مؤکلہ ان کے مرحوم بیٹے صفدر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

"جناب عالی! مدعی کے دونوں بیانات میں تضاد ہے۔ اگر پورے ایک گروہ نے
زیادتی کی ہے تو محض یہ دعویٰ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ صفدر ہی ہونے والے بچے کا
باپ ہے؟

اگر یہ دعوی درست ہے تو پہلا بیان غلط ہے کہ میری مظلوم مؤکلہ کے ساتھ
دوسروں نے بھی زیادتی کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ فاضل وکیل بیانات کے تضاد پر روشنی
ڈالیں گے اور اصل بیان کی تصدیق فرمائیں گے۔"

نادر کے وکیل نے کہا "جناب عالی! پہلے ہمیں شبہ تھا کہ اغوا کی واردات ایک گروہ
نے کی ہے لیکن آخری وقت جب صفدر اسپتال میں زیر علاج تھا تو اس نے اپنی والدہ کو

بتایا تھا کہ صائمہ کو اس نے تنہا اغوا کیا تھا۔ اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور واضح الفا
میں کہا کہ صائمہ سے اس کے تعلقات اس حد تک ہو چکے ہیں کہ وہ صحت یاب ہو
اور مقدمے سے بری ہونے کے بعد صائمہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

اجل نے کہا "یہ صرف صفدر کی ماں کا بیان ہے اور مجرم کی ماں کے بیان میں
زیادہ اور صداقت کم ہوتی ہے۔"

وکیل نے کہا "میں نے پولیس رپورٹ بھی پیش کی ہے۔ صفدر کو جس اڈے سے
گرفتار کیا گیا تھا وہاں وہ تنہا تھا۔ وہاں دور تک اس کا کوئی ساتھی نظر نہیں آیا۔"

اجل نے کہا "تو پھر اس پوائنٹ کو نوٹ کیا جائے کہ میری مؤکلہ کے ساتھ جو کچھ
بھی ہوا اس کا ذمے دار صرف صفدر ہے اور کوئی دوسرا ہونے والے بچے کا باپ نہیں
کہلائے گا۔"

وکیل نے اسے تسلیم کیا اور اسے نوٹ کر لیا گیا۔ اجل نے کہا "اب میں عدالت
سے درخواست کروں گا کہ میری مؤکلہ کا بیان سنا جائے۔"

صائمہ نے بیان دیا۔ "وہ مہندی کی رات گھر میں ایک بوڑھی عورت اور چھوٹے
بھائی کے ساتھ تھی۔ باقی رشتے دار لڑکے والوں کے ہاں مہندی کی رسم ادا کرنے گئے
تھے۔ اچانک کسی نے پیچھے سے آکر اس کی ناک پر کپڑا رکھا۔ اس کے بعد وہ بے ہوش
ہوگئی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو دن نکل آیا تھا۔ وہ ایک جیپ کی اگلی سیٹ پر تھی اور
رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ صفدر جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی
اسے گالیاں دے کر بولا۔ تمہارے باپ نے میرے جرم پر پردہ نہیں ڈالا۔ رشتے داری کا
بھی خیال نہیں کیا۔ اب میں تمہارے ذریعے تمہارے جج باپ سے انتقام لوں گا۔ اس
وقت جیپ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تھی۔ وہ غصہ دکھا رہا تھا۔ ایسے وقت اس کے ہاتھوں
سے اسٹیئرنگ بہک گیا۔ جیپ دو بڑے بھاری پتھروں کے درمیان جا کر اٹک گئی۔ وہ اپنا
توازن نہ سنبھال سکا۔ جھٹکا کھا کر جیپ سے باہر گر کر ڈھلان میں لڑھکتا چلا گیا۔

صائمہ رسیوں سے بندھی ہوئی تھی اس لیے گرنے سے محفوظ رہی۔ وہ لڑھکتا ہوا
بہت نیچے تک گیا تھا۔ لہولہان ہو رہا تھا۔ اوپر آتے وقت اپنے جسم کے کئی حصوں سے
کانٹے نکال رہا تھا پھر وہ جیپ کے قریب آکر گر پڑا۔ ہانپتے ہوئے بولا۔ میرا سر چکرا رہا
ہے۔ یہ کانٹے بہت زہریلے ہوتے ہیں۔ پلیز مجھے یہاں سے لے چلو۔ فوراً کسی طرح طبی
امداد پہنچاؤ۔ یہاں سے حیدر آباد چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس نے ایسا کہتے ہوئے
صائمہ کی رسیاں کھول دیں۔ وہ آزاد ہوگئی لیکن اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اسے

کسی اسپتال تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔ کیونکہ گاڑی چلانا نہیں جانتی تھی۔"

عدالت میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نادر اور بیگم نادر اپنے بیٹے کی حالت زار
سن کر دم سادھے ہوئے تھے۔ اب سے پہلے انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ صائمہ کو اغوا
کر کے لے جانے کے بعد بیٹے پر کیا گزری تھی۔ ماں نے اسپتال میں بیٹے سے مختصر ملاقات
کی تھی۔ اس ملاقات میں اس کے حالات معلوم نہیں کیے تھے کیونکہ وہ شدید تکلیف میں
مبتلا تھا۔ دوسری ملاقات ہوتی تو شاید بیٹا کچھ کہتا لیکن دوسرے دن پولیس والوں نے بیٹے
کی لاش پہنچائی تھی۔ بہرحال اب صائمہ جو بیان دے رہی تھی' اسے ہی درست سمجھا
جاسکتا تھا۔ اس کی غلط بیانی پر اعتراض کرنے والا مر چکا تھا۔ وہ بیان جاری رکھتے ہوئے بولی
"صفدر مجھے بے بس کر کے لایا تھا۔ اب وہ میرے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے سوچا' اسے
کتے کی موت مرنے کے لیے وہیں چھوڑ دوں اور کسی قریبی آبادی میں جا کر پولیس کی مدد
حاصل کروں لیکن پھر اس پر ترس آیا۔ آخر وہ میرے چچا کا بیٹا تھا۔ میں نے کہا' میں تمہیں
کسی بڑے اسپتال میں پہنچانے کے لیے حیدر آباد نہیں لے جاسکوں گی۔ کیونکہ گاڑی چلانا
نہیں جانتی' تم کسی طرح چلانے کی کوشش کرو لیکن وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کے جسم پر
اب بھی دو ایک کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سب کو نکالا۔ جیپ کے پچھلے حصے میں
کھانے پینے' اور پہننے اوڑھنے کے سامان کے ساتھ طبی امداد کا ایک بکس رکھا ہوا تھا۔ میں
طبی امداد پہنچانے کے متعلق کچھ نہیں جانتی ہوں۔ پھر بھی میں نے اس کے زخموں کو
صاف کیا۔ جو مرہم میری سمجھ میں آیا اسے زخموں پر لگا دیا۔ ایک گھنٹے بعد اسے ہوش آیا۔
میں نے اسے کچھ کھانے کے لیے دیا۔ بخار سے اس کا بدن تپ رہا تھا۔ وہ بولا یہاں سے
قریب ہی میرا خفیہ اڈا ہے' کسی طرح مجھے وہاں لے چلو۔ میں نے اسے اٹھنے اور چلنے کے
لیے سہارا دیا۔ مگر وہ ایک قدم چلتے ہی گر پڑا۔ میں نے کہا تمہیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔
مجھے کسی قریبی آبادی تک جانا ہوگا۔ اگر کوئی ڈاکٹر نہیں ملے گا تو یہ گاڑی چلانے والا مل
جائے گا پھر تمہاری تیمارداری کے لیے ان لوگوں کو لے آؤں گی۔ وہ رونے لگا۔ ہاتھ جوڑ
کر گڑگڑانے لگا کہ میں اسے معاف کر دوں۔ میں نے اسے معاف کر دیا پھر ایک سمت چل
پڑی۔ دوسری پہاڑی سے اتر کر دیکھا۔ دور تک میدانی علاقہ اور چھوٹی بڑی پہاڑیاں
تھیں۔ میں صبح سے شام تک چلتی رہی۔ کوئی انسانی آبادی نظر نہیں آئی۔ کہیں کہیں
دو چار کچے مکانات دکھائی دیئے۔ میں نے وہاں رہنے والوں کو بتایا کہ جنوب کی سمت پتا
نہیں کتنے میل دور ایک پہاڑی پر ایک زخمی شخص ہے۔ اس کے پاس کھانے پینے کا سامان
اور کافی رقم ہے۔ وہ تمہیں بہت رقم دے گا وہاں جا کر اس کی مدد کرو۔

میری باتیں سن کر دو افراد ادھر چلے گئے۔ ان میں سے کوئی گاڑی چلانا نہیں جانتا تھا۔ میں پھر آگے بڑھ گئی میں کسی ڈاکٹر کو اور گاڑی چلانے والے کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے وہ رات ایک غریب میاں بیوی کے گھر میں گزاری۔ دوسری صبح پھر آگے چل پڑی۔ آخر ایک بستی میں پہنچی۔ اب اتنی دور نکل آئی تھی کہ واپسی کا خیال دل سے نکال دیا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا کہ میں نے صفدر کی مدد کے لیے دو افراد کو بھیج دیا ہے۔ اس بستی میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انہیں اپنی روداد سنائی تو وہ مجھے بیٹی بنا کر لاہور لے آئے۔ پھر میرے گھر والوں کو وہاں بلا کر مجھے عزت آبرو سے میرے گھر پہنچا دیا۔"

سید صاحب سن رہے تھے اور اس کی روداد کے آخری حصے کے متعلق سمجھ رہے تھے کہ بیٹی جھوٹ بول رہی ہے لیکن وہ اسے جھٹلا نہیں سکتے تھے کیونکہ انہوں نے شرم کے باعث بیٹی سے یہ کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ اغوا ہونے کے بعد کن حالات سے گزرتی رہی تھی۔ انہوں نے صفیہ بیگم سے بھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ایک غیرت مند باپ اپنی بیوی سے بھی بیٹی کے سلسلے میں ایسی کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ بیٹی کے آنسو اور گہری سنجیدگی سے کچھ اندازہ ہوتا رہا تھا۔ پھر یہ کہ اب وہ ماں بننے والی تھی اور یہ بات اس کے جھوٹ کو ثابت کر رہی تھی۔

سید صاحب صبر سے سنتے رہے۔ انہیں یقین تھا کہ بیٹی جھوٹ بولتے آگے جا کر پھنسنے والی ہے۔ اجمل نے اس کے بیان کے اختتام پر ایک فائل سے چند کاغذات نکال کر پیش کرتے ہوئے کہا "صفدر گرفتاری کے بعد جن اسپتالوں میں زیر علاج تھا۔ یہ وہاں کی میڈیکل رپورٹس ہیں اور ان زہریلے کانٹوں کا طبی تجزیہ بھی ہے۔ ایسے کانٹے چبھنے کے بعد کوئی شخص چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتا۔"

سید صاحب نے کانٹوں کے طبی تجزیے کو پڑھا۔ اجمل نے کہا "جناب عالی! جس وقت میری مؤکلہ رسیوں سے آزاد ہوئی اس وقت وہ کانٹے صفدر کو بے دست و پا کر چکے تھے۔ پھر کوئی دو گھنٹے بعد میری مؤکلہ صفدر کو چھوڑ کر چلی گئی تھی اور لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ پھر مدعی نادر علی کیسے دعویٰ کرتے ہیں کہ میری مؤکلہ ان کے اپاہج بیٹے کے بچے کی ماں بننے والی ہے؟"

نادر نے پریشان ہو کر اپنے وکیل کو دیکھا۔ وکیل نے کہا۔ "جناب عالی! یہ صائمہ بیگم ایک من گھڑت کہانی سنا رہی ہے۔ جس دن اسے اغوا کیا گیا' اسی دن صفدر کو حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔"

اجمل نے پوچھا "کیا فاضل وکیل حادثے کا دن اور وقت دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھے یا کوئی چشم دید گواہ پیش کر سکتے ہیں؟"

کوئی چشم دید گواہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ نادر اور وکیل تسلیم کر چکے تھے کہ صفدر نے تنہا صائمہ کو اغوا کیا تھا اور پولیس نے اسے ایک اڈے میں تنہا دیکھ کر گرفتار کیا تھا۔ ادھر میڈیکل رپورٹ ثابت کر رہی تھی کہ ان کانٹوں نے صفدر کو باپ بننے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ نادر کے وکیل نے کہا "میرے مؤکل مسٹر نادر علی چاہتے تھے کہ ان کی بھتیجی صائمہ کی عزت رہ جائے اور وہ ہونے والے بچے کو اپنے بیٹے کی اولاد تسلیم کر لیں لیکن فاضل وکیل اجمل نواز نے ان کی نیکی پر پانی پھیر دیا۔ اب یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یہ کنواری ماں کسی دوسری جگہ منہ کالا کر کے آئی ہے۔"

اجمل نے کہا "میں درخواست کروں گا کہ یہ جلد باز وکیل صاحب میری مؤکلہ کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال نہ کریں اور ایک عزت دار شادی شدہ خاتون کو کنواری ماں نہ کہیں۔"

اس بات پر سب نے چونک کر دیکھا۔ سید صاحب سے اتنا بڑا جھوٹ برداشت نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا "مسٹر اجمل نواز تم ایک باپ کے سامنے سفید جھوٹ بول رہے ہو کہ اس کی بیٹی شادی شدہ ہے۔ جبکہ آج تک اس کا نکاح نہیں پڑھایا گیا ہے۔"

نادر کے وکیل نے خوش ہو کر کہا "آفرین ہے آپ کی دیانت داری اور سچائی پر' آپ نے بیٹی کی ذلت کی پروا نہیں کی۔ جو حق ہے' وہ بھری عدالت میں کہا ہے۔"

اجمل نے کہا۔ "آپ انصاف کی کرسی پر ہیں۔ اس لیے میں سوال و جواب کے لیے آپ کو کٹہرے میں نہیں بلاؤں گا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ میری مؤکلہ کا شوہر یہاں موجود ہے۔ آپ اسے حاضری کی اجازت دیں۔"

سید صاحب نے کہا "اجازت ہے۔"

یہ سن کر قاسم علی حاضرین میں سے نکل کر کٹہرے میں آیا۔ سید صاحب نے نادر کے وکیل کو جرح کرنے کا حکم دیا۔ وکیل نے اس سے نام وغیرہ دریافت کرنے کے بعد پوچھا "کیا یہ درست ہے کہ صائمہ سے تمہاری شادی ہونے والی تھی' اس سے ایک رات پہلے ہی اسے اغوا کر لیا گیا؟"

قاسم نے کہا "جی ہاں۔ یہ درست ہے۔"

"کیا یہ بھی درست ہے کہ صائمہ کو اغوا کرنے کے بعد شادی نہ ہو سکی اور آج تک تم نکاح پڑھانے صائمہ کے گھر نہیں آئے؟"

"جی ہاں۔ یہ بھی درست ہے۔"

"جب یہ سب کچھ درست ہے تو یہ تمہاری منکوحہ کیسے ہے؟"

"ایسے کہ اب سے دس ماہ پہلے میں نے اور صائمہ نے کورٹ میرج کی تھی۔"

تھوڑی دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا۔ قاسم نے کہا "ہم دونوں بہت عرصے سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں' ہمیں اندیشہ تھا کہ خاندان کے بزرگ ہماری شادی میں رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ کیونکہ میں ایک گوٹھ کا رہنے والا ہوں اور صائمہ شہر کی رہنے والی ایک معزز جج کی بیٹی ہے۔ اس اندیشے کو دور کرنے کے لیے ہم نے رجسٹرار آفس میں درخواست پیش کی اور بڑی رازداری سے قانونی طور پر میاں بیوی بن گئے۔ ہم بہت خوش تھے کہ ہم نے محبت کی اور ایک دوسرے کو پالیا لیکن چند ماہ بعد صائمہ نے خوش خبری سنائی کہ میں باپ بننے والا ہوں۔ میں نے اپنی والدہ کو مجبور کیا کہ وہ صائمہ کے ہاں رشتہ مانگنے جائیں۔ اگر رشتہ منظور نہیں ہوگا تو حقیقت ظاہر کرنی ہوگی اور اگر منظور ہوگا تو ہم بزرگوں کا دل نہیں دکھائیں گے اور کورٹ میرج کی بات چھپالیں گے۔ بہرحال ہم نے یہی کیا' اب تک یہ بات چھپاتے رہے اور یہ پیچیدگیاں پیدا کرتے رہے۔"

اجل نواز نے فائل میں سے کاغذات پیش کرتے ہوئے کہا "جناب عالی یہ ہیں وہ کورٹ میرج کے کاغذات.........."

سید صاحب نے وہ کاغذات لے کر پڑھے۔ ان کاغذات سے ثابت ہو رہا تھا کہ صائمہ اور قاسم کی شادی دس ماہ پہلے ہو چکی تھی۔ ایک پہلو سے انہیں اطمینان ہو رہا تھا کہ جوان بیٹی کے اغوا ہونے سے لے کر حاملہ ہونے اور عدالت میں پہنچنے تک جو مسلسل بدنامی اور ذلتوں کا پہاڑ کھڑا ہوا تھا' وہ اچانک زمین بوس ہو گیا ہے۔ باپ بیٹی اور پورے گھر والوں کی عزت بحال ہو چکی ہے۔ دشمنوں نے منہ کی کھائی ہے اور اب کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھائے گا۔ یہ اطمینان اور بے پناہ مسرتوں کا موقع تھا۔ اس کے باوجود ان کے اندر بے یقینی سی تھی کہ یہ سب کچھ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ بیٹی پردہ نشین تھی۔ ماں یا باپ کے ساتھ گھر سے قدم نکالتی تھی پھر اس نے رجسٹرار کے دفتر جانے اور کورٹ میرج کرنے کا ایسا بے باک قدم کب اٹھایا؟

اجل نے کہا "جناب عالی! ایک باپ کے لیے یہ حیرانی اور بے یقینی کی بات ہوگی کہ بیٹی نے دس ماہ قبل اتنا بڑا قدم کیسے اٹھایا تھا؟ یہ ایک باپ بیٹی کا مسئلہ ہے۔ باپ گھر جا کر بیٹی کا محاسبہ کر سکتا ہے لیکن عدالت میں ثبوت اور گواہی کے مطابق فیصلے سنائے جاتے ہیں۔ آپ کے سامنے ایک ٹھوس قانونی نکاح نامہ اور گواہان کے دستخط موجود ہیں۔"

سید صاحب نے وہ کورٹ میرج کے کاغذات نادر کے وکیل کو دکھائے پھر پوچھا "تم اپنے مؤکل کے دعوے کے متعلق کیا کہتے ہو؟"

وکیل نے کہا "جناب عالی! ہم اس بات سے لاعلم تھے کہ صائمہ اور قاسم نے چوری اور دھوکے سے شادی کی ہوئی ہے۔"

اجل نے کہا "جناب عالی! میں سختی سے احتجاج کرتا ہوں کہ فاضل وکیل قانونی شادی کو چوری اور دھوکا کہہ رہے ہیں۔"

سید صاحب نے وکیل کو تنبیہہ کی' پھر کہا "اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اعتراض ہو تو پیش کیا جائے۔"

وکیل اپنے مؤکل نادر کی حمایت میں کچھ کہہ نہ سکا۔ اجل نے کہا "یہ مقدمہ نادر علی نے دائر کیا ہے' جو اپنے بیٹے کے جرم میں شریک رہا تھا۔ اب بھی یہ ملزم ہے اور جیل سے ضمانت پر رہا ہو کر آیا ہے۔ ایسے مجرمانہ ذہن رکھنے والے نے ایک عزت دار گھرانے کی بیٹی صائمہ پر کسی ثبوت کے بغیر بدکاری کا الزام لگایا اور ایک شریف زادی کو عدالت میں تماشا بنایا۔ بدکاری کا بے بنیاد الزام لگانے کی سزا کتنی سخت ہے' یہ آپ بھی جانتے ہیں اور مدعی نادر علی کے باکمال وکیل کو بھی معلوم ہے۔ فی الحال میں اپنی مؤکلہ صائمہ قاسم کے لیے درخواست کروں گا کہ انہیں باعزت طور پر بری کیا جائے۔"

سید صاحب پر فیصلے کی یہ گھڑی بھاری تھی۔ وہ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر ہمیشہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرتے آئے تھے لیکن اب دودھ اور پانی ایسے مل گئے تھے کہ وہ الگ نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ اپنے تجربات کی بنا پر جانتے تھے کہ عدالت کی چاردیواری میں کس طرح قانون سے کھیلا جاتا ہے۔ وہ ایسے کھیل کا موقع نہیں دیتے تھے۔ مگر اس روز عجیب طرح سے بازی پلٹ گئی تھی۔ مجرم نادر علی اپنے مجرم بیٹے صفدر کا باپ اور اس کا وکیل جھوٹے اور مکار ہونے کے باوجود ایک کنواری ماں کے خلاف درست بیان دے رہے تھے اور ایک شریف' ایماندار جج کی بیٹی صائمہ نے جس کے لہو میں سچائی رواں رہتی تھی' اس عدالت میں سراسر جھوٹا بیان دیا تھا اور جعلی ثبوت پیش کیے تھے لیکن ثبوت کو جعلی ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جو جھوٹے تھے' وہ سچ بول کر مقدمہ ہار رہے تھے اور جو سچی تھی' وہ جھوٹ بول کر جیت رہی تھی۔

سید آصف جاہ کو فیصلہ سنانا پڑا۔ انہوں نے صائمہ کو تمام الزامات سے بری کر دیا۔

ایسے ہی وقت عدالت کے وسیع و عریض کمرے میں سفید دھند سی چھا گئی۔ اس دھند میں عدالت کے تمام حاضرین گم ہو گئے۔ ان کے سامنے وکیل کا سیاہ کوٹ پہنے صرف

اجل کھڑا ہوا تھا۔ اجل نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا ”یہ وہ جگہ ہے‘ وہ مرحلہ ہے
جہاں آخری بار حیات و موت کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ دنیا‘ یہ کائنات پھر نہیں
رہتی۔ مُردے کے لیے سب مُردہ ہوجاتے ہیں۔“

سید صاحب نے پوچھا ”تم کون ہو؟“

”میں اجل نواز نہیں ہوں اجل ہوں۔ تمہارے باہر بھی ہوں اور تمہارے بہت اندر بھی ہوں‘ اور یہ دیکھ رہا ہوں کہ اپنی بیٹی کو سچے الزامات سے باعزت بری کرنے کا احساسِ جرم تمہیں مار رہا ہے۔ تم جھوٹ اور فریب برداشت نہیں کرسکتے۔ ساری دنیا تمہیں فریب دیتی رہی۔ مگر آج تو انتہا ہوگئی۔ سگی بیٹی نے جھوٹ بول کر اور فریب دے کر تمہارے معتبر انصاف کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ وہ اور کیا کرتی؟ کیا وہ دنیا والوں کو اپنے سچے اور شریف باپ کے منہ پر تھوکنے دیتی؟ کیا وہ ماں کو صدمے سے مرتے اور بھائی کو غیرت میں آکر دشمنوں کو قتل کرتے اور پھر پھانسی پر چڑھتے دیکھتی؟ کیا وہ اپنے بچے کو کسی باپ کا نام نہ دے کر اسے معاشرے کا نفرت انگیز کردار بنا دیتی؟

”کبھی کبھی ایک جھوٹ بہت سے افراد کی جانیں بچالیتا ہے اور بہت سے نیم پاگلوں کو نارمل بنا کر بھرپور اعتماد سے زندگی گزارنے کا موقع دیتا ہے۔ جھوٹ ایک لعنت ہے لیکن انسان نے انسان کی لعنت و ملامت سے بچنے کے لیے اس لعنت کو باعثِ رحمت بنالیا ہے۔ دودھ میں پانی ملانا فریب ہے لیکن شیرخوار بچے کو دودھ میں پانی ملا کر دینا لازمی ہے کیونکہ اس کا معدہ خالص دودھ ہضم نہیں کرتا ہے۔ یعنی ایک عمل جو عام حالات میں ممنوعہ ہے‘ وہ کسی خاص حالت میں لازمی ہو جاتا ہے۔

”تم ایمان کو دودھ اور شہد کی طرح خالص بناتے ہو اس لیے دنیا والوں کا معدہ اسے ہضم نہیں کرتا ہے۔ قاسم نے‘ کاشف اور صفیہ بیگم نے تمہاری بیٹی کو بے داغ رکھنے کے لیے اور دشمنوں کو تمہارے منہ پر تھوکنے کا موقع نہ دینے کے لیے رجسٹرار آفس میں رشوت دے کر دس ماہ پہلے کا پکا میرج سرٹیفکیٹ بنوالیا۔

”تم نے ریلوے کمپارٹمنٹ میں رشوت نہیں دی تو تمہاری پوری فیملی کو ٹرین سے باہر پھینک دیا گیا۔ اگر رجسٹرار آفس میں رشوت نہ دی جاتی تو پھر ایک بار پوری فیملی کو نیک نامی کی زندگی سے باہر ذلت کی پستی میں پھینک دیا جاتا۔

”مگر تمہیں بیٹی کی اور پورے خاندان کی ذلت اور رسوائی منظور تھی‘ عدالت کی کرسی پر ناانصافی منظور نہ تھی۔ تم بیٹی کو سنگسار کرنے کا حکم دیتے لیکن اپنے ایمان کو ایک پتھر لگنے نہ دیتے۔

”تمہاری جگہ اس دنیا میں نہیں ہے سید آصف جاہ! تمہاری آخری گھڑی کہہ رہی ہے کہ میں تمہیں اس دنیا کی ٹرین سے باہر پھینک دوں اور یہ تو لوحِ مقدر پر لکھا ہے کہ ایمان والو! تم سجدے میں جان دو گے‘ یا پھر کسی عدل پر.........“

اجل نے روح قبض کرلی۔

دھند چھٹ گئی۔ عدالت کے وسیع و عریض کمرے میں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ بھیڑ میں دشمن بھی تھے اور اپنے بھی تھے۔ تمام فوٹوگرافرز انصاف کی کرسی کے پاس آکر فلیش لائٹ کی چکاچوند سے ان کی تصویریں مختلف زاویوں سے اتار رہے تھے۔ وہ کرسی پر تن کر بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھ کرسی کے دونوں ہتھوں پر تھے۔ آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ سر سینے کی طرف یا گریبان کی طرف یوں ڈھلک کر جھک گیا تھا جیسے سجدے میں جانے والے ہوں۔

خدایا! تُو قادرِ مطلق ہے۔ وہی کرے گا جو تجھے کرنا ہے۔ پھر بھی تجھ سے ایک دعا ہے کہ جب تک دنیا ایسی ہے‘ تب تک چاہے دولت چھپر پھاڑ کر دے مگر ایمان چھپر پھاڑ کر نہ دے۔

============

الٹا سیدھا

آدمی بے حد متضاد کیفیات اور عادات کا مجموعہ ہے۔ اس کا یہ عجیب اور حیران کُن تنوع نت نئی کہانیوں کو جنم دیتا ہے جو بعض اوقات ہمارے لیے ناقابلِ یقین بھی ہوتی ہیں۔ عام طور پر آدمی یا تو سچا ہوتا ہے یا جھوٹا۔ درمیان میں اگر کوئی تیسرا راستہ ہے تو وہ منافقت کا ہے .... لیکن بعض لوگوں کی فطرت کا تضاد اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت اُلٹے بھی ہوتے ہیں اور سیدھے بھی، جھوٹے بھی ہوتے ہیں اور سچے بھی۔ یہ لوگ راہِ مستقیم پر چلتے تو ہیں مگر اُلٹے! ایسے ہی اَن گنت آدمیوں کی بھیڑ میں وہ بھی ایسا ہی کردار تھا۔ اس پر مستزاد اُس کا پولیس والا ہونا تھا۔ اپنے قبیلے کے دیگر افراد کی طرح وہ بھی "چوری میرا پیشہ اور نماز میرا فرض" کے مقولے پر عمل پیرا تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ طبیعت کے اس اختلاف نے اُس کے متعلقین کی طرح خود اُسے بھی زِچ کیا ہوا تھا۔ صورتِ حال اس وقت اور پیچیدہ ہوگئی جب ایک خاتون صحافی سے اُس کی ٹھن گئی۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر سچائی کی اُس علم بردار خاتون کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن وردی کے تقاضے کچھ اور تھے۔ ضمیر اور وردی کی اس کھینچا تانی کا انجام بڑا ہی منطقی نکلا!

سیدھا آدمی 'الف' کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے پاؤں زمین پر اور سر آسمان کی طرف رہتا ہے لیکن اجل نواز آدمی ہوتا تو سیدھا ہوتا۔ اُس کی چال ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔ آدمی عدم سے وجود کی طرف آتا ہے۔ وہ اسے الٹا پلٹا کر وجود سے پھر عدم کو پہنچادیتا ہے۔

اس بار وہ الٹی چال چلنے والا اجل نواز خود الٹ گیا تھا۔ اس کا سر زمین کی طرف تھا اور پاؤں آسمان کی سمت اٹھے ہوئے تھے۔ ایسا یوں ہوا تھا کہ کچھ لوگ ایک اونچی شہتیر سے اس کے دونوں پاؤں باندھ کر اسے اُلٹا لٹکا کر چلے گئے تھے اور ان کے ارادے بتا رہے تھے کہ وہ اسے الٹے پاؤں ہی دنیا سے رخصت کریں گے۔

اوپر رسے سے پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ سر نیچے کی طرف تھا اور وہ ہوا کے جھونکوں سے جھول رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ ایسا سلوک ہونے پر احتجاج نہیں کیا تھا۔ ایسا سلوک کرنے والوں کو سیدھا سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ بھائیو! تم آدمی کے مرنے کے بعد اس کی تصویر دیوار پر سیدھی لگاتے ہو مگر زندگی میں اس سے الٹا سلوک کیوں کرتے ہو؟

صاف اور سیدھی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ تمہیں ہمیشہ الٹی کیوں سوجھتی ہے؟ کیا تم موت کے پاؤں باندھ کر اسے الٹا لٹکا کر سیدھا اپنی طرف آنے سے روک سکتے ہو؟

کراچی سے میرپور خاص تقریباً ایک سو ساٹھ میل ہے۔ میں اجل سے اتنا ہی دور تھا۔ ساحلِ سمندر کے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ وہ میرپور خاص سے چند کلومیٹر دور تھر کے صحرا میں الٹا لٹکا ہوا مجھ سے آواز کے ذریعے رابطہ قائم کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "پچھلی بار تم ایک سردار زادی مرجانہ کے مشیر تھے۔ آج کل کیا کر رہے ہو، کس حیثیت سے انسانی نگاہوں کے سامنے ہو؟"

اس نے جواب دیا "آج کل میں ایک صحافی ہوں اور تم جانتے ہو صحافی کیا ہوتا ہے؟"

"جانتا ہوں۔ صحافی ایک حکیم ہوتا ہے۔ سماجی، معاشی اور سیاسی نبضیں ٹٹول کر صحیح

نسخے لکھتا ہے۔"

اس نے کہا "لیکن مفاد پرست سیاست دانوں کے لیے صحافی ایک ننگی تلوار ہوتی ہے۔ جب یہ آڑی ترچھی اور سیدھی چلتی ہے تو بااثر لوگ اسے پکڑ کر نیام میں ڈال دیتے ہیں۔ سیدھی چلنے والی تلوار' نیام میں ہمیشہ الٹی جاتی ہے۔ اسی لیے ان لوگوں نے مجھے الٹا لٹکا دیا ہے۔"

"یہ میں جانتا ہوں' تمہارے لیے الٹا لٹکنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر قصہ کیا ہے؟"

"اس بار قصہ ایسے لوگوں کا ہے' جو الٹے بھی ہیں اور سیدھے بھی۔ جھوٹے بھی ہیں اور سچے بھی اور جو صراط مستقیم پر چلتے ہیں' مگر الٹے چلتے ہیں۔"

پھر اُس نے یوں ماجرا بیان کیا۔

☆=========☆=========☆

سید شاکر چنگیزی پولیس والا بھی تھا اور اللہ والا بھی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پولیس والے انسان نہیں ہوتے اور مسلمان نہیں ہوتے تو انہیں ایسا اپنے مشاہدے اور تجربے سے سمجھنے کا حق ہے جبکہ حق بات یہ ہے کہ وہ انسان بھی ہوتے ہیں اور دلوں میں خوفِ خدا بھی رکھتے ہیں۔

سید شاکر چنگیزی طالب علمی کے زمانے سے روزے نماز کا پابند تھا۔ پولیس ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد لاہور کے ایک تھانے میں انسپکٹر کی حیثیت سے اس کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ جب پہلی بار اس نے وردی پہنی تو اسے محسوس ہوا جسے اُس پر زین کس دی گئی ہو۔ وہ ایک گھوڑا ہے اور اس پر ہمیشہ قانون سوار رہے گا اور قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے اسے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں ڈنڈا پکڑے رہنا ہوگا۔

آدمی یا تو سچا ہوگا' یا جھوٹا ہوگا۔ ایماندار ہوگا' یا بے ایمان ہوگا۔ ان دو کے درمیان سے جو تیسرا راستہ گزرتا ہے' وہ منافقت کا ہوتا ہے۔

اکثر لوگ حالات سے مجبور ہو کر بُرے بنتے ہیں۔ مگر اچھائی کو بھی گلے لگا لیتے ہیں۔ چور بازاری' منافع خوری اپنے پیشے کا تقاضا ہے۔ نماز' حج' زکوۃ اور قربانی وغیرہ دین کا لازمی عمل ہے۔ سارے تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ اس مشہور فلمی مکالمہ کو فی زمانہ کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ "چوری میرا پیشہ ہے اور نماز میرا فرض.........."

ابتدا میں سید شاکر چنگیزی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایمان دار ہے یا بے ایمان؟ رحم دل ہے یا ظالم؟

جب وہ ایک تھانے کا چارج سنبھالنے سے پہلے اسی تھانے کے سابقہ تھانے دار سے ملاقات کرنے آیا تو سادے لباس میں تھا۔ سر پر کپڑے کی ایک گول ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور ہاتھ میں ایک تسبیح تھی۔ پہلے کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ جب اس نے اپنے کاغذات دکھائے اور سپاہیوں کو معلوم ہوا کہ وہ نیا افسر ہے تو سب الرٹ ہو گئے۔ اسے سیلوٹ کرنے لگے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اے مسلمانو! انگریزوں کا دستور چھوڑ دو۔ اسلامی دستور کے مطابق سلام کرو اور ایک دوسرے پر سلامتی بھیجو۔"

وہاں کے تھانے دار اور سپاہیوں نے اسے سلام بھی کیا اور اس سے مصافحہ بھی کیا۔ اس نے جس سپاہی سے بھی مصافحہ کیا۔ اسے نماز پڑھنے کی ہدایت کی۔ حوالات میں تین ملزم تھے۔ ان سے بھی ملاقات کی۔ ان کے جرائم معلوم کیے۔ پھر انہیں نصیحت کی کہ وہ گمراہی سے باز آجائیں۔ اگر وہ آج سے نماز پڑھیں گے تو وہ کل تھانے کا چارج سنبھالنے کے بعد انہیں رہا کردے گا۔

سپاہیوں سے لے کر مجرموں تک سب حیران تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ایسا ایمان والا انسان دوست پولیس افسر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کہا "یہ حیران ہونے کا نہیں' غور کرنے کا مقام ہے کہ ہم گمراہ لوگوں کو صحیح راستے پر چلا سکتے ہیں۔ اس لیے انہیں حوالات میں رکھ کر یا جیل بھیج کر ان سے غیر انسانی سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں ان کی بیوی اور بچوں سے دور نہیں کرنا چاہیے۔"

حوالات کا ایک قیدی یہ باتیں سن کر رو پڑا۔ شاکر چنگیزی کے قدموں میں جھک کر بولا۔ "آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ آپ کی باتیں دل پر اثر کرتی ہیں۔ میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں آئندہ کبھی کوئی کام قانون کے خلاف نہیں کروں گا۔ محنت مزدوری کر کے حلال روزی کماؤں گا۔"

سابقہ تھانے دار نے کہا۔ "میں نے تھانے کے پیچھے والا کوارٹر خالی کردیا ہے۔ آپ آج ہی اپنا سامان لا سکتے ہیں۔"

"میرے پاس سامان ہی کیا ہے؟ ایک چٹائی' ایک چارپائی' بستر' کھانے پکانے کے چند برتن' لباس کا ایک صندوق اور چند دینی کتب ہیں۔"

شام کو یہ سارا سامان ایک ریڑھے میں آگیا تھا۔ دو کمروں کا کوارٹر تھا۔ سامان ایک کمرے کے گوشے میں آگیا۔ محلے کا ایک چیئرمین چھ کرسیاں اور ایک سینٹر ٹیبل لے آیا۔ اس علاقے کا دادا ٹیپ ریکارڈر اور رنگین ٹی وی لے آیا۔ سید شاکر چنگیزی نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "یہ کیا خرافات ہیں؟ کیا تم جانتے ہو کہ رشوت دینے اور لینے والے ہاتھ جہنم

کی آگ میں جلائے جائیں گے۔"

چیئرمین نے کہا۔ "سر! یہ کرسیاں آپ کے آرام کے لیے ہیں۔ ہم آپ کے خادم ہیں۔ ہمیں خدمت کا موقع دیں۔"

علاقے کے دادا نے کہا۔ "میں اس تھانے کا پرانا خدمت گار ہوں۔ آپ کا نوکر ہوں۔ آپ کی تفریح کے لیے یہ سامان لایا ہوں۔"

سیّد شاکر چنگیزی نے کہا۔ "میں کفایت شعار ہوں۔ رات کو لالٹین جلاتا ہوں۔ ہمیں سرکاری بجلی بچانا چاہیے۔ ہم جتنی توانائی بچائیں گے' اتنا ہی ہمارا ملک ترقی کرے گا۔"

وہ دونوں گڑگڑائے "سر! ہمیں کچھ تو خدمت کرنے کا موقع دیں۔"

اس نے کہا۔ "رشوت ستانی سے باز آؤ اور نیکی کرو۔ یہ ٹیپ ریکارڈر' ٹی وی اور کرسیاں یہاں سے لے جاکر فروخت کرو۔ ان سے جتنی رقم حاصل ہو' وہ میرے پاس لاؤ اور یہاں کے فلاحی اداروں کے انچارج کو کل تھانے میں بلاؤ۔ یہ ساری رقم انہیں دی جائے گی۔ رشوت' کارِ خیر میں بدل جائے گی تو اللہ تم سے خوش ہوگا۔"

اس علاقے کے سپاہیوں' غنڈوں' بدمعاشوں' چیئرمین اور چوہدریوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ ایک فرشتہ صفت افسر کی آمد نے یہ جتادیا تھا کہ وہاں جوئے' شراب اور منشیات کے اڈے نہیں چلیں گے۔ انہوں نے آدھی رات کو بھی کوارٹر کے قریب سے گزر کر دیکھا۔ وہاں لالٹین کی ہی روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ پکا ایمان والا وہاں کے جرائم پیشہ افراد کے لیے عذاب بن کر آگیا تھا۔

صبح تک جرائم پیشہ افراد کی میٹنگ ہوتی رہی۔ فجر کی اذان کے بعد انہوں نے نئے افسر کو قریبی مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا۔ اس کے بعد وہ جوگنگ کے لیے چلا گیا۔ ایک سپاہی نے آکر پوچھا۔ "کیا اس کے لیے ہوٹل سے ناشتا لایا جائے؟"

اس نے نکار کرتے ہوئے کہا۔ "تم تمام سپاہی میرے نہیں' سرکار کے ملازم ہو۔ آئندہ یہاں نہ آنا۔ اپنی ڈیوٹی پر جاؤ اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو۔"

وہ سپاہی منہ لٹکا کر تھانے میں آیا۔ حوالدار اور دوسرے سپاہیوں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

سپاہی نے کہا "قیامت قریب ہے۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں اسلامی نظام قائم ہورہا ہے۔"

سید شاکر چنگیزی نے کوارٹر کے کچن میں اپنے لیے ناشتا تیار کیا۔ چائے پی' جھوٹے

برتن دھوئے' اپنی مدد آپ کے طور پر اپنا سب کام خود کیا۔ پھر جب شلوار قمیض اتار کر انسپکٹر کی وردی پہننے لگا تو اس کے اندر موسم اور مزاج بدلنے لگا۔ ایک ٹوٹے ہوئے آئینے میں شاندار وردی کے اندر اپنی ذات اپنی شخصیت دیکھی تو سینہ تن گیا۔ گردن ذرا اکڑ گئی۔ اس نے گھوم گھوم کر دو کمروں کے خالی کوارٹر کو یوں دیکھا جیسے کسی مفلس کنگال کے مکان میں آگیا ہو۔ اتنی شاندار وردی پہن کر اسے کسی شاندار کوٹھی میں رہنا چاہیے تھا۔

وہ کوارٹر میں دروازہ بند کرکے تھانے کے پچھلے حصے سے اگلے حصے کی طرف آیا۔ احاطے میں حوالدار اور کئی سپاہی اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ سب سے پہلے حوالدار نے آگے بڑھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے ہوئے کہا۔ "السلام علیکم..........."

سید شاکر چنگیزی پہلے تو حیران ہوا پھر گرج کر بولا۔ "وہاٹ نان سنس! تم عید ملنے آئے ہو' یا ڈیوٹی کرنے؟ پولیس ٹریننگ میں سلام سکھایا جاتا ہے یا سیلوٹ؟"

حوالدار نے سہم کر فوراً ہی الرٹ ہو کر سیلوٹ کیا پھر کہا۔ "سر! آپ نے کل اسلامی تعلیمات دی تھیں کہ ہمیں بحیثیت مسلمان ایک دوسرے پر سلامتی بھیجنا چاہیے۔"

وہ ڈانٹ کر بولا۔ "بکواس مت کرو۔ کل میں نے تم سے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔ کیا میرا دماغ چل گیا ہے کہ میں پولیس ٹریننگ کے خلاف بات کروں گا؟"

تھانے کے اندر اور باہر کھڑے ہوئے سپاہی بھی سلام کرنے اور مصافحہ کرنے والے تھے۔ جب حوالدار پر جھاڑ پڑی تو سب دستور کے مطابق ایڑیاں بجا بجا کر سیلوٹ کرنے لگے۔ انہیں وہ کل والا دین دار افسر نہیں کوئی چنگیز خان دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی کرسی پر اکڑ کر وہاں کے ضروری معاملات پر ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ اس علاقے کے تمام بدمعاشوں اور دادا گیری کرنے والوں کو حاضر کیا جائے۔ پچھلے دن حوالات میں جو تین ملزمان تھے۔ انہیں طلب کیا۔

ان تینوں کو حاضر کیا گیا۔ جس ملزم نے اس سے متاثر ہو کر اور رو کر اسے فرشتہ کہا تھا اس نے سلام کرتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ چنگیزی نے اس کے ہاتھ پر ایک بید رسید کرتے ہوئے کہا۔ "کہاں گھسے آرہے ہو؟ دور جاؤ۔ اکڑوں بیٹھو۔ بتاؤ کیا جرم کیا ہے تمہارا؟"

"حضور! ایک ہوٹل میں پندرہ روپے کی بریانی کھائی تھی۔ جیب میں پیسے نہیں تھے۔ میں چپ چاپ نکل جانا چاہتا تھا مگر ہوٹل کے ملازموں نے مجھے پکڑ لیا۔ مگر کل آپ

کی ایمان افروز باتوں نے دل پر اثر کیا تھا۔ مجھے رہائی ملے گی تو میں پاک صاف ہو کر نماز پڑھوں گا اور محنت مزدوری سے روٹیاں کھاؤں گا۔"

"یعنی تُو یہ کہنا چاہتا ہے کہ جتنے چور بدمعاش نمازیں پڑھنے لگیں' انہیں پھولوں کے ہار پہنا کر رہا کر دیا جائے۔ قانون' عدالت اور سزا کوئی چیز نہیں بلکہ تھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ایک طرف چوری کرتے جاؤ' دوسری طرف نمازیں پڑھتے جاؤ۔ کوئی تمہیں نہیں پکڑے گا۔"

پھر اس نے حوالدار سے کہا۔ "اس نے پندرہ روپے کی بریانی کھائی تھی۔ اسے پندرہ جوتے مار کر یہاں سے بھگا دو۔"

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس علاقے کا چیئرمین' محلے کا داوا' جوئے اور منشیات کے اڈے چلانے والے حاضر ہوگئے۔ وہ سب باہر منتظر تھے۔ انہیں ایک ایک کر کے کمرے میں بلایا گیا۔ پہلے محلے کا داوا آیا۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔ پھر اس کے سامنے نوٹوں کی ایک گڈی رکھ کر کہا۔ "آپ کے حکم سے ٹی وی اور ریکارڈر بیچ کر یہ سولہ ہزار روپے حاصل کئے ہیں۔"

انسپکٹر چنگیزی نے سر کھجاتے ہوئے سوچا پھر پوچھا۔ "کیا میں نے وہ سامان فروخت کرنے کو کہا تھا؟"

"جی حضور! آپ نے رشوت پر لعنت بھیجی تھی اور فرمایا تھا کہ میں کسی فلاحی ادارے کے انچارج کو ساتھ لے آؤں تاکہ یہ رقم کارِ خیر میں جائے۔ میں ایک انچارج کو ساتھ لایا ہوں۔"

وہ گھور کر بولا۔ "کیا مجھے اُلو سمجھتے ہو؟ اپنے کسی آدمی کو فرضی فلاحی ادارے کا انچارج بنا کر لے آئے ہو۔"

"حضور! میری اتنی جرأت نہیں ہے کہ میں آپ سے دھوکا کروں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں.........."

"بس بس۔ قسم رہنے دو۔ اس انچارج کو بھگاؤ یہاں سے۔ میں خود فلاحی ادارے میں جا کر یہ رقم ادا کر دوں گا۔" اس نے وہ سولہ ہزار اپنی میز کی دراز میں رکھ لیے۔ داوا کے جانے کے بعد چیئرمین آیا۔ اس نے میز پر نوٹوں کی گڈی رکھ کر کہا۔ "آپ کے حکم سے وہ میزیں کرسیاں بیچنے کے بعد یہ چار ہزار ملے ہیں۔ میں ایک فلاحی ادارے کے انچارج کو بھی ساتھ لایا ہوں۔"

انسپکٹر چنگیزی سوچ میں پڑ گیا اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے چیئرمین کو کوئی ا

م دیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تم کہاں کے چیئرمین ہو.........؟ کیا تم نے مجھے بتایا تھا؟"

وہ غرا کر بولا۔ "بے شرم! کتے! مجرا کرنے والیاں لاکھوں کماتی ہیں اور تُو یہ چار ہزار روپے کی ہڈی میرے سامنے پھینک رہا ہے۔ چل اٹھا یہ ہڈی یہاں سے۔ آج رات جہاں ہی مجرا ہو گا' وہاں پولیس کے چھاپے پڑیں گے۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "جناب عالی! کل آپ نے ہمیں کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہم سے ناراض ہو رہے تھے۔ میں ابھی دو گھنٹے کے اندر پچیس ہزار حاضر کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ جس فلاحی ادارے کے آدمی کو لائے ہو۔ اسے بھگا دو۔ میں ایسے اداروں کی خود انکوائری کروں گا پھر یہ رقم عطیے کے طور پر دوں گا۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

وہ چلا گیا۔ اس نے بارہ بجے تک تمام بدمعاشوں اور اڈے والوں کو بھگتا لیا۔ جب لنچ کے لیے اٹھا تو اس کے ہاتھ میں ایک پرانے اخبار کا بڑا سا بنڈل تھا۔ اس بنڈل میں ان ہزار روپے تھے۔ دو روز پہلے اس نے سو روپے سے ایک بینک میں اکاؤنٹ کھولا تھا ں اکاؤنٹ میں اس نے وہ بھاری رقم جمع کر دی۔ اس وقت ایک قریبی مسجد سے ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ اذان کانوں سے گزر رہی تھی۔ مگر یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ نماز کا پابند ہے اور اذان سنتے ہی مسجد کی سمت چل پڑتا ہے۔ یہ کوئی عجیب اور ناقابلِ فہم بات نہیں ی۔ روزانہ پانچوں وقت لاکھوں کروڑوں' مسلمانوں کے کانوں تک یہ آواز پہنچتی ہے لیکن اپنی طرف مائل نہیں کرتی۔ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اذان وہ صدا ہے جو کانوں سے نہیں سنی جاتی۔ اپنی نیت سے سنی جاتی ہے۔

اس نے ایک مہنگے ہوٹل میں خوب شکم سیر ہو کر لذیذ کھانے کھائے۔ پھر تھانے آکر پنے ماتحت سے کہا۔ "میں کوارٹر میں آرام کرنے جا رہا ہوں۔ کوئی خاص ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا۔"

اس نے تھانے کے پیچھے آکر کوارٹر کا قفل کھولا۔ اندر پہنچ کر ناگواری سی محسوس ہوئی۔ اس نے چارپائی پر بیٹھ کر جوتے اور جرابیں اتارتے ہوئے سوچا۔ رہائش کے لیے یک شاندار کوٹھی ضروری ہے۔ اگر آج کی طرح روز مرغے پھنستے رہے تو کسی مہنگے علاقے میں ایک کوٹھی خریدے گا۔

وہ جوتے اور جرابیں لے کر دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں کھونٹی پر اس کی شلوار اور قمیض لٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے لباس بدلنے کے لیے وردی اتاری تو یوں لگا جیسے اپنے سر سے پہاڑ اتار رہا ہو۔ اس نے اپنے دل' دماغ اور روح کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

وردی کو ہینگر میں لٹکا کر قمیص شلوار پہنتے ہی اندر سے موسم اور مزاج یکسر بدل گیا۔ اللہ اللہ کرنے لگا۔ چارپائی کے سرہانے رکھی ہوئی ٹائم پیس دیکھی۔ سہ پہر کے تین بجنے والے تھے۔ ایک دم سے پریشان ہو کر بولا۔ "یا اللہ! توبہ آج میں نے وقت پر ظہر کی نماز نہیں پڑھی۔ بہرحال قضا پڑھ سکتا ہوں۔"

اس نے قضا پڑھی پھر آخر میں دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "یا اللہ! میرے معبود! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو مجھے صراط مستقیم پر چلا رہا ہے اور حق حلال کی روزی دے رہا ہے۔ کل میں نے رشوت دینے والوں کو نیکی کی راہ دکھائی ہے۔ ان سے کہا تھا کہ رشوت کی نقد رقم لائیں۔ تاکہ اسے کارِ خیر میں خرچ کیا جائے۔ وہ جتنی رقم بھی لائیں گے' میں وہ سب کسی فلاحی ادارے کو دے دوں گا۔ میرے مالک! مجھے نیکیاں کرنے کی توفیق عطا کر۔ آمین۔ ثم آمین۔"

نیک عمل کے وقت اپنی برائی یاد نہیں آتی اگر وہ وردی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھتا تو اسے ایک بینک کی ڈیپازٹ بک نظر آتی۔ جس کے ذریعے اس نے آج ہی باون ہزار روپے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائے تھے لیکن یہ باتیں وہ بھول چکا تھا۔ اسے صرف ڈیوٹی کے اوقات میں وردی یاد آتی تھی۔

ایک ماتحت نے آکر دروازے پر دستک دی پھر کہا۔ "جناب عالی! دو بندوں کو تھانے میں لایا گیا ہے۔ وہ بڑے خون خرابے کے بعد لائے گئے ہیں۔ آپ ایس پی اور ڈی آئی جی سے بات کریں جناب!"

اس نے باہر آکر دروازے پر قفل لگاتے ہوئے کہا۔ "بڑے افسران سے کہنا کیا ضروری ہے۔ میں ان سے نمٹ لوں گا' چلو۔"

ماتحت ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "لیکن جناب! وہ دونوں دو سیاسی پارٹیوں کے بندے ہیں۔ اوپر والوں سے پوچھے بغیر کارروائی مناسب نہیں ہوگی۔"

"کیوں مناسب نہیں ہوگی؟"

"وہ دونوں بڑے پہنچے ہوئے بندے ہیں۔ بڑے سے بڑا جرم کرکے بھی بچ نکلتے ہیں۔"

وہ تھانے میں آیا۔ چونکہ عجلت میں آیا تھا۔ اس لیے بدن پر وردی نہیں تھی۔ ہاتھ میں ڈنڈا نہیں تھا۔ صرف تسبیح تھی۔ تمام سپاہیوں نے اسے سلام کیا تو ان سیاسی غنڈوں کی سمجھ میں آیا کہ وہی تھانے کا نیا انسپکٹر ہے۔ وہ دونوں غنڈے زخمی تھے۔ سپاہیوں نے انہیں اچھی طرح جکڑ کر ایک دوسرے سے دور کھڑا کیا تھا۔

اس نے دونوں کو دیکھ کر کہا "تم دونوں نے اپنا جتنا خون بہایا ہے' اتنا خون کسی مریض کو دے کر اس کی جان بچاسکتے تھے۔ اللہ اور اس کے بندے کو خوش کرسکتے تھے۔"

ایک غنڈے نے کہا۔ "میں نے اپنا خون اپنی قوم کے لیے بہایا ہے۔ جو سامنے کھڑا ہے اس کی پارٹی ملک دشمن پارٹی ہے۔ یہ لوگ عوام کو بے وقوف بناتے ہیں۔"

دوسرے غنڈے نے کہا۔ "ابے جا! بڑا آیا قوم کے لیے خون بہانے والا۔ حضور تھانے دار صاحب! یہ مزنگ اڈے میں چرس بیچتا ہے۔ قوم کا خون چوستا ہے۔"

پہلے نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "اور تو بھنگیوں کے کوٹھے پر ملنے والی اب لکشمی چوک کے فلمی دفتروں میں لے جاکر بیچتا ہے۔ قوم کا وڈا خدمت گار ہے۔"

انسپکٹر شاکر چنگیزی نے حوالدار سے کہا۔ "محرر سے کہو' دونوں کے بیان لکھے اور ان سے دستخط کرائے۔ میں ایف آئی آر درج کروں گا۔"

حوالدار نے کہا۔ "جناب والا! آپ یہ زحمت کریں گے؟ آپ یہاں نئے ہیں۔ آپ انہیں نہیں جانتے۔ دراصل........"

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "میں انہیں نہیں جانتا مگر یہ مجھے آج کے بعد جان جائیں گے میں نشہ کرنے اور کرانے والوں کو معاف نہیں کرتا ہوں۔ جو کہہ رہا ہوں' وہ کرو۔"

اسی وقت ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا پھر بولا۔ "سر! ایس پی صاحب تشریف لارہے ہیں۔"

انسپکٹر چنگیزی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک قد آور افسر تھانے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے قریب آتے ہی چنگیزی نے اسے سلوٹ کیا۔ ایس پی نے اسے نظرانداز کرکے حوالدار سے پوچھا۔ "انسپکٹر کہاں ہے؟"

چنگیزی نے کہا۔ "سر! میں ہوں نیا انسپکٹر شاکر چنگیزی!"

ایس پی نے اسے گھور کر دیکھا پھر پوچھا۔ "تمہاری وردی کہاں ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "سر! میں نماز کے وقت وردی اتار دیتا ہوں۔ آج قضا نماز پڑھ رہا تھا کہ یہ کیس آگیا۔ مجھے عجلت میں وردی کے بغیر آنا پڑا۔"

ایس پی نے دونوں غنڈوں کو نفرت سے دیکھا پھر کہا۔ "تم لوگوں کو اتنے جوتے مارنا چاہئیں کہ منہ کی جگہ جوتا ہی نظر آئے گا۔ کیا تم لوگوں کا حلیہ دیکھ کر کوئی کہے گا کہ کسی محب وطن پارٹی کے کارکن ہو۔"

چنگیزی نے کہا۔ "سر! یہ محبِ وطن نہیں ہیں۔ چرس اور شراب بیچتے ہیں۔"

"مجھے سب پتا ہے۔ انہیں وارننگ دے کر چھوڑ دو۔"

شاکر چنگیزی نے انگلیوں پر تسبیح پھیرتے ہوئے کہا۔ "اللہ ہُو۔ اللہ ہُو' برائی
ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے جرائم اور اڈے ہمیں معلوم ہیں پھر وارننگ کیوں
جائے۔ انہیں پورے ثبوت کے ساتھ عدالت میں پہنچانا پولیس کا فرض ہے۔"
ایس پی نے گرج کر کہا۔ "تم مجھے پولیس کا فرض سمجھا رہے ہو؟ او
آرڈر۔"
"سوری سر! میں خدا سے ڈرتا ہوں جبکہ دوسرے انسپکٹر اپنے اعلیٰ افسران
ڈرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اپنے اعلیٰ افسر کے احکامات کی تعمیل مجھے کرنا چاہیے
میرا ایمان اور ضمیر جن احکامات کو غلط سمجھتا ہے' میں اس پر عمل نہیں کروں گا۔"
ایس پی حیرت زدہ سا اسے اور اس کی تسبیح کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہ
سکتا تھا کہ ایک ماتحت افسر اس کے حکم سے انکار کی جرأت کرے گا۔ وہ سخت لہجے
بولا۔ "ہوش میں تو ہو؟ میرے حکم سے انکار کا نتیجہ جانتے ہو؟"
"یس سر! مجھے لائن حاضر کیا جاسکتا ہے۔ میری ملازمت جاسکتی ہے۔ پھر بھی
اپنے ایمان اور فرض کے مطابق ایف آئی آر درج کروں گا اور ان دونوں کو عدالت
پہنچاؤں گا۔"
ایس پی اسے گہری سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے۔
اپنے کمرے میں چلو۔"
وہ تھانے کے اس حصے سے گزرتا ہوا اپنے دفتری کمرے کا دروازہ کھول کر اس
کے ساتھ اندر آیا۔ ایس پی نے کہا۔ "بیٹھو اور میری باتیں توجہ سے سنو۔ تم نے
کے پورے عملے کے سامنے میرے حکم سے انکار کرکے میری جو توہین کی ہے اسے
کس طرح برداشت کررہا ہوں' یہ میں خود نہیں جانتا۔ شاید تمہاری تسبیح' تمہاری نماز
تمہارے بولنے کا ایمانی انداز مجھے متاثر کر رہا ہے۔"
"سر! میں یہی چاہتا ہوں کہ ایمان سب کو متاثر کرے۔"
"یہ تمہاری بھول ہے۔ ایمان سب کو متاثر کرتا تو بے ایمانی عام نہ ہوتی۔ ان
کو چھوڑ دینے سے مجھے کوئی روحانی خوشی حاصل نہیں ہوگی اگر نہ چھوڑا تو میری
تمہاری ملازمتیں سلامت نہیں رہیں گی۔"
انسپکٹر چنگیزی اپنے افسر کا منہ تکنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "سیاسی پارٹیاں اپنے کار
کی خوش حالی اور ان کا روزگار قائم رکھنے کے لیے کسی کو نوکریاں دلاتی ہیں' کسی کو
سے قرضے دلاتی ہیں اور جو کارکن غنڈے موالی ہوتے ہیں' ان کے تمام

خانوں کا تحفظ ہم سے کراتی ہیں۔ اگر ان کے کارکنوں پر آنچ آئے تو ہماری
کو خطرہ ہوجاتا ہے یا کسی چھوٹی جگہ تبادلہ کردیا جاتا ہے۔"
"بلا سے چھوٹی جگہ تبادلہ ہوجائے۔ میں دال روٹی کھا کر صبر و شکر سے فرائض انجام
ہوں گا۔ اس وقت میں یہاں کا انچارج ہوں۔ میں ان دونوں کے خلاف ضرور قانونی
روائی کروں گا۔ آپ اپنے طور پر میرے خلاف کارروائی کرسکتے ہیں۔"
ایس پی اس کی باتیں سنتا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے تو قانون میں بھی
جانتا ہوں۔ ان لمحات میں تمہارے پاس ایسی کوئی شناخت نہیں ہے کہ تم یہاں کے
چارج ہو۔ جب تک تمہارے بدن پر وردی نہیں ہوگی اور تمہارے شناختی کاغذات
ہوں گے تم یہاں کوئی قانونی کارروائی نہیں کرسکو گے' ناؤ گیٹ آؤٹ۔"
وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا' پھر بولا۔ "آل رائٹ سر! میں ابھی اپنی وردی اور شناخت کے
حاضر ہوتا ہوں۔"
وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ ایس پی نے اطمینان کی سانس لی۔
تو وہ اپنے افسرانہ دبدبے اور انسپکٹر کی تابعدارانہ مجبوری سے اسے قانونی کارروائی
روک سکتا تھا لیکن اس باغی انسپکٹر سے انتقام لینے کی تدبیر سوجھ گئی تھی۔ اب وہ
دار سے کہہ سکتا تھا کہ ڈیوٹی کے روزنامچے میں لکھو کہ انسپکٹر شاکر چنگیزی بارہ بجے دن
تھانے سے جانے کے بعد اب تک ڈیوٹی پر حاضر نہیں ہوا ہے۔
مزید یہ کہ ایس پی بھی روزنامچے پر لکھے گا کہ وہ تھانے کا معائنہ کرنے آیا تو اس نے
کو غیر حاضر پایا تھا۔ جب تھانے میں ایسی ڈیوٹی رپورٹ درج ہوجائے گی تو ایس پی
زخمی سپاہی غنڈوں کو وہاں سے بھگا دے گا۔
ایس پی کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس سیاست داں کا ممنون احسان تھا جس کا ایک
یہاں گرفتار ہوکر آیا تھا۔ اپنے محسن سیاست داں پر ایسے غنڈے کے ذریعے کوئی
نہ آئے' اس لیے اسے ہی نہیں دوسری پارٹی کے غنڈے کو بھی وہاں سے بھگادینا
تھا کہ تھانے میں ان دونوں کے ذریعے کوئی بات نہ بڑھے۔
اس نے میز پر رکھی ہوئی کال بیل کے ذریعے سپاہی کو بلایا۔ سپاہی کی جگہ حوالدار
حاضر ہوکر کہا۔ "یس سر!"
اس نے حکم دیا۔ "روزنامچہ لاؤ۔ میں اس میں انسپکٹر کی غیر حاضری لکھوں گا۔ ان
ڈوں کو یہاں سے بھگا دو۔"
وہ عاجزی سے بولا۔ "مشکل ہے جناب باہر گڑ بڑ ہوگئی ہے۔"

اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیسی گڑ بڑ؟"

"اخباروں کے رپورٹر آگئے ہیں۔ ان کا ایک فوٹوگرافر ان غنڈوں کی تصویریں ا
چاہتا تھا۔ ہم نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا ہے۔ اسے بتایا ہے کہ آپ یہاں
ہیں۔ آپ کے حکم کے بغیر انہیں یہاں سے تصویریں اور خبریں نہیں ملیں گی۔"

"کیا مصیبت ہے۔ یہ اخبار والے کہاں سے مرنے آگئے ہیں۔ اب تو وہ چنگیزی
زیادہ شیر ہوجائے گا۔ تم ایسا کرو' ان کے پاس رہو۔ رپورٹرز کو غنڈوں سے کوئی سوال
کرنے دو۔ جاؤ اُن پر نظر رکھو۔"

"میں جارہا ہوں جناب' لیکن وہ بڑے اخباروں کے رپورٹر ہیں۔ شاید آپ ہی
قابو آسکیں گے۔"

وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ ایس پی نے ریسیور اٹھا کر اپنے محسن سیاست داں کے نمبر
ڈائل کیے۔ رابطہ ہونے پر معلوم ہوا کہ اس کا محسن وہاں موجود نہیں ہے۔ اس
جھنجلا کر ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔

ایک ایس پی کی حیثیت سے اس کی بڑی نیک نامی تھی کہ وہ قانون کی برتری
رکھنے کے معاملات میں بہت سخت ہے اور کسی کا نہ لحاظ کرتا ہے اور نہ بااثر افراد کے
میں آتا ہے۔

ایک سپاہی نے آکر کہا۔ "جناب عالی! ابھی انسپکٹر صاحب آئے تھے۔ وہ حوالدار
تین سپاہیوں کے ساتھ ان دونوں غنڈوں کو لے گئے ہیں۔"

ایس پی نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کمبخت انسپکٹر انہیں کہاں لے گیا ہے؟"

"پتا نہیں جناب! آپ کے لیے پیغام دے گئے ہیں کہ فکر نہ کریں۔ ابھی سا
معاملہ ٹھیک ہوجائے گا۔"

"کیا خاک ٹھیک ہوگا۔ وہ انسپکٹر نہیں پکا مولوی ہے۔ اُسے یہ سمجھانا مشکل ہے
ملک کا قانون کچھ ہوتا ہے اور تھانے کا قانون کچھ اور.........."

"سر! وہ اخبار والے آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "ان سے کہو' انتظار کریں۔ میں ایک بہت پیچیدہ کیس کی فا
پڑھ رہا ہوں۔ انسپکٹر شاکر چنگیزی کے آنے کے بعد اُن سب سے ملاقات کروں گا۔"

سپاہی چلا گیا۔ وہ ایک بڑا افسر ہو کر اپنی توہین محسوس کر رہا تھا کہ محض ایک
کی وجہ سے کمرے میں قید ہوگیا ہے۔ باہر نکل کر اخبار والوں کے سوالات کے جوابات
تو دور کی بات ہے' انہیں یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کا ماتحت انسپکٹر ان زخمی غنڈوں

کہاں لے گیا ہے؟"

دس منٹ کے بعد ہی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر پوچھا۔

"ہیلو کون ہے؟"

شاکر چنگیزی کی آواز سنائی دی "سر! میں ہوں آپ کا خادم۔ پوری طرح وردی میں
ہوں اور اپنے فرائض ادا کر رہا ہوں۔"

وہ غصے سے بولا "یو نان سنس! تم میری اجازت کے بغیر ان غنڈوں کو کہاں لے گئے
ہو؟"

"سر! آپ کو اخبار والوں سے دور رکھنے کے لئے ان بدمعاشوں کو لے آیا ہوں۔
اب آپ ان سے یہ کہہ کر جان چھڑا سکتے ہیں کہ تھانے کا انچارج ان کے معاملات کی
تحقیقات کر رہا ہے۔ اس کے بعد آپ کو مکمل رپورٹ ملے گی تو آپ کچھ کہہ سکیں
گے۔"

"لیکن تم کس لائن پر تحقیقات کر رہے ہو؟ تمہاری دیانت داری مجھے لے ڈوبے
گی۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ وہ لوگ کتنے بااثر اور بااختیار ہیں۔ اپنے ایک غنڈے کی
خاطر ہماری وردیاں اتروا دیں گے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں سر! آپ کا خادم ہوں۔ آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گا اگر
کوئی سامنا ہو تو وہیں انتظار کریں' میں آدھے گھنٹے بعد فون کروں گا۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ ریسیور رکھ کر سوچنے لگا "کیا یہ وہی تسبیح پڑھنے والا انسپکٹر ہے؟
ابھی فون پر اس کی باتوں سے مکاری ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ پہلے میرے احکامات کی تعمیل
نہیں کر رہا تھا۔ وردی پہن کر آتے ہی حکم کا بندہ بن گیا ہے۔ کیا اتنی جلدی کوئی انسان
بدل سکتا ہے؟ انسان کو بدلنے کے لئے اس کے آگے کچھ چارا ڈالنا پڑتا ہے۔ یا اس کی
گردن پر تلوار رکھنی پڑتی ہے لیکن وہ تسبیح پھیرتے وقت میری دھمکیوں کی تلوار سے بھی
نہیں ڈر رہا تھا۔"

اس نے ایک سپاہی کو بلا کر پوچھا "یہ نیا انسپکٹر کیسا ہے؟ کیا دھاندلی کرتا ہے؟"

"جناب عالی! وہ کچھ عجیب سا بندہ ہے۔ اپنے کوارٹر میں لالٹین جلاتا ہے اور توانائی
بچاتا ہے۔ جب ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے تو رشوت پر لعنت بھیجتا ہے لیکن صبح وردی پہن کر
آیا تو ہاتھ میں تسبیح نہیں تھی۔ ڈنڈا تھا۔ یہاں کے خاص بندوں سے ایسی رشوت لی ہے
کہ ان کی کھال کھینچ لی ہے۔"

وہ اطمینان سے سانس لے کر بولا "اچھا تو بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہے۔ بڑا ڈراما باز

ہے۔ میں تو سچ مچ اسے دیانت دار سمجھنے لگا تھا لیکن اسے اپنی پارسائی دوسروں کو دکھانا
چاہیے۔ میرے سامنے کیوں دیانت دار بن رہا تھا اور میرے حکم سے انکار کرکے میری
توہین کر رہا تھا؟"

اسے چنگیزی پر غصہ بھی آتا رہا اور وہ اُس کی دوغلی حرکتوں پر الجھتا بھی رہا۔
اگرچہ یہ حقیقت ازل سے واضح ہے کہ آدمی اپنے اندر انسان بھی ہے اور شیطان بھی۔
کسی کو دولت بدل دیتی ہے، کسی کو رُتبہ اور اقتدار بدل دیتا ہے اور کسی کو وردی بدل دیا
کرتی ہے۔

سپاہی نے آکر اطلاع دی کہ انسپکٹر صاحب دو ملزموں کو واپس لے آئے ہیں۔ ایس
پی بڑی دیر سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ غصے میں جھنجھلاتا
ہوا کمرے سے باہر آیا۔ دوسرے بڑے کمرے میں انسپکٹر شاکر چنگیزی، حوالدار، کئی سپاہی
دو ملزمان اور کئی اخبار والے موجود تھے۔ دونوں ملزموں کے چہروں اور جسم کے دوسرے
حصوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک اخباری رپورٹر پوچھ رہا تھا "انسپکٹر صاحب! وہ دو
غنڈے کہاں ہیں، جنہیں آپ یہاں سے لے گئے تھے؟ اور کیوں لے گئے تھے؟"

انسپکٹر چنگیزی نے کہا "کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ میں اسپتال سے ان کی مرہم
پٹی کرا کے لا رہا ہوں؟ کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ یہ دونوں بہت بری طرح زخمی
تھے؟"

وہ تمام اخبار والے ان ملزموں کو غور سے دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر پٹیاں بندھی
ہوئی تھیں۔ تقریباً آدھے سے زیادہ چہرے چھپے ہوئے تھے۔ ایک نے کہا "لیکن جناب! یہ
وہ دونوں سیاسی غنڈے نہیں ہیں۔ یہ تو دوسرے ہیں۔"

چنگیزی نے ناگواری سے پوچھا "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ یہ غنڈے نہیں ہیں تو کیا
میں انہیں کسی شریف خاندان سے پکڑ لایا ہوں؟ کیا میں آپ لوگوں کے سامنے انہیں مرہم
پٹی کے لئے نہیں لے گیا تھا؟ شاید ان کے چہروں پر پٹیاں بندھی ہونے کے باعث آپ
انہیں پہچان نہیں پا رہے ہیں؟"

ایک رپورٹر نے کہا "ہم اُس غنڈے کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، ایم پی اے کا پالتو تھا
ہے اور اس دوسری پارٹی کے غنڈے کو بھی خوب پہچانتے ہیں۔ انہوں نے ایسی حرکتیں کی
ہیں کہ ان کے سیاسی سرپرستوں کے چہرے بے نقاب ہو جائیں گے لیکن یہ دونوں وہ نہیں
ہیں۔"

ایس پی کی سمجھ میں آگیا کہ انسپکٹر چنگیزی نے کیا چال چلی ہے۔ اس نے کہا "تم

ذمے دار افسر یہاں موجود ہوں۔ میں نے انسپکٹر سے کہا تھا کہ ان بدمعاشوں کو مرہم
پٹی کے لئے لے جائے۔ میں چشم دید گواہ ہوں کہ یہی دو بدمعاش یہاں سے لے جائے
گئے۔ تعجب ہے کہ آپ حضرات انہیں شناخت کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔"

انسپکٹر چنگیزی نے کہا "آپ اخبار والے کیوں ہم پولیس والوں کے پیچھے پڑ جاتے
ہیں؟ اب آپ بے تکی خبر شائع کریں گے کہ ہم نے مجرم تبدیل کر دیئے ہیں۔ ان کی مرہم
پٹی نہیں کرائی ہے۔ پلاسٹک سرجری کے ذریعے چہرے بدل دیئے ہیں۔"

ایک رپورٹر نے قریب آکر پوچھا "سچ بتاؤ تم ایم پی اے چوہدری احمد حسین کے آدمی
ہو؟"

اس ملزم نے کہا "میں نے آج تک چوہدری صاحب کی شکل بھی نہیں دیکھی
ہے۔"

دوسرے رپورٹر نے پوچھا "تم لوگ کس الزام میں یہاں آئے ہو؟"

ایک زخمی نے کہا "میں نے اس کی بہن کو چھیڑا تھا۔ اس نے جواباً میری بہن کو
چھیڑا۔ اس بات پر بات بڑھ گئی اور ہمارے درمیان لاٹھیاں اور چھریاں چلنے لگیں۔ آخر
پولیس ہمیں گرفتار کرکے یہاں لے آئی۔"

دوسرے ملزم نے کہا "یہ درست ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کی بہن کو چھیڑا تھا۔
انسپکٹر صاحب بہت رحم دل ہیں، انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم آپس میں صلح کرلیں
گے اور ایک دوسرے کی بہن سے شادی کرکے ایک دوسرے کے سالے اور بہنوئی بن
جائیں گے تو ہم پر کوئی کیس نہیں ہوگا۔ ہم رہا کر دیئے جائیں گے۔"

انسپکٹر نے کہا "آپ اخبار والوں کو لکھنا چاہیے کہ ہم پولیس والے کتنی خوش
اسلوبی سے نفرتوں کو محبتوں میں بدلتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی اپنی بہن کے لئے غیرت میں آکر
ایک دوسرے کے قاتل بن سکتے تھے۔ ہم نے انہیں ایک دوسرے کی بہن کا تاحیات محافظ
بنا دیا ہے۔"

وہ اخبار والے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ ثابت نہیں کرسکتے تھے کہ مجرم
بدل دیئے گئے ہیں۔ وہ اصل مجرموں کی تصویریں اور خبریں حاصل کرنے آئے تھے۔ ان
تصویروں اور خبروں کے ذریعے دوسرے دن کے اخبارات میں زبردست سیاسی دھماکا
ہو سکتے تھے لیکن انسپکٹر چنگیزی نے دھماکا کرنے والے بارود کو مٹی میں بدل دیا تھا۔

وہ اخبار والے مایوس ہو کر چلے گئے۔ ایس پی نے خوش ہو کر کہا "انسپکٹر! تم نے تو
الٹا کر دیا۔ وہ دونوں غنڈے کہاں ہیں؟"

"وہ پولیس ہسپتال میں زیرِ علاج بھی ہیں اور زیرِ حراست بھی۔ اب آپ جا کر ان کے سیاسی سرپرستوں کو سمجھائیں کہ پولیس بار بار ان کے کرتوت چھپا نہیں سکے گی۔ لہٰذا ایسے نچلے درجے کے سیاسی کارکنوں کو قابو میں رکھیں۔ یہ لوگ نشہ کرتے وقت اندر کے راز زبان پر لے آتے ہیں پھر ایک دوسرے کا پول کھولنے کے لئے خون خرابہ کرتے ہوئے پولیس اور پریس والوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔"

ایس پی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "میں ابھی ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔ ویسے تم نے کمال کیا ہے۔ ان دونوں زخمیوں کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟"

"یہ دوسرے تھانے کے ملزم ہیں۔ انہیں ادھار لایا ہوں۔ ابھی واپس پہنچا دوں گا۔"

ایس پی خوش ہو کر چلا گیا۔ حوالدار نے چنگیزی سے کہا "سر! آپ کی کچھ باتیں، کچھ حرکتیں الجھا دیتی ہیں۔ آپ نے پہلے تھانے میں آ کر ایس پی صاحب کو ناراض کیا۔ ان کے حکم کے خلاف ان سیاسی غنڈوں کو معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ انہیں عدالت تک پہنچانے کا عہد کیا لیکن دوسری بار تھانے آ کر اپنے عہد کے خلاف ایس پی صاحب کے حکم کے مطابق ان غنڈوں کو اور ان کے سیاسی سرپرستوں کو بے نقاب ہونے سے بچا لیا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ پہلے حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کیوں کیا تھا؟"

شاکر چنگیزی کرسی پر بیٹھ گیا' سر کھجا کر سوچنے لگا' کیا میں نے اپنے اعلیٰ افسر کے حکم سے انکار کیا تھا؟

شاید میں نے ایسا کیا ہو گا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ میں بہت سی باتیں بھول جاتا ہوں؟

پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب میرے ہاتھ میں ڈنڈا آتا ہے تو میں تسبیح نہیں پکڑتا۔ شاید اس لئے کہ آدمی دو میں سے کوئی ایک ہی کام کر سکتا ہے۔ گولی مار سکتا ہے یا پھول مار سکتا ہے۔

بعض اوقات یاد آتا ہے کہ میں بہت ایمان والا ہوں۔ رشوت کی بڑی رقموں کو ٹھکرا دیتا ہوں پھر کچھ ایسا لگتا ہے کہ میں حرام کما رہا ہوں۔ دولت مند بنتا جا رہا ہوں۔ جب کبھی وردی پہنوں گا تو یاد آئے گا کہ وہ دولت میں نے کہاں چھپا رکھی ہے۔"

ایک ہفتے بعد ایس پی نے چنگیزی کو اپنے دفتر میں طلب کیا پھر کہا "چوہدری احمد حسین تم سے بہت خوش ہیں۔"

اس نے پوچھا "یہ چوہدری احمد حسین کون ہیں؟"

"وہی ایم پی اے ہیں۔ بڑی پارٹی کے لیڈر ہیں۔ انہیں صوبے میں وزارت ملنے والی ہے۔ تم نے اخبار والوں کو جس انداز میں بے وقوف بنایا تھا' وہ واقعہ سن کر وہ تم سے بہت خوش ہوئے۔ تمہارا کوئی کام ہو تو بتاؤ فوراً ہو جائے گا۔"

"ابھی جس تھانے میں ہوں' وہاں عیش ہی عیش ہیں۔ کام بس اتنا ہی ہے کہ وہاں سے کبھی میرا تبادلہ نہ ہو۔"

"نہیں ہوتا۔ فکر نہ کرو۔ وہیں عیش کرو گے۔ ویسے چوہدری صاحب کا ایک کام ہے' وہ تمہارے جیسا چالاک آدمی ہی کر سکتا ہے۔"

"میں حاضر ہوں۔ آپ حکم کریں۔"

اس کے افسر نے میز کی دراز کھول کر ایک تصویر نکالی۔ پھر اسے دیتے ہوئے کہا "اس کا نام شمائلہ پروین ہے۔ صحافت کے میدان میں نئی ہے۔ مگر بہت تیز ہے۔ چوہدری صاحب کے لئے ہری مرچ ہے۔ اُن کے خلاف دوبار کالم لکھ چکی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ تیسری بار لکھنے نہ پائے۔"

"سر! میں کوشش کروں گا کہ یہ چوہدری صاحب کی مخالفت سے باز آجائے۔ مگر آپ سوچ لیں کہ ہم پولیس والے ہیں۔ ہمیں پریس والوں سے کترانا چاہیے' ٹکرانا نہیں چاہیے۔"

"اس طرح ٹکراؤ کہ ہمارا نام نہ آئے۔ میں چوہدری صاحب کو فون کرتا ہوں۔ تم ابھی چلے جاؤ۔ اُن سے تمہیں شمائلہ کے متعلق معلومات بھی حاصل ہوں گی اور تم کوئی لائن آف ایکشن بھی بنا سکو گے۔"

وہ تصویر دیکھ رہا تھا۔ لڑکی بڑی رنگین اور سنگین دکھائی دے رہی تھی۔ وہ قیافہ شناسی کے ذریعے سمجھ رہا تھا کہ وہ تیز طرار بھی ہے اور پختہ ارادوں والی بھی ہے۔ سیدھی طرح قابو میں نہیں آئے گی۔ ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا ہو گا۔

چوہدری احمد حسین سے ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا "چنگیزی! تم نے تصویر دیکھ کر ہی بڑی حد تک اسے سمجھ لیا ہے۔ اسے قتل کرنے کے لئے میرے پاس غنڈوں اور قاتلوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کا مرڈر ہو گا تو مجھ پر شبہ کیا جائے گا۔ صرف شبہے کی بنا پر قانون میرا کچھ نہیں بگاڑے گا مگر میرے سیاسی کیریئر کو نقصان پہنچے گا۔"

"کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟"

"نہیں' ابھی کنواری ہے۔ عمر پچیس برس سے کم نہیں ہوگی۔ اسے کسی کے ساتھ بدنام کیا جا سکتا ہے۔"

"بدنام کرنے کے لئے اس کے ہاتھ کے کچھ خطوط، کچھ قابلِ اعتراض تصویریں، کچھ ٹھوس ثبوت لازمی ہیں۔ یہ سب کچھ حاصل کرنے میں جتنا عرصہ لگے گا، اتنے عرصے میں یہ آپ پر مزید کیچڑ اچھال چکی ہوگی۔"

"ہاں، اس کا قلم روکنے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ پتا نہیں اس کُتیا کو میری کچھ کمزوریاں کس طرح معلوم ہوگئی ہیں۔ اس نے فون پر مجھے دھمکیاں دی تھیں۔ میری کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں کہ میں سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ ایس پی نے تمہاری بڑی تعریفیں کی ہیں۔ پلیز، کچھ کرو۔"

"کیا آپ لاکھ ڈیڑھ لاکھ دے سکتے ہیں؟ یہ میں اپنے لئے نہیں، اسے پھنسانے کے لئے مانگ رہا ہوں۔"

"میں ابھی تمہیں ایک لاکھ روپے دوں گا۔ بولو تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ جانتے ہیں، میرا تھانہ ہیرا منڈی سے لگتا ہے۔ میں اُسے طوائف بنا کر وہاں بٹھادوں گا۔"

"یہ تو کمال ہو جائے گا۔ مگر اسے شریف زادی سے طوائف کیسے بناؤ گے؟"

"یہ میرا کام ہے۔ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ چونکہ کام بہت مشکل ہے۔ اس لئے بڑی رقم مانگ رہا ہوں۔"

چوہدری اٹھ کر ڈرائنگ روم سے گیا۔ پھر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بڑے نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ چنگیزی نے وہ گڈی لے کر اپنی جیب میں ٹھونس لی۔ پھر چوہدری سے شائلہ کا فون نمبر معلوم کرکے ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر کسی نے پوچھا "آپ کون ہیں؟ کس سے بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں انسپکٹر سید شاکر چنگیزی بول رہا ہوں۔ محترمہ شائلہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں شائلہ بول رہی ہوں، فرمایئے۔"

"تم سے فون پر گفتگو کرکے خوشی ہو رہی ہے۔ میں تمہارے کالم پڑھتا ہوں۔ قانون کے ایک محافظ کی حیثیت سے تمہارا وہ کالم بہت سچا اور کھرا لگا، جو تم نے چوہدری احمد حسین کے متعلق لکھا ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ اس کالم کی سچائی پر یقین کر رہے ہیں۔"

"اس لئے یقین کر رہا ہوں کہ میں بھی چوہدری کا کچا چٹھا جانتا ہوں۔ مگر مجھے ثبوت نہیں مل رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے تعاون سے اسے قانونی گرفت میں لے سکوں گا۔"

"یہ تو آپ میرے دل کی بات کہہ رہے ہیں۔ میں ہر طرح سے تعاون کروں گی۔"

"اگر تم مناسب سمجھو تو میرے پولیس اسٹیشن آجاؤ یا مجھے اپنے ہاں کوئی وقت دو۔"

"میں کل صبح ایک پریس کانفرنس اٹینڈ کرنے اسلام آباد جا رہی ہوں۔ وہاں سے واپسی پر میری فلائٹ کنفرم ہے۔ میں کل چھ بجے لاہور پہنچوں گی۔"

"پھر تو میں تمہیں ایئرپورٹ سے پک کر سکتا ہوں۔ تم جہاں کہو گی، وہاں چل کر بیٹھیں گے اور چوہدری کے مسئلے پر بات کریں گے۔"

وہ بولی "میرے گھر میں افراد بہت ہیں۔ باتیں کرنے کے لئے آپ کا پولیس اسٹیشن مناسب رہے گا لیکن ہم ایئرپورٹ پر ایک دوسرے کو کیسے پہچانیں گے؟"

"تم بھول رہی ہو، اخبار میں تمہاری تحریر کے ساتھ تمہاری تصویر بھی چھپتی ہے اور میری پہچان یہ ہے کہ میں انسپکٹر ہوں وردی میں نظر آؤں گا۔"

ملاقات طے ہوگئی۔ رابطہ ختم ہوگیا۔ چوہدری نے خوش ہو کر کہا "کمال ہے، تم نے اسے منٹوں میں پھانس لیا۔ کوشش کرو کہ وہ دام میں آئے تو پھر نکل نہ پائے۔"

"چوہدری صاحب! وہ بہت عرصہ لاپتا رہنے کے بعد دام سے نکلے گی لیکن کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ بازاری گاہکوں کے ساتھ اس کی تصویریں عام ہو جائیں گی۔"

وہ چوہدری کی کوٹھی سے نکل کر بینک آیا۔ وہاں اپنے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ روپے جمع کئے۔ پھر تھانے پہنچ کر طوائفوں کی انجمن کے صدر کو بلوایا۔ وہ حکم سنتے ہی دوڑا چلا آیا۔ چنگیزی نے کہا "بیٹھو اور یہ بتاؤ دھندا کیسا چل رہا ہے؟"

"آپ کی مہربانی ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ قانوناً ایک بجے کے بعد مجرا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ بازار بند کرنے کا حکم ہے لیکن آپ چھاپے نہیں مارتے۔ اس لئے گاہک وہاں صبح تک رہ جاتے ہیں۔"

وہ بولا "مجھے مجرے سے دلچسپی نہیں ہے۔ منڈی کے اس حصے کی بات کرو، جہاں جسم فروشی ہوتی ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہاں پہلی بار جو لڑکی لائی جاتی ہے، اسے کیسے مجبور کیا جاتا ہے؟"

وہ بتانے لگا کہ جو راضی نہیں ہوتی، اسے کیسے راضی کیا جاتا ہے۔ چنگیزی نے کہا "کل رات سات یا آٹھ بجے تک میں ایک لڑکی کے ساتھ وہاں آؤں گا۔ اپنے لوگوں کو سمجھا دو کہ اسے اس طرح قابو میں کریں کہ وہ زیادہ شور نہ مچائے۔ ایسا ہنگامہ نہ ہو کہ

میں بدنام ہو جاؤں۔"

"حضور! آپ فکر نہ کریں۔ ہم ضد کرنے والیوں کو ایک چٹکی......... سیندور کھلا دیتے ہیں پھر ان کے حلق سے آواز ہی نہیں نکلتی ہے۔"

"یہی ہونا چاہیے' اگر ایسا نہ ہوا۔ وہ قابو میں نہ آئی تو میں تمہارے سارے دھندے بند کرا دوں گا۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

وہ چلا گیا۔ اس نے جیب سے تصویر نکال کر دیکھی۔ شمائلہ پروین مسکرا رہی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ میں بھی قدرے سنجیدگی اور دھیما دھیما سا غرور تھا۔ ایسا غرور جو کبھی زیر نہیں ہوتا۔ ہمیشہ زبر رہتا ہے۔

تصویر خواہ کتنی ہی خوب صورت ہو' وہ بے جان ہوتی ہے لیکن اس میں جان پڑ جائے تو دل کھینچ لیتی ہے۔ اس نے دوسری شام ایئرپورٹ پر اسے زندہ متحرک دیکھا تو نیت میں فتور آگیا۔ دل نے کہا' یہ تو آج سے بہتی گنگا بننے والی ہے۔ لہٰذا پہلے خود ہی گنگا میں نہائے گا۔

شمائلہ پروین کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ پہلے شمائلہ اور چنگیزی ایک دوسرے سے چہرہ شناس ہوئے۔ پھر وہ بولی "یہ ہمارے بزرگ صحافی امجد رانا صاحب ہیں۔ آیئے رانا صاحب!"

شاکر چنگیزی کو مایوسی ہوئی کہ وہ بزرگ ساتھ لگے رہے تو سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ وہ تینوں پارکنگ ایریا میں آئے۔ پھر پولیس کی جیپ میں بیٹھ گئے۔ شمائلہ نے کہا "آپ کو زحمت نہ ہو تو رانا صاحب کو گلبرگ میں ڈراپ کردیں۔ پھر ہم آگے جائیں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولا "زحمت کیسی۔ رانا صاحب میرے بھی بزرگ ہیں اور قابلِ احترام صحافی ہیں۔"

اس نے جیپ اسٹارٹ کرکے آگے بڑھائی۔ امجد رانا نے کہا۔ "ویسے میاں شاکر چنگیزی! تمہارا دو لفظی نام بڑا متضاد ہے۔ شاکر کے معنی ہیں اللہ کا شکر ادا کرنے والا اور چنگیزی سے چنگیز خان کی دہشت' تباہی اور بربادی کا خیال قائم ہوتا ہے۔"

شمائلہ ہنسنے لگی' چنگیزی نے کہا "ہم آباؤاجداد سے چنگیزی کہلاتے ہیں۔ ویسے بھی میرے شعبے کے لحاظ سے یہ نام موزوں ہے۔ ہم پولیس والے چنگیز خان ہی سمجھے جاتے ہیں۔"

اس نے بزرگ صحافی کو گلبرگ کی ایک کوٹھی کے سامنے ڈراپ کردیا۔ پھر گاڑی

آگے بڑھاتے ہوئے بولا "اسلام آباد میں پریس کانفرنس کیسی رہی؟"

"وہی روایتی سی پریس کانفرنس تھی۔ ہمارے حکمران صحافیوں کے سوالات سے کتراتے ہیں۔ گول مول جواب دے کر پیچھا چھڑاتے ہیں۔ بلکہ چند لونے قسم کے صحافیوں کو سوالات کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ مجھے اور بزرگ امجد رانا صاحب کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔"

وہ بولا "میں حکمرانوں کی باتیں نہیں جانتا۔ مگر وہ چوہدری احمد حسین تم سے بڑا خار کھاتا ہے۔"

"ابھی وہ اور انگاروں پر لوٹے گا۔ وہ حیران ہے کہ میں اُس کی کمزوریاں کیسے جانتی ہوں۔"

"کیسے جانتی ہو؟ کیا مجھ پر بھروسہ کرکے بتاؤ گی؟"

"بے شک۔ آپ مقبول پولیس افسر ہیں۔ آپ سے خطرہ نہیں تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل چوہدری یہ نہیں جانتا ہے کہ میں اُس کی مقتول بیوی کی سہیلی تھی۔ اس کی رازدار تھی۔ اسے شبہہ ہوگیا تھا کہ چوہدری اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ آخر وہی ہوا گیس چولہے سے آگ بھڑکنے کے باعث وہ جل کر مرگئی۔ بظاہر یہ ایک حادثہ تھا۔ مگر چوہدری نے اسے قتل کیا تھا۔"

"تم اسے قاتل کیسے ثابت کرسکو گی؟"

"اس کی بیوی نے اپنی موت سے ایک ہفتہ پہلے مجھے خط لکھا تھا کہ چوہدری پر سیاست کا بھوت سوار ہے۔ وہ الیکشن لڑنے کے لئے اس بے چاری کی تمام زمینیں بیچنا چاہتا ہے اور وہ انکار کررہی ہے۔ اس پر چوہدری نے اسے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی اور صاف طور پر اسے کہا تھا کہ وہ بہت جلد جل جل کر مرے گی' آخر وہ جل کر ہی مرگئی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "ہمارے ہاں سیاست ایک کھلونا ہوگئی ہے۔ جسے دیکھو' وہ اپنے طور پر کھیل رہا ہے۔ بے چارے عوام کا کباڑا کررہا ہے' حتیٰ کہ بیوی بچوں کو بھی نہیں بخش رہا ہے۔"

"وہ چونک کر بولی "یہ ہم کدھر آگئے ہیں؟ یہ......... یہ تو ہیرا منڈی ہے۔"

"ہاں۔ یہیں ایک گلی میں پولیس اسٹیشن ہے۔ تمہاری جیسی بے باک صحافی کو ایسے ماحول پر بھی کچھ لکھنا چاہیے۔"

وہ اسے باتوں میں الجھاتا ہوا جیپ ڈرائیو کرتا ہوا اس گلی میں لے آیا' جہاں عورت کی توہین کا سامان کیا جاتا تھا۔ جہاں انسانیت شرماتی تھی مگر انسان نہیں شرماتا تھا۔ جیپ

کے رکتے ہی چاروں طرف سے چھ ہٹے کٹے بدمعاش آ گئے۔ ان میں سے ایک نے شمائلہ کو جیپ کی اگلی سیٹ سے کھینچ کر کپڑے کے تھان کی طرح اٹھایا پھر اسے کاندھے پر ڈال لے جانے لگا۔ اس نے چیخ ماری۔ ایسے وقت منہ کھلتے ہی ایک نے اس کے منہ کے اندر اپنی انگلی ٹھونس کر تھوڑے سے سیندور کو حلق تک پہنچا دیا۔ پھر جبراً اس کا منہ بند کر دیا۔

وہ ہاتھ پاؤں جھٹکتی رہی۔ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتی رہی لیکن اسے ایک کمرے میں پہنچا کر ایک پلنگ پر پھینک دیا گیا۔ اس نے اٹھ کر بھاگنا چاہا تو ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ الٹ کر پھر بستر پر آ گئی۔ سہمی ہوئی نظروں سے دیدے گھما کر دیکھنے لگی۔ پلنگ کے چاروں طرف چھ پہلوان نما درندے تھے۔ سب کے قہقہے بتا رہے تھے کہ وہ شکاری ہیں اور شکار کی بوٹی بوٹی نوچ لیتے ہیں۔

ایک بھیانک چہرے والے نے پوچھا "بول راضی یا ناراضی؟"

دوسرے نے کہا "ہم یہاں آنے والی سے کچھ پوچھتے نہیں، پوستے اور پالتے ہیں۔ اسے باہر جانے کے قابل نہیں چھوڑتے۔"

تیسرے نے کہا "تیری رضامندی اس لئے پوچھ رہے ہیں کہ یہ انسپکٹر صاحب کا حکم ہے۔"

چوتھے نے کہا "ہمارے انسپکٹر صاحب آدمی ہیں اور ہم کتے ہیں۔ بول آدمی اچھا کہ کتے؟"

وہ بری طرح خوف زدہ ہو کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ جواباً کئی بار اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ اندر سے آواز کی جگہ ہوا کا بھپکا سا نکلتا رہا اور حلق دکھتا رہا۔

اب یہ سوچنے اور حیران ہونے کا وقت گزر چکا تھا کہ قانون کے ایک محافظ نے اسے بازاری عورت بنانے کے لئے خود تھانے کی گاڑی میں وہاں پہنچایا ہے۔

اور جب قانون کی بالادستی قائم رکھنے والے ہی ایسا کرتے ہیں تو پھر کون انصاف کرنے اور رہائی دلانے آئے گا؟

پھر اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ انسپکٹر شاکر چنگیزی نظر آیا۔ اگرچہ وہی اسے لایا تھا۔ مگر شمائلہ اسے دیکھ کر یوں اٹھی جیسے جسم و جان کا محافظ آ گیا ہو۔

یہ احمقانہ امید تھی۔ ایک پہلوان نے اس کی ریشمی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ وہ پھر تکئیے پر گر پڑی۔ شدید تکلیف کے باوجود حلق سے آواز نہ نکلی۔ آہ انداز میں ہوا نکل کر رہ گئی۔ چنگیزی نے حاکمانہ انداز میں کہا "تم سب جاؤ یہاں سے۔"

وہ سب پلنگ سے دور ہٹ گئے۔ سر جھکا کر ایک کے پیچھے ایک کمرے سے باہر چلے گئے۔ چنگیزی نے دروازے کو بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "دروازہ بند نہ بھی کروں تو بھاگ نہیں سکو گی۔ باہر وہ چھ کتے تمہیں نوچنے اور بھنبھوڑنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔"

وہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پھر بولنے کی ناکام کوشش کی جب بول نہ سکی تو آنسوؤں سے اور ہاتھ کے اشاروں سے پوچھنے لگی "مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ مجھ سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

اس نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ تم بولنے کے قابل نہیں رہیں اور قلم تو اب پکڑ نہیں سکو گی کیونکہ یہاں لکھنے پڑھنے کا نہیں، صرف عیاشی کا سامان ہوتا ہے۔ تمہیں کس احمق نے مشورہ دیا تھا کہ صحافی بنو اور سیاست دانوں سے ٹکراؤ؟ کیا تمہیں نہیں معلوم تھا کہ اس ملک کی انتقامی سیاست میں نواب پور کی بستی ہو یا کسی زمیندار کا علاقہ، وہاں عورتوں کو سرتاپا برہنہ کر کے سرِ بازار گھمایا گیا۔ یہی تماشا دیکھ کر کہا جاتا ہے"

میرے ملک کی سیاست کا حال نہ پوچھ
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

اب تم بھی طوائف بنو گی اور تمہارا گاہک میں ہوں۔ میرے بعد بھی لوگ آتے رہیں گے، جاتے رہیں گے اور یہ چار دیواری تمہاری آبرو کا مقبرہ بنی رہے گی۔

تمہارے والدین، تمہارے رشتے دار، تمہارے اخبارات والے اور تمہارے پریس اور پبلی کیشنز والے سب تمہیں تلاش کریں گے۔ مگر انہیں تمہارا سراغ نہیں ملے گا۔ پھر تلاش کرنے کے لئے ہم پولیس والوں کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ ہماری خدمات ہا ہا ہا......... ہا ہا ہا۔ ہماری خدمات حاصل کی جائیں گی اور میں بھی تمہیں تلاش کرتا رہوں گا۔

ویسے جب تمہاری جوانی ڈھلنے لگے گی اور آنے والے تم میں کوئی کشش نہ پا کر دوسرے دروازوں پر جائیں گے تو اس بازار سے تمہاری چھٹی ہو جائے گی۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ طوائفیں بھی ووٹ دے کر قوم کے نمائندے منتخب کرتی ہیں۔ تم ہیرامنڈی کے حلقے سے چوہدری احمد حسین جیسے کسی ناپسندیدہ شخص کو ووٹ دے کر اسمبلی میں پہنچاؤ گی اور اپنی بے باک صحافت بھول جاؤ گی۔ لکھنا بھی چاہو گی تو پڑھنے والے تمہارے گاہک ہی ہوں گے، وہ تمہاری بے حیائی اور تمہارے قلم کی پارسائی کو خوب سمجھتے ہوں گے۔"

وہ دیدے پھیلائے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ قلمی ذہانت اور ذاتی تجربات کی بھٹی میں پکنے والی ذہانت کا فرق سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس نے اپنے ملک کے مفاد پرستوں کو نہایت پستی میں گرتے دیکھا تھا۔ آج پہلی بار طوائف کے بستر پہنچانے والی ان کی سیاست بھی دیکھ رہی تھی۔

وہ ہنستا ہوا قریب آ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ وہ پیچھے ہٹنا چاہتی تھی۔ اس نے پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ اسے مارنے لگی۔ وہ مار کھا کر ہنسنے لگا۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لئے اس کی وردی کے گریبان کو پکڑ کر جھنجھوڑا تو اوپر کا ایک بٹن ٹوٹ گیا' وہ قہقہہ لگا کر بولا "بٹن کیوں توڑ رہی ہو۔ سارے بٹن میں خود ہی کھول دیتا ہوں۔"

اس کے دونوں ہاتھ اپنی وردی کی طرف آئے تو وہ رہائی پاتے ہی بستر سے اتر کر ذرا دور چلی گئی۔ اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ایسی مجبوری تھی کہ گڑگڑا کر ظالم سے رحم کی بھیک مانگ سکتی تھی' نہ خدا سے دعا مانگنے کے لئے ایک لفظ ادا کر سکتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں گڑگڑانے لگی "یااللہ! میری مدد کر۔ میری شرم رکھ لے۔ میں نے کبھی بے حیائی کا کوئی منظر نہیں دیکھا۔ وہ درندہ افسر بے لباس ہو رہا ہے۔ میرے مالک! تُو ہی میرا محافظ ہے یا تو میری آبرو رکھ لے' یا وحشی درندے کو آدمیت سکھا دے.........."

معجزے ایسے ہی رونما نہیں ہو جاتے۔ غیبی امداد یونہی نہیں پہنچ جاتی۔ اس کے لئے قدرتی منطق اور دلائل' انسان کی لاعلمی میں چلے آ رہے ہوتے ہیں' جو اپنے مخصوص وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔

اچانک ہی معجزہ سا رونما ہوا۔ ثمائلہ کے کانوں میں شاکر چنگیزی کی گڑگڑاتی ہوئی صدا پہنچی۔ "یااللہ! یہ مجھ سے کیسا گناہ سرزد ہونے والا تھا؟ کیا میں ایک بے گناہ لڑکی کو گناہوں کی دلدل میں پہنچانے آیا ہوں۔ توبہ توبہ' اللہ توبہ۔ توبہ توبہ' اللہ توبہ.........."

دل ہی دل میں دعا مانگنے والی نے حیرت سے اس درندے کی ایسی باتیں سنیں' جو ندامت میں ڈوبی ہوئی تھیں اور توبہ کی تکرار کر رہی تھیں۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا کہ شیطان ایک انسان بن گیا ہے۔ پھر اس نے جھجکتے ہوئے سر گھما کر دیکھا۔ ادھر بے حیائی کا منظر نہیں تھا۔

انسپکٹر کی وردی زمین پر ایک طرف پڑی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں اسے بالکل بے لباس ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے بستر کی چادر کھینچ کر اپنے آپ کو چھپا لیا تھا۔ سر اٹھا کر چھت کو یوں تک رہا تھا جیسے آسمان کو دیکھ رہا ہو اور خدا کو پا رہا ہو۔ اس پر خوف طاری تھا

وہ اللہ تعالیٰ سے بار بار اپنی غلطی کی معافی مانگ رہا تھا۔

ثمائلہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پولیس والے پر کون سا نادیدہ عذاب نازل ہو رہا ہے کہ وہ پچھتاوے اور توبہ کی راہ پر آ گیا ہے۔

وہ یہ تو نہ سمجھ سکی کہ وردی کے اتر جانے سے کیسا انقلاب آیا ہے۔ مگر اس نے والی یہ شان دیکھی کہ وہاں چھ پہلوان دلالوں نے اسے جس بستر پر لا کر پھینکا تھا' اسی بستر کی چادر سے انسپکٹر اپنا برہنہ پن چھپا رہا تھا اور عاجزی سے کہہ رہا تھا "ثمائلہ! مجھے معاف کر دو۔ تم معاف کرو گی تو خدا بھی معاف کر دے گا۔"

اس نے بولنے کے لئے ہونٹ کھولے' زبان ہلائی مگر بول نہ سکی۔ وہ بڑی ملامت سے بولا "یہ مجھ سے ایک اور جرم ہو گیا۔ ملک اور قوم کے لئے لڑنے والی صحافی کی آواز لالی۔ اسے بے زبان کر دیا۔ نہیں' میں.......... میں اس کی تلافی کروں گا۔ شاید طبی امداد ملنے سے یہ بول سکے۔"

اس نے اپنے جسم پر چادر کو اچھی طرح لپیٹا۔ پھر ثمائلہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا "چلو۔ پہلے تمہیں کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ اس کے بعد تم مجھے جو سزا دو گی' اسے سر جھکا کر قبول کروں گا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ باہر گلی میں انسپکٹر کی جیپ کھڑی تھی۔ اس کے اطراف چھ پہلوان ٹائپ کے غنڈے تھے۔ ثمائلہ انہیں دیکھ کر سہم گئی۔ چنگیزی نے گرج کر کہا "بے غیرتو! بھاگ جاؤ یہاں سے۔ اگر اسے کسی نے ہاتھ لگایا تو اسے گولی مار دوں گا۔ حوالات میں پہنچا دوں گا۔"

وہ تمام غنڈے دور چلے گئے۔ حیرانی اور پریشانی سے انسپکٹر کے بدلے ہوئے رویے پر بڑبڑانے لگے۔ وہ ثمائلہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر جیپ اسٹارٹ کر کے اسے ڈرائیو کرتا ہوا اس بدنام بازار کی گلیوں اور راستوں سے ثمائلہ کو دور لے جانے لگا۔

وہ ایک بہت ہی گندی دلدل سے بے داغ نکل آئی تھی لیکن بستر کی ایک چادر میں وہ شخص اس کے ساتھ بیٹھا ہوا اور جیپ ڈرائیو کرتا ہوا عجیب سا لگ رہا تھا بلکہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ بازاروں اور شاہراہوں سے گزرتا ہوا ایک ہاتھ سے چادر سنبھال رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اسٹیئرنگ۔

ثمائلہ نے سوچا' اگر ایسا سب کے ساتھ ہو تو؟

اگر آدمی کے بدن پر اتنا ہی کپڑا ہو' جتنا وہ اپنی بے لباسی کو سنبھال پائے تو دوسرے

کو بے لباس کرنے کی اسے مہلت نہیں ملے گی۔

ہماری دینی زندگی میں دو مقامات ایسے آتے ہیں' جب ہم شرم ستر پوشی کی اہمیت
سمجھنا چاہیں تو سمجھ سکتے ہیں۔ ایک مقام وہ جب طوافِ کعبہ کے لئے احرام باندھتے
اور بے سلا کپڑا اپنے بدن سے لپیٹ کر خدا کے حضور جھکتے ہیں اور اپنی بے لباسی
سنبھال کر مکمل حیا سے ملبوس رہتے ہیں۔

دوسرا مقام وہ ہے' جب ہم کفن میں لپٹ کر اپنی قبر میں سوتے ہیں۔ آدمی تو
پھر وہ کیا اور اس کا ننگا پن کیا؟ اسے گڑھے میں پھینک دو لیکن اخلاق اور تہذیب
کی ستر پوشی بھی سکھاتی ہے۔

گونگی شمائلہ کے دل سے آواز نکلی۔ یا خدا! تو بڑا کارساز ہے۔ تو نے بے حیائی
بستر کی ایک چادر کو چنگیزی کے لئے احرام بنا دیا ہے۔

☆=========☆=========☆

بڑا غضب ہو گیا تھا۔ ایک صحافی لڑکی چکلے سے برآمد ہو کر اسپتال پہنچی تھی۔ پھر
پولیس اور پریس والوں تک پہنچ گئی تھی۔ بات صرف پولیس والوں تک رہتی تو اس
کا رخ بدل دیا جاتا۔ یا کسی طرح اس کیس پر مٹی ڈال دی جاتی مگر یہ خبر پریس والوں
پہنچ گئی تھی۔ کتنے ہی نامی گرامی صحافی اطلاع ملتے ہی اسپتال دوڑے چلے آئے تھے۔

اس سلسلے میں جو بڑی غلطی ہوئی وہ یہ تھی کہ پہلے صحافیوں کو اطلاع دی گئی۔
کے بعد پولیس کو خبر پہنچائی گئی اور اسی غلطی پر پولیس کے اعلیٰ افسران کا عتاب انسپکٹر
چنگیزی پر نازل ہو رہا تھا۔

ایم پی اے چوہدری احمد حسین کے ڈرائنگ روم میں ایس پی کے علاوہ دو
بڑے افسران بھی تھے۔ انسپکٹر چنگیزی ان سے ذرا دور سر جھکائے کھڑا تھا اور وہ سب
پر گرج رہے تھے۔ برس رہے تھے' چوہدری احمد حسین کبھی اٹھ رہا تھا' کبھی بیٹھ رہا تھا
اپنا سر پیٹ رہا تھا کہ اخبار والے اسے صرف اسمبلی اور سیاست سے ہی نہیں نکالیں
بلکہ عدالت تک پہنچا دیں گے۔

سیاسی پارٹی کے اکابرین پریشان تھے کہ ان کا ایک ایم پی اے زبردست گھیراؤ
آ گیا ہے۔ جو سیاسی جرم ایک صحافی لڑکی کے ساتھ ہوا تھا' وہ منظرِ عام پر آ گیا تھا۔
سیاسی ہتھکنڈوں سے چھپایا جا سکتا تھا اور نہ ہی کسی سمجھوتے سے یہ معاملہ دبایا جا سکتا

ایک لیڈر نے ایک بڑے پولیس افسر کو مخاطب کیا' پھر چنگیزی کی طرف اشارہ
بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس گدھے کو پولیس میں ملازمت کس نے دی؟"

ایس پی نے کہا "یہ بہت ذہین اور چالاک انسپکٹر ہے۔ اپنی اسامیوں کو بچانے کے
ئے زبردست چالیں چلتا ہے۔ خود چوہدری صاحب گواہ ہیں کہ پچھلے روز غنڈے سیاسی
وں کی غلطیوں سے جو بدنامی ہونے والی تھی' اس نے چوہدری صاحب کو اس بدنامی
بچایا تھا۔"

لیڈر نے کہا "یہ تو کوئی خدمت نہ ہوئی کہ کنوئیں سے نکال کر کھائی میں پھینک دیا۔
نے اپوزیشن پارٹی کو ہمارے گلے میں پھندا ڈالنے کا موقع دیا ہے۔"

ایک افسر نے پوچھا "سنا ہے تم اس چکلے سے شمائلہ کو لے کر نکلے تو تمہارے جسم پر
ی نہیں تھی۔ تم ایک چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ یہ قصہ کیا ہے؟ تم نے اپنی وردی
ں چھوڑ دی تھی؟"

چنگیزی اس وقت وردی میں تھا۔ اوپر والوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں
آ رہا تھا کہ ایسے کسی سوال کا کیا جواب دے؟ اسے کچھ یاد نہیں رہا تھا کہ وردی کیوں
ر آیا تھا اور چادر لپیٹ کر آنے کی وہ کیا حماقت تھی؟

پھر چادر میں لپٹے رہنے کے دوران اس نے جو کچھ کیا' وہ جیسے خواب میں کی جانے
کی تھی؟ آنکھ کھلنے کے بعد بہت سے خواب یاد نہیں رہتے۔ اس طرح وہ بھولا ہوا تھا
وہ شمائلہ کو ایک اسپتال میں لے کر آیا تھا اور ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ اس کے حلق میں
ر پہنچایا گیا ہے۔ اس کی آواز بند کر دی گئی ہے۔ لہٰذا فوری امداد پہنچائی جائے۔

وہ بول نہیں سکتی تھی۔ اس نے ایک کاغذ پر لکھا "چنگیزی صاحب! آپ کی مہربانی
۔ آپ ہمارے بزرگ صحافی امجد رانا صاحب کو فوراً کال کریں اور انہیں میرے
بتائیں۔"

ثاکر چنگیزی نے یہی کیا۔ امجد رانا کو یہ خبر ملی تو انہوں نے دوسرے صحافیوں تک یہ
ہائی۔ چنگیزی نے اسپتال کے قریبی تھانے میں آ کر ایس ایچ او کو حالات بتائے۔ ایس
نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا "تم کون ہو؟ تمہارے پاس پہننے کو لباس
ہے۔ بستر کی چادر لپیٹ کر رپورٹ درج کرانے آئے ہو۔"

سپکٹر چنگیزی نے اپنا تعارف کرایا لیکن وہ ایس ایچ او' اسے کسی تھانے کا پولیس
ماننے کو تیار نہیں تھا۔ بعد میں صحافیوں نے آ کر اسے مجبور کیا کہ وہ اسپتال چل کر
کا بیان لے لیکن شمائلہ نے اس وقت بیان دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے ایک کاغذ
"ابھی میرے اعصاب بری طرح متاثر ہیں۔ میں پوری طرح اپنے حواس میں نہیں
ذرا نارمل ہونے پر بیان لکھوں گی۔"

ڈاکٹر نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مریضہ کو ابھی مجبور نہ کیا جائے۔ صحافیوں نے تھانے واپس آکر ایس ایچ او کی موجودگی میں چنگیزی سے سوالات کئے کہ شائلہ اس بدنام گلی میں کیسے پہنچ گئی تھی اور چنگیزی اسے کس طرح وہاں سے نکال لایا تھا؟

اس نے سیدھا اور سچا بیان لکھ دیا کہ ایک ایم پی اے چوہدری کی شائلہ سے ذاتی دشمنی تھی۔ شائلہ کا قلم اس کی مکروہ سیاست کا بھانڈا پھوڑنے والا تھا۔ اس لئے وہ اور چنگیزی شائلہ کو راستے سے ہٹانے اور اس کا صحافتی کیرئر تباہ کرنے کے لئے اسے بدنام گلی میں لے گیا تاکہ اسے طوائف بنا دیا جائے۔ پھر پتا نہیں کیسے اس کا ضمیر بیدار ہوا اور وہ شائلہ کو عزت و آبرو سے اسپتال لے آیا۔

اخبار والوں کے اصرار پر ایف آئی آر درج کرلی گئی لیکن ابھی شائلہ کا بیان باقی تھا اور یہ یقین تھا کہ اس کے بیان سے چوہدری کے جرم کی تصدیق ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ اس کے خلاف کچھ ٹھوس ثبوت بھی رکھتی تھی۔

اس دوران ڈاکٹر نے ایس ایچ او نے اور صحافیوں نے چنگیزی سے بار بار یہ سوال کیا کہ وہ چادر میں کیوں لپٹا ہوا ہے؟ اس کا لباس اور وردی کہاں ہے؟

اس نے جواب دیا "اسے کچھ یاد نہیں ہے کہ وردی کہاں رہ گئی ہے۔ وہ ابھی تھانے جاکر معلوم کرے گا۔ وردی نہ ملی تو سادہ لباس پہن لے گا۔"

بزرگ صحافی امجد رانا نے کہا "بیٹے! بہتر ہے تم جاؤ اور وردی پہن کر آؤ۔ شائلہ تمہاری موجودگی میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھ رہی ہے۔"

وہ اپنی جیپ میں بیٹھ کر اپنے تھانے آیا۔ طوائفوں کی انجمن کے صدر نے اس کی وردی تھانے میں پہنچا دی تھی جسے وہ چھوڑ آیا تھا۔ وہ میلی اور شکن آلود ہوگئی تھی۔ اس نے کوارٹر میں آکر دوسری ڈھلی ہوئی صاف وردی پہنی تو اچانک ہی کھوپڑی گھوم گئی۔ وہ باتیں خواب کی طرح لگیں کہ اس نے شائلہ کو چکلے میں پہنچانے کے بعد تماشے کئے تھے۔ اب وہ تماشے نہیں، غلطیاں تھیں۔ اس نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ اپنے خلاف بیان دے کر پولیس کے محکمے کو بدنام کرچکا تھا۔

اسے پریس اور صحافیوں کی بھرپور حمایت حاصل ہو گئی مگر اب پولیس کی ملازمت جانے والی تھی۔

جب وہ وردی پہننے کے بعد پچھلی نیکیوں پر پچھتا رہا تھا تب ہی اُس کے اعلیٰ افسران کے فون آنے لگے تھے۔ اُسے ڈانٹا اور پھٹکارا جا رہا تھا۔ پھر اسے چوہدری احمد حسین کے ڈرائنگ روم میں طلب کیا گیا تھا۔

اور اب وہ اپنے اعلیٰ افسران اور سیاسی اکابرین کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ایک سنٹر ٹیبل پر بہت سے اخبارات بکھرے ہوئے تھے۔ ان اخبارات نے لکھا تھا کہ شائلہ اب تک بولنے کے قابل نہیں ہوئی ہے اور شاید کل تک نارمل ہونے کے بعد ایم پی اے چوہدری احمد حسین اور اس کے زر خرید پولیس والوں کے خلاف تحریری بیان دے گی۔

ایک معمر لیڈر نے کہا "انسپکٹر پر غصہ کرتے رہنے سے بات نہیں بنے گی۔ ابھی بچاؤ کی ایک تدبیر ہے۔ یہ اسے وہاں سے بچا کر نہ لاتا تو وہ بازاری عورت بن جاتی۔ وہ ابھی اس کی احسان مند ہے۔ یہ اس پر مزید احسانات جتا کر اسے ہمارے خلاف بیان لکھنے سے باز رکھ سکتا ہے۔"

"ہوں" ایک بڑے افسر نے کہا "چنگیزی! تم ایسا کرسکتے ہو۔ اس سے احسان کا بدلہ مانگو۔ اس کے قدموں میں گر جاؤ۔ کسی بھی طرح چوہدری صاحب اور ان کی پارٹی کو بدنامی سے بچاؤ۔"

وہ بولا "سر! اگرچہ بات بہت دور تک پھیل گئی ہے اور کئی صحافی حضرات اس معاملے میں بہت زیادہ سرگرمی دکھا رہے ہیں پھر بھی میں سب کی زبانیں بند کردینے کی پوری کوشش کروں گا۔"

"ہاں، کوشش میں کامیابی حاصل کرو گے تو تمہاری بھلائی ہے۔ ورنہ ملازمت سے تو جاؤ گے ہی، سیاسی انتقام سے بھی بچ نہیں پاؤ گے۔ زمین تم پر تنگ ہو جائے گی۔"

"اور اگر تم اس معاملے پر قابو پالو گے۔ پریس والوں اور اپوزیشن پارٹی کی زبانیں بند کردو گے تو تمہیں ترقی دی جائے گی۔ تمہیں انسپکٹر سے ڈی ایس پی بنا دیا جائے گا۔"

وہ اپنے بڑوں کو سیلوٹ کر کے چوہدری کی کوٹھی سے باہر آیا۔ پھر اپنی جیپ میں بیٹھ کر اسپتال کی طرف جانے لگا اور سوچنے لگا۔ "میں نے اس کمبخت لڑکی کو کیوں بچایا؟ یہ مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ اچانک نیکیوں سے کیوں بھر جاتا ہوں؟ دنیا میں سب ہی برائیاں کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ چھوٹی بڑی نیکیاں بھی کرلیتے ہیں۔ ایمان اور بے ایمانی ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن مجھے ایمانداری مہنگی پڑ رہی ہے۔ اگر شائلہ میری احسان مند نہ ہوئی اور میری مرضی کے مطابق بیان نہ لکھا تو پھر زندگی بھر کبھی میرے ہاتھ میں ڈنڈا نہیں آئے گا۔ میں صرف تسبیح لے کر ڈنڈے والوں سے مار کھاتا رہوں گا۔"

وہ اسپتال پہنچا۔ صحافیوں نے وہاں ایسے سخت انتظامات کئے تھے کہ کوئی پولیس والا تنہائی میں شائلہ سے نہ ملے۔ یہ اندیشہ تھا کہ سیاسی لوگ پولیس کے ذریعے شائلہ کو دباؤ ڈلوائیں گے لیکن انسپکٹر شاکر چنگیزی پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ تمام صحافی حضرات

چنگیزی کی عزت کر رہے تھے۔ وہ شمائلہ کی آبرو بچانے والا ہیرو تھا۔ اخبارات کے ذریعے
بھی اس کی شہرت ہو رہی تھی۔ اس لئے اسے کمرے میں جا کر اس سے تنہا ملاقات کرنے
کی اجازت دے دی گئی۔

وہ بستر کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ”میری برائی بھی تم
نے دیکھی اور اچھائی بھی دیکھ رہی ہو لیکن تم سے نیکی کر کے میں بہت بڑی مصیبت میں
مبتلا ہو گیا ہوں۔ میری ملازمت جانے والی ہے۔ اس کے بعد سیاسی غنڈے اور قاتل مجھے
زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

شمائلہ نے کاغذ پر لکھا ”میں چوہدری جیسے سیاست دانوں کی بے حسی اور بے رحمی کو
خوب سمجھتی ہوں۔ اس نے اپنی بیوی یعنی میری سہیلی کو زندہ جلا کر مار ڈالا۔ میں کبھی
نہیں چاہوں گی کہ میری عزت بچانے والا سازشوں کا شکار ہو کر بے موت مارا جائے۔ اس
لئے میں نے اب تک بیان نہیں لکھا ہے۔ آپ بتائیں کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں‘ چوہدری سے دشمنی نہ کرو۔ اس کی پارٹی کے خلاف کوئی بیان نہ
دو۔ یہ لکھ دو کہ چند نامعلوم غنڈے تمہیں اٹھا کر وہاں لے گئے تھے‘ میں تمہیں وہاں سے
عزت و آبرو کے ساتھ لے آیا ہوں۔“

شمائلہ نے اقرار میں سرہلایا۔ اسے اشارے سے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی بیان لکھے گی
لیکن اس نے لکھا کہ چوہدری جیسے درندے کے خلاف محاذ آرائی جاری رکھے گی۔

وہ بولا ”اصل جڑ تو وہی ہے۔ اسے بچانے کے لئے تمام محکمہ میرے پیچھے پڑ گیا
ہے۔ اگر تم اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہو گی یا لکھو گی تو میری شامت آجائے گی۔“

اس نے لکھا ”ہر شخص کو اپنا دکھ بھاری ہے۔ ہر شخص ملک اور قوم سے پہلے اپنی
سلامتی دیکھتا ہے۔ جرائم پیشہ سیاست داں تم سے ملازمت چھیننے اور مجھ سے آبرو چھیننے
کی دھمکیوں پر عمل کرتے رہیں گے تو ہم اسی طرح ملازمت اور آبرو بچانے کے لئے اس
ملک کو ان کے حوالے کرتے رہیں گے۔

میں مانتی ہوں کہ عورت کا سب سے قیمتی اور آخری سرمایہ آبرو ہے لیکن پاکستان
قائم کرنے کے لئے ہزاروں ماؤں‘ بہنوں اور بیٹیوں نے اپنی آبرو لٹائی تھی۔ کیا ایک بار پھر
میں یہ قربانی نہیں دے سکتی؟ فرق اتنا ہو گا کہ پہلے ہندوؤں نے یہ ستم کیا اب ہمارے ہی
مسلمان عیاش ایسا کریں گے۔ مگر ان راہوں میں آپ جیسے باضمیر اور حساس پاکستانی بھی
آئیں گے جو صحافت کے میدان میں مجھ جیسی صحافی خواتین کے ہاتھ مضبوط کریں گے۔“

”شمائلہ! تمہاری تمام باتیں درست ہیں۔ مگر جذباتی ہیں۔ ملک اور قوم کی خدمت

کرنے کے لئے صرف ہم ہی نہیں رہ گئے ہیں۔ ایسی خدمت دوسروں کو کرنے دو‘ تم ایسا
نہیں کرو گی تو میں بری طرح برباد ہو جاؤں گا۔“

وہ تھوڑی دیر تک اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر لکھنے لگی ”میں
احسان فراموش نہیں ہوں‘ تمہیں برباد نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری ملازمت بحال رکھنے
کے لئے یہ بیان نہیں دوں گی کہ تم نے چوہدری احمد حسین کے حکم پر پہلے مجھے اغوا کیا
تھا۔ پھر باضمیر ہو کر میری عزت بچالی تھی۔ میں تمہاری خاطر صرف اس واردات میں
چوہدری کا نام نہیں آنے دوں گی لیکن میری التجا ہے کہ آئندہ اس چوہدری کے آلہ کار نہ
بنا کیونکہ میں اس کم ظرف اور کمینے کے متعلق اس وقت تک کالم لکھتی رہوں گی جب
تک کہ اس کی شیطانی سیاست کا بھانڈا نہیں پھوڑوں گی۔ میں اس سیاسی مجرم کو ضرور سزا
دلاؤں گی۔“

چنگیزی نے سوچا ”یہ لڑکی بہت ضدی ہے۔ اپنے صحافتی جذبات سے باز نہیں آئے
گی۔ فی الحال یہی بہت ہے کہ موجودہ کیس میں یہ چوہدری اور اس کی پارٹی کے خلاف
بیان نہیں دے گی اور اوپر والے میری دیانت داری والی غلطی کو معاف کر دیں گے۔“

اس نے شمائلہ کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اس سلسلے میں چوہدری کا نام نہیں آنے دے
گی۔ پھر اس سے رخصت ہو کر اپنے بڑوں کے پاس پہنچ کر یہ خوش خبری سنائی کہ ایک
صحافی لڑکی کے اغوا کے کیس میں چوہدری اور اس کی پارٹی کا نام نہیں آئے گا۔

پارٹی لیڈر اور دوسرے اہم افراد نے اطمینان کا اظہار کیا۔ چوہدری نے کہا ”اس
طرح ہماری پارٹی کی نیک نامی تو بحال رہے گی لیکن وہ آئندہ میرے خلاف محاذ آرائی
جاری رکھے گی۔ اس کے پاس میرے خلاف کچھ ثبوت ہیں۔ جب تک وہ ثبوت ضائع
نہیں ہوں گے‘ وہ میرے لئے مصیبت بنی رہے گی۔“

ایک نے کہا ”مسٹر چنگیزی! تم چاہو تو معلوم کر سکتے ہو کہ وہ ایسے ثبوت کہاں چھپا کر
رکھتی ہے۔“

”بہت مشکل ہے۔ وہ بہت ہی ضدی‘ پُرعزم اور مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔ ان
ثبوت کو ہوا لگنے نہیں دے گی۔“

”وہ ایسی رئیس زادی نہیں ہے کہ کسی بینک میں اُس کا لاکر ہو گا اور وہ اس لاکر
میں ثبوت چھپا کر رکھتی ہو گی۔ وہ ثبوت اس کے گھر کے‘ اس کے کمرے کے کسی سامان
میں ہو گا۔ ہمارے پاس بڑے گھاگ چور ہیں‘ وہ اسے چُرا لائیں گے۔“

چنگیزی نے کہا ”اس کے گھر میں بہت سے افراد ہیں۔ وہ اپنے رشتے داروں کے

ساتھ رہتی ہے۔ اس کے گھر میں ایسا میلہ لگا رہتا ہے کہ چوری میں ناکامی ہو سکتی ہے۔"

ایک اعلیٰ افسر نے کہا "میں نے وعدہ کیا تھا کہ چوہدری صاحب کو موجودہ کیس کی دلدل سے نکالو گے تو تمہاری ترقی ہوگی' میں اپنا وعدہ پورا کروں گا اور اگر تم وہ ثبوت کسی طرح اس سے حاصل کرلو تو چوہدری صاحب سے تمہیں منہ مانگی رقم دلاؤں گا۔"

چوہدری احمد حسین نے کہا "چنگیزی! میں تمہیں نوٹوں میں تول دوں گا۔ وہ تمہاری احسان مند ہے' کچھ کرو۔"

شاکر چنگیزی اپنا سر کھجانے لگا۔ وردی میں اس کا دماغ بڑی تیزی سے کام کرتا تھا۔ اس نے کہا "یہ بات یقینی ہے کہ وہ ثبوت سمیت اپنی تمام اہم چیزیں اپنے سامان میں رکھتی ہوگی چونکہ بہت سادگی سے زندگی گزارتی ہے۔ اس لئے سامان مختصر ہوگا۔ اس کے والدین مرچکے ہیں۔ اپنے رشتے داروں کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر اسے کسی وجہ سے یہ شہر چھوڑ کر دوسرے شہر جانا پڑے تو وہ اپنا اہم اور ضروری سامان لے کر یہاں سے وہاں جائے گی۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ سفر کے دوران واردات کی جاسکتی ہے اور اس کے مختصر سے سامان کی تلاشی لے کر ثبوت حاصل کئے جاسکتے ہیں؟"

"ہاں' ایسا سفر کے دوران بھی ہوسکتا ہے۔ یا وہ دوسرے شہر میں جاکر جہاں قیام کرے وہاں بھی واردات ہو سکتی ہے۔ اس طرح نوے فیصد ضمانت اس بات کی ہے کہ چوہدری صاحب کے خلاف جتنے ثبوت ہیں' وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر جائے گی۔ یہاں کسی کے بھروسے پر نہیں چھوڑے گی۔"

"بات تو بالکل درست ہے لیکن وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کیوں جائے گی؟"

"اسے کراچی کے کسی روزنامے یا ہفت روزہ میں بہت بڑی پیش کش کی جائے۔ اسے وہاں کی مدیرہ بنایا جائے۔ وہاں اس کی رہائش کے لئے ایک مکان اور دوسری سہولتیں دی جائیں اور یہ آزادی دی جائے کہ وہ لاہور کے روزنامے میں بدستور کالم لکھتی رہے گی۔ کراچی میں......... اسے ماہانہ دس ہزار روپے ملا کریں گے۔ وہ اتنی بڑی آفر کبھی نہیں ٹھکرائے گی۔"

"چنگیزی! تم منصوبے اچھے بناتے ہو' لیکن تمہارے اس منصوبے پر عمل کرنے میں ذرا دیر لگے گی۔ کراچی میں ہمارا ایک زر خرید سیاسی ہفت روزہ ہے۔ وہاں سے اس منصوبے پر عمل شروع ہو جائے گا لیکن ادھر شمائلہ اسپتال سے نکلتے ہی میرے خلاف پھر لکھنا شروع کردے گی۔"

"میرے پاس اس کے قلم کو روکنے کی ایک اور تدبیر ہے۔ دیکھئے ابھی اسے آزماتا ہوں۔"

اس نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر اسپتال کے نمبر ڈائل کئے۔ پھر اسپتال کے ایکسچینج سے کہا کہ وہ انسپکٹر چنگیزی ہے اور کمرا نمبر سولہ کی مریضہ شمائلہ پروین سے بات کرنا چاہتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد بزرگ صحافی امجد رانا صاحب کی آواز سنائی دی "ہیلو کون ہے؟"

"السلام علیکم رانا صاحب! میں چنگیزی بول رہا ہوں۔ شمائلہ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ جانتے ہیں کہ وہ بولنے کے قابل نہیں ہے' پھر بات کیا کریں گے؟"

"محترم رانا صاحب! وہ بول نہیں سکتی۔ مگر سن تو سکتی ہے' آپ اُس سے پوچھ لیں۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر آواز آئی۔ "ریسیور شمائلہ کے پاس ہے اور وہ اسے کان سے لگا رہی ہے۔"

وہ بولا "ہیلو شمائلہ! میں شاکر چنگیزی بول رہا ہوں۔ کوئی ضروری نہیں کہ تم زبان سے جواب دو۔ میری کوئی بات تمہیں پسند آئے تو تم ریسیور کو ماؤتھ پیس پر ایک انگلی سے تک دینا۔ میری کوئی بات ناگوار گزرے تو پھر انگلی سے دو بار دستک دو گی۔ یوں مجھے تمہاری پسند اور ناپسند معلوم ہوتی رہے گی۔"

وہ ذرا ایک توقف سے بولا "آج صبح تم سے ملنے اسپتال گیا تو تم سے بہت سی باتیں کیں۔ مگر دل میں جو بات تھی وہ کہہ نہ سکا۔ پولیس والا ہو کر دل کی بات کہنے کا حوصلہ نہ رکھ سکا۔ اگر اجازت دو تو فون پر کہہ دوں۔"

دوسری طرف سے خاموشی رہی' وہ بولا "خاموشی کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ میری آواز تم تک نہیں پہنچ رہی ہے اگر پہنچ رہی ہے تو دستک دو۔ ایک دستک پر دل کی بات کہوں گا' دو بار دستک سنائی دے گی تو اپنے دل کو مار لوں گا۔"

پھر ذرا خاموشی رہی۔ اس کے بعد انگلی کی ایک دستک سنائی دی' وہ بولا "شکریہ۔ تم حوصلہ دے رہی ہو تو کہہ رہا ہوں۔ آئی لو یو۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ سوچتا تھا کہ تم سے کہوں گا تو شاید ناراض ہو جاؤ گی۔ اس لیے فون پر کہنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ کیا میری محبت کا جواب محبت سے دو گی؟"

دوسری طرف چپ لگ گئی۔ اس نے انتظار کرنے کے بعد کہا۔ "شاید تم کشمکش میں

ہو یا میری محبت سے انکار کر کے میرا دل نہیں دکھانا چاہتیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ دل کو پتھر بنالوں گا۔ تم انکار کرنے کے لیے دوبار دستک دو۔"

پتا نہیں اس لڑکی کی کیا کیفیت ہو گی؟ دل ضرور تیزی سے دھڑک رہا ہو گا۔ دنیا کی ہر عورت اپنا ایک باڈی گارڈ چاہتی ہے۔ پھر وہ تو اس کے بدن کا ایسا محافظ تھا کہ اسے گناہوں کی دلدل سے نکال لایا تھا۔ چنگیزی نے کہا "میں منتظر ہوں۔ جواب دو۔ میری محبت قبول ہے تو ایک دستک دو ورنہ دو دستک سننے کے بعد شاید میں بھی تمہاری طرح گونگا ہو جاؤں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی انگلی کی ایک دستک سنائی دی۔ ایک کے بعد دوسری سنائی نہیں دی۔ وہ خوش ہو کر بولا "تمہاری ایک دستک نے مجھے سچ مچ کا سپاہی بنا دیا ہے۔ سپاہی ملک فتح کرتے ہیں۔ میں نے تمہیں جیت لیا ہے۔ میں شام کو پانچ بجے آ رہا ہوں۔ خدا حافظ۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے اطراف بیٹھے ہوئے اعلیٰ افسران اور پارٹی کے اہم افراد خوش ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ چوہدری نے کہا "مان گیا چنگیزی! تم بڑے ڈرامے باز ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ اس سے عشق کرو گے تو اس کا قلم میرے خلاف کیسے رکے گا؟"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں ترقی اور تبادلہ چاہتا ہوں۔ سنا ہے بھارتی سرحد کے قریب پولیس والوں کی بڑی چاندی ہے۔ میں ترقی پا کر میرپور خاص جانا چاہوں گا۔ دو چار ہفتے شائلہ کو اپنے عشق میں الجھائے رکھوں گا۔ جب میں اس کے دل کے اندر پہنچوں گا تو دل میں چھپے ہوئے ثبوت تک بھی پہنچ جاؤں گا' جو چوہدری صاحب کے خلاف ہیں۔ لہٰذا میں شائلہ کو سنبھالتا ہوں۔ آپ میری ترقی اور تبادلہ کرا دیں۔ میں اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ پھر جہاں موقع ملے گا' اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔"

بس یہ جو کسی کو ٹھکانے لگانے کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے وہ........... غلط ہوتا ہے۔

دل کا دروازہ ہم اپنے کسی ایک کے لیے کھولتے ہیں اور باقی کے لیے بند رکھتے ہیں۔

گھر کا دروازہ اپنوں کے لیے کھولتے ہیں اور چوروں کے لیے بند کرتے ہیں۔

لیکن دنیا میں آنے کا دروازہ بند نہیں کر پاتے کیونکہ ہمیں واپس جانا ہوتا ہے۔

اور ہم اپنی مرضی سے واپس نہیں جاتے اور نہ ہی اپنی کم ظرفی سے کسی شائلہ کو اس دنیا کے دروازے سے باہر بھیج سکتے ہیں یہ کام تو صرف اجل کا ہے۔

جب شاکر چنگیزی شام کے پانچ بجے اسپتال کے کمرے میں پہنچا تو وہاں شائلہ کے

پاس اجل نواز موجود تھا۔

وہ ایک خوبرو جوان کو دیکھ ٹھٹک گیا۔ شائلہ بستر پر بیٹھی اجل کی کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ شاکر چنگیزی کو دیکھ کر شرماتے ہوئے اپنے سر پر آنچل رکھنے لگی۔ فون پر اظہارِ محبت کرنے والا آیا تھا۔ اس لیے اسمارٹ اور آزاد خیال ہونے کے باوجود محبوب کو دیکھ کر شرمانے لگی تھی۔

اجل نے کہا "ہیلو انسپکٹر! آپ سے غائبانہ تعارف ہو چکا ہے۔ ابھی شائلہ تحریر کے ذریعے بتا رہی تھیں کہ آپ یہاں آنے والے ہیں۔ مجھ خادم کو اجل نواز کہتے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ چنگیزی کو اس کی موجودگی ناگوار گزر رہی تھی۔ پھر بھی اس نے اخلاقاً اس سے ہاتھ ملایا۔ اجل کے ہاتھ ایسے سرد تھے جیسے چنگیزی نے موت کو چھو لیا ہو۔ چونکہ ابھی موت نہیں آئی تھی اس لیے اجل نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا' پھر بولا "اجل تو موت کو کہتے ہیں۔ کیا آپ کا نام عجیب سا نہیں ہے؟"

"دنیا میں بڑے بڑے عجیب نام بھی ہوتے ہیں اور عجیب کام بھی ہوتے ہیں۔ شاید آپ یقین نہ کریں کہ ہمارے دفتر میں ایک بہت ہی نیک افسر ہے' جو چپراسی کا کام کرتا ہے۔"

"یہ یقین کرنے والی بات نہیں ہے۔ آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

"میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ اس کا نام افسر خان ہے اور وہ ہمارے دفتر میں چپراسی ہے۔"

"اچھا تو یوں کہئے کہ وہ چپراسی ہے۔ مگر نام افسر خان ہے۔"

"اسی طرح آپ سمجھیں کہ میں انسان ہوں مگر نام اجل ہے۔"

"آپ صحافیوں کے انداز میں سیدھی سی بات کرتے ہیں' چونکہ سیاست ذرا دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔ اس لیے بات پلے پڑنے میں دیر لگتی ہے۔ کیا آپ صحافی ہیں؟"

"جی ہاں۔ یہی میرا پیشہ ہے۔ ایک پریس کانفرنس میں مس شائلہ پروین سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے انہیں ایک عمدہ آفر دی ہے۔ کراچی کے ایک سیاسی ہفت روزہ میں شائلہ جیسی بے باک لکھنے والی صحافی اور مدیرہ کی ضرورت ہے۔"

چنگیزی نے حیرت اور مسرت سے اجل کو دیکھا۔ وہ یہی چاہتا تھا جو اجل کہہ رہا تھا' مگر اجل نے اس کے آگے جو کہا' وہ بھی چونکا دینے والی بات تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہاں

شمائلہ کو دس ہزار روپے ملیں گے۔ رہائش کے لیے ایک مکان اور دیگر سہولتیں دی جائیں گی اور یہ آزادی بھی دیا جائے گی کہ یہ لاہور کے روزنامے میں بدستور کالم لکھتی رہیں گی۔

شاکر چنگیزی کا منہ حیرت سے کُھل گیا تھا۔ اس نے جو پلاننگ اپنے بڑے افسروں اور سیاسی پارٹی والوں کے سامنے کی تھی' وہ اجل لفظ بہ لفظ اس کے سامنے دہرا رہا تھا اور اسے اپنے سوچے سمجھے ہوئے منصوبے پر عمل کرنے کی سہولتیں فراہم کر رہا تھا۔

اس نے چنگیزی کے شانے کو تھپک کر کہا "انسپکٹر صاحب! آپ شمائلہ سے باتیں کریں۔ میں جا رہا ہوں۔ پھر ہماری ملاقات ہو گی۔"

وہ کمرے سے چلا گیا مگر اس شاطر انسپکٹر کے حیران اور پریشان ہونے کے لیے بہت سی باتیں چھوڑ گیا۔ وہ پلنگ کے سرے پر بیٹھ کر بولا "یہ کوئی عجیب سا' پُراسرار سا بندہ لگتا ہے۔"

شمائلہ نے کاغذ پر لکھا "بے شک' کچھ ایسا ہی ہے۔ بہت گہرا ہے۔ صحافت کا ہنر جانتا ہے۔ بڑے بڑے سیاست دانوں کے ایسے ایسے راز جانتا ہے کہ جو طشت ازبام ہو جائیں تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں لیکن وہ کھل کر کسی کے خلاف لکھتا نہیں ہے۔ مجھے بھی مشورہ دے رہا تھا کہ میں چوہدری احمد حسین کے خلاف ابھی کچھ نہ لکھوں۔"

یہ اجل نے پھر چنگیزی کے دل کی بات شمائلہ کو سمجھائی تھی۔ اس نے کہا "میں بھی تمہیں یہی سمجھانے والا تھا۔ تم کوئی پرائی ہوتیں تو نہیں سمجھاتا لیکن اب میری زندگی کا حصہ ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے بدن کو کوئی ہاتھ لگائے۔ اس لیے ایک دلدل سے نکال لایا ہوں۔ اب نہیں چاہوں گا کہ تمہاری جان پر بن آئے۔ بندوق سے چلنے والی گولی نظر آجاتی ہے۔ مگر چوہدری جیسے کم ظرف سیاست داں کی طرف سے آنے والی موت اچانک اور نادیدہ ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کم از کم ایک ماہ تک آرام کرو۔ قلم نہ اٹھاؤ۔ میرے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرو اور یہ تو میں ضرور چاہوں گا کہ تم اجل کی پیش کش قبول کر کے کراچی چلو' وہاں رہائش اختیار کرو۔ وہاں میرا بھی ٹرانسفر ہونے والا ہے۔"

وہ سر جھکائے سن رہی تھی۔ شاکر چنگیزی کی باتیں اس لیے دل میں اتر رہی تھیں کہ وہ اسے اپنے جسم و جان کا مالک بنا چکی تھی۔ اس نے محبت اور انسانیت کا جو ثبوت دیا تھا اس سے وہ بہت زیادہ متاثر ہو گئی تھی۔ پھر اجل نے بھی اس کے دماغ میں وہی باتیں ٹھونس دی تھیں' جو انسپکٹر چنگیزی چاہتا تھا۔ اس لیے وہ دل ہی دل میں چنگیزی کے ساتھ

ایک نئی زندگی گزارنے پر راضی ہو رہی تھی۔

ہم اپنے سامنے والے کے متعلق نہیں کہہ سکتے کہ وہ مکمل انسان ہے۔ خود اپنے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتے۔ جھوٹ ہماری زندگی میں اتنا رچ بس گیا ہے کہ ایک جھوٹ یا غلط بات یوں بے حسی سے کہہ جاتے ہیں جیسے وہ غلطی ہماری زندگی کے لیے لازمی ہو۔ ایسا نہ کریں تو گزارا نہ ہو۔

انسپکٹر چنگیزی کو بھی اپنی کسی غلطی کا نہ احساس ہوتا تھا اور نہ شرمندگی۔ اس کے برعکس وہ اس بات پر جھنجلاتا تھا کہ اس نے تسبیح ہاتھ میں لینے کے بعد کیسی کیسی نادانیاں کی ہیں؟

ایک تو یہی سب سے بڑی نادانی کی تھی کہ شمائلہ کو خود ہی اغوا کیا تھا اور خود ہی باضمیر ہو کر اسے تباہی سے بچا لایا تھا پھر چادر میں لپٹا ہوا ایک ہاتھ تسبیح لے کر اللہ اللہ کرتا ہوا تھانے میں یہ بیان درج کرایا تھا کہ اس نے چوہدری احمد حسین سے ایک لاکھ روپے رشوت لے کر شمائلہ کو اغوا کیا تھا اور اب خود خدا سے توبہ توبہ کرتا ہوا تھانے میں یہ بیان دے رہا ہے۔

ایک پولیس انسپکٹر کے ایسے باضمیر ہونے اور ایمان افروز بیان دینے پر تمام صحافی برادری خوش ہو گئی تھی۔ وہ سب چاہتے تھے کہ شمائلہ کا بھی بیان حاصل کرنے کے بعد چوہدری اور اس کی سیاسی پارٹی کے خلاف اخبارات میں دھماکے کریں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

انسپکٹر چنگیزی نے مولوی بن کر جس تھانے میں سچائی سے بیان دیا تھا' اس تھانے میں آگ لگا دی گئی تھی۔ ایف آئی آر والا رجسٹر اور بیان درج ہونے والی فائل جل گئی تھی۔ پھر دوسری شام شمائلہ نے اپنے محبوب کی ملازمت اور بہتری کے لیے اپنے بیان سے چوہدری احمد حسین کا نام خارج کر دیا تھا۔ یہ لکھا تھا کہ اسے اغوا ضرور کیا گیا تھا لیکن وہ کسی ثبوت کے بغیر چوہدری کو اس واردات کا ملزم قرار نہیں دے سکتی۔

ان حالات میں صحافیوں کے درمیان گروہ بندی ہو گئی تھی۔ کچھ الزام لگا رہے تھے کہ شمائلہ رشوت لے کر یا دباؤ میں آکر چوہدری کے خلاف بیان نہیں دے رہی ہے۔ یہ شبہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ انسپکٹر شاکر چنگیزی کے سچے اور کھرے بیان کو غائب کرنے کے لیے تھانے میں آگ لگائی گئی ہے اور اب انسپکٹر چنگیزی اپنے پہلے بیان سے منحرف ہو چکا ہے۔

اس ملک میں ایسی کوئی عوامی عدالت نہیں ہے' جہاں سیاست داں' نوکر شاہی اور ان کے دباؤ میں رہنے والوں کو ایک ساتھ حاضر ہونے کا حکم دے کر سچ معلوم کیا جا سکے۔

جب اتفاق سے اسمبلی میں آگ لگ سکتی ہے تو تھانے میں کیوں نہیں لگ سکتی؟ کیا اتفاقی واقعات کو کوئی جرم قرار دے سکتا ہے؟

جب ایٹمی پروگرام کو محدود کرنے یا منجمد کرنے والوں کی پردہ پوشی کی جا سکتی ہے تو اغوا کرنے والے چوہدری احمد حسین کا نام بھی شمائلہ چھپا سکتی ہے' کوئی کسی سے سچ اگلوا ہی نہیں سکتا۔ لاہور کے صحافیوں کا خیال تھا کہ انسپکٹر شاکر چنگیزی کو گھیر کر پھر اس سے سچ اگلوا سکیں گے۔ مگر پتا چلا کہ اس کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

اسپتال میں تیسرے دن شمائلہ کی چھٹی ہو گئی۔ وہ بالکل نارمل تھی۔ صرف بول نہیں سکتی تھی۔ ایک تجربہ کار ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ مخصوص دوائیں استعمال کرتی رہے گی تو ایک دن بولنے کے قابل ہو جائے گی۔

وہ کراچی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اجل نے اس ہفت روزہ کے مالک سے اس کی ملاقات کرا دی۔ اسے ایک ماہ کی تنخواہ دس ہزار روپے پیشگی ادا کئے گئے تھے۔ اس لیے وہ اپنا مختصر سا سامان پیک کر کے کراچی روانہ ہو گئی۔ ٹرین کے ائرکنڈیشنڈ سلیپر میں چنگیزی نے اپنی اور اس کی سیٹ ریزرو کرائی تھی۔ اس کمپارٹمنٹ میں یوں تو کئی مسافر تھے مگر جب ٹرین لاہور سے روانہ ہوئی تو ان میں ایک اور مسافر کا اضافہ ہو گیا اور وہ تھا اجل نواز۔

اس کی سیٹ چنگیزی اور شمائلہ کے ساتھ ہی تھی۔ یوں تو چنگیزی اسے دیکھ کر کوئی نامعلوم سا خطرہ محسوس کرتا تھا۔ مگر یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ وہ بڑے کام کا آدمی ہے۔ اسی نے شمائلہ کو اس کے ساتھ کراچی جانے پر مجبور کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سفر کے دوران شمائلہ سے یہ اگلوا لے گا کہ اس نے چوہدری احمد حسین کے خلاف جو ثبوت رکھے ہیں' وہ کہاں ہیں؟ اس کے سوٹ کیس میں؟ چھوٹی اٹیچی میں' بستر یا تکیے کے غلاف میں؟یا اپنے پرس میں؟

یہ ارادہ تھا کہ ثبوت حاصل کرتے ہی وہ شمائلہ کو کراچی تک بھی نہیں پہنچنے دے گا۔ راستے میں ہی اس کا کام تمام کرنے کے کئی راستے نکال لے گا لیکن یہ ارادہ اس وقت تک قائم رہا' جب تک وہ وردی میں تھا۔ سفر کے دوران چونکہ وہ ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ اس لیے وردی میں بھی نہیں تھا۔ شلوار قمیض پہنے' ہاتھ میں تسبیح لیے شمائلہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اجل کو ہم سفر بنتے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ پھر ازراہِ مذاق کہا "اگر تم مذکر ہو تو پھر ہمارے بہترین ہم سفر ہو۔ اگر مونث ہو تو پھر موت ہو۔"

اجل نے کہا "شمیم اور خورشید جیسے نام مردوں کے بھی ہوتے ہیں اور عورتوں کے بھی۔ میرا نام بھی دونوں اصناف میں مشترک ہے۔ آپ مجھ سے پریشان نہ ہوں۔ ٹرین کا سفر ہو یا زندگی کا' موت تو ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔ میرے نام سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

وہ تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا "واقعی یہ کوئی نہیں جانتا کہ اسے موت کہاں آئے گی؟"

شمائلہ نے دل میں کہا "ہم یہ بھی نہیں جانتے کے موت ہم سب کو کہاں کہاں لے جا کر حیات کا ختم شد لکھے گی۔"

اجل نے مسکرا کر کہا "تم نے موت کو گفتگو کا موضوع بنا لیا ہے۔ مسٹر چنگیزی جتنی بھی سانسیں رہ گئی ہیں' ان میں صرف جینے کی باتیں کرو۔ بائی دی وے' تم وردی میں نہیں ہو۔"

"ہم صرف ڈیوٹی کے وقت وردی پہنتے ہیں۔"

"اور ڈیوٹی پر کسی وقت بھی حاضری کا حکم مل جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اگلے چند گھنٹوں میں تمہاری ڈیوٹی شروع ہو جائے۔"

چنگیزی نے کہا "ایسا نہیں ہو گا۔ میں میرپور خاص پہنچنے تک چھٹی پر ہوں۔"

کوئی پانچ گھنٹے کے بعد ٹرین ملتان پہنچی تو ایک سپاہی نے کمپارٹمنٹ میں آکر پوچھا "کیا آپ کا سیٹ نمبر تیرہ ہے اور آپ انسپکٹر چنگیزی صاحب ہیں؟"

چنگیزی نے کہا "ہاں۔ تمہیں میرا نام اور سیٹ نمبر کیسے معلوم ہوا؟"

"سر! مجھ سے کہا گیا ہے کہ ریلوے پولیس کے دفتر میں آپ کا ضروری فون آیا ہے۔ آپ فوراً اٹینڈ کریں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کمپارٹمنٹ سے باہر آیا۔ ریلوے پولیس کے دفتر میں آکر وہاں کے افسر سے ملاقات کی۔ افسر نے اس کی طرف ریسور بڑھا دیا۔ اس نے اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو کون ہے؟ میں شاکر چنگیزی بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "میں چوہدری صاحب کی پارٹی کا سیکریٹری بول رہا ہوں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ ملتان پہنچنے سے پہلے ہی شمائلہ کے سامان سے وہ تمام ثبوت غائب کر دیں گے۔ کیا کام ہو گیا؟"

چنگیزی نے ذرا غصے سے کہا "کیا بکواس کر رہے ہو۔ وہ ایک سچی اور بے باک صحافی ہے۔ ہم سب کو اس پر ناز کرنا چاہئے۔ کیا تم مجھے بے ایمان اور ضمیر فروش پولیس افسر سمجھتے ہو۔ کیا میں ایک عورت سے دشمنی کروں گا۔"

"پلیز مسٹر چنگیزی۔ آپ غصے میں نہ آئیں۔ یہ آپ کے بڑے بات کر رہے ہیں۔"

چند ساعتوں کے بعد بڑے صاحب کی آواز آئی "چنگیزی! یہ سیکریٹری صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا پھر تمہاری کھوپڑی الٹ رہی ہے اور تم شمائلہ کے عشق میں گرفتار ہو رہے ہو؟"

"سر! بات عشق کی نہیں فرض کی ہے۔ پولیس کا فرض ہے کہ وہ عوام کو تحفظ فراہم کرے۔"

"یوشٹ اپ۔ تم صرف میرے احکامات کے پابند ہو۔"

"میں آپ کے ان احکامات کا پابند ہوں' جو انسانیت کے دائرے میں ہیں۔"

"کیا تمہاری شامت آئی ہے؟ کیا اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا چاہتے ہو؟"

"سر! میں ملازمت چھوڑ سکتا ہوں' ایمان نہیں چھوڑ سکتا۔"

"گو ٹو ہیل۔" بڑے صاحب نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ ان کے اطراف میں سیاسی پارٹی کے اہم افراد اور پولیس کے افسران بھی تھے۔

ایس پی نے بڑے صاحب کو غصے میں دیکھ کر پوچھا "سر! کیا وہ پھر گڑبڑ کر رہا ہے؟"

"ہاں' سارا کھیل بگاڑ رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کبھی بالکل ہی شیطان اور کبھی بالکل ہی فرشتہ کیسے بن جاتا ہے۔"

ایس پی نے کہا "میں پہلے دن سے اس کی اسٹڈی کر رہا ہوں۔ وہ فرشتہ نہیں' محض انسان ہے اور تھوڑا حیوان ہے' تھوڑا شریف ہے' تھوڑا حریف ہے۔ یعنی انسانوں کی طرح نیکی اور بدی کے امتزاج سے زندگی گزار رہا ہے۔"

چوہدری احمد حسین نے کہا "آپ فلسفہ بول رہے ہیں اور میری جان نکل رہی ہے۔ وہ شمائلہ کو ٹھکانے لگانے گیا تھا' میرے خلاف تمام ثبوت ضائع کرنے والا تھا۔ مگر اس لڑکی کا محافظ بن گیا ہے۔"

ایس پی نے کہا "ڈاکٹر کو بیماری سمجھ میں آجائے تو صحیح نسخہ لکھ کر مریض کو تندرست بنا دیتا ہے۔ مجھے بھی شاکر چنگیزی کی بیماری سمجھ میں آگئی ہے۔ سر! آپ ابھی اسے قابو میں کر سکتے ہیں۔"

بڑے صاحب نے کہا "باتیں نہ بناؤ۔ ریسیور اٹھاؤ اور اسے قابو میں کرو۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے' رابطہ ہوا۔ دوسری طرف سے کہا گیا کہ وہ ٹرین ملتان سے روانہ ہو چکی ہے۔ یعنی ابھی چنگیزی سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ ایس پی نے رحیم یار خان کے ریلوے پولیس افسر کو حکم دیا کہ جیسے ہی ٹرین وہاں پہنچے ایئرکنڈیشنڈ سلیپر میں انسپکٹر شاکر چنگیزی کو فون پر بلائے وہ سیٹ نمبر تیرہ پر ہے۔

ایس پی نے ریسیور رکھ دیا۔ بڑے صاحب نے پوچھا "مجھے صاف صاف بتاؤ کہ اسے کیسے قابو میں کیا جائے؟"

اس نے تمام حاضرین پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔ "سر! شاکر کے معنی ہیں (خدا کا) شکر ادا کرنے والا اور چنگیزی سے تباہی وہلاکت کا تصور ابھرتا ہے۔ جب تک' آدمی کے پاؤں زمین پر ہیں' وہ شاکر ہے اور جب وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھتا ہے یا اختیارات کی وردی پہنتا ہے تو چنگیزی بن جاتا ہے۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا "میری بات ایسے سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آپ میرے مشوروں پر عمل کریں۔ فون پر شمائلہ کے خلاف کوئی بات نہ کریں۔ اس کی دیانت داری کی تعریف کریں اور اسے ایک معمولی سا حکم دیں کہ وہ کمپارٹمنٹ میں جاتے ہی وردی پہن لے۔"

بات کسی حد تک سمجھ میں آگئی۔ رحیم یار خان میں ٹرین پہنچی.........اور دوبارہ چنگیزی سے رابطہ ہوا تو بڑے صاحب نے کہا۔ "چنگیزی! میں تمہاری فرض شناسی سے بہت خوش ہوں۔ تمہیں ایک غلط بات کہہ کر آزما رہا تھا۔ فی الوقت تم سے ایک بہت اہم کام پڑا ہے۔ اس ٹرین کے نواب شاہ پہنچنے تک تمہیں ایک مجرم کو گرفتار کرنا ہے۔ ہمارا ایک جاسوس اس مجرم کی نشاندہی کرے گا۔"

"سر! آپ اطمینان رکھیں۔ وہ مجرم زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔ اور کوئی حکم سر!"

"اسے گرفتار کرنے کے لیے فوراً کمپارٹمنٹ میں جا کر وردی پہنو اور ہتھیار سے لیس رہو۔ تم سے نواب شاہ میں گفتگو ہو گی۔"

اس نے حکم کی تعمیل کا وعدہ کیا۔ ریسیور رکھا۔ پھر اپنے کمپارٹمنٹ میں آگیا۔ ٹرین چل پڑی۔ وہ اوپر برتھ پر رکھی ہوئی اٹیچی کھول کر اپنی وردی نکالنے لگا۔ شمائلہ نے پوچھا "یہ وردی کیوں نکال رہے ہو؟ تم ڈیوٹی پر تو نہیں ہو۔"

"پولیس کی ڈیوٹی کا کیا بھروسہ؟ آدھی رات کو بھی گہری نیند سے اٹھ کر فرائض کی ادائیگی کرنی ہوتی ہے۔"

وہ وردی لے کر ٹوائلٹ کی طرف چلا گیا۔ اجل نے مسکرا کر شمائلہ سے کہا "تمہیں یاد ہو۔ میں نے چنگیزی سے کہا تھا کہ ڈیوٹی پر کسی وقت بھی حاضری کا حکم مل جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اگلے چند گھنٹوں میں ڈیوٹی شروع ہو جائے اور تم دیکھ رہی ہو کہ اب صرف چنگیزی نہیں' انسپکٹر چنگیزی بن رہا ہے۔"

شمائلہ نے تائید میں سر ہلایا' اجل نے کہا "ٹرین اتنی زیادہ ہلتی اور دھچکے کھاتی ہے کہ

تم لکھ کر باتیں نہیں کر سکو گی۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ تمہاری آواز چھن گئی ہے۔ کیا میں یاد دلاؤں کہ تم دوا کھانا بھول گئی ہو۔"

وہ چونک کر مسکرائی' تائید میں سر ہلا کر قدموں کے پاس رکھے ہوئے سوٹ کیس کو کھول کر دوائیں نکالنے لگی۔ وہیں دواؤں کے پاس ایک ڈائری رکھی تھی' جو نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ کپڑوں کو الٹ کر دیکھنے لگی۔ پھر پریشان ہو گئی۔

ڈائری کے علاوہ ایک پلاسٹک کا لفافہ تھا۔ اس لفافے میں چوہدری احمد حسین کی کچھ مجرمانہ اور شرمناک تصاویر تھیں' چوہدری کی مقتولہ بیوی کے وہ خطوط تھے جن سے بیوی کی موت حادثہ نہیں قتل ثابت ہوتی تھی۔ پھر وہ ڈائری بھی چوہدری کی بیوی کی تھی جس میں اس نے اپنے قاتل شوہر کا کچا چٹھا تحریر کیا تھا۔

اس نے پورا سوٹ کیس کھنگال لیا۔ تمام کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھے لیکن چوہدری کے خلاف تمام ثبوت غائب تھے۔ اس نے سوٹ کیس کو بند کیا۔ پھر اپنی اٹیچی کی تلاشی لی۔ اتنی دیر میں شاکر چنگیزی وردی میں ملبوس انسپکٹر بن کر آ گیا تھا۔ وردی پہنتے ہی مزاج بھی بدل گیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اتنا وقت ضائع کیوں کیا؟ شمائلہ سے یہ راز کیوں نہیں اگلوایا کہ اس نے چوہدری کے خلاف ثبوت کہاں رکھے ہیں؟

کمپارٹمنٹ کے لوگ اسے ایک عام آدمی سمجھ رہے تھے۔ اچانک اسے انسپکٹر کی وردی میں دیکھ کر حیران ہوئے' کچھ محتاط ہوئے' سامنے والی سیٹوں پر پھیل کر بیٹھنے والے ذرا سمٹ گئے۔ اس نے شمائلہ کے قریب آ کر پوچھا "اٹیچی میں کیا ڈھونڈ رہی ہو؟"

شمائلہ نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ منہ سے کچھ بولنا چاہا مگر بول نہیں سکی' اجل نے کہا "یہ بہت دیر سے پریشان ہے۔ پہلے اس نے اپنے سوٹ کیس کے ایک ایک کپڑے کو اٹھا کر تلاش کیا پھر اس اٹیچی میں تلاش کرتی رہی ہے مگر سمجھ نہیں آتا کہ کیا چیز گم ہو گئی ہے؟"

چنگیزی نے اس کا بازو پکڑ کر کہا "شمائلہ! لکھ کر بتاؤ۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

وہ تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی۔ چنگیزی نے ایک کاغذ اور قلم نکال کر دیا۔ اگرچہ ٹرین تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی' صحیح طرح لکھا نہیں جا رہا تھا پھر بھی آڑی ترچھی تحریر سے واضح ہو گیا کہ چوہدری احمد حسین کے خلاف جتنے بھی تحریری اور تصویری ثبوت تھے وہ سب غائب ہو گئے ہیں۔

وہ جھنجلا کر بولا "کیا بکواس کر رہی ہو؟ ایسی چیزیں سوٹ کیس اور اٹیچی سے کیسے غائب ہو جائیں گی۔ جبکہ میں نے دیکھا ہے کہ تم نے اسے لاک کیا ہوا تھا۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ چنگیزی اس سے چابیاں لے کر خود اس کے سوٹ کیس اور اٹیچی کی تلاشی لینے لگا۔ پھر اس نے بندھے ہوئے بستر کو اور تکیے کے غلاف وغیرہ کو دیکھا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے مسافر پوچھ رہے تھے کہ کیا گم ہو گیا ہے؟ اجل انہیں بتا رہا تھا کہ محترمہ کے کچھ اہم دستاویزات رکھے ہوئے تھے' وہ نظر نہیں آ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ تمام دستاویزات گھر بھول آئی ہے۔ چنگیزی نے کہا "یہی ہو سکتا ہے' تم وہ چیزیں گھر میں بھول آئی ہو؟"

وہ تحریر کے ذریعے بولی "میں نے سب سے پہلے وہی چیزیں سنبھال کر سوٹ کیس میں رکھی تھیں' میں نے اتنی اہم چیزیں لاہور میں چھوڑ کر آنے کی حماقت نہیں کی ہے۔"

"کیا تم یہاں سے اٹھ کر ٹائلٹ گئی تھیں؟"

اجل نے کہا "اس بات کا میں گواہ ہوں کہ یہ سیٹ چھوڑ کر نہیں گئی۔ میں بھی چائے وغیرہ پینے کے لیے دوسری کھڑکیوں کی طرف نہیں گیا۔ ویسے کیا میں کچھ پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کس قسم کے دستاویزات تھے؟"

چنگیزی نے کہا "فضول سوالات نہ کرو۔ انسپکٹر میں ہوں اور تم پولیس والے بن کر پوچھ رہے ہو۔ سب سے قریب تم ہی بیٹھے ہوئے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارے سامان کی تلاشی لوں گا۔"

اجل نے ہنستے ہوئے کہا "عجیب پولیس والے ہو۔ کیا تم نے مجھے یہاں آتے وقت نہیں دیکھا کہ میرے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔ میرے بدن پر یہ لباس ہے اور لباس میں کچھ نہیں ہے۔ تم تلاشی لے سکتے ہو۔"

چنگیزی نے اس کے لباس کی تلاشی لی پھر کہا "تم پریس کانفرنس اٹینڈ کرنے کراچی سے اسلام آباد گئے وہاں سے لاہور آئے۔ اب لاہور سے کراچی جا رہے ہو۔ کیا اتنے لمبے سفر میں تمہارے ساتھ ایک چھوٹا سا بھی سامان نہیں ہے؟"

وہ بولا "سامان سو برس کا ہوتا ہے اور پل کی خبر نہیں ہوتی اس لیے میں اپنے ساتھ کچھ نہیں رکھتا۔"

شمائلہ نے کہا "کسی کی بھی تلاشی لینا دانشمندی نہیں ہے کیونکہ میرا سامان مقفل تھا۔ چابیاں میرے پاس تھیں اور میں لاہور سے اب تک یہاں بیٹھی ہوئی ہوں پھر چوری کیسے ہو سکتی ہے؟"

انسپکٹر چنگیزی اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جس خزانے کی اسے تلاش تھی' اسی خزانے سے وہ خالی ہو گئی تھی۔ اس کے کسی کام کی نہیں رہی تھی۔ بلکہ کچھ مکار سی لگ رہی تھی

جیسے اس سے کوئی اہم راز چھپا رہی ہو اور اوپر سے معصوم بن رہی ہو۔ جب مقفل سوٹ
کیس میں وہ چیزیں نہیں تھیں تو اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ چیزیں لاہور ہی میں کہیں چھپا
کر آئی ہے۔

وہ سخت لہجے میں بولا "شمائلہ! میں تمہیں بدنام گلیوں سے نکال کر نہ لاتا تو تم اس
وقت کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتیں اور تم میرے احسان کا بدلہ جھوٹ بول کر
دے رہی ہو۔ صاف ظاہر ہے کہ کسی نے جادو سے اسے غائب نہیں کیا ہوگا' تم اسے
لاہور میں کہیں چھپا کر آئی ہو۔"

اس نے لکھا "میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ اپنی صحافتی زندگی کی تمام
تحریریں' تمام راز اپنے ساتھ اس سوٹ کیس میں لائی تھی۔ میں جادو کو نہیں مانتی مگر
میرے ساتھ کوئی جادو ہوا ہے۔"

چنگیزی نے اس کا لکھا ہوا کاغذ چھین کر پھاڑ دیا۔ جادو کے سلسلے میں گالیاں دیتے
ہوئے بولا "میں پولیس والا ہوں۔ تمہارے چہرے کی معصومیت سے اور کسی جادو ٹونے
کے حوالے سے دھوکہ نہیں کھاؤں گا۔"

وہ تحریر کے ذریعے بولی "تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ پولیس والوں کے انداز میں میری
توہین کر رہے ہو جبکہ تھوڑی دیر پہلے تمہیں صرف میری ذات میں دلچسپی تھی۔ تم لاہور
سے مجھ پر قربان ہوتے آ رہے ہو۔ اگر میری چیزیں گم ہوگئی ہیں' چوری ہوگئیں ہیں یا
کہیں بے خیالی میں رہ گئی ہیں تو تم پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ نقصان میں تو میں رہوں
گی۔ اپنے دشمن کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گی' پلیز اپنا لہجہ اور اپنا انداز درست کرو۔"

وہ تھوڑی دیر اسے گھورتا رہا پھر بولا "نقصان صرف تمہارا نہیں' میرا بھی ہوا ہے۔
اگر چوہدری کا راز اپوزیشن والوں تک پہنچے گا تو چوہدری سیاست اور میں ملازمت سے
جاؤں گا۔ دیکھو' ہم ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ شادی کرنے والے ہیں۔
مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ' میں تمہارا راز دار ہوں۔ تمہارا محافظ ہوں۔"

وہ پھر تحریر کے ذریعے بولی "مجھے دل سے چاہتے ہو تو میرا یقین کرو۔ میں تم سے
کبھی جھوٹ بولوں گی نہ کوئی بات چھپاؤں گی۔ میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ
تمام ثبوت بڑے سوٹ کیس میں لاک کر کے لائی تھی۔ میں پاگل ہوں' نہ تھوڑی بہت
ایب نارمل ہوں۔ مگر یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ ثبوت مقفل سوٹ کیس سے کیسے
غائب ہوگئے؟"

پولیس والے ایسی بے تکی باتیں تسلیم نہیں کرتے۔ اگر وہ ملزمہ کی حیثیت سے

نے لائی جاتی اور یہ بیان دیتی کہ سامان چوری نہیں ہوا بلکہ جادو سے غائب ہوگیا ہے تو
پھر چنگیزی ڈنڈے سے اس کی پٹائی کرتا۔ ایسی باتیں نہ عقل تسلیم کرتی ہے' نہ
الت

وہ شمائلہ کے پاس سے اٹھ کر دور چلا گیا۔ اب وہ اسے کانٹے کی طرح چبھ رہی
ی۔ دروازے کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ سوچنے لگا۔ اب کیا کیا جائے؟ اس کے بڑے
ب بھی یہ یقین نہ کرتے کہ اہم ثبوت آپ ہی آپ غائب ہوگئے ہیں۔ وہ شاکر
یزی پر شبہ کرتے کہ وہ اپنی معشوق سے دیوانہ وار محبت کرتے ہوئے چوہدری احمد
ین سے دشمنی کر رہا ہے۔ ابھی وہ ڈی ایس پی بن کر میرپور خاص جا رہا تھا۔ مگر کراچی
نچنے تک نوکری سے ڈس مس ہو جاتا۔

وہ دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس نے وہیں سے اجمل کو دیکھا' جو شمائلہ کے
س بیٹھا ہوا تھا اور اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ شبہ یقین میں بدل رہا تھا کہ اجمل نے وہ
ام ثبوت غائب کر دیئے ہیں۔ یہ کوئی چال چل رہی ہے۔ اجمل یا تو اپوزیشن کا بندہ ہے یا
شمائلہ پر عاشق ہوگیا ہے اور اسے ایک انسپکٹر کا اصلی چہرہ دکھا رہا ہے۔ اس نے شمائلہ کو
ا کے خلاف بھکایا ہے۔ اس لیے وہ ثبوت گم ہو جانے کا بہانہ کر رہی ہے۔

چنگیزی کے دماغ میں ان دونوں کے خلاف زہر بھر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ آ رہا
ا کہ اجمل نے اپنا سامانِ سفر کسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں رکھا ہے اور شمائلہ سے تمام
ت لے کر وہاں اپنے سامان میں چھپا دیئے ہیں اور یہ کھلا جھوٹ بول رہی ہے کہ مقفل
ٹ کیس سے یہ اہم ثبوت غائب ہوگئے ہیں۔

اس پولیس والے کو شمائلہ اور اجمل کے خلاف ایک کڑی سے دوسری کڑی ملتی جا
ا تھی۔ واقعات کی ایک زنجیر بنتی جا رہی تھی کہ کس طرح اچانک شمائلہ کی زندگی میں
ل آیا اور اس نے کراچی میں بہت بڑی ملازمت کی آفر اسے دی۔ پھر اچانک ٹرین میں
بھی ان کا ہم سفر بن گیا۔ جب کہ اس کے خیال میں یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا تھا۔
جھی اسکیم کے تحت ہو رہا تھا۔

ادھر اجمل شمائلہ کو سمجھا رہا تھا "سید شاکر چنگیزی ایک برا آدمی ہے۔ مگر اچھا انسان
ہے۔ تمہیں اپنی ذات پر گزرے ہوئے تجربات سے کچھ سیکھنا چاہیے۔ جب وردی
اتھا تو اسی نے تمہیں ہیرا منڈی پہنچا دیا تھا۔ جب وردی سے نکل کر عزت کی چادر میں
تو اس نے مکمل انسان بن کر تمہیں گٹر سے نکالا حتیٰ کہ اپنے خلاف بھی شرافت اور
ری سے بیان دیا کہ وہ ایک سیاسی پارٹی کی خاطر تمہارے خلاف ایسا کر رہا تھا۔ تم غور کرو

گی تو وہ وردی میں بے رحم اور سول لباس میں رحم دل ہوتا ہے۔ ابھی وردی پہننے سے
پہلے تمہارے ساتھ محبت سے پیش آرہا تھا۔ اب وردی پہن کر دشمن کی طرح سلوک کر
رہا ہے۔ وہ چوہدری احمد حسین کی نیک نامی بحال رکھنے اور اس کے خلاف تمام ثبوت تم
سے حاصل کرنے کے لیے تمہاری جان سے بھی کھیل سکتا ہے۔"

شمائلہ پریشان ہو کر اس کی باتیں سن رہی تھی وہ جو کہہ رہا تھا' اس میں حرف بہ
حرف سچائی تھی۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ذہن سے سمجھا تھا کہ چنگیزی
کا رویہ اچانک بدلتا رہتا ہے۔ اس نے تحریر کے ذریعے پوچھا "کیا وردی اتنی بری ہوتی ہے
کہ آدمی اسے پہن کر بدترین بن جاتا ہے؟"

"وردی بری نہیں ہوتی۔ وردی تو پولیس کی شان اور قانون کی پہچان ہے۔ اقتدار
کی کرسی بری نہیں ہوتی اس پر ایک مومن بیٹھ کر ساری دنیا میں اپنے ملک اور قوم کا بول
بالا کر سکتا ہے' دراصل کرسی اور وردی کے جو بے جا اور بے حساب اختیارات حاصل ہو
جاتے ہیں' وہ آدمی کو جانور بنا دیتے ہیں۔"

شمائلہ کی تحریر نے کہا "چنگیزی کا مجھ پر احسان ہے' اس نے میری آبرو باقی رکھی
ہے۔ میں اسے برا نہیں سمجھنا چاہتی۔"

"یہی تو ہماری قومی کمزوری ہے' ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ملکی نمائندے ہماری آبرو
رکھتے ہیں جبکہ وہ ملک کے باہر ملکی اور قومی آبرو کا سودا کرتے ہیں۔ احسان بھی کرتے
ہیں' جڑیں بھی کاٹتے ہیں۔ اگر تم تھوڑی دیر کے لیے مجھے سچ مچ اجل سمجھ لو تو میں پیش
گوئی کرتا ہوں کہ وہ تمہاری زندگی کی جڑ کاٹنے والا ہے۔"

وہ اس حد تک بدگمان نہیں ہو سکتی تھی کہ چنگیزی اس کی جان سے بھی کھیل سکتا
ہے۔ ویسے سیاسی ہیرا پھیری کو خوب سمجھتی تھی۔ اس لیے چنگیزی کے بدلے ہوئے تیور
کو سمجھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اوپر سے اس پر دباؤ پڑ رہا ہے۔ وہ اسے اور اپنی
ملازمت کو بچانا چاہتا ہے۔ اس لیے غصہ کھا رہا ہے۔ پھر اتنے اہم ثبوت کے غائب
جانے سے غصہ لازماً آتا ہے۔ وہ خود تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔

ایک پولیس افسر چار سپاہیوں کے ساتھ اس کمپارٹمنٹ میں آیا۔ پھر [illegible] دروازے
کے پاس دیکھ کر بولا "کیا آپ سید شاکر چنگیزی ہیں؟"

اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "ہاں میں ہی چنگیزی ہوں' فرمائیے؟"

دوسرے انسپکٹر نے کہا "میرا نام شہباز علی ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آپ کے
ساتھ رہوں اور آپ سے تعاون کرتا رہوں۔ یہ سپاہی بھی آپ کی ماتحتی میں رہا

"مجھے وضاحت سے بتاؤ' کیا ہدایات دی گئی ہیں؟"

"مجھ سے کہا گیا ہے کہ آپ کے ساتھ شمائلہ پروین نامی ایک صحافی سفر کر رہی ہے۔
ے سامان میں کچھ اہم دستاویزات ہیں۔ کسی طرح بھی ان دستاویزات کو حاصل کرنا
"

"میں اس کے تمام سامان کی تلاشی لے چکا ہوں۔ وہ اہم چیزیں اس کے پاس نہیں
اس پر مجھے شبہ ہے۔ وہ ایک صحافی کے بہکانے میں آگئی ہے۔ اس نے وہ اہم
ویزات اسی شخص کے حوالے کر دیئے ہیں۔"

"کون ہے وہ شخص؟"

"اس کا نام اجل نواز ہے۔ ایک بہت بڑے اخبار سے اس کا تعلق ہے۔ اس لیے
دھونس اور دھمکیوں سے اسے مرعوب اور مجبور نہیں کر سکیں گے۔ یہ معلوم کرنا ہو گا
اس نے اپنا سفری سامان کس کمپارٹمنٹ میں رکھا ہے۔ اس کا سامان ملے گا تو ہماری
یہ چیزیں بھی مل جائیں گی۔"

اس نے اجل کی نشاندہی کی۔ انہیں بتایا کہ وہ سیٹ نمبر پندرہ پر شمائلہ کے ساتھ
باتیں کر رہا ہے۔ اس کے پاس اس کمپارٹمنٹ کا ٹکٹ ہے لیکن سامانِ سفر نہیں
ہے۔"

انسپکٹر شہباز نے کہا "اس نے جہاں بھی سامان چھپایا ہے۔ کراچی پہنچنے کے بعد اپنا
ن ضرور اٹھا کر لے جائے گا۔ اس وقت ہم اس کے سامان کی تلاشی لے سکیں گے۔"

یہی ایک راستہ رہ گیا تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ سینکڑوں میل کا سفر کرنے والے
ساتھ تھوڑا بہت سامان ضرور ہو گا۔ کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر پولیس والے کسی
شبے کی بنا پر اس کا سامان چیک کر سکتے تھے اور اس کے سامان سے اہم دستاویزات
کر وہاں ہیروئن کے پیکٹ رکھ سکتے تھے۔

بہرحال انہیں کراچی پہنچنے تک صبر کرنا پڑا۔ رات کو سونے کے لیے تمام مسافر اپنی
برتھ پر جا کر لیٹ گئے۔ کسی نے چادر کسی نے کمبل اوڑھ لیا۔ اجل اوپری برتھ پر
چاروں سپاہیوں کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ اس پر نظر رکھیں۔ انسپکٹر شہباز بھی صبح تک
کمپارٹمنٹ میں کبھی کبھی آتا رہا اور اوپر برتھ پر کمبل میں لپٹے اجل کو دیکھ کر مطمئن
ہو کر جاتا رہا۔ پھر یہ کہ اس کی نچلی برتھ پر چنگیزی سویا ہوا تھا۔ گویا اس کی نگرانی کرتے
ہوئے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی تھی۔

صبح پانچ بجے انسپکٹر نے کمپارٹمنٹ کا ایک راؤنڈ لگایا تو اسے اوپری برتھ خالی نظر آئی۔ صرف وہ کمبل پڑا ہوا تھا جسے اجمل اوڑھ کر سو رہا تھا۔ انسپکٹر نے سپاہیوں سے پوچھا"یہ کہاں ہے؟"

دو سپاہی ایک جگہ بیٹھے سو رہے تھے۔ دو جاگ رہے تھے۔ سونے والے ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ جاگنے والوں میں سے ایک نے کہا"ابھی سو رہا تھا۔ شاید ٹائلٹ میں گیا ہے۔"

انسپکٹر نے ڈانٹ کر پوچھا"شاید کا مطلب کیا ہوا؟ کیا تم نے اُسے برتھ سے اتر کر ٹائلٹ جاتے نہیں دیکھا؟"

"وہ بات یہ ہے سر! کوئی تمام رات ایک ہی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ پھر اوپری برتھ کو دیکھتے دیکھتے گردن دُکھنے لگتی ہے۔"

دوسرے سپاہی نے کہا"سر! میں چائے والے کو پیسے دے رہا تھا۔ یہاں دو مسافر آپس میں لڑنے لگے تھے۔ میں بیچ بچاؤ کرا رہا تھا۔"

اس کمپارٹمنٹ میں دو طرف دو ٹائلٹ تھے۔ دو دو سپاہی ہر ٹائلٹ کی طرف گئے۔ انسپکٹر شہباز نے چنگیزی کو نیند سے جگایا۔ اسے بتایا کہ اوپری برتھ پر کمبل ہے۔ کمبل کے اندر بندہ نہیں ہے۔ وہ دونوں بھی تیزی سے چلتے ہوئے دو مختلف ٹائلٹ کی طرف گئے۔ سپاہیوں نے بتایا کہ ٹائلٹ کے اندر کوئی مسافر ہے۔ انسپکٹر چنگیزی نے انتظار کیا۔ پھر دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھلا تو کوئی دوسرا مسافر وہاں سے برآمد ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اجمل نواز کمپارٹمنٹ کے دوسرے ٹائلٹ میں گیا ہو گا۔

وہ دونوں سپاہیوں کے ساتھ دوسری طرف جانے لگا۔ اُدھر سے انسپکٹر شہباز دو سپاہیوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ اس نے کہا"وہ ٹائلٹ خالی ہے۔"

دو انسپکٹر اور چار سپاہی دو حصوں میں بٹ گئے۔ ٹرین کے اگلے اور پچھلے تمام کمپارٹمنٹ کے مسافروں کو چیک کرنے لگے۔ اگرچہ صبح ہو چکی تھی تاہم کئی مسافر منہ پر چادر یا کمبل لپیٹے سو رہے تھے۔ انہوں نے ان کے منہ کھول کر دیکھے۔ طرح طرح کی اچھی بری شکلیں نظر آئیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔

انسپکٹر چنگیزی نے پوچھا"مسٹر چنگیزی! آپ نے کہا تھا کہ اس کے ساتھ سامان نہیں ہے۔ اس نے کہیں چھپایا ہے پھر اس کے پاس اوڑھنے کے لیے کمبل کہاں سے آگیا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا"میں نے دھیان نہیں دیا۔ یہ بات ذہن میں نہیں آئی کہ اس کے پاس کمبل کہاں سے آگیا تھا؟"

اس نے شمائلہ کے پاس آ کر پوچھا"اجمل کہاں ہے؟"

وہ تحریر کے ذریعے بولی"میں کیا جانوں؟ اسی ٹرین میں ہو گا۔ وہ بھی تو کراچی جا رہا ہے۔"

"لیکن پوری ٹرین میں کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔ کیا وہ ٹرین سے آگے نکل گیا ہے؟"

"تم مجھ سے ایسے پوچھ رہے ہو' جیسے وہ مجھے بتا کر گیا ہو۔ کراچی آنے دو۔ وہ نظر آجائے گا۔"

ٹرین صبح دس بجے کراچی پہنچ گئی مگر وہ نظر نہیں آیا۔ جس سیاسی ہفت روزہ میں وہ مدیرہ کی حیثیت سے فرائض ادا کرنے آئی تھی اس کا مالک اور نائب مدیر اس کے استقبال کے لیے آئے تھے اور اسے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ چنگیزی نے ان سے شمائلہ کی رہائش گاہ کا اور دفتر کا پتا اور فون نمبر وغیرہ پوچھ کر نوٹ کیا پھر پلیٹ فارم پر اجمل کو تلاش کرنے لگا۔

وہ دونوں انسپکٹر حیران اور پریشان تھے۔ وہ نہ تو ٹرین میں نظر آیا اور نہ ہی کراچی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر۔ یوں چنگیزی کو پورا یقین ہو گیا کہ شمائلہ نے دھوکا دیا ہے۔ وہ ثبوت اجمل کے حوالے کر چکی ہے جسے وہ لے کر پولیس والوں کو دھوکا دے گیا ہے۔

انسپکٹر چنگیزی کو اپنے لاہور اور اسلام آباد کے اکابرین سے بڑی باتیں سننی پڑیں۔ اسے حکم دیا گیا کہ وہ شمائلہ کے معاملے میں ناکام رہا ہے۔ لہٰذا یہ کیس چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی سنبھالنے کے لیے میرپور خاص چلا جائے۔ کراچی کے دو پولیس افسران کو شمائلہ اور اجمل کے پیچھے لگایا گیا۔ انہیں تاکید کی گئی کہ اجمل کا پتا ٹھکانہ اور اس کی مصروفیات معلوم کی جائیں اور اس کی رہائش گاہ میں گھُس کر تمام سامان کی تلاشی لی جائے۔

اخبار کے دفتر سے پتا چلا' وہ اسلام آباد اور لاہور کے دورے سے واپس نہیں آیا ہے۔ اس کی رہائش گاہ کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ مالک مکان نے کہا"اجمل صاحب یہ مکان چھوڑ کر گئے ہیں۔ ان کا یہاں کوئی سامان نہیں ہے۔"

انسپکٹر چنگیزی کو اپنے بڑوں سے جتنی باتیں سننی پڑیں اور جس طرح اس کی توہین ہوئی' اس سے وہ طیش میں آ گیا تھا۔ ایک رات شمائلہ کی رہائش گاہ میں چپکے سے پہنچ گیا پھر بولا"تو تمام ثبوت کو اور اپنے یار کو چھپا کر بڑی چالاک بن رہی ہے اور یہ سمجھ رہی ہے کہ پہاڑوں سے ٹکر لے کر زندہ رہ سکے گی۔"

وہ بولی"چنگیزی! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیوں مجھ پر شبہ کر رہے ہو۔ اوّل تو میں نے وہ تمام ثبوت کہیں چھپائے ہی نہیں ہیں اور نہ انہیں اجمل کے حوالے کیا ہے۔ اگر ایسا کرتی

بھی تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ میں ملک کے غلیظ سیاست دانوں کو بے نقاب کر رہی ہوں۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ صحافت کے پیشے میں وہی خوشحال' زندہ سلامت اور معروف و مقبول رہتے ہیں جو نوکر شاہی کے ساتھ چلتے ہیں۔ بڑے بڑے سیاست دانوں کی تحریری و تصویری دستاویزات اور ان کی گندی سیاست کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ سردخانے میں پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں کوئی منظرِ عام پر نہیں لاسکتا۔ تم کل کی صحافی چھوکری' تم کس گنتی میں ہو؟"

وہ قریب آیا' وہ پیچھے ہٹنا چاہتی تھی لیکن اس نے پکڑ لیا پھر کہا "اجل آج نہیں تو کل نظروں میں آجائے گا۔ اس کا بھی یہی انجام ہو گا' جو تیرا ہوا ہے۔"

اس نے گردن دبوچ لی۔ اس کا دم رکنے لگا۔ وہ سانس لینے کے لیے جدوجہد کرنے لگی۔ ایسے وقت جب موت قریب ہوتی ہے' روح قبض کرنے کی گھڑی قریب ہو تو اجل کی موجودگی لازمی ہوتی ہے۔ اجل موجود تھا۔ دور سے تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ بے چاری اس کی گرفت میں تڑپ رہی تھی۔ کسی طرح خود کو ظالم سے چھڑا کر زندگی حاصل کرنا چاہتی تھی مگر انسپکٹر چنگیزی بہت تگڑا تھا۔ بڑے بڑے بدمعاش اس کی گرفت سے نکل نہیں پاتے تھے۔ وہ تو ایک نازک اندام سی لڑکی تھی' بے چاری کیا کرتی؟

اجل کو حکم تھا کہ تماشا دیکھے۔ اپنی طرف سے کوئی حرکت نہ کرے۔ اس لیے وہ تماشا بن گئی۔ جدوجہد سرد پڑ گئی۔ ہاتھوں پیروں میں جان نہ رہی۔ دیدے پھیل گئے۔ اخبار خواہ کتنی ہی اہم خبروں سے بھرپور ہو' وہ صبح تازہ ہوتا ہے اور شام کو ردی کی ٹوکری میں چلا جاتا ہے۔ وہ خبروں سے بھرپور صحافی لڑکی بھی موت کی ردی میں چلی گئی۔

چنگیزی نے اس کی گردن چھوڑی تو وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر چاروں شانے چت ہو گئی۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا۔ زندگی حرکت کرنا بھول چکی تھی۔ چنگیزی نے دونوں گھٹنے فرش پر ٹیک دیئے۔ پہلے اس کی نبض دیکھی پھر جھک کر اپنا کان مردہ سینے پر رکھا۔ وہاں سے کسی دھڑکن کی صدا نہیں تھی۔ موت مصدقہ تھی۔ پولیس افسر کو زندوں اور مُردوں کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں تصدیق کرنی بھی آتی ہے۔ چنگیزی نے اپنے پولیس کیریئر میں بہت سے مُردے دیکھے تھے۔ ایک اس مُردہ لڑکی کو بھی دیکھ لیا پھر وہاں سے پلٹ کر دروازے پر آیا۔ ایک نظر چاروں طرف ڈالی۔ یہ دیکھنے کے لیے اس کے وہاں آنے پھر جانے کا کوئی نشان تو نہیں رہ گیا؟ کوئی نشان' کوئی ثبوت نہیں تھا۔ کوئی اسے قاتل نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔

جس چار دیواری میں آدمی زندہ ہو' وہ گھر کہلاتی ہے۔ مُردہ ہو تو اسے مقبرہ کہتے ہیں۔ اس مقبرے میں موت کی سی گہری خاموشی تھی۔ پھر اس خاموشی میں سانسوں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی اور پھر وہ سانسیں رفتہ رفتہ سُر جگانے لگیں۔ جو گھر سے مقبرہ بن گیا تھا' وہ پھر گھر بننے لگا۔

اجل کو حکم تھا کہ صرف تماشا دیکھے۔ اپنی طرف سے کوئی حرکت نہ کرے۔ چونکہ اپنی طرف سے کچھ نہ کرنے کا حکم تھا۔ اس لیے اس نے شمائلہ کی روح قبض نہیں کی تھی۔

اس لیے وہ تماشائی تھا اور تماشا سانس لے رہا تھا۔

☆=========☆=========☆

سید شاکر چنگیزی ایس پی بن کر میرپور خاص پہنچ گیا۔ وہاں کے تھانے دار اور چند وڈیروں نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اس کی رہائش کے لیے ایک بڑا سا مکان مخصوص کیا گیا تھا۔ مکان کے چاروں طرف خوش نما باغ تھا۔ ہر طرف ہریالی اور رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ احاطے میں ایک تگڑی بھینس بندھی ہوئی تھی اور کئی ملازم ہاتھ باندھے نظر آرہے تھے۔ چنگیزی نے پوچھا "یہاں بھینس کیوں بندھی ہے؟"

ایک زمیندار نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور کے لیے ہے۔ آپ کو صبح وشام تازہ دودھ ملا کرے گا۔ بھینس کا چارا اور گوالا سب اس خادم کی طرف سے ہے۔"

دوسرے زمیندار نے کہا "میں نے ضرورت کا تمام راشن پہنچا دیا ہے۔ باورچی اور دوسرے خدمت گار بھی موجود رہا کریں گے۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی۔"

مکان کے پیچھے کئی ڈربوں میں بے شمار مرغیاں اور تیتر وغیرہ تھے۔ مکان کے اندر قدم رکھتے ہی بہترین کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں آرہی تھیں۔ ایک میز پر طرح طرح کی ڈشیں لا کر رکھی جا رہی تھیں۔ کھانے کے دوران تھانے دار نے بتایا کہ اس ضلع میں تمام زمینداروں اور وڈیروں نے ایک "خصوصی فنڈ" قائم کیا ہے۔ جب بھی ضلع کے بڑے افسران دورے پر آتے ہیں تو ان کی خاطر تواضع کے لیے اس فنڈ سے رقم خرچ کی جاتی ہے اور افسران کو نذرانے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

وہ کھا رہا تھا' ان کی باتیں سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہاں مال بنانے کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔ پچھلا ایس پی ادھر سرحد کے قریب مارا گیا تھا۔ اس سے پہلے سرحد کے آرپار دونوں طرف کے کچھ سپاہی بھی جان سے گئے تھے لیکن اب تک ادھر کا کوئی تھانے

دار موت کے گلے نہیں لگا تھا۔ یعنی جو بھی تھانے دار آیا وہ اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے گیا یا پھر تبادلے پر وہاں سے زندہ رخصت ہوا۔

شاکر چنگیزی نے سمجھ لیا کہ سابق تھانے داروں کے نقشِ قدم پر چلتا رہے گا تو اپنی جان و مال کے ساتھ پھلتا پھولتا رہے گا۔ کھانے کے بعد اس نے کہا "میں دوپہر کو ذرا آرام کرتا ہوں لہٰذا شام کو یہ علاقہ دیکھنے کے لیے نکلوں گا۔ فی الحال تنہائی چاہتا ہوں۔"

تمام میزبان اور استقبال کرنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ وہ دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں اس کا سامان رکھا ہوا تھا۔ وہ سوٹ کیس کھول کر ایک شلوار قمیض نکالنے لگا۔

نائب تھانے دار مکان کے باہر احاطے میں تھا۔ گوالے اور دوسرے ملازموں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ ڈرائیور اور سپاہیوں کو پروگرام سمجھا رہا تھا کہ شام کو دو گاڑیاں تیار رکھی جائیں' صاحب دورے پر نکلیں گے۔ ایسے ہی وقت صاحب کی گرج دار آواز سنائی دی "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

سب نے پلٹ کر ایس پی چنگیزی کو دیکھا۔ وہ شلوار قمیض پہنے' ہاتھ میں تسبیح لیے برآمدے میں کھڑا تھا۔ نائب نے الرٹ ہو کر کہا "سر! میں سپاہیوں کو ہدایت دے رہا ہوں.........."

وہ بات کاٹ کر بولا "میں سپاہیوں کو نہیں' ان غریب دیہاتیوں کو پوچھ رہا ہوں۔ یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کیوں بھیڑ لگا رکھی ہے؟"

"سر! یہ لوگ آپ کی خدمت کے لیے ہیں۔ یہ باورچی ہے' یہ گھر کی صفائی کے لیے ہے' یہ مالی ہے اور یہ.........."

وہ ڈانٹ کر بولا "یہ میرے خدمت گار کیسے ہو گئے؟ کیا میں اپنی محدود تنخواہ میں اتنے ملازم رکھ سکتا ہوں؟ کیا تم انہیں بے گار کے لیے پکڑ لائے ہو۔"

"سر! یہ سب یہاں کے زمینداروں کی رعیت ہیں۔ ان کی غلامی کرتے ہیں۔ اب آپ کی کریں گے۔"

"یوشٹ اپ! کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو غلام بناتا ہے؟ کیا تم تھانے دار ہو کر اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ جاگیردار' زمیندار اور وڈیرے بڑے بڑے مفادات حاصل کرنے کے لیے ہم پولیس والوں کو خوش کرتے ہیں۔ اور یہ بھینس بھی شاید رشوت کے طور پر لائی گئی ہے۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔ فوراً ان سب کو بھگاؤ۔ لعنت ہے' تم لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہو جیسے دنیا سے ایمان اٹھ گیا ہے۔"

وہ لاحول پڑھتا ہوا' برآمدے سے کمرے کے اندر چلا گیا۔ تھانے دار کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔ سپاہی ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ ایک نے تھانے دار سے کہا "جناب! یہ ایس پی صاحب' تو پکے مسلمان ہیں۔"

تھانے دار نے سوچنے کے انداز میں کہا "یہ ایسا ہی ایمان والا ہے تو ابھی مرغ اور بریانی کیسے کھا رہا تھا؟ کیا اس کھانے کو رشوت نہیں سمجھ رہا تھا؟"

دوسرے سپاہی نے کہا "جناب! یہ کڑک افسر ثابت ہوا تو بڑی مصیبت بن جائے گا۔"

تھانے دار تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا برآمدے میں آیا۔ وہاں سے اندر ایک کمرے میں' جھانک کر دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اس کے ایس پی صاحب جائے نماز پر کھڑے ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ دبے قدموں برآمدے سے واپس آیا پھر سپاہیوں سے بولا "آخر یہ ہے کیا چیز؟ جب یہاں آیا تو زمینداروں سے مصافحے کر رہا تھا۔ ان کی زبانوں سے سنا کہ وہ بڑے لوگ اسے بھینس' گوالا' ملازمین اور راشن وغیرہ سب دے رہے ہیں تب اس نے اعتراض نہیں کیا۔"

دوسرے سپاہی نے کہا "واقعی اس وقت اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ رشوت ہے۔ اور وہ ان ہاریوں سے بیگار نہیں کرائے گا۔"

تیسرے سپاہی نے کہا "جناب! یہ بگلا بھگت ہے۔ محض دکھاوے کے لیے نماز پڑھ رہا ہے۔"

تھانے دار نے کہا "میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں۔ یہ اندر سے کچھ اور ہے اور باہر سے کچھ اور۔ میں اسے ٹٹولنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ پھر برآمدے میں آیا۔ دروازے کے پاس کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا کہ عبادت ختم ہو تو صاحب سے کچھ اصلیت اگلوائے۔

چنگیزی نے نماز پوری کی پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر دل ہی دل میں کہنے لگا "یا خدا مجھے معاف کر دے۔ وہ مجھ پر بھروسا کرنے اور مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ میں نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ پتا نہیں' میں نے زندگی میں کتنی خطائیں کی ہوں گی۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہتا ہے۔ مگر وہ مجھے یاد رہی ہے۔ اسے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ عبادت کے وقت بے اختیار یاد آ جاتی ہے۔ یا اللہ! میں معافی کا طلب گار ہوں۔ تُو معاف کرنے والا ہے۔ میرا یہ جرم بھی معاف کر دے۔"

اس نے دعا کے بعد سر گھما کر تھانے دار کو دروازے پر دیکھا۔ پھر کہا "یہاں آؤ اور

میری طرح دو زانو ہو کر بیٹھ جاؤ۔"

اس نے بڑے صاحب کے حکم کی تکمیل کی۔ جوتے اتار کر قریب آیا پھر اس کے قریب دو زانو ہو گیا۔ اس نے پوچھا "نماز پڑھتے ہو؟"

تھانے دار نے جھجکتے ہوئے کہا "جی.........جی ہاں عید بقرعید میں پڑھ لیتا ہوں۔"

"یہ تمہاری گمراہی ہے۔ اس معبودِ حقیقی کو دن رات یاد کیا کرو۔ ہم پولیس والوں سے بڑی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ ہماری غلطیاں تب ہی معاف ہوں گی' جب ہم نماز پڑھتے رہیں گے۔"

"سر! آپ کا حکم ہے تو ضرور پڑھوں گا۔ مگر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اجازت ہے؟"

"ضرور کہو۔ مومن کو حق بات کہنے کی اجازت کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"سر! آپ نے یہاں آتے ہی کئی زمینداروں کی رشوت قبول کی۔ ان کی مرغیوں' تیتروں اور بھینس کو قبول کیا۔ ان بیگار کرنے والوں پر اعتراض نہیں کیا۔ ان کے پیش کئے ہوئے طرح طرح کے کھانے کھائے۔ جس وقت کھا رہے تھے' اس وقت پاس والی مسجد میں ظہر کی نماز ہو رہی تھی اب آپ قضا پڑھتے وقت پچھلی تمام باتوں پر اعتراض کر رہے ہیں۔"

چنگیزی نے کہا "انسان خطا کا پتلا ہے۔ مجھ سے غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ میری یادداشت بھی کمزور ہے۔ اس لیے عبادت کرتا ہوں اور حرام کی کمائی سے پرہیز کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ بھول چوک سے حرام کمایا ہو تو وہ معاف ہو جائے۔"

"آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بھول چوک سے رشوت لے لیتے ہیں۔"

"ہاں شاید' لے لیتا ہوں پھر بھول جاتا ہوں۔"

"تو جناب! آپ یہ بھی بھول جائیں کہ ابھی کچھ زمیندار آپ کو خوش کر کے گئے ہیں۔"

"کیسے بھول جاؤں' کیا بھولنا میرے بس میں ہے؟ میں کسی کو سمجھا نہیں سکتا کہ میرا حافظہ اس معاملے میں بہت کمزور ہے۔ مجھے کچھ یاد رہتا ہے کچھ بھول جاتا ہوں' اور جو بھول جاتا ہوں' وہ بعد میں یاد آتا ہے۔ جیسے ابھی یاد آ رہا ہے کہ یہ بھینس' یہ مرغیاں اور یہ ملازمین میرے لیے جائز نہیں ہے۔ یہاں آ کر جو کھایا وہ حرام تھا۔ آج رات کو ہمیشہ کی طرح خود پکا کر کھاؤں گا۔"

"سر! آپ شام کو کس وقت دورے پر نکلیں گے؟ آپ کے لیے سپاہی اور گاڑیاں تیار رہیں گی۔"

"گاڑیوں کی کیا ضرورت ہے؟ خواہ مخواہ پیٹرول خرچ کرو گے اور سرکاری اخراجات بڑھاؤ گے۔ ہم پیدل جائیں گے۔"

"سر! یہ شہر خاصا بڑا ہے۔ آپ تھک جائیں گے۔ پھر آس پاس کے علاقے بھی ہیں۔"

وہ تسبیح پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا "سپاہی کبھی نہیں تھکتے۔ سرکار ہمیں تنخواہ دیتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم خرچ کم کریں اور سرکاری خزانے میں اضافہ کریں۔ جب میں دورے کے لیے نکلوں تو بدنیت لوگوں کو سمجھا دینا کہ میں رشوت خور نہیں ہوں۔ جو رشوت دینا چاہے گا' اسے میں الٹا لٹکا دوں گا۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ آپ آرام فرمائیں۔ میں شام کو پانچ بجے حاضر ہو جاؤں گا۔"

وہ سلام کر کے دروازے پر آیا۔ وہاں اپنے جوتے پہنے پھر تیزی سے چلتا ہوا سپاہیوں کے پاس آ کر بولا "یہ کمبخت دیانت دار اور کڑک افسر ہے۔ یہ ہمارے لیے اور اس علاقے کے بڑے لوگوں کے لیے مصیبت بن جائے گا۔ گاڑی نکالو۔ ہمیں اپنے خاص زمینداروں اور وڈیروں کو اس کی فطرت سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ کسی کا لحاظ نہ کرے اور کسی کے مان اور مرتبے کا خیال کئے بغیر حوالات میں بند کر دے۔"

وہ ایک گاڑی میں سپاہیوں کے ساتھ بیٹھ کر وہاں کے بڑے لوگوں کے پاس جانے لگا۔ کسی کے دروازے پر پہنچ کر اور کسی کو فون کے ذریعے تاکید کرنے لگا کہ نئے ایس پی صاحب کے سامنے یہاں کے خفیہ دھندوں کا ذکر نہ چھیڑا جائے اور نہ ہی لین دین کی بات کی جائے۔ یہ صاحب اندر سے پکا مسلمان ہے۔ اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ہو گا یا تو یہ ہمارے رنگ میں رنگے گا یا پھر سرحد پار سے آنے والی گولی کھا کر شہید ہو کہلائے گا۔ ویسے اس کے کانوں میں یہ بات ڈالی جائے گی کہ پچھلی بار ایک ایماندار پولیس افسر کا جنازہ کتنی دھوم دھام سے نکلا تھا۔

وہ وہاں کے تمام اکابرین کو حالاتِ حاضرہ یا چنگیزی کی فطرتِ حاضرہ سے آگاہ کر کے پانچ بجے حاضر ہو گیا۔ چنگیزی پوری طرح وردی میں ملبوس تھا۔ اس نے گرج کر پوچھا "کہاں مر گئے تھے؟ پانچ بج کر پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ جبکہ یہاں سے پانچ بجے روانہ ہونا تھا۔ یاد رکھو میں وقت کا بہت پابند ہوں۔ ڈیوٹی کے وقت کوتاہی برداشت نہیں کرتا۔"

وہ مرعوب ہو کر بولا "معافی چاہتا ہوں سر! آئندہ وقت سے پہلے حاضر رہوں گا۔ آئیں تشریف لے چلیں۔"

چنگیزی نے احاطے میں دور تک نظریں دوڑائیں پھر پوچھا "کیسے چلوں؟ گاڑی کہاں ہے؟"

"جی؟" وہ چونک کر بولا "سر! آپ نے حکم دیا تھا کہ سرکاری پیٹرول خرچ نہ کیا جائے۔ آپ پیدل دورہ کریں گے۔"

وہ گرج کر بولا "کیا تم پاگل کے بچے ہو۔ میں ان علاقوں پیدل چلوں گا؟ میں افسر ہوں یا کوئی گھسیارا۔ میں نے کب تمہیں ایسا حکم دیا تھا؟"

"جب آپ ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے تب مجھے نیک ہدایات دے رہے تھے۔"

چنگیزی ذرا تذبذب میں رہا پھر بولا "ٹھیک ہے۔ تھانے سے گاڑی منگواؤ اور ادھر آؤ۔"

وہ کمرے کے اندر آگیا۔ تھانے دار نے سپاہیوں کو تھانے جا کر گاڑیاں لانے کا حکم دیا پھر کمرے میں آکر صاحب کے سامنے ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا صاحب تھوڑی دیر تک الجھا رہا پھر بولا "تم یہاں میرے خاص ماتحت ہو اور رہو گے اس لیے میری عادت یا فطرت کو کچھ سمجھ لو۔ اسے تم عام انسانی فطرت بھی کہہ سکتے ہو کہ آدمی ہنستے وقت صرف ہنسے گا۔ ہنستے وقت کبھی روئے نہیں روئے گا۔ اگر آنکھوں میں آنسو آئیں گے تو وہ خوشی کے آنسو ہوں گے۔ آنسو تو صدمات کی پیداوار ہوتے ہیں مگر ہم اسے مسرت کا اظہار بھی بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح جرم' بے ایمانی کی پیداوار ہے۔ مگر کتنے ہی ایسے جرائم ہیں' جنہیں ہم ایمان کی تسبیح میں پرو لیتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یا مجھے یاد نہیں رہتا کہ میں کب بدی سے نیکی کی طرف گیا تھا اور کس طرح نیکی بھول کر بدی کی طرف چل پڑا ہوں۔ ہم اپنے اندر کی بہت سی باتیں نہیں جانتے۔ جبکہ وہ باتیں' وہ عادتیں ہمارے اندر موجود رہتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ ہم بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنی بدلتی ہوئی نیت کو نہیں سمجھ پاتے۔ ایک عابد کو اس کے حالات پوچھو' وہ زہر کھائے گا یا رشوت؟ وہ زہر کھائے یا نہ کھائے' رشوت کبھی نہیں کھائے گا۔ ایک بے حد بااختیار شخص سے پوچھو تو وہ پوچھنے سے پہلے ہی رشوت کھا لے گا اور زہر تمہیں کھلا دے گا۔

"میں اپنے بارے میں اس سے زیادہ نہیں سمجھ سکتا۔ میرا تجربہ ہے کہ ایک افسر خود کو اتنا بھی نہیں سمجھتا' جتنا کہ اس کا ماتحت سمجھتا ہے اور جو ماتحت اپنے افسر کو نہ سمجھ پائے' اس کا تبادلہ ہو جایا کرتا ہے۔"

تھانے دار نے اسے بڑی حد تک سمجھ لیا۔ گاڑیاں آگئی تھیں۔ وہ اپنے صاحب کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دوسری میں سپاہی تھے۔ وہاں سے روانہ ہوتے ہی وہ اپنے صاحب کو ان علاقوں کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا۔ وہاں کے شہری رئیس اور مضافاتی علاقوں کے زمیندار اپنی رئیسانہ شان و شوکت اور وڈیرا شاہی قائم رکھنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے تھے۔ چونکہ وہ سرحدی علاقہ بھی تھا' اس لیے شاکر چنگیزی کو سرحدی معاملات سے زیادہ دلچسپی تھی۔

میرپور خاص کا ضلع رقبے کے لحاظ سے بڑے اضلاع میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس کا صرف ایک حصہ ہی سرسبز و شاداب ہے باقی تین حصے ریگستانی ہیں۔ یہاں مسلمان بھی ہیں ہندو بھی' اور یہ سرحد کے دونوں طرف آباد ہیں۔ ادھر کی سرحد اتنی طویل ہے کہ غیر قانونی نقل و حرکت پر مکمل پابندی عائد کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ پولیس اور بارڈر فورس کے پہرہ لگانے کے باوجود غیر قانونی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ شاکر چنگیزی کو وہاں ہونے والی اسمگلنگ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ بھارت سے بیڑی کے پتے' گرم مصالحے اور الائچی آتی ہے اور پاکستان سے گندم برآمد کی جاتی ہے۔

بھارت کو شکایت تھی کہ پاکستان نے اپنی سرحد پر رینجرز نہیں ڈاکوؤں کی ڈیوٹی لگائی ہے۔ وہ بھارت داخل ہوتے ہیں اور وہاں سے مویشی چرا کر لے جاتے ہیں۔ یہی شکایت پاکستان کو تھی کہ بھارتی ڈاکو آتے ہیں' وہ بارڈر پولیس کی وردی میں ہوتے ہیں اور یہاں سے مویشی چرا کر لے جاتے ہیں۔

ان مویشیوں کی چوریوں کے پیچھے بڑی سیاسی چالیں تھیں۔ ان چالوں کو سمجھنے کے لیے پتھاریداروں کو سمجھنا ضروری تھا۔ ایک پتھارے دار کے پاس چوری کے دو چار سو بیل اور بھینسیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ وہ خفیہ باڑے میں ان مویشیوں کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ اس جگہ کو پتھاری کہتے ہیں۔ پولیس والوں سے ان پتھاریداروں کے تعلقات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ ان مویشیوں کے باڑوں پر کبھی چھاپے نہیں پڑتے۔ جن بے چاروں کی چوری ہوتی ہے۔ وہ اپنے مویشی کی آدھی قیمت دے کر اسے پتھاری سے لے آتے ہیں۔

یہ تصویر کا واضح رخ تھا۔ مگر اس کا پچھلا چھپا ہوا سیاسی رخ یہ تھا کہ مویشیوں کی آڑ میں بھارتی جاسوس پتھاریداروں کے ہاں آتے جاتے تھے۔ چھپ کر رہتے تھے پھر چپ چاپ سندھ کے دوسرے علاقوں میں جا کر گم ہو جاتے تھے۔ بھارتی انٹیلی جنس کے شعبے

"را" کے جاسوس پتھارے داروں کے مہمان بن کر آتے ہیں' یہ حقیقت وہاں کی پولیس تو جانتی تھی یا پھر اس لیے غافل تھی کہ ان پتھاریداروں کو صرف مویشی چور سمجھ کر ان سے بھتہ وصول کر کے سیاسی سازشوں کو نظرانداز کر دیتی تھی۔

شاکر چنگیزی وہاں زیادہ تر وردی میں ہی رہتا تھا۔ صرف رات کو سوتے وقت اسے اتارتا تھا پھر صبح پہن لیتا تھا۔ کیونکہ صبح سے رات گئے تک پتھارے داروں' وڈیروں اور چھوٹے بڑے اسمگلروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی مسئلے میں حاضری دیتے کرتے تھے اور وہ ان کے مسئلے اور مشکلیں آسان کرتا رہتا تھا۔

ان دنوں کراچی اور دوسرے شہروں میں کچھ بھارتی جاسوس گرفتار ہوئے تھے اخبارات میں زوروشور سے ان کا چرچا ہو رہا تھا۔ وفاقی حکومت سندھ انتظامیہ پر پُرس کر رہی تھی اور انتظامیہ میں ایک ایسی ٹیم تشکیل دے رہی تھی جو سرحدی علاقوں میں جا کر بھارتی ایجنٹوں کے آنے کے چور دروازے معلوم کر سکے۔ اس ٹیم میں پولیس سراغ رساں اور انتظامیہ کے چند عہدے داران کے علاوہ پریس رپورٹرز بھی تھے۔

وہاں کے تھانے دار اور ایس پی شاکر چنگیزی نے میرپور خاص میں اس تحقیقاتی ٹیم کا استقبال کیا لیکن اس ٹیم میں اجل اور شائلہ کو دیکھتے ہی چنگیزی کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ اسے قتل کر کے اس کی موت کی اچھی طرح تصدیق کر کے آیا تھا۔ اب آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ مُردہ صحافی زندہ ہو گئی ہے۔

استقبالیہ تقریب میں ایک دوسرے سے متعارف ہونے اور کھانے پینے کے پُرتکلف انتظامات تھے۔ ٹیم کا ایک افسر اپنے ساتھ آنے والوں کا تعارف کرا رہا تھا۔ جب اس نے شائلہ سے تعارف کروایا گیا تو وہ مسکرا کر بولی "ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں مگر واقفیت کچھ عرصے کے لیے مُردہ ہو گئی تھی۔ جان پہچان کا سلسلہ ٹوٹ جائے تو لوگ جی ایک دوسرے کے لیے مرجاتے ہیں۔ بائی دی وے' ایس پی صاحب کو دیکھ کر ایک یاد آگیا ہے۔

کس قدر تھے موت کے مراحل پھر بھی
کوئی بات تو تھی' جس بات نے مرنے نہ دیا۔

موسم خوشگوار تھا۔ پھر بھی چنگیزی کو پسینہ آرہا تھا۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا "مم......... میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی "ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی عمر پڑی ہے باتیں کرنے کے لیے۔ عمر ختم دینے سے مختصر نہیں ہو جاتی۔ تم دنیا کی ہر شے ناپ سکتے ہو۔ صرف عمر کا قد معلوم نہیں

ہم ضرور ملیں گے۔ ابھی تو میں یہاں ہوں۔"

وہ منہ پھیر کر چلی گئی۔ اجل نے روبرو آ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ چنگیزی نے مصافحہ کیا۔ موت جیسی سرد لہر جسم میں دوڑ گئی۔ شائلہ کو دیکھ کر جو پسینہ آیا تھا' وہ ہو گیا۔ ٹھنڈا پسینہ بھی نہیں آیا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑا لیا' اجل نے کہا "ہم الٹے ہیں۔ جیسا ہونا چاہیے' ویسے نہیں ہیں۔ شائلہ کو موت کی طرح سرد ہونا مگر وہ حرارتِ حیات سے بھرپور ہے۔ میں باحیات ہوں مگر موت کی طرح ٹھنڈا تم تسبیح پڑھنے والے افسر ہو مگر یہ کبھی سمجھ نہیں پائے الٹی تسبیح پڑھا کرتے ہو۔ ہم ذرا سیدھے ہیں' مگر الٹے زیادہ ہیں۔"

چنگیزی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' اسے کیا جواب دے؟ یا دوسرے افسران اور ٹیم عہدے داران سے کس طرح ملے کہ اندر کا انتشار اور گھبراہٹ ظاہر نہ ہو۔ وہ شائلہ آنکھوں کے سامنے زندہ سلامت چلتے پھرتے دیکھ کر مرا جا رہا تھا۔

وہ فی الوقت خود کو تسلیاں دے رہا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ شائلہ ہے اس لیے اسے نہ قاتل کہہ سکے گی نہ یہ ثابت کر سکے گی کہ اس نے اسے قتل کی کوشش کی تھی اور نہ ہی پوری ٹیم ایسے کسی قتل کی تفتیش کرنے آئی ہے۔

وہ مسکرانے لگا اور بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ اعلیٰ افسران سے کے بہانے شائلہ کو نظرانداز کرنے لگا۔ اس ٹیم کے چند افراد چاق و چوبند اور فرض تھے۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی سرحدی علاقوں کا دورہ کرنا چاہتے تھے مگر باقی دار اور دیگر افسران تھکن ظاہر کر رہے تھے' آج آرام اور کل کام کرنا چاہتے

اجل نے کہا "کام آج ہو یا کل' ہمارا مقصد پورا نہیں ہو گا۔ یہاں کوئی بھارتی پکڑا نہیں جا سکے گا۔"

پولیس کے اعلیٰ افسر نے کہا "تم صحافی لوگ خواہ مخواہ پیش گوئی کرتے ہو۔ تم کیا جانو ہم پولیس والے کس طرح ان کی قبر سے بھی انہیں نکال لائیں گے۔"

اجل نے کہا "ہم جتنی دھوم دھام سے یہاں آئے ہیں اس کے بعد تو وہ مُردہ بھی قبر سے نکل بھاگے ہوں گے۔"

شائلہ نے کہا "یہاں صرف مسلمان نہیں' ہندو بھی صدیوں سے آباد ہیں۔ یہ یہاں سندھ کے دوسرے علاقوں میں رشتے داروں کے ہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ آپ معلوم کریں گے کہ ان میں کون جاسوس ہے؟"

"یہاں بھارتی ایجنٹوں نے چھپنے کے اڈے بنا رکھے ہوں گے۔ ہم ان اڈوں کا سراغ

لگائیں گے۔"

بحث جاری رہی۔ چند بڑے افسران آرام کرنے کے لیے ریسٹ ہاؤس میں رہ گئے
باقی دورے پر نکل گئے۔ ایس پی چنگیزی ان کے ساتھ تھا۔ اسے راستے میں شمائلہ سے
باتیں کرنے کا موقع ملا۔ اس نے کہا"شمائلہ! میں نے پچھلے دنوں تمہارے ساتھ جو سلوک
کیا' اس کا مجھے افسوس ہے۔ ویسے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ تمہاری آواز بالکل ختم
نہیں ہوئی تھی۔ تم پھر بولنے لگی ہو۔"

"ہاں' جب ایک چٹکی سیندور کے ذریعے میری آواز بند کر دی گئی تو سمجھ میں آنے
لگا کہ ہمارے ملک میں صحافیوں کا منہ کیسے کیسے ہتھکنڈوں سے بند کر دیا جاتا ہے۔ میں بھول
گئی تھی کہ پاکستان کا ایک بازو کاٹنے والی تلوار کو کیسے چھپایا گیا۔ حمود الرحمٰن کمیشن
رپورٹ کا منہ کیسے بند کیا گیا۔ اوجڑی کیمپ کے حادثے پر کیسے مٹی ڈالی گئی۔ جنرل ضیاء
الحق کے جہاز کے حادثے اور اس سلسلے کے ذمے داروں کی پردہ پوشی کس طرح کی گئی
ایسی بہت سی زبان بندیاں سمجھ آئیں تو معلوم ہوا کہ ہم صحافیوں کو روتا ہوا بچہ سمجھ کر
میں فیڈر دے دیا جاتا ہے۔ تاکہ بچہ چپ ہو جائے اور سو جائے۔

"بچہ ہی سہی۔ وہ سوتا ہے تو پھر جاگتا بھی ہے اور سارے سوئے ہوئے مسائل
جگاتا بھی ہے۔ صحافی وہ مؤذن ہوتا ہے' جس کی زبان کاٹو تب بھی ہر صبح اخبار کے ذریعے
پوری قوم کے کانوں میں اذان سناتا ہے۔ کوئی مفادات پرست سیاست دان اس اذان
سیندور کھلا سکا ہے' نہ کبھی کھلا سکے گا۔"

وہ بول رہی تھی اور چنگیزی سن رہا تھا اور خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ پہلے وہ فتنہ
اب قیامت ہو گئی ہے۔ پہلے قلم کا دریا تھی' اب سمندر ہو گئی ہے۔ ویسے اس نے
بندی کے بہت سے حوالے دیئے مگر ان صحافیوں کے حوالے اسے یاد نہیں ہیں کہ
طرح جیلوں اور عقوبت خانوں میں ان سے جانوروں جیسا سلوک کیا گیا۔ جو ظلم سہہ کر
باز نہ آئے انہیں باعزت رہا کر کے سرِ راہ نادیدہ ہاتھوں سے قتل کرا دیا۔ شمائلہ کو بھی
سبق سکھانا ہو گا اور اس کے ساتھ اجل کو بھی۔ کیونکہ چوہدری احمد حسین کے خلاف
ثبوت ان دونوں کے ہی پاس ہیں۔

وہ دورہ کرنے والی ٹیم ایک پتھارے دار کے باڑے میں پہنچی۔ وہاں بے شمار مویشی
تھے۔ ان مویشیوں کے جسم پر آہنی سانچے سے جو نشان ثبت کیے گئے تھے' ان سے
ہوتا تھا کہ وہ بھارتی سرحد کے اس پار سے چرا کر لائے گئے ہیں۔ ایک اعلیٰ افسر نے
کیا"یہ پڑوسی ملک کے مویشی تمہارے پاس کیسے آ گئے؟"

پتھارے دار کی جگہ تھانے دار نے کہا"اس نے میرے حکم سے انہیں باندھ رکھا
ہے کیونکہ ہمارے ملک کے چھ سو مویشی وہ ہندوستانی ڈاکو لے گئے ہیں۔ ہم نے اطلاع
بھیجی ہے کہ وہ اپنے مویشیوں سے ہمارے مویشیوں کا تبادلہ کریں اور اس سرحدی علاقے
میں پُرامن رہیں۔ سر! ان کے ساتھ ایسا سخت رویہ اختیار نہ کیا جائے تو ہماری عورتیں بھی
اٹھا لے جائیں گے۔"

اجل نے پوچھا"یہاں ہندو باشندوں سے تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے ہیں۔ آخر وہ بھی پاکستانی ہیں۔ ہم بھی پاکستانی ہیں۔ ہم میل محبت سے
رہتے ہیں۔"

"سرحد پار سے بھی ہندو میل محبت بڑھانے آتے ہیں اور یہاں قیام کرتے ہیں؟"

"نہیں صاحب! سرحد پار سے یہاں کوئی بھی آئے تو ہم فوراً تھانے میں رپورٹ
کرتے ہیں۔"

ٹیم کے افراد طرح طرح کے سوالات کرنے اور جوابات پانے کے بعد واپس آ گئے۔
وہ سب مطمئن تھے۔ صرف اجل کو معلوم تھا کہ کس گھر میں کون جاسوس چھپا ہوا ہے اور
وہاں کیسے کیسے سرحدی جرائم ہوا کرتے ہیں۔ فی الحال وہ محض تماشائی تھا۔

دوسرے دن اس ٹیم نے تھر کے علاقے میں جانے کا پروگرام بنایا۔ شمائلہ کی طبیعت
ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ ریسٹ ہاؤس میں رہی۔ چنگیزی نے
تھر کی سمت جاتے ہوئے اجل سے کہا"شمائلہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہتی ہے۔ پھر تم
اسے تنہا چھوڑ کر کیسے آ گئے؟"

اجل نے کہا"تم تنہا چھوڑنے کی بات کر رہے ہو جبکہ میں کسی کو نہیں چھوڑتا۔
تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دوں۔ وہ مجھے صرف ایک بہترین اور قابلِ اعتماد دوست سمجھتی
ہے۔"

چنگیزی نے مسکرا کر کہا"میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ لوگوں کو ان کے چہروں
اور آنکھوں سے پہچانتا ہوں۔ یہ دعوے سے کہتا ہوں کہ اب وہ کنواری نہیں رہی ہے۔
بلکہ اس سے بھی زیادہ کچھ اور ہے۔"

"مسٹر چنگیزی! تم نہ تو کوئی چونکا دینے والی بات کہہ رہے ہو اور نہ ہی شمائلہ پر کیچڑ
اچھال رہی ہے۔ بے شک اب وہ کنواری نہیں ہے۔ اب سے سات ماہ پہلے ہفت روزہ
کے مالک سے اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس سے بھی زیادہ تم جو محسوس کر رہے ہو' وہ
یہ ہے کہ اس کے پاؤں بھاری ہیں اور وہ تقریباً چار ماہ بعد ماں بننے والی ہے۔"

چنگیزی کو چپ لگ گئی۔ وہ ایک مرد تھا۔ اس نے کنواری شمائلہ کو بند کمرے میں دیکھا تھا۔ اسے حاصل کرنا چاہتا تھا اور اسے حاصل کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی مگر ایسے وقت کھوپڑی الٹ گئی تھی وہ پارسا بن گیا تھا۔

اب وہ افسوس کر رہا تھا اگر حکمتِ عملی سے کام لیتا اسے شریکِ حیات اور رازدار بنا لیتا تو چوہدری احمد حسین کے خلاف تمام ثبوت بڑی محبت سے حاصل کر لیتا لیکن پولیس کی وردی' اختیارات اور رُعب ودبدبے نے سارا کام بگاڑ دیا تھا۔

اب تو حالات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ شمائلہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا۔ چوہدری احمد حسین کے سلسلے میں ناکام رہنے کے باعث اسے تبادلے میں میرپور خاص بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں بھی اتنی زیادہ حرام کی کمائی تھی کہ اونچی مسند پر بیٹھنے والے سرحدی علاقوں کے اندرونی معاملات کو نہیں سمجھتے تھے۔ چار روزہ دورے پر آنے والی ٹیم بھی بھارتی ایجنٹوں اور جاسوسوں کو وہاں پہچاننے اور پکڑنے میں ناکام ہو کر جانے والی تھی۔

چنگیزی چاہتا تھا' وہ ٹیم میرپور خاص کی پولیس اور انتظامیہ کے فرائض سے مطمئن ہو کر چلی جائے۔ عقل سمجھا رہی تھی کہ اب وہ شمائلہ کا بھی پیچھا چھوڑ دے۔ چوہدری کی سیاسی پارٹی نے نوکر شاہی کے دوسرے افسران کو شمائلہ کے پیچھے لگا دیا تھا۔ وہی لوگ اس سے نمٹنے والے تھے۔

اس نے اجل سے پوچھا "وہ چوہدری احمد حسین کے معاملے کا کیا بنا؟ بھئی تم نے اور شمائلہ نے مجھے اس معاملے میں زبردست دھوکا دیا تھا۔ تم دونوں کی وجہ سے مجھے اس چھوٹی سی جگہ میں لا کر پھینکا گیا ہے۔"

وہ ہنس کر بولا "کوئی جگہ چھوٹی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ قبر بھی نہیں جسے تنگ اور چھوٹا کہا جاتا ہے جبکہ وہ انسانی قد کے برابر ہوتی ہے۔ اس میں مُردہ تو کیا' زندہ بھی آسانی سے سو سکتا ہے اور یہاں تبادلہ کرانا تو تمہاری دیرینہ خواہش تھی۔"

چنگیزی نے مسکرا کر پوچھا "بکواس ہے اور تم نے قبر کی عجیب کہی بھلا زندہ شخص بھی قبر میں سو سکتا ہے؟"

"انسان عجیب مخلوق ہے۔ اس کی دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ کل رات جب ہم دورے پر سے واپس آ رہے تھے تو شمائلہ نے ایک زندہ شخص کو ایک قبر میں سوتے دیکھا تھا۔"

چنگیزی ایک دم سے پریشان ہو کر بولا "کک......... کیا کہہ رہے ہو؟ کل رات شمائلہ قبرستان نہیں گئی تھی پھر اس نے.........."

وہ بات کاٹ کر بولا "گھبراتے کیوں ہو؟ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ قبرستان گئی تھی۔ بات یہ ہے کہ جب واپسی پر ہماری گاڑی قبرستان کے قریب سے گزر رہی تھی' تب موڑ کاٹتے وقت ہیڈ لائٹس کی روشنی کئی قبروں سے گزر رہی تھی۔ اس دوران ایک قبر سے شمائلہ نے ایک شخص کو جھانکتے پھر فوراً ہی اس میں چھپتے ہوئے دیکھا تھا۔"

ایس پی شاکر چنگیزی گھور کر اجل کو دیکھ رہا تھا۔ اجل کہہ رہا تھا "ظاہر ہے اس قبر سے کسی مُردے نے جھانک کر نہیں دیکھا ہو گا۔ کوئی بھارتی جاسوس سو رہا ہو گا۔ ہماری گاڑیوں کی آواز سے اس کی نیند میں خلل پڑا ہو گا۔"

چنگیزی نے ہنستے ہوئے کہا "بھارتی جاسوس اور قبر میں؟ نہیں' یہ شمائلہ کا محض وہم ہے۔"

"وہم کو دور کرنا چاہیے۔ اس لیے شمائلہ ابھی ہماری ٹیم کے ساتھ نہیں آئی ہے۔ وہ اس وقت قبرستان میں ہو گی۔"

وہ ذرا پریشان ہوا اور پریشانی کو چھپانے کے لیے ہنستے ہوئے بولا "شمائلہ کے ساتھ تمہارا دماغ بھی چل گیا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ قبر میں کوئی جاسوس چھپا ہوا تھا تو کل رات کا چھپا ہوا جاسوس کیا ابھی دن کے وقت بھی وہاں ہو گا کہ شمائلہ آئے گی اور اس کا انٹرویو لے گی؟"

"میں نہیں جانتا کہ اس قبرستان میں وہ کسی کا انٹرویو لے گی یا نہیں لیکن وہ کالم لکھنے کے لیے کچھ سنسنی خیز مواد ضرور حاصل کر لے گی۔"

چنگیزی خاموش رہا۔ اسے اطمینان تھا کہ رات گزرنے کے بعد شمائلہ وہاں سے کوئی مقصد حاصل نہیں کر سکے گی۔

اجل بھی خاموش رہا۔ موت اور قبر وغیرہ کا شعبہ اس کا اپنا تھا۔ شمائلہ اگر اسے یہ نہ بھی بتاتی کہ اس نے کسی قبر سے کسی کو سر اٹھاتے پھر چھپتے دیکھا ہے' تب بھی اجل بہت کچھ جانتا تھا۔ وہاں ایسی کئی پرانی شکستہ قبریں تھیں' جنہیں ایک پتھارے دار کی نگرانی میں اندر سے صاف ستھرا رکھا جاتا تھا۔ کبھی پاکستانی فوج کے جوان ان علاقوں سے گزرتے اور بھارتی ایجنٹوں کو تلاش کرتے تو وہ ایجنٹ چھپنے کے لیے ان قبروں میں چلے جاتے تھے۔

پچھلی رات جب پوری ٹیم کے افراد سو رہے تھے۔ تب اجل اسی قبرستان میں گیا تھا۔ اس ٹیم کی آمد سے متعلق اتنی خبریں شائع کی گئی تھیں کہ کئی جاسوس عارضی طور پر بھارت واپس چلے گئے تھے۔ صرف تین رہ گئے تھے۔ وہ جس مشن پر آئے تھے' اسے ہر حال میں پورا کر کے جانا چاہتے تھے۔ اس لیے وہاں تین قبروں میں جا کر چھپ گئے تھے۔

اجل نے پہلی قبر کے پاس آکر دیکھا۔ وہ کسی حد تک دھنسی ہوئی تھی لیکن وہ خود بخود نہیں دھنسی تھی۔ اسے مصنوعی طور پر شکستہ بنایا گیا تھا۔ یعنی اسے ڈھکن کی طرح کھولا جاسکتا تھا۔ پھر اندر جاکر اسے اوپر سے بند کیا جاسکتا تھا۔

اجل نے قبر سے مٹی نما ڈھکن پر دستک دی پھر کہا”جگ پال! اعمال کے حساب کا وقت آیا ہے۔ زندہ ہو جاؤ۔“

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اجل نے پھر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی”کون ہو تم؟“

”میں ٹو ان ون ہوں۔ یعنی منکر بھی ہوں نکیر بھی۔ تم نے ”را“ کے ٹریننگ سینٹر میں مسلمان بن کر رہنے کی تربیت حاصل کی ہے تاکہ پاکستان میں کبھی ہندو کی حیثیت سے گرفت میں نہ آؤ لہٰذا تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہو گا کہ قبر میں جانے کے بعد سب سے پہلے منکر نکیر سے ملاقات ہوتی ہے۔“

”میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ مگر منکر نکیر مُردوں کے پاس آتے ہیں۔ میں زندہ ہوں۔ مجھ سے مذاق نہ کرو۔ ہمارے آدمی ہو تو کوڈ ورڈز ادا کرو۔“

اجل نے کہا”کوڈ ورڈز ہیں۔ ٹک ٹک ٹک ٹک.......... یعنی میں ایک ٹائم بم آن کر کے تمہارے اوپر اس شکستہ ڈھکن پر رکھ رہا ہوں۔ ابھی تمہیں اس بم کی ٹک ٹک سنائی دے گی۔ تم اندر سے ڈھکن نہیں کھولو گے تو یہ دھماکہ سے کھل جائے گا۔“

اندر سے سہمی ہوئی آواز سنائی دی”ٹھہرو۔ میں کھول رہا ہوں۔“

قبر کا وہ شکستہ حصہ ایک طرف سے اٹھنے لگا۔ قبر کھل گئی۔ اندر ایک آرام دہ بچھا تھا۔ جس پر ایک شخص لیٹا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس شراب کی ایک بوتل اور کھانے پینے کا کچھ سامان تھا۔ اس نے ہاتھوں میں ایک گن پکڑی ہوئی تھی‘ جس کا رخ اجل کی طرف تھا۔

اجل نے کہا”گولی چلاؤ گے تو دور تک آواز آجائے گی۔ دیکھو‘ میں خالی ہاتھ ہوں اور تنہا کھڑا ہوں۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑا ہو کر قبر کے باہر دیکھا تو واقعی وہاں دور تک اور کوئی نہیں تھا۔ وہی ایک تنہا اسے قبر سے اٹھانے آیا تھا۔ اس نے اجل کے سینے پر نال رکھتے ہوئے پوچھا”کون ہو تم؟ جلدی بولو۔ ورنہ مار ڈالوں گا۔“

ایسا کہتے ہی اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ یوں لگا جسم سے جان نکل رہی ہے۔ ہاتھوں سے گن چھوٹ گئی تھی۔ وہ پھر قبر کی گہرائی میں گر پڑا تھا اور مُردے کی طرح

چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اجل نے کہا”اس قبر میں لیٹے وقت تمہیں یقین تھا کہ نہ مرو گے‘ نہ دفنائے جاؤ گے کیونکہ ہندو ہو‘ جب بھی موت ہو گی تمہاری چتا جلائی جائے گی۔

کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہندو مرے تو چتا جلے اور مسلمان مرے تو قبر میں جائے۔ آدمی مرنے کے بعد وہ نہیں پاتا‘ جو زندگی میں چاہتا ہے۔ کبھی اس کی لاش کو گدھ نوچ لیتے ہیں‘ کبھی وہ دریا برد ہو جاتا ہے۔ اب دیکھ لو کہ تمہاری موت جہاں لکھی تھی‘ تم خود وہیں آکر لیٹ گئے ہو۔“

وہ خوف سے تھرتھراتے ہوئے بولا”نن.......... نہیں۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو۔ تم مجھے ہاتھ نہیں لگا رہے ہو۔ پھر بھی میری جان نکلی جا رہی ہے۔“

”کیا جان نکلنے سے پہلے یہ نہیں بتاؤ گے کہ اس ملک میں کیا کرنے آئے ہو؟“

”ہم سیاسی فائدہ اٹھانے آئے ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے لیاری کے بنگالی پاڑے میں جو زبردست بم کا دھماکہ ہوا تھا اور دو گروہوں کے درمیان زبردست فائرنگ ہوئی تھی‘ ان میں سے ایک گروہ ہمارا زر خرید تھا۔ ہم یہاں سرحد سے بنگالی عورتوں کو پار کراتے ہیں اور وہاں پہنچاتے ہیں۔ وہاں ان عورتوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ منشیات کی فروخت تو ادھر ایک معمولی سی بات ہو گئی ہے۔ ہم نے لیاری کی گنجان آبادی میں اسلحہ اس قدر پھیلا دیا ہے کہ پولیس اسے علاقہ غیر سمجھنے لگی ہے۔ کبھی وہاں چھاپے مارنے کی جرأت نہیں کرتی۔ صرف اخبارات کو خبریں فراہم کرنے کے لیے نورا کشتی کے طور پر چھوٹا دھندا کرنے والوں کو پکڑتی ہے۔ انہیں بڑے مجرم کے طور پر پیش کر کے تصویریں چھپواتی ہے پھر انہیں چھوڑ دیتی ہے۔“

اجل نے سوال کیا”ایسا کرنے سے تمہاری بھارتی حکومت کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟“

”ہم سندھ کی صوبائی حکومت کے مسائل میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ہم نے جن بااثر افراد کو لاکھوں کروڑوں روپے دے کر اسمبلیوں میں پہنچایا ہے‘ ان کے ذریعے پولیس اور انتظامیہ کو بے اثر بنا رہے ہیں اور کشمیر کا مسئلہ ہمارے نقطۂ نظر سے نہ سلجھا تو اسے مزید الجھانے کی تدبیر کر رہے ہیں۔ ہم.......... ہم..........“

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ آواز بند ہو گئی۔ سانس رک گئی اور دیدے پھیلے رہ گئے۔ وہ قبر میں آیا تھا۔ قبر کا ہو کر رہ گیا۔ اجل وہاں سے اٹھ کر ذرا دور چلتا ہوا دوسری قبر کے پاس آیا پھر کوئی دستک دیئے بغیر اندر پہنچ گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ اجل نے اسے ایک طمانچہ رسید کیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو اس کا سر قبر کے اوپری حصے سے ٹکرایا وہ پھر لیٹنے

کے انداز میں گر پڑا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر کسی دوسرے کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک قبر میں دو مُردے نہیں ہوتے۔ اس نے خوف سے کانپتے ہوئے پوچھا "کون ہو تم؟"

"عقل سے سوچو' قبر میں صرف موت ہوتی ہے۔ میں موت کا فرشتہ ہوں۔"

"نہیں۔ مم.......... میں یہاں مرنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے قبر کے اوپری حصے کو توڑتا ہوا اٹھا۔ اچھل کر باہر آگیا۔ پھر جیسے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگا۔ اجل نے اسے بھاگنے دیا کیونکہ اس رات اس کی موت نہیں تھی۔ وہ اس کی روح قبض نہیں کر سکتا تھا۔

قبرستان کے سناٹے میں یہ شور سن کر تیسرا جاسوس اپنی قبر سے نکل آیا تھا۔ اس نے اپنی طرف آنے والے اجل کو ریوالور کے نشانے پر رکھتے ہوئے پوچھا "کون ہو تم؟ وہیں رک جاؤ۔"

"تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں؟ ابھی تمہاری زندگی کی سانسیں باقی ہیں لیکن جب موت نہیں آتی تو شامت آتی ہے۔ یہ شامت میری ایک عزیزہ ہے۔ چند نمونے پیش کر کے بندوں کو سمجھاتی ہے کہ میں ایسی ہوں تو پھر موت کیسی ہوگی؟"

تیسرے نے گولی چلائی لیکن اجل کو نہیں لگی۔ نشانہ چُوک گیا۔ اجل نے کہا "تم نے فائر کر کے اپنی حماقت سے اپنی شامت کو بلایا ہے۔ ذرا سنو' کچھ آوازیں آرہی ہیں۔"

قبرستان کے باہر ایک گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کوئی حکم دے رہا تھا۔ "سپاہی جان محمد! یہ گولی چلنے کی آواز قبرستان سے آئی ہے۔ فوراً ادھر چلو۔"

گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ تیسرے جاسوس کو غلطی کا احساس ہوا۔ وہ قبر سے نکل کر بھاگنے لگا۔ اس کی شامت نے اسے آنے والی گاڑی کی طرف کو بھگایا۔ جب اُدھر سے سپاہیوں نے للکارا اور ایک گولی چلائی تو وہ راستہ بدل کر جوابی فائرنگ کرتا ہوا رات کے اندھیرے میں گم ہوتا چلا گیا۔ گاڑی بھی اسی سمت چلی گئی تھی۔

اجل ریسٹ ہاؤس میں واپس آگیا۔ اس نے صبح شمائلہ کو پچھلی رات کے واقعات سنائے پھر کہا "تم آج ٹیم کے ساتھ تھر کے علاقے میں نہ جاؤ۔ قبرستان جا کر ان تین قبروں کی تصویریں اتارو اور ثبوت کے طور پر زیادہ سے زیادہ مواد حاصل کرو۔"

شمائلہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ تھر جانے والی ٹیم نے پوری طرح دورہ نہیں کیا۔ شام سے پہلے ہی واپس آگئی۔ دراصل چنگیزی اس فکر میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں شمائلہ قبرستان جا کر نہ معلوم کیا کر رہی ہوگی۔ اسے امید تو نہیں تھی کہ

وہ وہاں چھپے ہوئے جاسوسوں تک پہنچ پائے گی۔ کیونکہ وہ رات قبرستان میں گزارنے کے بعد صبح منہ اندھیرے اٹھ کر چلے جانے والے تھے۔

چنگیزی کی ٹیم کو ریسٹ ہاؤس اور دوسرے گیسٹ ہاؤس وغیرہ میں پہنچانے کے بعد سب سے پہلے ایک پتھارے دار غوث بخش سے ملاقات کی۔ وہ گھبرایا ہوا تھا چنگیزی سے کہنے لگا "جناب عالی! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ایک جاسوس قبر میں مُردہ پڑا ہے۔ باقی دو لاپتا ہیں۔ ان کی قبریں خالی ہیں۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا وہ صحافی خاتون قبرستان کی طرف گئی تھی؟"

"میں نے اور میرے آدمیوں نے وہاں کسی خاتون کو نہیں دیکھا لیکن اسٹل فوٹو گرافی فلم کا ایک چھوٹا سا ڈبا ایک قبر کے کنارے پایا گیا ہے۔ یہ دیکھئے۔"

اس نے جیب سے ایک چھوٹے سے فلم رول کا ڈبا نکال کر دکھایا۔ چنگیزی نے اسے دیکھا پھر کہا "وہ ضرور وہاں گئی تھی اس نے ایک قبر میں مُردہ جاسوس کی اور دوسری دو خالی قبروں کی تصویریں لی ہوں گی۔ مجھے بتاؤ' ان قبروں میں اور کیا کچھ تھا؟"

"جناب! آپ تو جانتے ہیں' وہ شراب پیتے ہیں۔ ان کے پاس بھارتی برانڈ کی شراب کی بوتلیں تھیں۔ ہتھیار بھی تھے۔ بھارتی برانڈ کی سگریٹ کے پیکٹ تھے۔ اور.......... اور وہ کاغذات تھے' جن کے ذریعے ہم انہیں بھارتی جاسوس کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ ایسے اہم کاغذات وہ میرے پاس چھوڑ کر جاتے ہیں تاکہ کسی وجہ سے ان کی موت ہو جائے تو ہم سرحد پار بھارتی متعلقہ افسران کو ان کی موت یا گمشدگی کی اطلاع دے سکیں۔"

"وہ اہم کاغذات کہاں ہیں؟"

"وہ تینوں اپنے ساتھ قبر میں لے گئے تھے۔ اس ٹیم کی آمد سے مجھے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے وہ کاغذات اپنے پاس نہیں رکھے۔ وہ قبروں میں ہی زیادہ محفوظ رہ سکتے تھے۔"

"کیا وہ کاغذات ان قبروں میں تھے؟"

"نہیں۔ وہ جاسوس وہاں سے جاتے وقت اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔"

"لیکن تیسرا جاسوس تو مُردہ تھا۔ اس کے کاغذات کہاں ہیں؟"

پتھارے دار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "جناب! کیا عرض کروں۔ آپ کا شبہ درست ہے' وہ صحافی خاتون ادھر گئی ہوگی۔ وہ کاغذات اپنے ساتھ لے گئی ہوگی۔"

وہ گرج کر بولا "اس کا مطلب سمجھتے ہو؟ صرف میری ملازمت ہی نہیں جائے گی

بلکہ ہم سب بھارتی ایجنٹ بننے کے جرم میں جیل جائیں گے۔ وہ صحافی خاتون بہت ٹیڑھی اور ناقابلِ خرید ہے۔ میں اسے لاہور سے دیکھتا اور سمجھتا آیا ہوں۔"

"جنابِ عالی! آپ حکم کریں تو ہم اسے اٹھوالیں۔"

"گدھے ہو' گھاس کھا گئے ہو۔ وہ بڑے افسران اور سرکاری عہدے داران کی ٹیم کے ساتھ آئی ہے۔ اسے اٹھوانے کے نتیجے میں ہم دنیا سے اٹھ جائیں گے۔"

وہ غصے سے ٹہلتے ہوئے بولا "وہ ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں رہتی ہے۔ دوسرے میں اجل نواز ہے۔ باقی دو کمروں میں ہمارے اعلیٰ افسران ہیں۔ شمائلہ قبرستان سے جو کچھ لے گئی ہے' وہ سب کچھ اس کے سامان میں ہو گا لیکن ہم وہاں سے ایسی اہم چیزیں چوری نہیں کرا سکیں گے۔"

پھر وہ ایک جگہ رک کر بولا "کیا خاک چوری کرائیں گے؟ ہو سکتا ہے' وہ ابھی تمام ثبوت پوری ٹیم کو دکھا رہی ہو۔ میں تو کل سے پوری ٹیم کے ساتھ ہوں۔ ان الزامات سے بچنے کی کوشش کروں گا۔ میری الماری میں جتنی ہندوستانی کرنسی ہے۔ ابھی لے جا کر کہیں چھپا دوں گا۔ تم کچھ دنوں کے لیے کہیں چلے جاؤ' چھپ جاؤ۔"

چنگیزی اپنی جیپ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اپنی رہائش گاہ میں آیا۔ وہاں دروازے پر ایک ہی سپاہی کھڑا تھا۔ کیونکہ تمام سپاہی ٹیم والوں کی میزبانی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اس نے اپنے کمرے میں آکر الماری کھولی۔ اس میں سے ایک چھوٹی سی اٹیچی نکالی پھر الماری کا سیف کھول کر اس میں سے ہندوستانی نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اٹیچی میں رکھنے لگا۔

اسی وقت فلیش لائٹ کی چمک سی ہوئی۔ جیسے بجلی چمک کر گزر گئی ہو۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ دروازے اور کھڑکی کی طرف دیکھ کر گرجتے ہوئے پوچھا "کون ہے؟"

اس نے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ وہ بھاگنے والا اجل تھا۔ اس نے وہاں سے جاتے ہوئے ایک چھوٹا سا زنانہ رومال جان بوجھ کر گرا دیا۔ اس رومال کے کونے پر شمائلہ کا نام کڑھا ہوا تھا۔ ظاہر ہے' وہ رومال چنگیزی کو ملے گا اور اس یقین کا سبب بنے گا کہ شمائلہ فلیش کیمرے کے ساتھ آئی تھی اور ہندوستانی نوٹوں کو چھپاتے وقت ایک ذمے دار ایس پی کی تصویر اتار کر لے گئی ہے۔ اجل ایسا کیوں کر رہا تھا؟

اس لیے کہ یہ مقدر کا تقاضا تھا۔ زندگی جن مرحلوں سے گزر کر موت کی آغوش میں آتی ہے' وہ مرحلے پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں' یہ راز کاتبِ تقدیر جانتا ہے۔ اجل کی ڈیوٹی تھی کہ چنگیزی اور شمائلہ کو ایسے کتنے مراحل سے گزار کر انہیں ایک مخصوص

مرحلے پر پہنچانا ہے جہاں موت آخری فیصلہ کرے گی کہ ان میں سے کس کی روح قبض کی جائے؟

ان میں ایک شکاری تھا اور ایک شکار۔ اس کھیل میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ شکاری اپنے شکار کو دبوچ لے گا یا شکار پلٹ کر شکاری کی خوش فہمی خاک میں ملا دے گا۔ شکار کا حتمی نتیجہ پہلے سے کوئی نہیں جانتا۔

اجل کو معلوم تھا اسی لیے اس نے پچھلی رات خود تین قبروں سے کچھ حاصل نہیں کیا تھا۔ تمام ثبوت حاصل کرنے کے لیے شمائلہ کے وہاں جانے کی راہ ہموار کی تھی۔

ان حالات میں چنگیزی پورے یقین کے ساتھ الجھ رہا تھا' چونکہ اس نے شمائلہ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اس لیے وہ انتقاماً اسے تباہ و برباد کرنے اور مٹی میں ملانے کے لیے اس کے خلاف اہم مواد جمع کر رہی ہے۔ یہ اندیشہ تھا کہ وہ اب تک جو کچھ حاصل کر چکی ہے' اسے بھی اس کے اعلیٰ افسران کے سامنے پیش کر رہی ہو گی یا شاید رات کے کھانے کے دوران جب وہ خود وہاں موجود ہو گا تو سب کے سامنے اس کا پول کھولے گی۔

تھانے دار ٹیم کی خدمت کرنے کے لیے سپاہیوں کے ساتھ وہاں موجود رہتا تھا۔ چنگیزی نے فون کے ذریعے تھانے دار کو مخاطب کیا۔ اسے مختصر طور پر ان تینوں جاسوسوں کے متعلق بتایا پھر اس سے پوچھا "کیا اس ٹیم کے افراد جاسوسوں کے متعلق باتیں کر رہے ہیں؟"

اس نے کہا "نہیں جناب! یہاں سب اپنے آپ میں مست ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہ لوگ قبرستان والے واقعے سے بالکل بے خبر ہیں اور یہاں ہماری کارکردگی سے خوش ہیں۔"

"مجھے یہ بتاؤ کہ وہ صحافی شمائلہ کہاں ہے؟"

"شاید اپنے کمرے میں ہے۔"

"شاید نہیں' پورے یقین سے معلوم کر کے بتاؤ۔ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟ میں فون رکھ رہا ہوں۔ تم اس کے کمرے میں جا کر دیکھو۔ ریسٹ ہاؤس کے پیچھے بھی دیکھ آؤ۔"

"ایک منٹ جناب! فون بند نہ کیجئے۔ ابھی ایک آٹو رکشا ریسٹ ہاؤس کے سامنے آکر رکا ہے۔ وہ صحافی لڑکی اس میں سے اتر کر کرایہ ادا کر رہی ہے۔"

"کیا اس کے پاس کیمرا ہے؟"

"نظر تو نہیں آ رہا ہے۔ اس کے شانے سے ایک بڑا بیگ لٹکا ہوا ہے۔ شاید اسی میں

کیمرا ہو۔"

"وہ دوسرا صحافی اجل نواز کہاں ہے؟"

"یہیں کہیں ہو گا' آپ حکم دیں تو اس پر نظر رکھوں؟"

"سپاہی یار محمد ہوشیار بندہ ہے۔ اسے کہو اجل کی نگرانی کرتا رہے۔ تم شائلہ سے کہو' میرا فون ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں پہنچ کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ تھانے دار نے اسے مخاطب کیا "میڈم! آپ کا فون ہے۔ ایس پی صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ دوسرے کمرے میں ٹیلی فون کے پاس آئی پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے بولی "ہیلو' میں شائلہ بول رہی ہوں۔"

وہ بولا "شائلہ! بہت عرصے بعد کل تمہیں یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن تم نے کل ٹال دیا۔ پلیز' آج اور ابھی تھوڑا سا وقت مجھے دو۔ میں بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی تو میں آرام کروں گی۔ بہت تھک گئی ہوں۔ اجل نے تمہیں بتایا ہو گا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر نے مجھے آرام کرنے کو کہا ہے۔"

"بے شک تم اپنے کمرے میں آرام کرو۔ میں وہاں آجاؤں گا۔ پھر چند باتیں کر کے چلا جاؤں گا۔ یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم ایک اچھی ازدواجی زندگی گزار رہی ہو اور اب ماں بننے والی ہو۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھا۔ کھڑکی کے باہر شائلہ کا جو رومال ملا تھا' اس کو اٹھا کر اس نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب اس کمرے میں جا کر تنہائی میں اس سے کچھ سمجھوتے کرنا چاہتا تھا۔ اسی وقت اس کا ایک اعلیٰ افسر آگیا۔ اس نے سیلوٹ کر کے کہا "سر! آپ نے یہاں آنے کی زحمت کی۔ مجھے حکم دیتے' میں حاضر ہو جاتا۔"

افسر نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بیٹھو۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ یہاں کے بڑے بڑے لوگ تمہاری تعریفیں کر رہے ہیں۔ شہر میں آس پاس کے علاقوں میں جرائم بہت کم ہو گئے ہیں۔ یہ اخبار والے خواہ مخواہ شور مچاتے ہیں۔ پچھلے دنوں جو بھارتی جاسوس پکڑے گئے تھے ان میں سے ایک نے بیان دیا تھا کہ وہ اس راستے سے پاکستان آیا تھا۔ بس اس بات پر کراچی سے اسلام آباد تک شور برپا ہے۔"

"سر! میرا نام چنگیزی ہے۔ میں باز کی نظر رکھتا ہوں۔ جب تک میں یہاں ہوں' کوئی جاسوس ادھر سے گزر نہیں سکے گا۔ آپ چار روزہ دورے پر آئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں

آپ ہر دوسرے تیسرے دن آتے رہیں۔ آپ کو یقین ہو جائے گا کہ ہم پولیس والے یہاں دن رات کس طرح محتاط رہتے ہیں۔"

"میں نے دو روز میں ہی اندازہ کر لیا ہے۔ یہاں سے واپس جا کر تمہارے حق میں بہترین رپورٹ لکھوں گا۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ اس علاقے میں ہم آ ہی گئے ہیں تو کیوں نہ باقی دو دن شکار میں گزارے جائیں۔ بہت عرصے سے ہرن کا گوشت نہیں کھایا۔"

"سر! یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں انتظام کرتا ہوں۔ کل پوری ٹیم اس علاقے میں جائے گی جہاں ہرن اور تیتر وغیرہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آپ لوگوں کے ساتھ گائیڈ اور ہانکا لگانے والے بندے بھی ہوں گے۔"

اپنے بڑے صاحب سے باتیں کرنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ شائلہ سے ملاقات کرنے نہ جا سکا۔ ویسے بڑے صاحب کی گفتگو سے یقین ہو گیا کہ انہیں اور پوری ٹیم کو اب تک کسی بھارتی جاسوس کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں ہوئی ہے۔ شائلہ کی اپنی کوئی مصلحت ہے کہ وہ اس راز کو ابھی راز رکھ رہی ہے اور شاید واپس جا کر اخبارات کے ذریعے دھماکے کرنے والی ہے۔

وہ ریسٹ ہاؤس میں آیا۔ پتا چلا کہ شائلہ رات کا کھانا کھا کر سو گئی ہے۔ اس نے تھانے دار سے کہا "کل صبح ہی مجھے پوری ٹیم کے ساتھ شکار پر جانا ہو گا۔ شائلہ کا کچھ کرو۔ ورنہ ہم سب بے موت مریں گے۔"

"جناب! کل وہ یہاں تنہا رہے گی۔ شکار پر نہیں جائے گی۔ میں شاپنگ کے بہانے اسے بازار لے جاؤں گا۔ ہمارے بندے یہاں اس کے سامان کی تلاشی لے کر سارے ثبوت غائب کر دیں گے۔"

"پہلے یہی کوشش کرو کہ شائلہ سے اس معاملے میں الجھنا نہ پڑے۔ خاموشی سے کام ہو جائے۔ اگر ناکامی ہو تو اسے اس کے سارے سامان کے ساتھ غائب کر دو۔ کسی کو اس کی لاش کا بھی پتا نہ چلے۔"

وہ پھر اپنی رہائش گاہ میں واپس آیا۔ چند برس پہلے ایک سیاست داں مصطفیٰ بشر نے سیاست میں ناکام ہونے کے بعد بھارت سے ساز باز کی تھی۔ ان کے ایجنٹوں کو پاکستان کے مختلف شہروں میں پناہ دینے اور ضروری سہولتیں فراہم کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔ ہر سیاست داں کی پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ حکمران پارٹی سے اپنی طاقت منوائے' خواہ وہ تخریب کاری کے ذریعے ہی کیوں نہ منوائے اور یوں حکومت میں اپنے لیے کوئی جگہ' کوئی منصب حاصل کرے۔

پاکستان میں ایسے بشر بھی ہیں جیسے مصطفیٰ بشر تھا۔ ملک میں مارشل لا کے دوران بھاگ گیا تھا۔ جب فوج گئی اور جمہوریت آئی تو وہ بھی آگیا۔ اب لاہور میں شطرنج کھیل رہا تھا۔ شاکر چنگیزی نے فون پر اس سے رابطہ کیا۔ پھر اسے اپنے علاقے کے مختصر حالات سنا کر کہا "ہم نے پوری ٹیم کو سنبھال لیا ہے۔ کل سے دو دنوں تک ٹیم کے تمام افراد کو شکار میں مصروف رکھ کر کراچی واپس بھیج دیں گے مگر اجل نواز اور شائلہ نامی دو صحافی مصیبت بن گئے ہیں۔ یہ صرف ہمارے ہی نہیں آپ کے خلاف بھی یہاں سے بہت سے ثبوت لے جائیں گے۔"

بشر نے پوچھا "اس ٹیم میں کتنے صحافی ہیں؟"

"پانچ ہیں جن میں سے تین ہمارے قابو میں ہیں۔ صرف وہی دو ایسے ہیں' جن کے خلاف کوئی بڑا قدم اٹھانے سے پہلے ہر پہلو پر نظر رکھنا ہو گا۔ پلیز' آپ کچھ کریں۔"

دوسری طرف سے جواب ملا "اچھی بات ہے۔ میں صبح تک کچھ کروں گا۔"

چنگیزی رات کے دو بجے تک مصروف رہا پھر سو گیا۔ سوتے وقت اس نے وردی نہیں اتاری بس یونہی ایزی چیئر پر بیٹھے بیٹھے نیند آگئی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے چونکایا تو صبح ہو رہی تھی۔ دوسری طرف سے مصطفیٰ بشر نے کہا "میں اسی نتیجے پر پہنچ رہا ہوں کہ ان دونوں صحافیوں کو ان کے تمام سامان کے ساتھ غائب کر دیا جائے۔ تھانے دار غوث بخش سے کہو' ان کا انتظام کرے۔ اس سلسلے میں اخبارات کچھ شور مچائیں گے لیکن ہم محفوظ رہیں گے۔"

تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد رابطہ ختم ہو گیا۔ صبح چھ بجے وہ پوری ٹیم شکار کے لیے روانہ ہو گئی۔ اجل بھی ان کے ساتھ تھا۔ شائلہ ریسٹ ہاؤس میں تنہا رہ گئی۔

یہ دشمنوں کے لیے اچھا موقع تھا۔ چنگیزی کو امید تھی کہ بات زیادہ نہیں بڑھے گی۔ تھانے دار کسی طرح بھی اس کے سامان سے تمام ثبوت نکال لے جائے گا۔ اس نے شکار کھیلنے کے دوران اجل سے کہا "شائلہ ماں بننے والی ہے۔ اسے ایسی حالت میں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"ہو سکتا ہے' وہ خود نہ آئی ہو' اسے اس کی شامت لائی ہو یا اس کے ذریعے کسی کی شامت آئی ہو۔"

"تم بڑی معنی خیز باتیں کر رہے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ کل وہ دن کے وقت قبرستان گئی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں تمہیں کچھ بتایا ہو گا۔"

"ہاں' کہہ رہی تھی کہ آج کل مُردے قبر کے اندر بستر بچھا کر سوتے ہیں۔ اس نے

یک قبر میں ایسا مُردہ دیکھا تھا۔"

"کیوں مذاق کر رہے ہو۔ ایسی کوئی بات ہو گی تو پہلے ہم پولیس والوں کو معلوم ہو گا۔"

"مجھے بھی اس کی باتیں مذاق لگ رہی ہیں۔ کہہ رہی تھی کہ اس نے دو اور کھلی یں دیکھیں جہاں بستر تو بچھے ہوئے تھے مگر مُردے نہیں تھے۔ میرا خیال ہے' وہ بکواس ر رہی ہے۔"

"ہاں' ہے تو یہ بکواس۔ مگر وہ اور کیا کہہ رہی تھی؟ یعنی اس نے اور کیا دیکھا؟ وہاں تصویریں تو لی ہوں گی؟"

"مسٹر چنگیزی! جب ہم سمجھ رہے ہیں کہ یہ سب بکواس ہے تو اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہیے۔"

چنگیزی نے دل میں سوچا۔ ہاں' اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہیے۔ تھانے دار یسٹ ہاؤس میں اس سے نمٹ لے گا۔ اسے تاکید کی گئی تھی کہ شائلہ کے سامان سے ملے تو دوسرے کمرے میں اجل کے سامان کی بھی تلاشی لی جائے۔ پہلی بار ٹرین سفر کرنے کے دوران اجل نے اپنے سامان کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ لاہور سے اچی پہنچنے سے پہلے ہی کہیں گم ہو گیا تھا۔ اس بار اس کا سامان ریسٹ ہاؤس کے ایک ے میں رکھا ہوا تھا۔

وہ رات کے آٹھ بجے شکار سے واپس آئے۔ چنگیزی نے سب سے پہلے تھانے دار تنہائی میں ملاقات کی' اس نے کہا "جناب! کچھ کام ہوا اور نہیں بھی ہوا۔ ہم سمجھ رہے کہ وہ ریسٹ ہاؤس میں اکیلی رہے گی لیکن آپ لوگوں کے جاتے ہی اس کا شوہر حبیب لی اچانک کراچی سے یہاں آپہنچا ہے۔ میں دوپہر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ شہر نے نکلیں گے۔ پھر میں نے کہا کہ ان کے لیے ایک گاڑی کا بندوبست کر رہا ہوں لیکن وہ ابھی تک ریسٹ ہاؤس میں گھسے ہوئے ہیں۔"

چنگیزی نے غصے سے ہنستے ہوئے کہا "تم سب گدھے ہو۔ صاف کہہ دو کہ کام نہیں ہوا۔"

"میں نے کچھ کام کیا ہے جناب عالی! یہاں پوسٹ آفس میں اپنے دو آدمیوں سے یا تھا کہ مہمان ٹیم کی کوئی بھی ڈاک کراچی جائے تو پہلے اسے چیک کیا جائے۔ میرے امنے ایک بڑے لفافے کو چیک کیا۔ اس میں یہاں کے ایک قبرستان کی اور ایک ے کی تصویر ہے اور کچھ دستاویزات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بھی ہیں۔"

تھانے دار نے وہ بڑا سا لفافہ پیش کیا۔ چنگیزی نے اس میں سے تصویریں اور دستاویزات نکال کر دیکھیں۔ دیکھتے ہی دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ لفافے میں بھیجنے والی کا نام شمائلہ پروین تھا اور اس نے وہ لفافہ اپنے شوہر حبیب ہمدانی یعنی ہفت روزہ ۔ کے مالک کے نام ارسال کیا تھا۔

اگر شمائلہ کو معلوم ہوتا کہ حبیب ہمدانی اچانک اس سے ملنے آئے گا تو شاید وہ لفافہ پوسٹ نہ کرتی۔ شاکر چنگیزی نے تصاویر اور دستاویزات کو میز پر پھینکتے ہوئے کہا "یہ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ہیں اور ان تصویروں کے نیگیٹو بھی نہیں ہیں۔ تمام اصل چیزیں اب بھی شمائلہ کے پاس رکھی ہوئی ہیں۔"

"جنابِ عالی! یہ ثبوت مل گئے ہیں کہ ہمارے خلاف خاموشی سے کارروائی ہو رہی ہے اور یہ سب کچھ شمائلہ کر رہی ہے۔ آپ مجھے آج کی رات اور دیں۔ میں صبح سے پہلے اس کمینی کو تمام ثبوت کے ساتھ غائب کر دوں گا۔"

"تمہارے اس طرح دعوے کرنے سے مجھے اطمینان نہیں ہو گا۔ وہ تقریباً ایک برس سے میرے لیے عذابِ جان بنی ہوئی ہے۔ میں نے اسے ہلاک کر ڈالا تھا۔ پتا نہیں سور کی بچی کیسے بچ گئی۔ وہ مجھ سے بہت برا انتقام لے گی۔ تم کچھ نہیں کر سکو گے...... کچھ نہیں کر سکو گے۔ پھر آج رات وہ تنہا بھی نہیں رہے گی۔ اپنے شوہر کے ساتھ ہو گی۔ ہم میں سے کوئی بھی ریسٹ ہاؤس میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

وہ غصے سے ٹہلنے لگا اور کہنے لگا "کل اس ٹیم کے دورے کا آخری دن ہے۔ وہ سب کل رات یا پرسوں صبح یہاں سے چلے جائیں گے۔ شمائلہ بھی ان کے ساتھ جائے گی۔ جو کچھ ہمیں کرنا ہے' وہ آج رات یا کل شام تک کر گزرنا ہے۔"

ایسے وقت میں پٹھارے دار غوث بخش اپنے آدمیوں کے ساتھ آیا۔ اس نے کہا "حضور! جب سے ہم نے وہ لفافہ دیکھا ہے' ہماری کھوپڑی گھوم گئی ہے۔ آپ بس ایک کام کریں۔ ریسٹ ہاؤس سے مسلح سپاہیوں کو آدھی رات کے بعد ہٹا دیں۔ باقی ہم پر چھوڑ دیں۔"

"آخر کیا کرنا چاہتے ہو؟ پہلے مجھے پلاننگ بتاؤ۔"

"حضور! آخری راستہ یہی ہے کہ ڈاکوؤں کا مسلح گروہ ریسٹ ہاؤس پر حملہ کرے۔ مہمان ٹیم کے جس افسر کو بچنا ہو گا' بچے گا۔ ورنہ مرے گا۔ اس اخبار والی کو تو ہم کمرے سے نکلنے نہیں دیں گے۔ ایسی آگ لگائیں گے کہ وہ تمام ثبوت کے ساتھ جل مرے گی۔"

وہ سوچنے لگا' ٹہلنے لگا پھر بولا "آخری راستہ یہی ہے لیکن میں پہلے ریسٹ ہاؤس سے ہو آؤں گا۔ وہاں شمائلہ اور اس کے شوہر سے بھی ملاقات کروں گا۔ پوری طرح حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہم رات کے ایک بجے یہاں ملاقات کریں گے۔ پھر آخری منصوبے پر عمل کریں گے۔"

پٹھارے دار چلا گیا۔ چنگیزی نے تھانے دار سے کہا "میں نے کل سے یہ وردی نہیں اتاری ہے۔ یہ میلی اور شکن آلود ہو گئی ہے۔ میں ابھی غسل کر کے ریسٹ ہاؤس جاؤں گا۔"

تھانے دار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "جنابِ عالی! آپ سے التجا ہے کہ وردی نہ اتاریں۔ وردی پہن کر غسل کریں۔"

وہ ڈانٹ کر بولا "کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا میں پاگل ہوں کہ وردی پہن کر غسل کروں گا۔"

"آپ کا یہ خادم پاگل ہے مگر یہ میری ایک بات مان لیں۔ غسل کرتے ہی وردی پہن لیں۔"

"جب سے یہ ٹیم آئی ہے۔ میں نے اس کے افسران سے پاکستانی لباس میں ملاقات نہیں کی ہے۔ اردلی سے کہو' میرے لیے شلوار قمیص نکالے۔"

یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک سپاہی نے پوچھا "سر! آپ پاکستانی لباس پر اعتراض کیوں کر رہے ہیں؟"

اس نے کہا "تم نہیں سمجھو گے۔ قومی لباس پہن کر پتا نہیں کتنے پاکستانیوں کا ضمیر جاگتا ہو گا۔ ہمارے یہ بڑے صاحب ایسے پکے مسلمان اور سچے پاکستانی بن جاتے ہیں کہ ہم سب کے لیے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ اخبار والی کو ٹھکانے لگانے سے پہلے قومی لباس پہن لے گا تو پھر ایمان کی سلامتی کے لیے ہم سب کے خلاف سلطانی گواہ بن جائے گا۔ وہ قبریں ہم نے دوسروں کے لیے کھود رکھی ہیں' ان میں ہم ہی جائیں گے۔"

تھانے دار نے سپاہی کو باہر جانے کا حکم دیا۔ پھر چنگیزی کی الماری سے دوسری وردی نکال کر باتھ روم کے بند دروازے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد چنگیزی نے اسے آواز دی۔ "میرے کپڑے لاؤ۔"

"جنابِ عالی! دروازے پر حاضر ہیں۔"

اندر سے تھوڑا سا دروازہ کھلا۔ چنگیزی کا ایک ہاتھ باہر آیا' پھر کپڑے لے کر اندر چلا گیا۔ پھر کڑک دار آواز سنائی دی۔ "یو نان سنس۔ بلڈی فول! وردی نہیں' دوسرا لباس

دو۔"

"رحم جنابِ عالی! آپ کل شام تک وردی میں رہیں۔ ہماری آئندہ نسلوں پر احسان ہو گا۔"

"بکواس مت کرو۔ میرا لباس لاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

تھانے دار نے ریوالور اٹھایا پھر وہ باتھ روم کے دروازے کے اندر کرتے ہوئے بولا "یہ حاضر ہے جنابِ عالی! آپ گولی مار دیں۔ مجھے لائن حاضر کر دیں۔ باہر آ کر جوتے ماریں مگر میں آپ کو قومی لباس نہیں پہننے دوں گا۔"

باتھ روم میں خاموشی رہی۔ تھانے دار بھاگتا ہوا باہر احاطے میں آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ الماری کی چابیاں بھی لے آیا تھا تاکہ صاحب باتھ روم سے نکل کر وردی اتار کر دوسرا لباس نہ پہن سکے۔

پھر یہی ہوا۔ وہ ایس پی شاکر چنگیزی کی وردی میں شان و شوکت سے چلتا ہوا آیا۔ ہمیشہ کی طرح کڑک افسر لگ رہا تھا۔ وہ جیپ میں آ کر بیٹھ گیا۔ تھانے دار کی جان میں جان آئی۔ ڈرائیور نے جیپ آگے بڑھا دی۔ چنگیزی نے تھانے دار سے پوچھا "کیا تم نے شائلہ کے شوہر حبیب ہمدانی سے ملاقات کی تھی؟"

"جی جنابِ عالی! آج سے پہلے بھی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ وہ بھی ایک مشہور اخبار کا ایڈیٹر رہ چکا ہے۔ اب اپنا سیاسی ہفت روزہ شائع کر رہا ہے۔ یہ حبیب ہمدانی ان صحافیوں میں سے ہے جو سچ لکھنے کے جرم میں کئی بار جیل جا چکے ہیں۔"

"یعنی شائلہ کی طرح وہ بھی پتھر کا ہے۔ ٹوٹ جائے گا مگر بت نہیں بنے گا۔ تراشا نہیں جائے گا۔"

"جی جنابِ عالی! اور ان کے ساتھ وہ جو صحافی اجمل نواز ہے' وہ بھی کچھ عجیب سا بندہ ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے' وہ شائلہ سے سرگوشی کرتا رہتا ہے۔"

"ہاں وہ اجمل پچھلی بار بھی شائلہ کو میرے خلاف بہکاتا رہا تھا۔ اس بار اس سے بھی نمٹ لوں گا۔"

وہ ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں ہرن اور تیتر آگ پر بھونے جا رہے تھے۔ بڑے صاحب لوگ مے نوشی میں مصروف تھے۔ بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے درمیان شائلہ' اجمل نواز اور حبیب ہمدانی بھی موجود تھے۔ چنگیزی سے ہمدانی کا تعارف کرایا گیا۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ ان دشمنوں سے بات نہیں بنے گی۔ وہ تینوں جھکنے والے نہیں ہیں۔ ان سے کوئی سمجھوتا' کوئی سودا نہیں ہو گا لیکن وہاں پہنچتے ہی بات کچھ بننے لگی۔

شائلہ نے کہا "چنگیزی صاحب! آپ کے ساتھ فرصت میں بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ سوچ رہی تھی شاید کل موقع مل جائے مگر افسوس' میں صبح چھ بجے کراچی واپس جا رہی ہوں۔"

چنگیزی نے ہمدانی کو دیکھا۔ ہمدانی نے کہا "جی ہاں۔ میں وائف کو لینے آیا ہوں۔ میری لائف پارٹنر کے بغیر وہاں اشاعت کا بہت سا کام رکا ہوا ہے۔"

وہ بولا "آپ آج ہی اور اتنی جلدی جا رہے ہیں۔ ہمیں آپ نے خدمت کا موقع بھی نہیں دیا۔"

شائلہ بولی "آپ نے پوری ٹیم کی خدمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یہاں سے جاتے ہی آپ حضرات کے متعلق ایسی خبریں شائع کروں گی کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔ حکومت آپ پر خصوصی توجہ دے گی۔"

اس کی باتیں ذو معنی تھیں۔ وہ بات کے پیچھے چھپے ہوئے چیلنج کو سمجھ رہا تھا پھر بھی بڑا مسکرا کر بولا "مجھے تم سے یہی توقع ہے۔ میں تم میاں بیوی کی روانگی کے لیے صبح گاڑی کا انتظام کر دوں گا۔"

حبیب ہمدانی نے کہا "آپ کی نوازش ہے۔ ویسے میں اپنی گاڑی لایا ہوں۔ ہم صبح ہوتے ہی چلے جائیں گے۔ یوں سمجھیں کہ ابھی آپ سے پہلی اور آخری ملاقات ہو رہی ہے۔"

چنگیزی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی' میں تو نہیں چاہتا کہ یہ آخری ملاقات ہو۔"

وہ بھی ہنستے ہوئے بولا "پولیس والوں سے پہلی ہی ملاقات بھاری پڑتی ہے۔ یہی آخری ملاقات رہے تو اچھا ہے۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ ایک اعلیٰ افسر نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا "آپ اخبار والے خواہ مخواہ پولیس والوں کو بدنام کرتے ہیں۔ بھئی' ہر شعبے میں کچھ برے ہوتے ہیں تو کچھ اچھے بھی ہوتے ہیں۔ میں چیلنج کرتا ہوں آپ میرا سروس ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیں۔ ایک بھی خراب ریمارک نہیں ملے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں۔"

وہ بوتل اٹھا کر دوسرا جام بنانے لگا۔ شاکر چنگیزی کے دماغ میں اب تیزی سے دوسرا منصوبہ پک رہا تھا۔ وہ مہمانوں کو کھلانے پلانے اور ہر طرح سے خوش رکھنے میں بظاہر مصروف تھا۔ مگر یقینی کامیابی کا ایک دھندلا سا خاکہ دماغ میں تیار ہوتا جا رہا تھا۔

آدھی رات تک کچھ مہمان نشے میں لڑھک رہے تھے۔ کچھ شکم سیر ہو کر سونے

چلے گئے۔ جہاں الاؤ میں ہرن وغیرہ بھونے جا رہے تھے' وہاں سے دھواں اٹھنے لگا۔ شائلہ بھی اپنے میاں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اجمل ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں ایک ایزی چیئر پر پاؤں پھیلائے نیم دراز تھا۔ شاکر چنگیزی نے وہاں سے چلتے وقت پوچھا"برآمدے میں تنہا کیوں ہو؟ کمرے میں جا کر سونے کا ارادہ نہیں ہے؟"

وہ بولا"کیا سونے کا ارادہ کرنے سے نیند آجاتی ہے؟ کیا جینے کا ارادہ کرنے سے آدمی جی لیتا ہے اور جان لینے کا ارادہ کرنے سے کسی کی جان لے لیتا ہے؟ ارادہ تو ایک خوش فہمی ہے کہ ہم یہ کر گزریں گے۔ اگرچہ ارادہ لازمی ہے۔ ارادہ کرنے سے ہی منزل ملتی ہے لیکن ارادہ بُرا نہ ہو۔ نیک نیتی پر مبنی ہو۔ ارادہ بدنیتی کا براہ ہو گا تو آدمی منزل سے بھٹک کر زندگی کے آخری اسٹیشن پر پہنچ جائے گا۔"

چنگیزی نے ہنس کر کہا"ایسے بول رہے ہو جیسے خوب پی لی ہے۔"

"میں حرام شے نہیں پیتا۔ دراصل زندگی میں پہلی بار ہرن کا گوشت کھایا ہے۔ اس لیے پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ ذرا آرام آئے گا تو کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کروں گا۔"

چنگیزی تھانے دار کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر اپنی رہائش گاہ کی سمت جانے لگا۔ تھانے دار نے کہا"جناب عالی! یہ اجمل کچھ ایسی باتیں کر رہا تھا جیسے ہمارے ارادوں کو جانتا ہو۔"

"وہ کوئی ہمارے اندر گھسا ہوا نہیں ہے کہ ہماری نیت کو سمجھ لے گا۔ وہ تو کیا تم بھی میرے اتنے قریب رہ کر نہیں سمجھ سکتے کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔"

اس کی رہائش گاہ کے احاطے میں پٹھارے دار غوث بخش دو مسلح جوانوں کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے چنگیزی کو دیکھتے ہی سلام کیا پھر اس کے ساتھ برآمدے تک چلتے ہوئے بولا"حضور! پوری تیاری کے ساتھ آیا ہوں۔ یہاں احاطے کے باہر بارہ مسلح بندے چھپے ہوئے ہیں۔ آپ دیکھنا چاہیں تو میں انہیں بلاتا ہوں۔"

وہ کمرے میں آکر بولا"ابھی رہنے دو۔ ادھر بیٹھو اور میری باتیں غور سے سنو۔"

وہ دونوں دو کرسیاں کھینچ کر ایک دوسرے کے سامنے اتنے قریب بیٹھ گئے کہ رازداری سے گفتگو ہو سکے۔ تھانے دار ان کے پاس کھڑا رہا۔ چنگیزی نے کہا"قسمت ہم پر مہربان ہے۔ ہمیں ریسٹ ہاؤس میں ہنگامہ کرنے اور شائلہ کے کمرے میں آگ لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

اس نے پوچھا"کیا ثبوت ہمارے ہاتھ میں آگئے ہیں؟"

"نہیں آئے ہیں مگر ضرور ہاتھ آئیں گے۔ شائلہ اپنے شوہر کے ساتھ صبح یہاں سے جا رہی ہے۔ وہ میاں بیوی اپنی کار میں جائیں گے۔ ان کے ساتھ تیسرا کوئی نہیں ہو گا۔"

غوث بخش نے کہا"اگر ہو گا بھی تو کیا فرق پڑے گا۔ ہمارے پاس نہ اسلحے کی کمی ہے اور نہ ہی جان نثاروں کا کال پڑا ہے۔ آپ حکم دیں' کرنا کیا ہے؟"

"شائلہ! اس خوش فہمی میں ہے کہ اس نے ہمارے خلاف ڈاک کے ذریعے جو مواد بھیجا ہے' وہ کراچی والے دفتر میں پہنچ جائے گا۔ جبکہ یہ ہمارے پاس ہے۔"

"مگر حضور! یہ نقل ہے' اصل تو اسی شائلہ کے پاس ہے۔"

"اور وہ اصل دستاویزات اور تصویروں کے نیگیٹو کل صبح اپنے ساتھ لے جائے گی۔ یہ سب کچھ کار میں اس کے سامان کے اندر ہو گا۔ اپنے آدمیوں کو اچھی طرح سمجھاؤ کہ ان کا راستہ روکیں اور انہیں بے بس کرنے کے لیے گولیاں نہ چلائیں۔"

"جی حضور! وہ صرف دہشت زدہ کرنے کے لیے گولیاں چلائیں گے۔ ایسی جگہ گھیریں گے کہ کوئی انہیں بچانے یا ان کی فریاد سننے والا نہ ہو گا۔"

"انہیں قابو میں کرتے ہی سب سے پہلے سامان کی تلاشی لو اور وہ تمام مواد حاصل کرو۔ اگر ہمارے خلاف کوئی چیز رہ جائے تو انہیں زندہ رکھنا اور ان سے اگلوانے کی کوشش کرنا کہ باقی مواد انہوں نے کہاں چھپایا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ سب کچھ ان کے پاس نہیں ہو گا۔ کچھ اجمل نے بھی چھپا رکھا ہو گا۔ آخر وہ بھی تو اپنے اخبار والے کے لیے کچھ لے جا رہا ہو گا۔"

وہ منصوبے بناتے رہے۔ ان منصوبوں کے ہر پہلو پر غور کرتے رہے اور رات گزارتے رہے۔ رات انہیں اسی طرح گزارنی تھی کیونکہ نیند آنے والی نہیں تھی۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی ہی نیندیں اُڑانے والی حرکتیں کرتے ہیں۔

جس کی نیند اُڑنا چاہیے' وہ سو رہی تھی۔ وہ واقعی خوش فہمی میں تھی کہ جو کچھ اس نے ڈاک کے ذریعے ارسال کیا ہے' وہ کراچی والے دفتر میں پہنچ جائے گا۔ باقی اصل دستاویزات اور تصاویر کے نیگیٹو وہ صبح اپنے ساتھ لے جانے والی تھی۔

اس ٹیم میں پولیس کے اعلیٰ افسران کے علاوہ حکومت کے دوسرے اہم عہدے دار بھی تھے۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ انہیں بھارتی جاسوسوں کے متعلق بتائے اور اپنا کارنامہ بیان کرے لیکن اجمل نے سمجھایا کہ پہلے یہ سمجھو کہ اس ٹیم میں کتنے افراد اپنے فرائض امانت داری سے ادا کرتے ہیں؟

شائلہ نے غور کیا۔ وہاں پہنچتے ہی پہلی رات سے پینے پلانے والی تفریح شروع ہو گئی۔ آس پاس کے علاقوں کے اکابرین نذرانے پیش کرنے لگے تھے۔ پھر فرائض پس پشت رہ گئے اور وہ شکار کھیلنے میں دلچسپیاں لینے لگے۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ نذرانے قبول کرنے والے مخلص نہیں ہوں گے۔ وہ بھارتی جاسوسوں کے معاملات پر مٹی ڈال دیں گے۔ اس لیے شائلہ نے جو اہم راز معلوم کئے تھے' انہیں صرف اجل اور اپنے شوہر حبیب ہمدانی کو بتایا تھا۔ وہ کراچی پہنچ کر بڑے ڈرامائی انداز میں ایسے راز کا انکشاف کرنا چاہتی تھی۔

ویسے راز پھر راز حقیقتاً ہی ہوتا ہے۔ اسے ضرور چھپانا چاہیے۔ یہ بظاہر شائلہ کی دانش مندی تھی لیکن حقیقتاً اجل کی حکمتِ عملی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ چنگیزی اور پتھارے دار صرف شائلہ کی جان کے دشمن بن جائیں۔ ایک جسم سے اس کی روح قبض کرنے کے لیے جن مراحل سے گزرنا تھا' وہ گزرتا جا رہا تھا۔

اس نے دستک سن کر دروازہ کھولا۔ سامنے شاکر چنگیزی کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا "اجل! تم ابھی تک سو رہے ہو۔ یہاں پوری ٹیم شکار کے لیے روانہ ہونے کو تیار ہے۔"

اجل نے جماہی لیتے ہوئے کہا "مسٹر چنگیزی! میں نے پچھلی رات کہا تھا کہ میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے۔ مجھے افسوس ہے' میں شکار پر نہیں جاسکوں گا۔ آج یہاں آرام کروں گا۔"

"کوئی بات نہیں' طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو آرام کرنا چاہیے۔"

اجل نے پوچھا "وہ میاں بیوی ابھی ہیں یا جا چکے ہیں۔"

"وہ تو صبح چھ بجے ہی یہاں سے چلے گئے۔ دعا کرو' وہ بخیریت کراچی پہنچ جائیں۔"

"کیا میری دعا قبول ہو جائے گی؟ کیا ہم کسی کو موت کے سفر پر روانہ کر کے اسے دعا کے ذریعے واپس لاسکتے ہیں؟"

"اجل! تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔ کیا شائلہ موت کے سفر پر گئی ہے؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ جب سے پیٹ خراب ہوا ہے' میں دماغ سے نہیں پیٹ سے سوچ کر بولنے لگا ہوں۔ بہتر ہے' مجھے سونے دو۔ تمہارا وقت ضائع ہو رہا ہے۔"

اجل نے دروازہ بند کر لیا۔ چنگیزی ناگواری سے بند دروازے کو دیکھ کر سوچنے لگا۔ "واقعی یہ بہت گہرا اور بہت خطرناک لگتا ہے۔ ایسے بولتا ہے جیسے اسے ہمارے

ارادوں کی خبر ہو۔ اس کی باتیں سانپ کی پھنکار لگتی ہیں۔"

پوری ٹیم روانگی کے لیے تیار تھی۔ وہ تھانے دار کے پاس آکر بولا "تقدیر پھر مہربان ہو رہی ہے۔ اجل یہاں تنہا رہے گا۔ گن پوائنٹ پر اس کے سامان کی تلاشی لو۔ کچھ نہ ملے تو دھوکا نہ کھاؤ۔ اسے اغوا کرا کے کہیں لے جاؤ اور فون کے ذریعے غوث بخش سے معلوم کرتے رہو کہ اسے شائلہ سے کیا حاصل ہو چکا ہے اور تمہیں اجل سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ میں آج شام اس ٹیم کو رخصت کرتے ہی تم لوگوں سے ملاقات کروں گا۔"

وہ تھانے دار کو ہدایات دے کر ٹیم کے ساتھ چلا گیا۔ چنگیزی' پتھارے دار اور تھانے دار کے درمیان یہ طے تھا کہ وہ کسی طرح ٹیلی فون کے ذریعے ایک دوسرے کو تازہ ترین حالات سے باخبر رکھیں گے۔ یوں باخبر رہنے کے لیے پتھارے دار غوث بخش نے کہا تھا کہ وہ سب سے پہلے حبیب ہمدانی کے موبائل فون پر قبضہ کرے گا پھر اس کے ذریعے تھانے دار سے رابطہ کرے گا۔

تھانے دار نے دو مسلح سپاہی اجل کے کمرے کے بند دروازے کے سامنے کھڑے کر دیئے تاکہ وہ کمرے سے باہر نہ جا سکے پھر اس کمرے میں آکر بیٹھ گیا جہاں ٹیلی فون تھا۔ صبح دس بج کر دس منٹ پر فون کی گھنٹی بجی۔ تھانے دار نے ریسیور اٹھا کر کہا "ہاں میں ہوں رجب علی۔ بولو تم کون ہو؟"

"میں غوث بول رہا ہوں۔ دونوں میاں بیوی کو قابو میں کر کے "سنگارو" لے آیا ہوں۔ میں نے ان کے سامان کی ایک ایک چیز چیک کی ہے۔ کسی بھی سامان میں نہ وہ اہم دستاویزات ہیں اور نہ ہی تصویروں کے نیگیٹو ہیں۔ بولو کیا کروں؟"

"کیا گاڑی کے نیچے اور سیٹوں کے اندر دیکھا ہے؟"

"میرے آدمی ابھی تک ایک ایک جگہ دیکھ رہے ہیں۔ شائلہ قسمیں کھا کر کہہ رہی ہے کہ اس نے وہ تمام ثبوت اپنے سوٹ کیس میں رکھے تھے۔ اس کا شوہر ہمدانی بھی یہی کہہ رہا ہے۔ دونوں حیران اور پریشان ہیں کہ وہ ثبوت کیسے غائب ہو گئے؟ یا کس طرح چرائے گئے ہیں؟"

"وہ میاں بیوی' ڈراما کر رہے ہیں۔ دونوں کی ایسی کی تیسی کرو۔ وہ سچ اگلیں گے۔ مجھ سے پندرہ منٹ کے بعد رابطہ کرو۔ میں ذرا اجل کی خبر لیتا ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر اٹھ گیا۔ اپنے تین سپاہیوں کو لے کر اجل کے کمرے کے پاس آیا۔ وہاں پہلے سے دو سپاہی موجود تھے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ پہلی دستک کے بعد انتظار نہیں کیا۔ دروازہ پیٹنا شروع کیا تو وہ کھل گیا کیونکہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اجل

ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا "پوری فوج لے کر کیوں آئے ہو؟"

تھانے دار نے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم تمہارے سامان کی تلاشی لیں گے۔"

اجل نے پوچھا "کیا تمہیں میرا کوئی سامان نظر آرہا ہے؟"

واقعی کوئی سامان نہیں تھا۔ ایک چھوٹا سا بیگ یا ننھا سا پرس بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھانے دار نے پوچھا "تمہارا سامان کہاں ہے؟ تم یہاں سامان کے بغیر نہیں آئے تھے۔"

"میں سامان کے بغیر آیا تھا۔ تم میں سے کسی نے غور نہیں کیا کہ میں خالی ہاتھ رہا ہوں۔ یہ دوسروں کو بھی سمجھاتا ہوں کہ اس دنیا سے خالی ہاتھ جانا ہے۔ اس لیے اپنے تن پر صرف شرم کا لباس رکھو اور کوئی بوجھ نہ رکھو۔"

"بکواس مت کرو۔ کھڑے ہو جاؤ۔ جان محمد' اس کی تلاشی لو۔"

سپاہی نے تلاشی لی پھر کہا "جناب! اس کے لباس میں جیب نہیں ہے اور لباس کے اندر کچھ نہیں ہے۔"

تھانے دار رجب علی نے اسے تعجب سے دیکھ کر پوچھا "جیب نہیں ہے تو رقم کہاں رکھتے ہو؟"

وہ بولا "میں رقم رکھ کر کیا کروں گا۔ میں دنیا سے جو چیز لے جا نہیں سکتا' اسے اپنے پاس نہیں رکھتا۔"

"ارے روٹی کھانے کے لیے تو کچھ رکھتے ہو گے؟"

"روٹی تم لوگ یہاں کھلا رہے ہو۔"

"کراچی میں کیسے کھاتے ہو؟"

"جس اخبار میں لکھتا ہوں' اسی اخبار پر رکھ کر کھاتا ہوں۔ اس طرح پلیٹ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔"

ایک سپاہی نے آکر کہا "سر! آپ کا فون ہے۔ ایس پی صاحب بلا رہے ہیں۔"

وہ سپاہیوں سے بولا "اسے گاڑی میں لے جا کر بٹھاؤ۔ شور مچانا چاہے تو منہ پر ٹیپ چپکا دو اور ہاتھ پاؤں باندھ کر رکھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں آیا۔ پھر ریسیور اٹھا کر بولا "جی جناب عالی! میں ہوں آپ کا خادم رجب علی۔ تھوڑی دیر پہلے غوث بخش کا فون آیا تھا.........."

وہ چنگیزی کو بتانے لگا کہ دونوں میاں بیوی کو اغوا کر کے سنگارو کے کھنڈر نما قلعہ

میں پہنچایا گیا ہے لیکن ان کے سامان میں وہ مطلوبہ اہم چیزیں نہیں ہیں اور اس بات پر شائلہ خود حیران ہے۔

پوری رپورٹ سننے کے بعد چنگیزی کو یاد آیا کہ اب سے کوئی آٹھ دس ماہ پہلے لاہور سے ٹرین میں کراچی آتے وقت بالکل اسی طرح شائلہ کے سوٹ کیس میں سے اہم ثبوت غائب ہو گئے تھے۔ اس نے تھانے دار رجب علی سے کہا "یہ اجل کی بدمعاشی ہے۔ فوراً جاؤ اور اس کے سامان کی تلاشی لو۔"

تھانے دار نے کہا "جناب عالی! اجل کے پاس کوئی سامان ہی نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی نے یہ توجہ نہیں دی کہ وہ اس ٹیم میں کسی سامان کے بغیر آیا ہے۔"

پھر چنگیزی کو یاد آیا کہ ٹرین میں بھی اجل کسی سامان کے بغیر سفر کر رہا تھا۔ یہ بات عجیب سی تھی کہ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا سفری بیگ بھی نہیں تھا۔ چنگیزی کے پوچھنے پر اس نے کہا تھا "سامان سو برس کا ہوتا ہے اور پل کی خبر نہیں ہوتی۔ اس لیے میں اپنے ساتھ کوئی سامان نہیں رکھتا۔"

چنگیزی نے فون پر تھانے دار سے کہا "رجب علی! وہ بہت بڑا فراڈ ہے۔ پہلے بھی مجھے دھوکہ دے چکا ہے۔ اس نے سامان کسی دوسری جگہ چھپایا ہے اور جتنے ثبوت شائلہ کے سامان سے غائب ہوئے ہیں' وہ اسی اجل کے پاس ہیں۔ اس کمبخت کو بھی سنگارو کے قلعے میں پہنچاؤ۔ میں اس ٹیم سے پیچھا چھڑا کر وہیں پہنچوں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ تھانے دار نے کمرے سے باہر آ کر پوچھا۔ "جان محمد! کیا اجل کو گاڑی کے اندر بند کیا ہے؟"

"یس سر! بند کر دیا ہے۔ منہ پر ٹیپ لگا دی ہے۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے پھر کمرے میں آکر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی "میں غوث بول رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب ادھر فون نہ کرنا۔ میں اجل کو باندھ کر تمہاری طرف لا رہا ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر اس بند گاڑی میں آکر اجل کے پاس بیٹھ گیا۔ آگے پیچھے مسلح سپاہی تھے۔ گاڑی وہاں سے چل پڑی۔ جب تک وہ شہر کے راستوں سے گزرتے رہے' خاموش رہے۔ پھر تھر کے راستے پر سفر کرتے وقت اجل کے منہ سے ٹیپ کو ہٹا دیا گیا۔ تھر کے علاقے میں ٹالپر عہد کے تعمیر کیے ہوئے کئی قلعے ہیں۔ جن میں قلعہ نوکوٹ' مٹھی' اسلام کوٹ اور سنگارو کے آثار رہ گئے ہیں۔ پتھارے دار غوث بخش نے اجل اور شائلہ سے

اہم ثبوت اگلوانے کے لئے اس ویران اور کھنڈر نما سنگارو قلعے کا انتخاب کیا تھا۔

شمائلہ اور حبیب ہمدانی اس قلعے کی شکستہ دیواروں کو اور تاریخ کی زبوں حالی کو حواس باختہ ہو کر دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ ان کے ساتھ بھی تاریخی قلعے جیسا سلوک کیا گیا تھا۔ کتنے ہی تگڑے ہاتھوں نے ان میاں بیوی کی پٹائی کی تھی۔ جگہ جگہ سے لباس پھاڑ دیئے۔ بدن پر لہو رنگ زخم لگائے تھے۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں وحشت سے پھیل گئی تھیں۔ ظالموں نے ان دونوں کو اس قلعے کی طرح کھنڈر بنا دیا تھا۔ پتھارے دار ان سے کہہ رہا تھا "ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ وہ تصاویر اور دستاویزات ہمیں دے دو۔ دوست بن جاؤ۔ ہم تمہیں زندگی ہی نہیں' منہ مانگی رقم بھی دیں گے۔"

شمائلہ نے زخموں کی تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا "تم لوگوں نے تمام سامان کی تلاشی لی ہے۔ سامان کا ایک ایک تنکا دیکھا ہے۔ ہماری گاڑی کے تمام پُرزے کھول ڈالے اور یہ دیکھ چکے ہو کہ جو چاہتے ہو' وہ ہمارے پاس نہیں ہے اگر ہوتا تو.........."

ایک بدمعاش نے شمائلہ کے منہ پر لات مارتے ہوئے کہا۔ "سالی وہ یہاں نہیں ہے تو پھر تو کسی یار کو دے کر آئی ہے۔"

پتھارے دار غوث بخش نے اس لات مارنے والے کو پکڑ کر کہا "اس کے منہ پر لات ماری کوئی بات نہیں' پیٹ پر نہ مارنا۔ یہ ماں بننے والی ہے۔"

ایک نے کہا "اچھا تو پیٹ بھاری ہے۔ اس لیے پیٹ کی ہلکی نہیں ہے۔ اندر سے سچ نہیں نکال رہی ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ ہم پیٹ میں گھسنا جانتے ہیں۔"

غوث نے کہا "اچھی خاصی پٹائی ہو گئی ہے۔ اب ذرا انہیں زخم سہلانے اور عقل سے کام لینے کا موقع دو۔ دوسرے راؤنڈ میں جس طرح ہم ٹارچر کریں گے۔ اس کے بعد ہی ہی ہی.........."

وہ ہنستا ہوا شمائلہ پر جھکا پھر بولا "عورت کے پیٹ میں کوئی بات نہیں رہتی اور کوئی اولاد نہیں رہتی' سب نکال دیتی ہے۔ تُو بات نہیں نکالے گی تو ہم تیرا پانچ مہینے کا بچہ پیٹ سے نکال لیں گے۔ ہی ہی ہی.........."

وہ ان میاں بیوی کو چھوڑ کر اپنے آدمیوں کے ساتھ چلا گیا۔ وہ کھنڈر نما قلعہ کھلا قید خانہ تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں کھلے تھے مگر وہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ ان کی اتنی پٹائی ہوئی تھی کہ وہ چار قدم چلنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ چلتے بھی تو حدِ نظر تک تھر کا ریگستان تھا۔ سر پر آسمان اور زمین پر ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ پھر غوث کے چار گن مین تھے' جو کھنڈر کے کسی سائے میں آرام کرنے گئے تھے۔

حبیب ہمدانی نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا "آہ شمائلہ! سچائی آدمی کو اس طرح کیوں مارتی ہے۔ میں سچ لکھنے کے باعث کئی بار جیل گیا۔ پریس کو آزادی دینے کا دعویٰ کیا جاتا ہے مگر صحافی کے قلم کی آزادی کو یا تو خریدا جاتا ہے یا اسے عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ میں نے بڑے مظالم برداشت کئے ہیں۔ مگر تم پر ہونے والی زیادتیاں برداشت نہیں ہو رہی ہیں۔"

وہ خاموش تھی۔ سکتے کی حالت میں سر اٹھائے آسمان کو تک رہی تھی۔ وہ بولا "سمجھ میں نہیں آتا' وہ تمام تصاویر اور دستاویزات تمہارے سوٹ کیس سے کیسے غائب ہو گئی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں وہ چیزیں سوٹ کیس میں رکھتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد تم نے اسے لاک کر دیا تھا۔"

وہ آسمان کو تکتے ہوئے بولی "وہ ہمارا دشمن ہے۔"

"کون؟" ہمدانی نے آسمان کو دیکھتے ہوئے پوچھا "کس کی بات کہہ رہی ہو؟"

"اسی اجل کو کہہ رہی ہوں۔ دوست بن کر دشمنی کر رہا ہے۔ اسی نے وہ تمام ثبوت غائب کئے ہیں۔"

"نہیں شمائلہ! وہ کل رات سے ہمارے قریب نہیں آیا۔ اس نے تمہارے سوٹ کیس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب ہم ریسٹ ہاؤس سے روانہ ہوئے تو اس کا دروازہ بند تھا۔ وہ شاید سو رہا تھا۔"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ایک بار لاہور سے آتے وقت بھی میرے سوٹ کیس سے چوہدری صاحب کے خلاف تمام ثبوت غائب ہو گئے تھے۔ میرا سوٹ کیس مقفل تھا۔ یہ جادو سمجھ میں نہیں آیا کہ مقفل سوٹ کیس سے ثبوت کیسے غائب ہو گئے لیکن اجل کراچی پہنچنے سے پہلے کہیں غائب ہو گیا تھا۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ وہ ہمیں ان قاتلوں کے حوالے کر کے ہم سے دور ہو گیا ہے۔"

"اسے الزام دینے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کوئی جادوگر ہے' کوئی پُراسرار علم جانتا ہے۔ اس علم کے ذریعے ہمیں ایسے عذاب سے گزار رہا ہے۔ تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہم سے دشمنی کیوں کر رہا ہے؟"

"اس لیے کہ بھارتی جاسوسوں اور یہاں کی نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ کا راز جو ہم نے پایا ہے' اس کا تمام کریڈٹ وہ اخبار کے ذریعے خود حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"وہ ایسا خود غرض نہیں لگتا پھر بھی آدمی کا کیا بھروسا؟ کسی کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی "میں مرنے کی حد تک تشدد برداشت کر سکتی

ہوں مگر میری ممتا مجھے کمزور بنا رہی ہے۔ یہ انسان نہیں درندے ہیں' میرے اس بچے کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں' جو ابھی میرے اندر مکمل بھی نہیں ہوا ہے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ روتے ہوئے بولی "ہم کیسی دنیا میں جی رہے ہیں۔ وہ بچہ جس کا ابھی وجود مکمل نہیں ہوا ہے۔ گوشت کا ایک لوتھڑا ابھی آدم زاد بننا چاہ رہا ہے اور ابھی سے اسے سزائے موت سنائی جا رہی ہے۔ ہائے ربا! میں اپنے بچے کو کیسے سلامت رکھوں؟"

ہمدانی نے کہا "یہ ہمارا بچہ ہے۔ ہم اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دے سکتے ہیں۔ وہ تمام ثبوت ہمیں مل جائیں تو ہم اس پتھارے دار کو دے کر بچے کو بچا سکتے ہیں۔ ہم ظالم کے آگے کبھی نہیں جھکتے لیکن نئی پود' نئی نسل کی خاطر جھکیں گے۔ سیاست میں ہزاروں طرح کے فراڈ ہوتے ہیں۔ ہم ایک فراڈ سے سمجھوتا کر لیں گے۔ بعض اوقات شکست کھانے والا ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ پھر دو قدم آگے بڑھ کر مار دیتا ہے۔ شطرنج اور سیاست میں یہی ہوتا آیا ہے۔"

صبح سے دوپہر ہو گئی۔ تب ایک بند گاڑی وہاں آئی۔ اس کے دروازے کھلے تو پہلے سپاہی اور تھانے دار نظر آئے پھر اس کے اندر سے اجل باہر آیا۔ غوث نے اسے دیکھ کر کہا "آؤ۔ تمہارا ہی انتظار تھا۔ بڑی چالاکیاں دکھا رہے ہو۔ اس عورت کے سامان سے اصل مال غائب کر کے آخر کیا چکر چلا رہے ہو؟"

اجل نے کہا "میں کوئی چکر نہیں چلا رہا ہوں۔ مجھ پر خواہ مخواہ شبہ کیا جا رہا ہے۔"

غوث نے اسے ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ اس کے حواری اسے مارتے ہوئے' دھکے دیتے ہوئے ادھر لے آئے جہاں وہ میاں بیوی نیم مُردہ آدھے لیٹے اور آدھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اجل کو دیکھ کر سیدھی طرح اٹھ بیٹھے تھے۔ تھانے دار رجب علی نے کہا۔ "غوث! میرا واپس جانا ضروری ہے۔ کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس معاملے میں پولیس کا ہاتھ ہے۔ ویسے ایس پی صاحب یہاں کسی وقت بھی آنے والے ہیں۔"

تھانے دار اپنے سپاہیوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ غوث نے کہا "دیکھ اجل! یہ میاں بیوی بھی یہاں ہیں۔ مال تم تینوں میں سے کسی کے پاس ہے۔ ہم ان دونوں کی اچھی طرح تلاشی لے چکے ہیں۔ ان کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے وہ تمہارے پاس ہے۔"

"میرے پاس ہوتا تو میں یہاں قیدی بن کر نہ آتا۔ میرے پاس کوئی سامان بھی نہیں ہے۔ کچھ چھپانے کے لیے میرے لباس میں جیب بھی نہیں ہے۔"

"تم نے ریسٹ ہاؤس کے آس پاس وہ ثبوت چھپائے ہوں گے۔"

"چلو سمجھ لو۔ میں نے یہی کیا ہے۔ ان تمام ثبوت کو جہاں چھپایا ہے' وہاں یہ تحریر ہی چھوڑ دی ہے کہ ایس پی شاکر چنگیزی' پتھارے دار غوث بخش اور تھانے دار رجب لی شائلہ اور حبیب ہمدانی کو اغوا کر کے کہیں لے گئے ہیں اور مجھے بھی ان سے خطرہ وس ہو رہا ہے۔ وہ شائلہ اور ہمدانی کی طرح مجھے بھی قتل کر سکتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی غوث نے گن کے دستے سے اجل کے منہ پر مارا پھر دوسرے حواری بھی ت بری طرح اس کی پٹائی کرنے لگے۔ شائلہ تھوڑی دیر پہلے اسے دشمن سمجھ رہی تھی۔ ب اس کی درگت بنتے دیکھ کر رونے لگی۔

اجل اور مار کھا رہا تھا؟ موت کو کسی نے مارا ہے کہ کوئی اسے مار پاتا؟ لیکن انسان بن کر رہنے کی سزا ملتی ہے۔ خواہ کوئی فرشتہ انسان بن کر دنیا میں آئے' ے دنیاوی عذاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ شاید یہی انجام دیکھ کر شیطان کبھی انسان بننے کی لی نہیں کرتا۔ شائلہ نے رو رو کر کہا "خدا کے لیے اتنا نہ مارو۔ یہ مر جائے گا۔ اجل الا! جب تم نے اعتراف کر لیا ہے کہ وہ ثبوت کہیں چھپائے ہیں تو انہیں وہ جگہ بتا دو۔ ب اسی میں ہماری تمہاری سلامتی ہے۔"

غوث کے چار حواریوں نے ایسی بے دردی سے مارا تھا کہ چہرہ اور لباس لہو میں ت رہا تھا۔ زمین کی مٹی لہو سے اور بدن سے چپک رہی تھی۔ وہ سر اٹھا کر بولا "بس یہی ٹی ہے' جو ہماری ابتدا ہے اور جو ہمارا اختتام ہے۔ یہ خوش فہمی اپنے دماغ سے نکال دو ہ ثبوت ملنے کے بعد یہ ہمیں اپنے خلاف پبلسٹی کے لیے زندہ چھوڑ دیں گے۔"

غوث نے کہا "میں قسم کھا کر کہتا ہوں تم تینوں کو چھوڑ دوں گا۔ مجھے بتاؤ ثبوت تم نے کہاں چھپائے ہیں؟"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا "یہ تو تمہیں قیامت کے دن معلوم ہو گا۔"

غوث نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ پھر چاروں حواری اس پر چڑھ دوڑے۔ تیں اور رائفلوں کے کندوں سے مارنے لگے۔ غوث نے اسے گالیاں دیتے ہوئے اریوں کو حکم دیا "اسے باندھ کر الٹا لٹکا دو۔"

حکم کی تعمیل کی گئی۔ اس کے دونوں پاؤں رسی سے کس کر باندھ دیے گئے پھر اس لا کے دوسرے سرے کو قلعے کے ایک اونچے شہتیر سے باندھ دیا گیا۔ یوں اسے رھے سے الٹا لٹکا دیا گیا۔ الٹا لٹکنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ساری دنیا الٹی دکھائی دیتی ہے ایدھی نظر آنے والی دنیا کا یہی سچا نظارہ ہے..........یا اشارہ ہے کہ یہاں الٹے ہی رہو

یا سیدھے رہنے کی سزا بھگتتے رہو۔

وہ سب بھوکے پیاسے تھے۔ ثبوت حاصل کرنے کی فکر اور پریشانی میں غوث کو بھوک لگ رہی تھی۔ حواری گاڑی سے کھانے کا سامان اور پانی کا کین لے آئے۔ ایک نے غوث سے کہا "سائیں! کچھ کھالو۔ ان حرام خوروں کو بھوکا پیاسا رہنے دو۔ تڑپ تڑپ کر مرنے دو۔"

دوسرے حواری نے کہا "جب ان سے کچھ حاصل ہو نہیں سکتا تو انہیں زندہ رکھنے کا فائدہ کیا ہے؟ میں تو کہتا ہوں سائیں! ان کا قصہ ختم کردو۔"

غوث بخش نے کہا "وہ تمہارا باپ ایس پی چنگیزی آنے والا ہے اس کے حکم کے بغیر میں کوئی آخری فیصلہ نہیں کرسکتا۔ تم لوگ کھاؤ۔ میری بھوک تو مرگئی ہے۔"

وہ چاروں ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ کر کھانے لگے۔ غوث نے شمائلہ کے پاس آ کر کہا "خود بھی زندہ رہ اور اپنے بچے کو بھی زندہ رہنے دے۔ اجل کو تو ہی سمجھا سکتی ہے اور تمام ثبوت ہمارے حوالے کرنے پر اسے راضی کرسکتی ہے۔"

ہمدانی نے کہا "ہم سمجھ رہے ہیں کہ تمہارے ہاتھوں نہیں بچیں گے اور تم سمجھ رہے ہو کہ وہ تمام ثبوت حکومت کے ذمے دار افراد کے ہاتھ لگیں گے تو تم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔"

وہ بولی "ہماری طرح تم بھی مصیبت میں ہو۔ فرق اتنا ہے کہ ہم زخم کھا رہے ہیں اور تم آرام سے ہو۔"

"تم بھی آرام سے رہو گی۔ ہم تمہیں بھی روٹی کھلائیں گے' پانی پلائیں گے بس کسی طرح اجل کو راضی کرلو۔"

وہ ایک دیوار کے سہارے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اسے بھوکا پیاسا رکھ کر مارا جاتا تو وہ مرجاتی مگر کوئی سمجھوتا نہ کرتی لیکن اپنے بچے کے لیے پیٹ میں خوراک پہنچانا ضروری تھا۔ وہ ہمدانی کے سہارے چلتی ہوئی دور لٹکنے والے اجل کے پاس آئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ جیسے وہ سو رہا ہو۔

شمائلہ نے آواز دی۔ "اجل! آنکھیں کھولو۔ میری حالت دیکھو۔ تم ماضی میں میرے بہت کام آئے ہو۔ اب اپنے لیے نہیں' اپنے بچے کے لیے تم سے التجا کرتی ہوں۔ دشمنوں کو دوست بنالو۔ ... کوئی ایسا سمجھوتا کرلو کہ ہمیں اپنی زندگی کی ضمانت مل جائے اور انہیں بھی ہم سے کوئی نقصان نہ پہنچے..........."

وہ بولتے بولتے رک گئی پھر اس نے پوچھا "کیا تم سن رہے ہو؟ تم آنکھیں کیوں

نہیں کھول رہے ہو؟"

ہمدانی نے اسے جھنجوڑا' پھر اس کی ناک پر ہاتھ رکھ کر سانسوں کو محسوس کیا اس کے بعد کہا "یہ زندہ ہے۔ مگر بے ہوش ہوگیا ہے۔"

غوث نے حواریوں کو گالیاں دیتے ہوئے کہا "تم لوگوں سے کس نے کہا تھا کہ اتنی پٹائی کرو۔ یہ مرجائے گا تو وہ تمام ثبوت تمہارے باپ لائیں گے؟"

وہ بے ہوش نہیں تھا۔ صرف بے ہوشی اور غفلت ظاہر کر رہا تھا کیونکہ اس کی ڈیوٹی شروع ہوگئی تھی۔ چند روحیں قبض کرنے کے لمحات شروع ہوگئے تھے۔

اچانک ایک حواری کو ابکائی سی آئی۔ اس کے منہ سے روٹی کے لقمے کے ساتھ تھوڑا سا پانی باہر آیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام کر سجدے کے انداز میں جھکنے لگا۔ غوث نے پوچھا "تجھے کیا ہو رہا ہے' کھاتے وقت سجدہ کر رہا ہے؟"

دوسرا حواری اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ مگر کھڑا نہ رہ سکا۔ پچھلی دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گرا پھر تڑپنے لگا۔ شمائلہ اور ہمدانی حیرت سے اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ تیسرے اور چوتھے حواری کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔ غوث بخش ان کے قریب جا کر ایک ایک کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا "کیا ہوگیا؟ یہ تم لوگوں کو کیا ہو رہا ہے؟"

کسی سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ جس کے پاس جا رہا تھا۔ وہ دم توڑ رہا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آگ لگنے سے' سیلاب آنے سے یا کوئی بڑا حادثہ پیش آنے سے سینکڑوں ہزاروں افراد بیک وقت لقمۂ اجل بن جاتے ہیں' وہاں تو صرف چار حواری جان سے گئے تھے اور ان کے جان سے جانے کی بھی کوئی وجہ ہوگی۔

غوث بخش محتاط تھا۔ ہاتھ میں ریوالور لیے ہمدانی سے کہہ رہا تھا۔ "خبردار! مرنے والوں کے ہتھیاروں کے پاس نہ آنا۔ گولی مار دوں گا۔ پیچھے جاؤ۔ جلدی کرو' ادھر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاؤ۔"

وہ دونوں دیوار کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ غوث بخش پتھارے دار تنہا رہ گیا تھا مگر اس کے پاس ہتھیار تھا۔ شمائلہ اور ہمدانی زخموں سے چُور تھے۔ ان میں سے کوئی اس پر حملہ نہیں کرسکتا تھا اور اجل بندھا ہوا لٹک رہا تھا۔

اگرچہ اس کی پوزیشن مضبوط تھی۔ اس کے باوجود وہ ... ہو کر بڑبڑا رہا تھا "بابا! کیا ہوگیا؟ کھاتے پیتے کیسے مرگئے؟"

اجل نے آنکھیں کھول دیں پھر کہا "یاد کرو۔ تمہارے کین کا پانی تھوڑا سا رہ گیا

تھا۔ تم نے وہ تھوڑا سا پانی پی لیا تھا۔ کین خالی ہو گیا تھا لیکن چھاچھرو کے کھنڈر والے کنوئیں سے تمہارے حواری نے پانی بھر لیا تھا۔"

پتھارے دار نے کہا "ہاں، مگر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ تمہاری گاڑی دور کھڑی ہوئی تھی اور کنوئیں سے پانی بھرنے والا حواری ناخواندہ تھا۔ پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ وہاں ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ کنوئیں کا پانی زہریلا ہو گیا ہے۔ صفائی ہونے تک کوئی اسے استعمال نہ کرے۔ ایک اَن پڑھ گنوار نے اپنے ساتھ تمہارے تین حواریوں کی جان لے لی۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا قریب آیا پھر بولا..........."تم..........تم کیسے جانتے ہو؟ یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟ تم ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ کسی کنوئیں سے کین میں پانی بھرا گیا تھا۔"

وہ بولا "اونچائی پر الٹا لٹکنے سے دنیا بہت دور تک الٹی حرکتیں کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنی موت کا سامان کرتی ہوئی اس مٹی کی طرف آرہی ہے جہاں سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔"

وہ غصے سے بولا "میرے سامنے باتیں نہ بناؤ، ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"ارے نادان! آدمی گولیوں، تیروں اور تلواروں سے نہیں، اپنی موت سے مرتا ہے۔ دیکھو ابھی تمہاری زندگی تھی اس لیے تم نے اس کین کا پانی نہیں پیا۔ حواریوں کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوئے۔ تمہیں اپنے باقی رہنے پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

کھنڈر کے باہر ایک گاڑی آکر رکی۔ ایس پی شاکر چنگیزی آیا تھا۔ قریب آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "بڑی مشکل سے افسران کی ٹیم سے جان چھڑا کر آرہا ہوں۔ ہمیں رات تک واپس جانا ہے۔ جلدی بتاؤ۔ کچھ حاصل ہوا؟"

"کچھ نہیں حضور! میں نے میاں بیوی کے تمام سامان کی تلاشی لی ہے۔ وہ ثبوت اجل کے پاس ہیں۔ اس نے ریسٹ ہاؤس کے قریب انہیں کہیں چھپا دیا ہے۔"

چنگیزی یہ باتیں سننے کے دوران سوالیہ نظروں سے چار لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان کے آس پاس کھانے پینے کا سامان پڑا تھا۔ دوسری طرف شائلہ اور ہمدانی کا تمام سامان کھلا ہوا تھا۔ زنانہ اور مردانہ کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ پتھارے دار اپنے حواریوں کی موت کے مختصر حالات بتا رہا تھا۔ چنگیزی نے غصے اور بیزاری سے اجل کے پاس آکر پوچھا "کیوں اپنے ساتھ ان بے چارے میاں بیوی کو ہلاک کرانا چاہتے ہو؟"

غوث بخش نے کہا "صرف یہ تین نہیں، چوتھا بھی مرے گا۔ چھوٹا سا ننھا منا سا ....."

چنگیزی نے پلٹ کر دور بیٹھی ہوئی شائلہ کو دیکھا پھر مسکرا کر کہا۔ "میں بھول گیا تھا کہ یہ ماں بننے والی ہے۔ غوث بخش! تم بڑی دُکھتی رگ پکڑتے ہو۔ یہاں دو مرد ہیں۔ انہیں نہیں چھیڑا جائے گا۔ بس آخری بار اس عورت سے پوچھ لو۔ اجل سے ہماری مطلوبہ چیزیں دلائے گی یا اپنے پیٹ کا ادھورا بچہ ہمیں دے گی۔"

وہ دیوار کے سہارے کھڑی ہو گئی چیخ کر بولی "خدا سے ڈرو۔ میرے بچے سے دشمنی نہ کرو۔"

"اجل چاہے تو ہم تمہارے پیٹ کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔"

ہمدانی نے کہا "اجل! ایک ماں کی ممتا اور اس کی تڑپ کو سمجھو۔ وہ تمام ثبوت ان کے حوالے کر دو۔"

اجل نے کہا "تم لوگ کس ثبوت کی بات کر رہے ہو۔ کیا اس ملک میں ثبوت پیش کرنے سے مجرموں کو سزا مل جاتی ہے؟ یہاں کی بڑی بڑی شخصیات مختلف ہتھکنڈوں سے قتل کی گئیں۔ ملک کے ٹکڑے کیے گئے۔ ملک کی سب سے بڑی قوت جوہری پروگرام کو منجمد رکھا گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ کس نے کیا؟ ساری باتیں کھلی کتاب کی طرح ہیں۔ کیا اُن جرائم کے مجرموں کو کبھی سزا دی گئی؟ اگر اس ملک میں پتھارے دار غوث بخش اور شاکر چنگیزی جیسے بھارتی ایجنٹ ہیں اور بھارتی جاسوسوں کی یہاں پشت پناہی کرتے ہیں تو اسرائیلی اور امریکی ایجنٹ بھی ہیں۔ ان سب کے خلاف آڈیو، ویڈیو ریکارڈز، تصویریں اور ساری دستاویزات ہیں لیکن یہ سب کہاں ہیں؟

"ایک مُردہ خانہ ہے۔ اس ملکِ خداداد میں ایک مُردہ خانہ ہے۔ جہاں یہ سارے مردے پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے چوہدری احمد حسین، پتھارے دار غوث بخش اور ایس پی شاکر چنگیزی کے تمام زندہ ثبوت اس مُردہ خانے میں پہنچا دیے ہیں۔ مُردہ خانے کا فائدہ یہ ہے کہ یہاں مُردے محفوظ رہتے ہیں۔ نہ دفن کیے جاتے ہیں، نہ جلائے جاتے ہیں۔ نئے طلبا و طالبات سیاست کے پہلے سال میں ڈائی سیکشن کے لیے مُردہ خانے میں آتے ہیں اور ان مُردوں کی چیر پھاڑ کرتے ہیں تو انہیں پاکستانی سیاست کے المیے کی پوری صورتحال معلوم ہوتی رہتی ہے۔ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ چھپانے سے منہ چھپتا ہے، کردار نہیں چھپتا۔ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ جو شاخِ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا۔"

شاکر چنگیزی نے غصے سے گرج کر کہا "ارے یہ باتیں بناتا رہے گا۔ بکواس کرتا رہے گا۔ ثبوت ہمارے ہاتھ لگنے نہیں دے گا۔ پہلے شمائلہ کو ٹھکانے لگاؤ۔ پہلے اس کا پیٹ چاک کرو۔"

وہ روتی ہوئی' انکار میں ہاتھ ہلاتی ہوئی بولی۔ "نہیں۔ رحم کرو' میرے بچے سے دشمنی نہ کرو۔"

پتھارے دار نے ریوالور رکھ لیا' ایک لانبا سا چاقو نکال کر کہا۔ "گولی چلانے سے یہ مرجائے گی' پیٹ چاک کرنے کے لیے یہ چاقو ٹھیک رہے گا۔"

ہمدانی ڈھال بن کر شمائلہ کے سامنے آگیا۔ چنگیزی نے اپنے ریوالور سے اس کا نشانہ لیا۔ شمائلہ نے فوراً ہی دھکا دے کر شوہر کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا "رک جاؤ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ رحم کرنا کسے کہتے ہیں؟"

عصر کا وقت ہو گیا تھا اجل الٹا لٹکا ہوا تھا لیکن الٹا لٹکنے سے کیا اذان سیدھی نہیں ہوتی؟

وہ دونوں ہاتھ اپنے کانوں تک لا کر بلند آواز سے کہنے لگا۔ "اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔"

اذان کے دوران چاقو کا پھل چمک رہا تھا۔ وہ تڑپ کر کہہ رہی تھی۔ "رحم کرو.........."

رحم کیا ہے؟

جو رعایت ایک بدنصیب کو کسی ظالم سے ملے' اسے رحم کہتے ہیں۔

ظالم خواہ کتنا ہی بے رحم ہو' کبھی اسے بھی رحم کی ضرورت پڑتی ہے۔

رحم وہ عمل ہے جو انسان کو سر جھکانا اور کتے کو دم ہلانا سکھاتا ہے۔

تم کیسے انسان ہو کہ ایک ماں کا پیٹ چاک کرنا چاہتے ہو۔

بے رحم! بے رحم! اتنا سن لے' رحم وہ مقدس جذبہ ہے کہ دنیا کے ہر انسان کے پہلے گھر کو رحم کا نام دیا گیا ہے۔

پتھارے دار ساکت رہ کر چنگیزی کو دیکھ رہا تھا۔ چنگیزی ادھر گیا تھا' جہاں شمائلہ اور ہمدانی کے لباس بکھرے پڑے تھے۔ وہ اپنی وردی اتار کر ہمدانی کا ایک لباس پہن رہا تھا۔ اس کے کانوں میں اذان کی آواز آرہی تھی۔ "آؤ نماز کی طرف آؤ۔ آؤ اپنی فلاح کی طرف آؤ۔ اللہ بڑا ہے۔ اللہ بڑا ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔"

کوئی مانے یا نہ مانے' حالات کبھی منوا دیتے ہیں کہ آدمی ذات میں تھوڑا الٹا ہے تھوڑا سیدھا ہے۔ اسے سامان میں چادر نہیں ملی۔ اس لیے شمائلہ کا دوپٹہ بچھا کر نماز پڑھنے لگا۔

پتھارے دار تذبذب میں تھا۔ قتل کا حکم دینے والا فرعون نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نماز کے دوران اسے قتل کا مرتکب ہونا چاہیے یا نہیں؟ وہ انتظار کرنے لگا۔

نماز مختصر تھی۔ چنگیزی نے سلام پھیرتے ہوئے ایک طرف گردن گھمائی تو اجل الٹا لٹکا ہوا نظر آیا۔ وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا' حیرانی سے بولا "تمہیں کس نے اس طرح لٹکایا ہے؟"

اجل نے کہا "میری بات چھوڑو۔ شمائلہ کی خبر لو۔"

اس نے گھوم کر شمائلہ اور ہمدانی کو دیکھا۔ تشدد سے ان کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ اس نے تیزی سے قریب آکر پوچھا "یہ سب کیا ہے؟ کس نے تمہارا یہ حال کیا ہے؟"

وہ میاں بیوی اس کے بدلے ہوئے رویے پر حیران تھے۔ پتھارے دار نے آگے بڑھ کر کہا "حضور! میں آپ کے حکم سے انہیں یہاں لایا ہوں۔ ان کے پاس ہمارے خلاف بہت سے ثبوت ہیں۔"

وہ سر ہلا کر بولا "ہاں مجھے کچھ یاد آرہا ہے۔ میں نے قانون ہاتھ میں لیا ہے۔ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر تم نے ایک خاتون پر ہاتھ کیوں اٹھایا ہے؟"

وہ چاقو دکھا کر بولا "حضور! آپ ہاتھ اٹھانے کی بات کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے ثبوت ہمارے حوالے نہیں کیے اس لیے میں اس کا پیٹ چاک کرنے والا ہوں۔ اس کا بچہ مرے گا تو.........."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی چنگیزی نے اس سے چاقو چھین لیا "سور کے بچے! تو ایک ماں کا پیٹ چاک کرے گا؟"

یہ کہتے ہی اس نے پتھارے دار کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ گھونپ کر پھر نکالا۔ خون کا ایک فوارہ سا نکلا۔ اس نے دوسری بار چھرا گھونپ کر اسے دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ پتھارے دار تڑپنے لگا۔ ایسی حالت میں بھی اجل نے اس کی روح قبض نہیں کی۔ اسے تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا۔

اسی وقت پتھارے دار کے پاس پڑے ہوئے موبائل فون سے اشارہ موصول ہوا۔ چنگیزی نے اسے اٹھا کر آپریٹ کیا۔ دوسری طرف سے تھانے دار رجب علی کی آواز سنائی

دی "ہیلو غوث بخش!"

"میں ایس پی شاکر چنگیزی بول رہا ہوں' کیا بات ہے؟"

"سر! میں آپ ہی سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ ٹیم ریسٹ ہاؤس میں آگئی ہے۔ بڑے صاحب آپ کو پوچھ رہے ہیں' میں کیا جواب دوں۔"

"ان سے کہو۔ میں دو گھنٹے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ بس یہاں سے چل رہا ہوں۔"

اس نے موبائل کو بند کیا پھر تیزی سے چلتا ہوا وہاں آیا' جہاں وردی اتاری تھی۔ اب اپنے اعلیٰ افسران کے سامنے وردی میں حاضر ہونا لازمی تھا۔

وہ شلوار قمیض اتار کر وردی پہننا چاہتا تھا۔ اسی لمحے میں پتھارے دار نے زمین پر پڑے ہی پڑے کروٹ لی۔ ریوالور کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالا۔ پھر گولی چلا دی۔ چنگیزی کے حلق سے کراہ نکلی۔ اس کے ہاتھ سے وردی چھوٹ کر گر پڑی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا قریبی دیوار کے پاس آیا پھر وہاں ایک محراب میں اٹک کر کھڑا رہ گیا۔ اجل نے اس کی روح قبض کرلی۔ اس سے پہلے پتھارے دار ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

اجل الٹا لٹک رہا تھا۔ ابھی ہمدانی اسے سیدھا کر دے گا۔ مسئلہ اجل کا نہیں ہے۔ وہ سیدھا ہو جائے گا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ وردی زمین پر پڑی ہوئی تھی' جو سیدھی پہنی جاتی ہے مگر اسے پہننے والا الٹا ہوتا ہے۔

وہ محراب میں اٹکا ہوا بے لباس کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر وردی ہوتی تو کیا فرق پڑ جاتا۔ بعض لوگ وردی پہن کر بھی صاف بے لباس نظر آتے ہیں۔

==================

حمام

اس داستان میں نواب صاحب نے حمام کو ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ہماری سیاست ایک غلیظ حمام نہیں تو اور کیا ہے؟ یہاں ہر سیاست دان اپنی برہنگی چھپانے کے لیے دوسروں کے ننگے پن کا واویلا کرتا نظر آتا ہے۔ اس حمام کو اقتدار کا راستہ سمجھ کر اس میں داخل ہونے والے کو ایمان داری اور دیانت داری کا لبادہ باہر ہی چھوڑنا ہوتا ہے۔ مفاد پرستی کی بوچھاڑ اُنہیں ملی تقاضوں اور مذہبی فریضوں سے بیگانہ کر دیتی ہے اور یہ ملک کی ابتر حالت کو مزید بدتر کر کے اپنی حالت کو بہتر بناتے رہتے ہیں۔ اس گندگی میں اتفاقاً وارد ہونے والی نفیس ہستی کو یہ بدطینت اپنی آلودگی میں شریک کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مزاحمت کرنے پر گھناؤنے منصوبے رُوبہ عمل لاتے ہیں۔ نتیجتاً اچھا بھلا پارسا اور دانا آدمی بھی نادانی کر بیٹھتا ہے.......... یوں نفاست جب غلاظت میں بدلتی ہے تو اندھیرے کچھ اور بڑھ جاتے ہیں' منزل کچھ اور دُور ہو جاتی ہے اور تعبیر پانے کے منتظر خواب بکھرنے لگتے ہیں.......... لیکن بُرائی کے خلاف برسرِ پیکار لوگ ظلمتوں سے گھبراتے ہیں نہ مسافت کو خاطر میں لاتے ہیں۔ اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی خاطر یہ ہر مصیبت کا سامنا خندہ پیشانی سے کرتے ہیں۔

یہ تو ازلی حقیقت ہے کہ اجل اپنے وقت پر آتی ہے اور اپنے مخصوص مقام پر پہنچ کر آتی ہے۔ اگر کاتبِ تقدیر نے لکھ دیا ہے کہ مغرب میں رہنے والے ایک شخص کو ہزاروں میل دور مشرق میں پہنچ کر اپنی آخری سانس پوری کرنی ہے' تو تقدیر اُسے کسی بہانے مشرق کے اس مخصوص مقام تک ضرور لے جائے گی۔

کاتبِ تقدیر نے حیات کے متعلق بھی کچھ ایسا ہی لکھا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ بچہ میٹرنٹی ہوم میں پیدا ہو یا گھر کی چاردیواری میں کسی دائی کے ہاتھوں سے جنم لے۔ شاہی محل میں پیدا ہونے والا بچہ اپنے محل سے ہزاروں میل دور عمرکوٹ میں پیدا ہو کر پاک و ہند کی تاریخ میں مغلِ اعظم کہلاتا ہے۔

اس تمہید کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ صائمہ کو ایک شکستہ سی جھگی میں پیدا ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ایک وزیر بے تدبیر کے عالیشان محل کے باتھ روم یعنی حمام میں پیدا ہوگئی۔ اس کی ماں سیما پورے دنوں سے تھی۔ زچگی کا وقت بالکل قریب تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا ذرا اٹھ کر ٹہلتی رہے۔ وہ ہدایت کے مطابق ٹہلتی رہی۔ پھر باتھ روم میں جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ دیوار کا اور دروازے کا سہارا لے کر اندر آئی۔ وہاں کا فرش چکنے ٹائلز کا تھا۔ پھر پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ وہاں دو قدم چلتے ہی پھسل کر ایسی گری کہ چیخیں مارتی ہوئی چاروں شانے چت پھسلتی چلی گئی۔

نرس دوسرے کمرے میں تھی۔ سیما کی چیخیں سنتے ہی دوڑتی ہوئی آئی۔ اس وقت تک اس کی چیخیں تھم گئی تھیں اور نوزائیدہ بچی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ فوراً ہی وہاں پہنچ کر زچہ اور بچہ کو سنبھالنے لگی۔

یہ کوئی سولہ برس پہلے کی بات تھی۔ خادم ذوالجلال دُرانی ایک نہایت ہی دین دار اور شرعی احکامات پر عمل کرنے والے شخص تھے۔ ایک وفادار بیوی اور ایک بیٹے اور بیٹی کے باپ تھے۔ سیاست کے میدان میں انسان کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے اور ذاتی مفاد پرستی غالب آجاتی ہے لیکن خادم ذوالجلال دُرانی کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ اُن کے بلند کردار کو دیکھ کر انہیں ایک اہم محکمے کا وزیر بنادیا گیا تھا۔ یہاں بھی وہ نہایت

فرض شناسی کا ثبوت دیتے رہے۔ بڑے سے بڑے بااثر شخص کی مجال نہیں تھی کہ ان سے کوئی غلط کام کرالیتا۔ سب ان سے نالاں بھی تھے اور سب ان کی عزت بھی کرتے تھے۔

پاکستان کی تاریخ میں ایسے ادوار گزر چکے ہیں جب اس ملک میں محبِ وطن اور ایماندار سیاستدان پائے جاتے تھے۔ ان میں سے کسی کو طبعی موت نے بڑی جلدی آلیا۔ کسی کو سازش کے تحت گولی مار دی گئی اور کسی کو بڑی رازداری سے ملک بدر کردیا گیا۔ خادم ذوالجلال دُرانی کے متعلق بھی سوچا جارہا تھا کہ ان کا کیا علاج کیا جائے؟ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں ایمان آٹے میں نمک کے برابر ہوتا ہے۔ اگر نمک زیادہ ہوجائے تو پکائی ہوئی روٹی تھوک دی جاتی ہے۔

انہیں سیاست کی دنیا سے باہر تھوکنے کے لیے سیما کا انتخاب کیا گیا۔ وہ ایک غریب والدین کی بیٹی تھی۔ ایک شکستہ سی کوٹھری میں رہتی تھی۔ غضب کا حسن و شباب پایا تھا۔ دیکھو تو آنکھیں نہیں ٹھہرتی تھیں پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنا پڑتا تھا۔ ایک سیاسی پارٹی کے چمچے نے اسے ملازمت دلانے کے لیے اپنے صاحب کے پاس پہنچایا۔ صاحب نے اسے دیکھتے ہی اندازہ کرلیا کہ وہ لڑکی خادم ذوالجلال دُرانی کی پارسائی کی ایسی تیسی کرکے اسے عوام کے سامنے ننگا کردے گی۔

صاحب نے سیما کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ گناہ کی طرف مائل نہیں ہوگی۔ لہٰذا اس کے ماں باپ کو راضی کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ان کے ایک بیٹے کو جھوٹے الزام میں جیل بھیج دیا گیا۔ دھمکی دی گئی کہ جوان بیٹی بھی کسی الزام میں اندر جائے گی تو جیل والے اس کی عزت کو کھلونا بنا کر کھیلیں گے۔

غریبوں کا پورا خاندان سہم گیا۔ صاحب کے منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے راضی ہوگیا۔ سیما نے دیکھا کہ اس کے بھائی کو جیل سے رہائی مل گئی ہے اور کاروبار کرنے کے لیے ایک لاکھ روپے دیئے گئے ہیں تو دُرانی صاحب کو ٹریپ کرنے کے لیے راضی ہوگئی۔

پھر اسے بڑے ڈرامائی انداز میں ایک ملازمہ کی حیثیت سے خادم ذوالجلال دُرانی کی رہائش گاہ میں پہنچایا گیا۔ بیگم صاحبہ ان دنوں تیسری زچگی کے لیے میکے گئی ہوئی تھیں۔ دو چار ماہ تک واپسی کی امید نہیں تھی۔ دُرانی نے اسے دیکھا تو کچھ عجیب سا محسوس کیا۔ اس نے کہا۔ ”تم گھر کا کام کاج سنبھال سکتی ہو لیکن بیگم آکر تمہاری مستقل ملازمت کا فیصلہ کریں گی۔“

اسے دوسری خادمہ کام سمجھانے کے لیے وہاں سے لے گئی لیکن دُرانی صاحب کو

یوں لگا جیسے وہ اب تک سامنے کھڑی ہے اور ساری دنیا سے الگ تھلگ نظر آ رہی ہے۔

یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مختلف کیوں ہے؟ حالانکہ ایک عورت ہے' ایک لڑکی ہے۔ مگر عجیب انداز میں بھڑکی ہے کہ جانے کے بعد بھی اس کی آنچ آ رہی ہے۔

وہ پہلے تو ایک دو روز اس سے کتراتے رہے۔ لاحول پڑھتے رہے۔ مگر وہ کسی نہ کسی خدمت کے لیے حاضر ہو جاتی تھی۔ ایک روز وہ تھک کر باہر سے آئے۔ صوفے پر بیٹھے تو ان کے جوتے اتارنے لگی۔ انہوں نے پاؤں کھینچ لیا۔ "ارے یہ کیا کرتی ہو؟ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔"

وہ فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے ایک پیر سے جوتا اتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے دیکھا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ انہوں نے حیرانی سے پوچھا "کیوں رو رہی ہو۔"

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ "میں غریب ہوں۔ سر پر نہیں چڑھ سکتی' پاؤں تو چھو سکتی ہوں۔"

"تعجب ہے' میرے پاؤں چھونے کے لیے رو رہی ہو؟"

"میں اس بے عزتی پر رو رہی ہوں کہ آپ کے پاؤں بھی چھو نہیں سکتی۔ کیا اللہ نے آپ کو اس لیے عزت دی ہے کہ آپ غریب کو قدموں میں رہنے کی بھی عزت نہ دیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہاری خدمت کے اس جذبے کو نہیں سمجھا۔ لو یہ دوسرا جوتا اتارو۔"

اس نے خوش ہو کر دوسرا جوتا اتارا لیکن جرابیں اتارتے وقت بڑی دیر لگائی۔ پیروں کو اپنی ہتھیلیوں کی گرمی پہنچاتی رہی۔ اپنی نازک انگلیوں کو محسوس کراتی رہی۔ پھر جوتے اور جرابیں اٹھا کر وہاں سے لے گئی۔ درانی صاحب کی عجیب حالت تھی۔ نازک انگلیاں اور حرارت بخش ہتھیلیاں صرف ان کے پاؤں کو نہیں ان کی کھوپڑی کو بھی سہلا رہی تھیں۔

وہ اس رات کروٹیں بدلتے رہے اور اپنی بیگم کو یاد کرتے رہے۔ یاد کرنے سے یاد آیا کہ بیگم کی ہتھیلیوں میں سہاگ رات والی حرارت نہیں رہی ہے۔ دو بچوں نے ٹھنڈا کر دیا ہے۔ اب تیسرے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ اگر موجود ہوتیں تو بچے کی طرف کروٹ لے کر سوتیں۔ ان کی طرف پشت کرتیں۔ پشت کرنے کا مطلب ہے' منہ پھیرنا یا پھر پہلے جیسی اپنائیت نہ رہنا۔

اس رات انہیں احساس ہوا کہ ان کے پاس مال و دولت' عزت و شہرت سب کچھ ہے' ایک اپنائیت نہیں ہے۔ جسے نکاح پڑھا کر لائے تھے' اس کی اپنائیت بچوں کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ پانچویں برس میں یہ تیسرا بچہ تھا۔ وہ بھی آتے ہی رہی سہی اپنائیت اپنے نام کرنے والا تھا۔ بیگم میکے سے بچوں کی ماں بن کر آتیں۔ بیوی تو بس رسمی طور پر کہلاتی رہتیں۔

وہ سیما کے متعلق سوچنا گناہ سمجھتے تھے لیکن اس کے حوالے سے بیگم کی اہمیت کچھ کم ہو رہی تھی۔ اگرچہ بیگم سے محبت پہلے جیسی تھی مگر محبت اور ضرورت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انہیں جوتے اور جرابیں اتارنے والی کی ضرورت تھی۔ جب ایسی اتارنے والی کی ضرورت پڑ جائے تو پھر مرد کی کھال بھی اتر جاتی ہے۔

دوسرے دن وہ صوفے پر آ کر بیٹھے تو وہ قدموں میں آ گئی۔ جوتے اتارتے وقت دانستہ اپنے شانے سے دوپٹے کو ڈھلکا دیا۔ انہیں یوں لگا جیسے پہلے نگاہوں کے سامنے خلا تھا اب نظارے بھر گئے ہیں اور سانسوں میں گرمی آ گئی ہے۔ انہوں نے کترا کر دوسری طرف دیکھا مگر گرم ہتھیلیاں اور مخروطی انگلیاں بدن کے ساز کو آوازیں دیتی رہیں۔ پھر وہ جوتے اور جرابیں اٹھا کر چلی گئی۔

مگر یہ بڑا ستم ہے کہ بعض جانے والے' جانے کے بعد اور قریب چلے آتے ہیں اور جب قریب ہوتے ہیں تو دور دور سے لگتے ہیں۔ جب کوئی دل و دماغ پر چھا جائے تو یہ ہوتا ہے کہ قربت میں دوری ہوتی ہے اور دوری سے قربت کی تپش آتی رہتی ہے۔

اس کوٹھی میں سیما کے علاوہ ایک پرانی ملازمہ اور دو ملازم تھے۔ باہر چوکیدار تھا۔ گڑبڑ کا اس وقت تصور نہ تھا۔ خریدنے والے درانی کو نہ خرید سکے لیکن ان کے تمام ملازموں کو بھاری قیمت پر خرید لیا تھا۔ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت پرانی ملازمہ اور ایک ملازم شام تک چھٹی لے کر چلے گئے۔

خادم ذوالجلال درانی کوٹھی میں پہنچے تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چوکیدار کو بلا کر پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ "صاحب! آپ نے رحمت بی بی اور قادر کو صبح چھٹی دے دی تھی۔ لالجی کوارٹر میں بیمار ہے۔ سیما بی بی اندر ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیں۔"

"نہیں' تم جاؤ۔"

وہ چلا گیا۔ درانی صاحب نے خالی کوٹھی کے اندر قدم رکھا تو دل بے اختیار تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ چور دل میں تھا کہ وہ خالی کوٹھی میں جوتے اور جرابیں اتارنے آئے

لیکن وہ نہیں آئی۔ انہوں نے صوفے پر بیٹھ کر ذرا انتظار کیا۔ پھر ذرا کھانس کر کھنکار کر اپنی موجودگی ظاہر کی۔ انہیں مایوسی ہوئی۔ حیرانی بھی ہوئی کہ ایک آہٹ پر آنے والی کہاں گم ہوگئی۔

انہوں نے جوتے اور جرابیں اتار کر گھر کے کپڑے بدلے پھر تولیہ لے کے باتھ روم کے دروازے پر پہنچے تو ٹھٹک گئے۔

وہ جیسے اُن کی موجودگی سے بے خبر تھی اور منتظر تھی۔ پھر خیال آیا کہ شرم اور شرافت غالب نہ آجائے اور وہ پلٹ کر چلے نہ جائیں۔ اس خیال سے وہ اچانک ہی چکنے فرش پر پھسل پڑی۔ چیخ مار کر کراہنے لگی۔ وہ تیزی سے لپکے پھر اسے سنبھالنے کے لیے جھکے تو خود بھی پھسل پڑے۔

پہلے زمانے میں تالاب اور دریا کے گھاٹ پر غسل کرنے والے کائی سے بچ کر چلتے تھے' مبادا پھسل نہ جائیں۔ کوئی پھسلنا اور گرنا نہیں چاہتا۔ پھر پتا نہیں کیوں حمام کے فرش پر چکنے ٹائلز بچھائے جاتے ہیں۔

اس روز انہیں پتا چلا کہ حمام کے پانی میں کبھی کوئی نہیں ڈوبتا' صرف شرم ڈوبتی ہے۔

وہ کمرے میں آئے تو بڑے شرمسار تھے۔ سیما ایک تولیے میں لپٹی' فرش پر بیٹھی رو رہی تھی اور اپنی عزت کی دہائی دے رہی تھی۔

وہ ندامت سے بولے۔ "مجھے معاف کردو۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔ جب سے تم آئی ہو' تب سے دور رہنا چاہتا تھا مگر نہ رہ سکا۔ پتا نہیں خدا مجھے معاف کرے گا یا نہیں' تم مجھے معاف کردو۔"

وہ رو رو کر سسک سسک کر بولی "آپ میری عزت مجھے واپس دے دیں میں معاف کردوں گی۔"

"مم.......... میں عزت کیسے واپس کروں؟ میں بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"آپ ایمان والے ہیں۔ جرمانہ ادا نہ کریں۔ حقدار کو اس کا حق ادا کریں۔ میری عزت گئی ہے تو آپ عزت دے کر ہی مجھے عزت دار بناسکتے ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ بات سمجھ میں آرہی تھی۔ اسے عزت دے کر عزت دار بنانے کا مطلب یہ تھا کہ اس سے شادی کی جائے۔ جبکہ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ملازمہ تھی اور وہ ایک عزت دار خاندانی آدمی تھے۔ وزیر کا رتبہ ماسوا تھا۔ ایسے میں سیما سے شادی کرنے

سے سیما کو عزت مل جاتی مگر اپنی عزت خاک میں مل جاتی۔

انہوں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم مجھے بدنام کرو گی؟"

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "میں نے جسے تن من دیا ہے' اسے کبھی بدنام نہیں کروں گی لیکن.........."

وہ چپ ہوگئی۔ انہوں نے پوچھا "لیکن؟"

"اب میں کسی اور مرد کا منہ نہیں دیکھوں گی' کبھی شادی نہیں کروں گی' اگر آپ مجھ سے شادی نہیں کرسکتے' مجھے اپنی کنیز بناکر تو رکھ سکیں گے۔"

"کنیز کا مطلب کیا یہ ہُوا کہ داشتہ بناؤں۔ یہ تو گناہ ہے۔"

"گناہ تو ہوچکا۔ آپ تلافی کی بات کریں۔"

وہ سر تھام کر رہ گئے۔ پھر بولے۔ "مجھے سوچنے کا موقع دو۔"

"میں آپ کے قدموں کی دھول ہوں۔ آپ ساری عمر سوچتے رہیں۔"

وہ کمرے سے چلی گئی۔ شام کو ملازمہ رحمت بی بی اور ملازم قادر بخش آگئے۔ باورچی کی بھی طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ رحمت بی بی نے کمرے میں صفائی کرتے ہوئے درانی صاحب سے کہا۔ "پتا نہیں سیما کو کیا ہوگیا ہے؟"

انہوں نے فوراً پوچھا۔ "کیا ہوگیا ہے؟"

"اب میں کیا بتاؤں؟ وہ تو کچھ بولتی ہی نہیں ہے۔ بہت زیادہ پوچھا تو رونے لگی۔"

انہیں ندامت کا احساس ہوا۔ وہ بھلا رحمت بی بی سے کیا کہہ سکتے تھے۔ وہ جس تکلیف سے رو رہی تھی اس کا علاج وہ خود ہی کرسکتے تھے۔

رحمت بی بی چلی گئی۔ انہوں نے تھوڑی دیر بعد قادر بخش کو بلا کر ایک لباس استری کرنے کو دیا۔ وہ لباس لیتے ہوئے بولا "حضور! یہ سیما کچھ پاگل سی ہوگئی ہے۔"

انہوں نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ ایک چھوٹا سا آئینہ اس سے ٹوٹ گیا تھا اور وہ اسے جوڑ رہی تھی' میں نے کہا پگلی! یہ معمولی سا آئینہ ہے پھینک دے' صاحب غصہ نہیں کریں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے' اس سے کہو' اسے پھینک دے۔"

"مگر اس نے آئینہ جوڑ دیا ہے۔ وہ جو شیشہ جوڑنے کا ایک ٹیوب ملتا ہے نا' اس سے اسے جوڑ دیا ہے لیکن حضور! ایک بات ہے۔"

"کیا بات ہے۔"

"آئینہ تو جُڑ گیا ہے مگر اس میں بال پڑ گیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ لباس استری کرنے چلا گیا۔ درّانی صاحب صوفے پر ایسے بیٹھے جیسے گر پڑے ہوں۔ یہ احساس ہونے کی بات ہے۔ ورنہ آدمی بے حس اور بے ضمیر ہوتو وہ کسی بے سہارا غریب کی عزت لوٹنے کے بعد اسے نظرانداز کردیتا ہے۔ ایسی کتنی ہی نوکرانیاں آتی ہیں اور مالکن کی کمی پوری کرکے چلی جاتی ہیں لیکن درّانی صاحب حساس تھے۔ کسی سے کچھ لیتے تھے تو اسے واپس کرنا نہیں بھولتے تھے۔

انسان خطا کا پُتلا ہے۔ اس بار انہوں نے ایسی چیز لی تھی' جس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ وہ اسے غریب بے سہارا سمجھ کر ٹال نہیں سکتے تھے۔ ان کی شرافت کہتی تھی کہ غریب کی بھی آبرو ہوتی ہے اور یہ آبرو اس کے مرد سے ہوتی ہے' وہ جذبات میں بہہ کر ایک دو کوڑی کی نوکرانی کی آبرو کے لٹیرے بن بیٹھے تھے۔ حق تو یہی تھا کہ وہ اسے اپنی عزت بناکر اس کا حق ادا کرتے مگر یہی مرحلہ بہت دشوار تھا۔

رات کے نو بجے باورچی نے آکر پوچھا۔ "سرکار! کھانا لگاؤں؟"

"نہیں' مجھے بھوک نہیں ہے۔"

ان کی بھوک مرگئی تھی۔ وہ محل نما کوٹھی سکڑ کر اتنی تنگ ہوگئی تھی جیسے شکنجے میں جکڑ کر کیے کی سزا دے رہی ہو۔ اگر اتنی شاندار کوٹھی نہ ہوتی' اتنا خوبصورت حمام پھسلنے کے لیے نہ ہوتا تو وہ کبھی نہ پھسلتے۔ جو کچھ ہوا' حمام میں قدم رکھنے سے ہوا۔

ایک حمام میں ایک ہو یا سب ہوں' سب ننگے ہوتے ہیں اور یہ ایک ننگی حقیقت ہے کہ حمام کے نلکے سے یا شاور سے پانی بہنے سے پہلے آنکھ کا پانی مرجاتا ہے۔

یہ وہ جگہ ہے' جہاں بدن کا میل ڈھلتا جاتا ہے اور بدن جتنا صاف ہوتا جاتا ہے' نیت اتنی ہی میلی ہوتی جاتی ہے۔

درّانی صاحب نے یہ طے کیا کہ دوسری صبح راج مستری کو بلاکر حمام کے فرش سے تمام ٹائلز اکھڑوا دیں گے۔ ابھی تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آدمی پھسلتا کیسے ہے؟ ٹائلز پر؟ کیلے کے چھلکے پر؟ دودھ کی بالائی پر یا بدن کی چکنائی پر؟

حمام کے فرش کا کوئی قصور نہیں تھا۔ حمام تو ایک ایسی چاردیواری کا نام ہے' جسے جنت میں انجیر کا پتّا کہا گیا تھا' ان پتّوں نے آدم علیہ السلام اور حوا کی ستر پوشی کی تھی۔ آدم زادوں نے ان پتّوں کی چاردیواری بناکر اسے حمام کا نام دیا ہے۔

درّانی صاحب کو یہی صدمہ تھا کہ حمام کا دروازہ کھلا ہی سہی' وہ اندر کیوں گئے؟ لفافہ کھلا ہو' تب بھی اس کے اندر جھانک کر خط کا مضمون پڑھنا اخلاق و آداب کے خلاف ہے۔

باورچی نے پھر ایک گھنٹے بعد آکر پوچھا۔ "سرکار! دس بج چکے ہیں' کھانا لگاؤں؟"

"کہہ جو دیا کہ بھوک نہیں ہے۔ جاؤ مجھے سونے دو۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے جانے لگا۔ "مجھے معلوم ہوتا تو آج روٹیاں نہ پکاتا۔ وہ بھی کھانے سے انکار کررہی ہے۔"

انہوں نے چونک کر باورچی کو دیکھا۔ پھر پوچھا "کس کی بات کررہے ہو؟"

وہ جاتے جاتے دروازے کے پاس رک گیا پھر پلٹ کر بولا "وہ جو اپنی سیما ہے نا' وہ کچھ بیمار سی' اداس سی لگ رہی ہے۔ میں نے کئی بار کھانے کے لیے کہا مگر وہ بھی کہتی ہے' بھوک نہیں ہے۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ ایک تو وہ حساس اور ضمیر والے تھے۔ ان پر مختلف ذرائع سے اپنے گناہ کا احساس شدت اختیار کررہا تھا۔ ایک غریب مظلوم لڑکی کی تباہی دل پر کچوکے لگا رہی تھی۔ وہ بڑی دیر تک ٹہلتے رہے پھر بستر پر گر کر کروٹیں بدلتے رہے۔

پتا نہیں کتنی رات گزر گئی۔ آہٹ سن کر دروازے کی طرف دیکھا تو دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ وہ سرجھکائے کھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے پریشان ہوکر کھلے دروازے کو دیکھا۔ پھر جلدی سے اٹھ کر دروازے کو بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "اس وقت آئی ہو' کسی ملازم نے دیکھ لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

وہ بھی دھیمی آواز میں بولی۔ "آپ کی عزت پر حرف نہیں آئے گا۔ سب سو رہے ہیں۔ میں اطمینان کرنے کے بعد آئی ہوں اور اپنے کسی مطلب سے نہیں آئی ہوں۔"

"میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا اور شرمندہ ہو رہا تھا۔"

"اور میں یہ سن کر آئی ہوں کہ آپ بھوکے ہیں۔"

"تم.......... تم بھی تو بھوکی ہو۔"

"میری بھوک خودکشی کے بعد ختم ہوجائے گی۔"

انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اُس کے شانوں کو تھام کر کہا۔ "پاگل ہوگئی ہو؟ کیا مجھے جیتے جی مارنا چاہتی ہو؟"

اُس کے شانوں کو بے اختیار تھامنے کے بعد پتا چلا' خواہشوں کے ہجوم کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا ہے۔

وہ بولی "میں محسوس کررہی ہوں کہ آپ کے ذہن پر بوجھ بن گئی ہوں۔ میں نہیں رہوں گی تو آپ میرے حقوق کی ادائیگی سے بری ہوجائیں گے۔"

"اوہ سیما! کیا تم میرے لیے جان دو گی؟"

اُس نے اپنی مٹھی کھول کر ایک چھوٹی سی شیشی دکھائی پھر کہا "یہ زہر ہے۔ اس کے چند قطروں سے وہ گناہ چھپ جائے گا' جو ہم سے ہوا ہے۔ آپ پھر سے باعزت زندگی گزار سکیں گے۔"

انہوں نے فرطِ محبت سے اسے کھینچ کر گلے لگا لیا۔ جذباتی انداز میں کہا۔ "میں بھی تمہارے لیے جان دے سکتا ہوں کیونکہ جان دینا آسان ہے لیکن عزت دینا اور بے عزتی سے مرنا بہت مشکل ہے۔ میں تمہارے لیے جاں دوں گا تو خاندان کی ناک کٹے گی اور تم میرے لیے جان دو گی تو میرا ضمیر مجھے مار ڈالے گا۔ ہمیں دانائی کا کوئی راستہ نکالنا چاہیے۔"

وہ دانائی کا راستہ نکالنے کے لیے پھر نادانیاں کرنے لگے۔ رات گزرنے لگی۔ صبح سے پہلے یہ طے پایا کہ دونوں چپ چاپ بڑی رازداری سے نکاح پڑھوالیں گے۔ وہ اسی شہر میں ایک چھوٹی سی کوٹھی اسے خرید کر دیں گے اور چوری چھپے اس سے ملتے رہیں گے۔

سیما نے وعدہ کیا کہ وہ ان کی عزت کو کبھی خاک میں ملنے نہیں دے گی۔ کبھی کسی پر ظاہر نہیں کرے گی کہ وہ بہت بڑے خاندانی رئیسِ اعظم اور ایک وزیر کی شریکِ حیات ہے۔

انہوں نے چار بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ' ڈائننگ روم والی کوٹھی سیما کے نام سے خریدی۔ سیما کے بھائی اور والدین نے جتنی بڑی قسمیں تھیں' وہ سب کھائیں اور یہ یقین دلایا کہ جب تک دُرّانی صاحب نہیں چاہیں گے' اس وقت تک خفیہ نکاح کے متعلق کوئی بات ان کی زبان پر نہیں آئے گی اور نہ ہی کبھی وہ دُرّانی صاحب سے کوئی دور کا رشتہ ظاہر کریں گے۔

اس یقین دہانی اور طرح طرح کی قسموں اور وعدوں کے بعد انہوں نے ایک رات خفیہ طور پر سیما سے نکاح پڑھوالیا اور اسے اپنی شریکِ حیات بنالیا۔

گناہ چھپ گیا کیونکہ اب وہ شریکِ حیات تھی۔ بے شک ایک نیک عمل سے برائی کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن نیک عمل مجرمانہ انداز میں ہو تو پھر وہ نیکی ایک غلطی بن کر رہ جاتی ہے۔

وہ سیما کے ساتھ گناہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے نکاح پڑھوایا تھا لیکن شرعی عمل خفیہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک عالم کے روبرو ہوتا ہے' اگر ایسا نہ ہو تو شریعت کو کھلونا بنا کر

عیش کرنے والی کفرانہ غلطی ہے۔

اپنی عزت اور خاندانی وقار کو قائم رکھتے وقت ایک اچھا مسلمان بھی ایسے چند اہم پہلوؤں کو نظرانداز کردیتا ہے۔ دُرّانی صاحب کے سامنے بھی یہی راستہ تھا کہ وہ شریعت پر عمل کریں۔ مگر چھپ کر کریں۔ ایسے وقت یاد نہیں رہتا کہ چھپ کر جو بھی کام ہوتا ہے' وہ مجرمانہ ہوتا ہے۔

پہلے اس مجرمانہ فعل کے نتائج ظاہر نہیں ہوتے۔ رفتہ رفتہ پتا چلتا ہے کہ ایک غلطی کو چھپانے کے لیے دوسری اور پھر تیسری غلطیاں کرنی پڑتی ہیں۔ یوں غلطیوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔

پہلے تو سیما کے رشتے داروں نے سوال کیا کہ وہ کوٹھی والی کیسے بن گئی۔ اس کے والدین نے یہ کہہ کر ٹالا کہ اللہ دیتا ہے۔ بڑا بیٹا زبیر کاروبار کر رہا ہے اور انہیں دولت اور عزت مل رہی ہے۔

لیکن یہ تو اُن بڑے لوگوں کی سازشیں تھیں جو حاکم ذوالجلال دُرّانی کی دیانتداری سے تنگ آئے ہوئے تھے اور سیاست میں رہ کر اپنا اُلو سیدھا کرنے کا موقع انہیں نہیں مل رہا تھا۔ وہ جب بھی بینک سے بڑی رقومات قرضے کے طور پر لینا چاہتے تو ان کی درخواستیں نامنظور کی جاتی تھیں۔

دُرّانی صاحب ان درخواستوں پر ریمارکس لکھتے تھے کہ پہلے اپنی جائیداد کی تفصیلات درج کی جائیں' پھر جائیداد کو گروی رکھ کر قرضہ لیا جائے۔

یہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے لیے گھاٹے کا سودا ہوتا' اگر زمیندار اپنی زمینوں کو اور صنعت کار اپنی ملوں اور فیکٹریوں کو گروی رکھ کر کروڑوں روپے قرض لیتے تو ادائیگی ضرور کرنی پڑتی جبکہ نیت ادائیگی کی نہیں تھی۔ ملک کے تمام بینکوں میں جتنی دولت تھی' وہ اپنے باپ کا مال سمجھتے تھے۔ اپنے دورِ اقتدار میں جس حد تک لوٹ کھسوٹ سکتے تھے وہ لوٹ لینا چاہتے تھے۔ کل کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ کوئی دوسری پارٹی اقتدار میں آجاتی تو ان نادہندگان کے قرضوں کا حساب کرتی اور ان کی زمینیں اور صنعتیں ضبط کروادیتی۔

اس ملک میں سیاستدانوں کا پہلا قدم یہی ہوتا ہے کہ اقتدار سنبھالتے ہی وہ ملک کی بگڑی ہوئی حالت کو نہیں سنبھالتے بلکہ ایک دوسرے کی پارٹیوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں میں اپنی حکومت کی مدت پوری کرتے ہیں۔

ان دنوں حکمران پارٹی کے کچھ ارکان ایسے تھے جو بینک سے قرضے لینا چاہتے تھے۔

جب درّانی صاحب سیدھی طرح ان کے قابو میں نہ آئے تو انہوں نے پلاننگ کی کہ پہلے خود درّانی صاحب ہی بینک سے قرضہ لیں جبکہ وہ رئیس اعظم تھے۔ انہیں قرض لینے کی ضرورت نہیں تھی لیکن سازشیں کرنے والے اندر کی خبر رکھتے ہیں۔ درّانی صاحب کی شادی چچا کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ خاندان کے بزرگ یعنی ان کے والد اور چچا زندہ تھے۔ زمین جائیداد اور بینک بیلنس وغیرہ کے کاغذات بزرگوں کو تحویل میں تھے۔

اگر درّانی صاحب بزرگوں سے لاکھوں روپے طلب کرتے تو انہیں مطلوبہ رقم مل جاتی لیکن یہ ضرور پوچھا جاتا کہ اتنی بڑی رقم کس سلسلے میں لی جارہی ہے؟ یہ رقم کہاں خرچ ہوگی اور واپسی میں کتنا منافع لائے گی؟

انہی معلومات کی بنا پر یہ منصوبہ بنایا گیا کہ درّانی صاحب کی زندگی میں دوسری عورت آئے اور انہیں بے پناہ اخراجات میں مبتلا کردے۔ ان کے ذاتی اکاؤنٹ میں جتنی رقم تھی اس سے انہوں نے سیما کے لیے کوٹھی اور کار خرید لی تھی۔ زیورات کے سیٹ بھی خرید کر دے دیئے تھے۔ اس طرح اب ان کے اکاؤنٹ میں چند ہزار روپے رہ گئے تھے۔

زمیندار چوہدری حاکم علی برسرِ اقتدار پارٹی کا بندا تھا۔ اپنی کچھ زمینیں بیچ کر لمبا مال خرچ کرکے اسمبلی میں پہنچا تھا۔ خیال تھا کہ اپنی حکومت قائم ہوگی تو پانچ لاکھ کی جگہ پچاس لاکھ بنائے گا۔ آس پاس کے دیہات کی زمینیں خریدے گا تو ان تمام دیہات کے مزارع اور دیگر باشندے اس کی رعایا کے طور پر رہیں گے اور اگلے الیکشن میں ووٹروں کی تعداد ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں تک پہنچ جائے گی۔

پہلے زمیندار اور جاگیردار کہلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ زمینیں خریدی جاتی تھیں اور اپنے پنڈ کی تعداد بڑھائی جاتی تھی۔ اب ووٹروں کی تعداد بڑھانے کے لیے زمینیں اور بستیاں خریدی جاتی تھیں اس لیے حاکم علی کو کم از کم پچاس لاکھ روپے کی ضرورت تھی۔ ان دنوں پچاس لاکھ بہت ہوا کرتے تھے اور بندہ پانچ دس لاکھ خرچ کرکے اسمبلیوں تک پہنچ جایا کرتا تھا۔ اب تو ہارس ٹریڈنگ وغیرہ کے باعث کروڑوں روپے خرچ ہونے لگے ہیں۔

حاکم علی نے سیما کے پاس آکر کہا۔ "تم نے یہاں تک ہماری مرضی کے مطابق بازی کھیلی ہے۔ یہ بتاؤ کہ میرے مشوروں پر عمل کرنے سے تمہارا برا ہوا یا بھلا؟"

سیما نے کہا۔ "آپ تو میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔ پہلے میں نے آپ کے متعلق غلط رائے قائم کی تھی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ میرے بھائی کو جیل بھیج کر مجھے اپنی

رت سستی کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میرا طریقہ کار کچھ ایسا ہی ہے۔ میں کسی کے ساتھ نیکی کرتا ہوں تو پہلے اس میں برائی نظر آتی ہے۔"

سیما کے بھائی زبیر نے کہا۔ "واقعی آپ کا عجیب طریقہ کار ہے۔ پہلے مجھے جیل بھجوادیا پھر رہائی دلا کر مجھے کاروبار کے لیے ایک لاکھ روپے دیئے۔ آپ کی مہربانی سے ہم بہت خوشحال ہوگئے ہیں۔"

"کیا خاک خوشحال ہوئے ہو؟ لاکھ روپے میں دھاگے رنگنے اور موٹے کھدر کے جیسے کپڑے تیار کررہے ہو۔ کیا ایک بڑی ٹیکسٹائل ملز کے مالک بننا نہیں چاہتے؟"

"جناب چوہدری صاحب اس کے لیے تو کم سے کم پچیس تیس لاکھ روپے کی ضرورت ہوگی۔ اتنی بڑی رقم کے ہم صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔"

"ایسے خوابوں کی تعبیر تمہاری بہن سیما ہے۔ تم اپنے بہنوئی درّانی صاحب کو نہیں جانتے کہ وہ کس محکمے کے وزیر ہیں۔ ان کے ایک دستخط سے لاکھوں کیا کروڑوں روپے قرض کے طور پر مل سکتے ہیں۔"

سیما نے پوچھا "کیا میرے سرتاج دستخط کرنے پر راضی ہوجائیں گے؟"

"نہیں، پہلے تو وہ ٹالنے کی کوششیں کریں گے۔ قانونی نکتہ پیش کریں گے کہ انہیں جائیداد گروی رکھنی پڑے گی اور تم تو جانتی ہو کہ درّانی صاحب کے والد اور تمہاری سوکن کی جائیداد کئی کروڑ کی ہے۔"

سیما نے کہا۔ "اس طرح یہ راز کھل جائے گا کہ میں ان کی منکوحہ ہوں۔ بڑے جھگڑے پھیلیں گے۔ ہم نے قسم کھائی ہے کہ یہ راز کھلنے نہیں دیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ اپنی زبان پر قائم رہنا چاہیے لیکن اپنی سوکن کے برابر دولت اور جائیداد کی مالکہ بننا بھی ضروری ہے۔ سیاست کے کھیل میں بڑے بڑے کھلاڑی دیوالیہ ہوجاتے ہیں۔ جب وہ دیوالیہ ہوجائیں گے اور جب تمہاری سوکن انہیں اپنی دولت سے سہارا دے گی تو عزت مان مرتبہ کس کا بڑھے گا' تمہارا یا سوکن کا؟"

بھائی اور والدین نے بھی سیما کو سمجھایا کہ چوہدری صاحب عقل کی باتیں سمجھا رہے ہیں۔ ایک وزیر کی شریکِ حیات بنانے کی راہ دکھانے والے چوہدری صاحب جو کہہ رہے ہیں اس کی بھلائی کے لیے کہہ رہے ہیں اور یہ تو ہر عورت سمجھتی ہے کہ اپنی سوکن سے بڑھ کر رہنے والی عورت ہی اپنے شوہر کے دل و دماغ پر راج کرتی ہے۔ اسے بھی ایسا کرنا چاہیے۔

سیمانے پوچھا۔ "مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ اپنے مستقبل کا تحفظ چاہو۔ اپنے شوہر سے کہو کہ تم اپنے نام سے ایک ٹیکسٹائل ملز قائم کرنا چاہتی ہو۔ ایسی مل قائم کرنے کے لیے تمہیں مشیر اور ایکسپرٹ مل جائیں گے۔"

وہ بولی۔ "پھر وہی مسئلہ درپیش ہوگا۔ وہ میری سوکن وغیرہ کی جائیداد گروی رکھنا چاہیں گے تو ہماری ازدواجی زندگی کا بھید کھل جائے گا۔"

"کوئی ضروری نہیں کہ جائیداد گروی رکھی جائے۔ درّانی صاحب ایک حکم جاری کریں کہ فلاں ہستی کو لاکھوں روپے قرض دیئے جائیں تو بینک والوں کی مجال نہیں ہے کہ وہ ان کے حکم سے انکار کریں۔ اگر بینک کا کوئی ڈائریکٹر انکار کرتا ہے تو اس کا تبادلہ کردیا جاتا ہے۔ تنزلی کی جاتی ہے یا اسے ریٹائر کردیا جاتا ہے اور اس کی جگہ اپنا حکم ماننے والے بندے کو ڈائریکٹر کا عہدہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح نوکر شاہی جنم لیتی ہے۔"

"یہ نوکر شاہی کیا ہوتی ہے؟"

"یہ نوکروں کا شاہانہ انداز ہوتا ہے۔ اگر ایک وزیر غیر قانونی طور پر ایک کروڑ کا قرضہ لے گا تو وہ قرضہ دینے والا ڈائریکٹر خود پچیس تیس لاکھ کا قرضہ اپنے کسی رشتہ دار کے نام پر منظور کرائے گا اور اس کے لیے وزیر موصوف سے دستخط لے گا۔ کیونکہ وزیر' ڈائریکٹر اور چپراسی تک کے قرضے غیر قانونی حمام میں ہوتے ہیں۔ اس حمام سے باہر آکر کوئی اپنا ننگاپن ظاہر نہیں کرتا۔ سب اپنے راز چھپاتے ہیں۔"

سیمانے کہا۔ "مگر یہ تو سراسر بددیانتی ہے' میرے سرتاج ایسا نہیں کریں گے۔"

"میں مانتا ہوں کہ اُن کی دیانتداری کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مگر آدمی آدمی ہوتا ہے' فرشتہ نہیں ہوتا۔ درّانی صاحب پہلے ایسے نہیں تھے مگر پہلے تم سے بددیانتی کی۔ اس بددیانتی کو چھپانے کے لیے اپنے اور تمہارے رشتے کو راز بنا کر رکھ رہے ہیں۔ اب یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ میں جیسا کہتا ہوں ویسا کرتی رہو۔ ایک دن تم اپنی سوکن سے زیادہ دولت مند اور عزت دار کہلاؤ گی۔"

چوہدری ایسے بہت سے گُر سکھا کر چلا گیا۔ خادم ذوالجلال درّانی دو دنوں کے بعد دورے سے واپس آئے تو سیما کو اداس پایا۔ وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔ "ہماری یہ خواب گاہ ایسا حمام ہے' جہاں کی بے لباسی صرف ہم جانتے ہیں۔ اس حمام کے باہر میری حیثیت نہیں ہے۔ میرا کوئی شوہر نہیں ہے۔ میں نے وعدہ کیا ہے' اس رشتے کو زبان پر نہیں لاؤں گی' لیکن میری کوئی سماجی اور مالی حیثیت ہونی چاہیے۔"

درّانی صاحب نے کہا۔ "تمہارے والدین کے لیے یہ بات پریشان کن ہوگی کہ تم و کتنی عمر تک کنواری کہلاتی رہوگی۔"

"یہ کوئی خاص پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں اپنی مرضی کی مالک خود بن سکتی ں۔ اگر میری مالی حالت مستحکم ہو تو میں کسی کی محتاج نہیں رہوں گی۔ ساری عمر کنواری ہنے پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔"

"لیکن تم اب بھی کسی کی محتاج نہیں ہو۔"

"رشتے دار اور دوسرے پوچھتے ہیں اور تجسس میں رہتے ہیں کہ میں کوٹھی اور کار مالکہ کیسے بن گئی ہوں۔ آپ بتائیں میں انہیں کس طرح مطمئن کروں۔ بہانہ کرتی ں کہ زبیر بھائی جان کے کاروبار میں ترقی ہو رہی ہے مگر یہ بہانہ کب تک چلے گا۔ بھائی ن کی شادی ہوگی اور بھابی آئے گی تو اس سے یہ راز چھپا نہیں رہے گا کہ یہ شان و ت ایک دکھاوا ہے۔ یہ کوٹھی' کار اور بینک بیلنس میرا ہے' بھائی جان کا کچھ نہیں ہے۔ مجھے بھائی جان کی شادی سے پہلے اپنی ایک الگ حیثیت بنانی ہوگی۔"

"تم درست کہتی ہو۔ اگر تمہاری ایک الگ مالی حیثیت ہو تو کوئی بھی زندگی بھر واری رہنے پر اعتراض نہیں کرے گا اور نہ ہی کوئی تمہارے مزاج کے خلاف سوالات ے گا۔"

"میں چاہتی ہوں' میرا ایک الگ کاروبار ہو۔ آپ چاہیں تو میری ایک الگ حیثیت سکتے ہیں۔"

"بے شک' میں ایسا کرسکتا ہوں لیکن تمہیں کاروبار کا تجربہ نہیں ہے۔"

"آپ ساری دنیا میں گھومتے پھرتے ہیں' کیا آپ ایک دو ایسے مشیر اور ایکسپرٹ ہم نہیں کرسکتے جو کاروبار میں میری رہنمائی کرتے رہیں؟"

"ہاں' ایسا ہو سکتا ہے لیکن تم کاروبار کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"ایک ٹیکسٹائل مل قائم کروں گی۔"

وہ حیرانی سے بولے۔ "کیا کہہ رہی ہو' اس میں کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔"

"چھوٹے پیمانے پر سہی۔ آپ پچاس لاکھ سے ابتدا کراسکتے ہیں۔"

"پچاس لاکھ میں چند مشینیں آئیں گی۔ اس کی چار دیواری قائم کرنے' زمین نے اور ابتدائی کم سے کم فائدے کو برداشت کرنے کے لیے شاید دو کروڑ روپے ں گے۔"

"کیا میں ایک وزیر کی شریکِ حیات ہو کر دو کروڑ کا بزنس کرنے کے لائق بھی نہیں

ہوں۔"

"بات وزارت کی نہیں ہے' رقم کی ہے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی"

"بینک سے اور کہاں سے۔"

"ایں؟" انہوں نے چونک کر سیما کو دیکھا۔

وہ بولی۔ "آپ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کیا آپ اسٹیٹ بینک کے گورنر سے کسی طرح کم ہیں؟ آپ اپنے ایک دستخط سے کروڑوں روپے قرض لے سکتے ہیں اور کسی کو قرض دلا سکتے ہیں۔"

"کیا تم جانتی ہو کہ قرض لینے کے لیے ضمانت دینی پڑتی ہے۔ جائیداد گروی رکھوانی پڑتی ہے۔"

"یہ قانون عام لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ وزیروں اور حکمرانوں کے لیے نہیں ہوتا۔"

"یہ' یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"ہاں' میں کہہ رہی ہوں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارے ملک میں حکمرانوں کا محاسبہ نہیں کیا جاتا ہے۔"

"خدا تو ہمارا محاسبہ کرتا ہے۔ خدا تو ہمارے اعمال دیکھ رہا ہے۔"

"کیا خدا یہ نہیں دیکھ رہا کہ میں آپ کی بیوی ہوتے ہوئے بھی بیوی نہیں ہوں۔"

دُرانی صاحب کو چپ سی لگ گئی۔ اچانک غلطی کا احساس ہوا کہ نکاح پڑھانے کے بعد بھی ان کے اعمال درست نہیں ہوئے ہیں۔ گناہ تو نکاح کے پردے میں چھپ گیا ہے لیکن نکاح کو چھپانے کا مجرمانہ فعل سرزد ہوتا چلا آرہا ہے۔

وہ سر جھکا کر بولے۔ "واقعی میں دنیا والوں کے سامنے تمہیں بیوی کا درجہ نہیں دے رہا ہوں۔"

"میں دنیا والوں کے سامنے بیوی کہلانا نہیں چاہتی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ میرے مجازی خدا ہیں۔ میں آپ سے عزت چاہتی ہوں۔ وہ عزت جو میری سوکن کو حاصل ہے۔ وہ ایک بڑے خاندان والی کہلاتی ہے' صرف اس لیے کہ اُس کے پاس باپ کی دولت اور زمینیں ہیں۔ اس میں سرخاب کے پَر نہیں لگے ہیں کہ وہ مجھ سے بلند اور برتر ہوگئی ہے۔ میں ایک بہت بڑی مل کی مالکہ کہلاؤں گی تو دنیا جھک کر سلام کرے گی۔ کوئی میرا شجرہ نہیں پوچھے گا۔ میرے اس نام سے شجرے کو پہچانے گا جو ٹیکسٹائل مل کی پیشانی پر لکھا ہوگا اور وہ ہوگا۔ "سیما ٹیکسٹائل ملز۔"

دُرانی صاحب اس رات بہت پریشان رہے۔ سیما تمام رات روتی رہی اور اپنی الگ حیثیت منوانے اور سوکن سے برتر ہونے کی ضد کرتی رہی۔ وہ ان کی عزت تھی۔ وہ اسے چاہتے تھے۔ حق کا تقاضہ یہ تھا کہ اسے جتنی عزت دیتے اتنا ہی ان کا ضمیر مطمئن ہوتا کیونکہ وہ ان کی خاطر تمام عمر بن بیاہتا کہلانے والی تھی۔

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود دل نہیں مانتا تھا۔ ایمان کہتا تھا بینک میں عوام کا روپیہ ہے' جو مختلف ذرائع سے ٹیکس وغیرہ کی صورت میں آیا ہے۔ بینک کی یہ دولت ملکی ترقی اور خوشحالی کے لیے ہے۔ وزیر اور حکمران بن کر لوٹنے کے لیے نہیں ہے۔

وہ تمام رات سوچتے رہے کہ پہلی بیوی کی طرح سیما کو بھی شاندار زندگی گزارنے کا حق ہے۔ یہ حق ایک شوہر ہی دے سکتا ہے لیکن کیسے؟

وہ اکثر راتوں کو ایک گارڈ کے ساتھ چھپ کر کار میں آتے تھے۔ سیما کی کوٹھی میں رہتے تھے پھر صبح سے پہلے پہلے چلے جاتے تھے۔

اب جو معاملہ درپیش تھا۔ اس پر عمل کرنا ان کے اصول کے خلاف تھا۔ وہ کوئی جائیداد گروی رکھے بغیر بینک سے قرضہ دلانا نہیں چاہتے تھے اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے والد سے یا بیوی سے ان کے جائیداد کے کاغذات لے کر گروی رکھتے۔ اس طرح دوسری شادی کا بھید کھلنے کا اندیشہ تھا۔

وہ صبح چلے گئے۔ دوسری رات نہیں آئے۔ اگرچہ دل ملنے کو بہت بے تاب ہو رہا تھا۔ یہ پریشانی بھی تھی کہ وہ رات تو گزارے گی لیکن رو رو کر صبح کرے گی اور اس کا رونا بجا ہوگا کیونکہ وہ اپنا حق مانگ رہی تھی۔ کوئی ناجائز مطالبہ نہیں کر رہی تھی۔

وہ تیسری رات آئے تو بازی پلٹ گئی۔ وہ بیچارے چکرا کر بیٹھ گئے۔ بات خوشی کی تھی مگر پریشانی کی بھی تھی۔ سیما نے بتایا کہ وہ ان کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

اب دنیا پوچھنے والی تھی کہ وہ کس کے بچے کی ماں بننے والی ہے؟ کون ہے اس کا باپ؟

باپ کا نام نکاح نامے میں موجود تھا مگر وہ نکاح نامہ حمام کے اندر تھا' باہر دُرانی صاحب کو ننگا نہیں کر سکتا تھا۔

اور اب .... اپنے حقوق مانگنے والی ایک بیوی ہی نہیں تھی ایک بچہ بھی پوچھنے آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ایک دیانتدار باپ کیا انصاف کرنے والا ہے؟

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولے۔ "یہ' یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا حالانکہ سوچنے کی بات تھی مگر تمہارے پیار میں اندھا ہو گیا تھا۔ میں' میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟"

سیما نے گردن میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "میں تو سمجھ رہی تھی آپ خوشی سے اچھل پڑیں گے۔ مگر آپ تو ایسا منہ بنا رہے ہیں جیسے شادی نہ کی ہو گناہ کیا ہو؟"

"دنیا تو اسے گناہ ہی سمجھے گی۔ سب اس کے باپ کا نام پوچھیں گے۔"

پوچھنے دیں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ آپ کو بدنام نہیں ہونے دوں گی۔ پھر آپ پریشان کیوں ہیں؟"

"تو پھر دنیا سے کیا کہو گی؟ یہ کس کا بچہ ہے؟"

"خادم ذوالجلال درّانی کہوں گی تو لوگوں کو شبہ ہو گا۔ کیونکہ یہ ایک عام سا نام نہیں ہے۔ ایک عجیب مخصوص قسم کا نام ہے۔ میرے بچے کے باپ کا نام خادم درّانی ہو گا۔ یعنی نام آپ ہی کا ہو گا لیکن کوئی شبہ نہیں کرے گا۔"

وہ خوش ہو کر بولے۔ "سیما! تمہارے جیسی شریف اور سمجھ دار عورت کو اپنا کر میں نے غلطی نہیں کی ہے۔ تم واقعی زبان کی سچی ہو۔"

آپ میری تعریف نہ کریں۔ اپنی کہیں۔ کیا آپ اپنے بچے کی خاطر بھی ایک ٹیکسٹائل مل قائم نہیں کریں گے؟"

"تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم نہیں رہی کہ اپنے بچے کے لیے کچھ کرسکوں۔ پھر بھی ضرور کچھ کروں گا۔"

"جو کرنا ہے' آج کل میں کریں کیونکہ ماں بننے تک میں اس شہر میں نہیں رہوں گی۔ ایک سال بعد آؤں گی۔ یہ ظاہر کروں گی کہ دوسرے شہر میں شادی ہوئی تھی اور بچے کا باپ خادم درّانی دبئی میں کام کرتا ہے۔"

"لیکن یہ جھوٹ کب تک چلے گا؟"

"صرف اس وقت تک کہ میری ٹیکسٹائل مل قائم نہ ہو جائے۔ اس کے بعد اعلان کروں گی کہ خادم درّانی نے مجھ سے علیٰحدگی اختیار کرلی ہے۔ اور وہ دبئی سے آنا نہیں چاہتا ہے۔"

انہوں نے سر جھکا کر سوچا ایک عورت ان کی محبت میں کیسی کیسی قربانیاں دے رہی ہے۔ تمام جھوٹ اور الزامات اپنی ذات پر سہہ رہی ہے۔ اپنے شوہر کی عزت پر آنچ نہیں آنے دے رہی ہے اور وہ ہیں کہ اس کی ایک علیٰحدہ شاندار زندگی بنانے سے کترا رہے ہیں۔ اب تو ایک نہیں دو زندگیوں کا سوال تھا۔ بیوی کا بھی اور بچے کا بھی۔

انہوں نے دوسرے دن اپنے شاندار دفتر میں بینک کے ڈائریکٹر کو بلایا۔ یہ ڈائریکٹر کے لیے اعزاز کی بات تھی کہ اس کے وزیر نے اسے طلب کیا تھا۔ اس نے آکر سلام کیا

ادب سے کھڑا ہوا۔

انہوں نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ درّانی صاحب نے پوچھا۔ "کیا دو کروڑ کا قرضہ دینا ہو تو حساب سے اس کی جائیداد گروی رکھی جائے گی؟"

"جی ہاں جناب عالی! یہی دستور ہے۔"

"اگر گروی رکھنے کے لیے جائیداد نہ ہو تو؟"

"تو کسی صاحبِ جائیداد کے کاغذات کی ضمانت پر قرضہ دیا جاسکتا ہے۔"

درّانی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ڈائریکٹر نے پوچھا۔ "جناب عالی! کوئی پرابلم ہو تو عرض کریں۔ یہ خادم اس کا حل نکالے گا۔"

"ایک عورت کو دو کروڑ قرض دلانا ہے۔ اس کے پاس صرف تین لاکھ کی کوٹھی اور پاس ہزار کی ایک کار ہے۔ وہ ایک ٹیکسٹائل مل قائم کرنا چاہتی ہے۔"

"جناب عالی! یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ درخواست منظور کرلیں' آپ کے تخط پر قرضہ مل جائے گا۔"

"لیکن یہ بینک کے اصولوں کے خلاف ہے۔ آج میں وزیر ہوں۔ آئندہ کوئی دوسری حکومت آئے گی' میری جگہ کوئی دوسرا وزیر ہو گا تو وہ میرا محاسبہ کرے گا۔"

اس نے کہا۔ "جناب عالی! آپ مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دیں۔ میں آپ کو مطمئن کرسکوں گا۔"

وہ اجازت حاصل کر کے چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد آیا تو اس کے پیچھے چپراسی کے ہاتھوں میں اتنی فائلیں رکھی ہوئی تھیں کہ چپراسی کا نچلا آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اس نے تمام فائلیں درّانی صاحب کی میز پر رکھ دیں پھر باہر چلا گیا۔ درّانی صاحب نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

ڈائریکٹر نے کہا۔ "یہ قرضوں کی فائلیں ہیں۔ آپ سے پہلے جتنی حکومتیں آئیں اور گئیں ان کے بااثر اسمبلیوں کے ارکان اپنے دستخطوں کے ذریعے اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے نام قرضے منظور کراتے رہے۔ پھر وہ قرضے کسی نے واپس نہیں کیے۔"

درّانی صاحب نے پوچھا۔ "تم نے یہ فائلیں اب تک مجھے کیوں نہیں دکھائیں؟"

"سر! ہمیں اپنی ملازمت عزیز ہے۔ ہم اپنے بدلتے ہوئے حکمرانوں کا مزاج دیکھ کر کام کرتے ہیں۔ ایسا نہ کریں تو ہمارا تبادلہ ہو جاتا ہے یا ہمیشہ کے لیے چھٹی ہو جاتی ہے۔ آج آپ کی پریشانی سے یقین ہو گیا کہ آپ بھی ضرورت مند ہیں۔ اس لیے پہلے والوں کا

محاسبہ نہیں کریں گے۔ ہم جیسے افسروں کے ہوتے ہوئے آئندہ آنے والا کوئی حکمران بھی آپ کا محاسبہ نہیں کرے گا۔"

درانی صاحب نے ان چند فائلوں کا مطالعہ کیا۔ پھر مطمئن ہو کر بولے۔ "ٹھیک ہے۔ انہیں لے جاؤ۔ کل ایک درخواست تمہارے پاس آئے گی۔ اس کی پے منٹ جلد سے جلد ہو جانا چاہیے۔"

وہ تابعداری سے بولا۔ "جناب عالی! کل درخواست آجائے گی۔ پرسوں پے منٹ ہو جائے گی۔ باقی دفتری کارروائیوں سے میں نمٹ لوں گا۔"

اس نے چپراسی کو بلا کر وہ فائلیں اٹھوائیں۔ اس کے جانے کے بعد بولا۔ "یہ فائلیں ہمارے لیے بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ ہم انہیں جان سے زیادہ سنبھال کر رکھتے ہیں۔ پتا نہیں کب اپوزیشن میں بیٹھنے والے اقتدار میں آجائیں اور.......... اقتدار میں رہنے والے اپوزیشن میں چلے جائیں اور پھر اپوزیشن میں رہنے والے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہاں حکومت بنانے والے چند چہرے ہی ہیں۔ وہی آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہم ان کا ریکارڈ نہیں رکھیں گے تو ہم پر غبن کا الزام آسکتا ہے۔ ہمیں تو ایک ایک پیسے کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔"

"کیا کوئی آڈیٹر وغیرہ ان کروڑوں اور اربوں روپے کی عدم موجودگی کا نوٹس نہیں لیتا ہے؟"

"ہماری یا کسی آڈیٹر وغیرہ کی کیا مجال ہے کہ اپنے حکمرانوں کا محاسبہ کریں۔"

"لیکن موجودہ حکمران' سابقہ حکمرانوں کے خلاف قرض ادا نہ کرنے کی کارروائی کر سکتے ہیں۔"

"نہیں کر سکتے جناب عالی! کیونکہ سابقہ حکمرانوں پاس کے بھی موجودہ حکمرانوں کے لیے ہوئے قرضوں کی فائل نمبر اور ان کے حوالہ جات موجود ہوتے ہیں۔ اپوزیشن پارٹی اور حکمران پارٹی ایک دوسرے کے بد ترین دشمن ہوتے ہیں۔ ان پر طرح طرح کے کیچڑ اچھالتے ہیں لیکن ملکی خزانہ خالی کرنے کے معاملے میں کوئی ایک دوسرے کے خلاف نہیں بولتا۔"

دشمنی یا اختلافات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بعض معاملات میں فریقین ایک دوسرے کی حمایت میں خاموشی اختیار کیے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کی سیاسی زندگی کی عمر بڑھتی رہتی ہے اور لاکھوں روپے جو الیکشن میں خرچ کرتے ہیں وہ کروڑوں روپے کی صورت میں حاصل کرتے ہیں۔

درانی صاحب نے اس کے جانے کے بعد سیما سے فون پر رابطہ کیا۔ پھر بڑے دکھ سے کہا۔ "آج میں نے بہت مجبور ہو کر اپنے ایمان اور اصول کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ کل صبح بیر کے ساتھ دو کروڑ روپے قرض حاصل کرنے کی درخواست اور متعلقہ کاغذات لے کر میرے دفتر آؤ اور مجھے مطمئن کرو کہ اتنی بڑی رقم ضائع نہیں ہو گی اور کس طرح ایک ٹیکسٹائل مل قائم کرو گی۔"

وہ بولی۔ "آپ نے میری بات مان کر اپنی بے پناہ محبت کا ثبوت دیا ہے۔ میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔ کاروبار میں کسی پر بھروسا نہیں کروں گی۔ آپ صرف ایک فرمانبردار مشیر اور ایکسپرٹ کا انتظام کر دیں۔"

دوسرے دن درانی صاحب نے اپنے صاف ستھرے اعمال نامے پر پہلی مصلحت اندیشی کے دستخط کیے اور سیما کے لیے قرضہ منظور کرا دیا۔ انہوں نے جن حالات سے گزر کر وہ دستخط کیے تھے' ان حالات کو صرف وہی سمجھ سکتے تھے یا سازشیں کرنے والے ان کے ساتھی سمجھ رہے تھے کہ ان کی ایک غلطی نے آئندہ بے شمار غلطیوں کی راہیں کھول دی ہیں۔

تیسرے دن ان کی سیاسی پارٹی کا خفیہ اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں پارٹی کے کئی ارکان نے قرضوں کی درخواست پیش کی۔ خادم ذوالجلال درانی نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

پارٹی لیڈر نے کہا۔ "درانی صاحب! آپ اپنے علاقے کے بہت ہی محترم اور معزز شخص ہیں۔ اس علاقے سے صرف آپ ہی الیکشن میں کامیاب ہوتے ہیں اور ہمیشہ ملک و قوم کی خدمت کے جذبات لے کر اسمبلی میں پہنچتے ہیں۔ ہم سب آپ کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں لیکن ایک بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی کہ پہلے ہم اپنا پیٹ نہیں بھریں گے تو قوم کو روٹیاں کہاں سے کھلائیں گے۔"

انہوں نے کہا۔ "لیکن ہم سب کھاتے پیتے جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں۔ ہم تو تین وقتوں سے بھی زیادہ کھاتے ہیں۔"

ایک نے ہنستے ہوئے کہا "آپ بڑے بھولے ہیں۔ پیٹ بھرنے سے مراد یہ ہے کہ الیکشن لڑنے کے دوران جو رقم تجوری سے نکالی ہے' اس تجوری کا پیٹ بھرا جائے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہر بزنس مین ایک لگا کر دس کماتا ہے۔ کیا ہمیں الیکشن میں ایک کروڑ لگا کر دس کروڑ نہیں کمانا چاہیے؟ کون اُلو کا پٹھا اپنی تجوری خالی کر کے قوم کی خدمت کرتا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ ”میں نے دو روز پہلے اس قسم کی فائلیں دیکھی ہیں۔ ہر آنے والا سیاستدان کروڑوں روپے قرض لیتا ہے یا سرکاری عمارتیں اور ہزاروں میل لمبی سڑکیں بنوانے کے ٹھیکے دوسروں کے نام سے لے کر انتخابی مہم پر خرچ ہونے والی رقومات منافع کے ساتھ حاصل کرتا ہے۔ جناب! اگر یہی ہوتا رہے گا تو ملک کا خزانہ بالکل خالی ہو جائے گا۔“

پارٹی لیڈر نے کہا۔ ”مسٹر درانی! خزانہ کبھی خالی نہیں ہوگا۔ ہمیں ورلڈ بینک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈز سے قرضے ملتے رہتے ہیں۔ اب آپ فرمائیں گے کہ اپنے ملک کا خزانہ خالی کرکے دوسرے بڑے ملکوں سے قرضے لینا کہاں کی دانشمندی ہے تو جناب! یہی دانشمندی ہے کیونکہ باہر سے لیے جانے والے قرضوں سے بھی ہمارا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔

”بینک آف پاکستان ہو یا بین الاقوامی بینک وغیرہ ہوں۔ قرضے جہاں سے آتے ہیں‘ وہاں سے ہماری مٹھیاں گرم ہوتی رہتی ہیں۔ اگر دولت حاصل کرنے کی یہ کشش نہ ہو تو ہم سیاست میں نہ آئیں۔ کیوں نہ قوم کو ذہین بنانے کے لیے اسکول ماسٹر بن جائیں؟“

پارٹی لیڈر نے کہا۔ ”درانی صاحب! میرا خیال ہے‘ ہم بحث میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ ہم سب نیک نام ہیں اور ہم پر کوئی کیچڑ نہیں اچھال سکتا۔ ہماری نیک نامی کا ٹھوس اور ناقابلِ انکار ثبوت یہ ہے کہ ملک کے عوام اپنے ووٹوں کے ذریعے اپنے سروں پر بٹھاتے ہیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہم سب اپنی نیک نامی کے حمام میں بیٹھے ہیں۔ ہمارے کپڑے اترے ہوئے ہیں لیکن حمام کے باہر کسی کو ہمارے ننگے پن کی خبر ہے اور نہ ہی کبھی ہوگی۔“

پارٹی لیڈر نے کہا۔ ”میں تم سب کا لیڈر ہوں۔ میرا حکم ماننا آپ کا فرض ہے۔ آپ درانی صاحب! پلیز‘ ان قرضوں کی درخواستوں پر دستخط کردیں۔“

درانی صاحب تذبذب کے عالم میں ایک ایک کا منہ تکنے لگے۔ پھر ان درخواستوں کو پڑھنے لگے‘ اس کے بعد بولے۔ ”ٹھیک ہے‘ بینکوں کے کچھ اصول ہیں قرضہ لینے کے لیے اپنی جائیداد گروی رکھوانی ہوگی۔“

ایک نے کہا۔ ”قرضے کے لیے بہت بڑی ضمانت دی جائے تو وہ منظور ہو جاتا ہے۔ آپ وزیر ہیں۔ آپ سے بڑی ضمانت اور کوئی نہیں دے سکتا۔“

درانی صاحب نے کہا۔ ”لیکن وزارت ختم ہونے کے بعد بینک والے میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔“

”آپ نے پچھلی فائلوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ہر آنے والی نئی حکومت پچھلی حکومت کو جی بھر کے گالیاں دیتی ہے لیکن ان کے قرضے ہڑپ کرجانے کا ذکر نہیں کرتی کیونکہ ہر حکومت خزانے پر ہاتھ صاف کرنے آتی ہے۔“

انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے کہ ایسا ہوتا رہا ہے لیکن میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا۔ ملکی خزانہ ایک امانت کے طور پر میری نگرانی میں ہے۔ اس میں سے ایک روپیہ نکالنا بھی بددیانتی ہوگی۔“

چوہدری حاکم علی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں اس عورت کا دور کا ایک رشتہ دار ہوں جسے آپ نے دو کروڑ کا قرضہ دلایا ہے۔ جبکہ وہ دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔“

درانی صاحب کو غصہ آیا۔ سیما ان کی عزت تھی‘ شریکِ زندگی تھی اور چوہدری اسے دو کوڑی کی کہہ رہا تھا۔ وہ بیوی کی توہین برداشت نہ کرسکے۔ بے اختیار بولے۔ ”زبان سنبھال کر بات کریں چوہدری صاحب‘ وہ عورت جسے آپ دو کوڑی کی سمجھ رہے ہیں‘ وہ بہت عزت دار اور اتنی معتبر ہے کہ میں نے اس کی ضمانت لی ہے۔“

ایک نے کہا۔ ”ہم بھی عزت دار اور معتبر ہیں اور ایک ہی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔“

چوہدری حاکم نے کہا۔ ”جبکہ وہ عورت اپنی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتی ہے۔ اگر وہ آپ کے لیے قابلِ اعتبار ہے تو پھر انکوائری کرنی ہوگی کہ وہ کس رشتے سے معتبر ہے۔“

اس بات نے انہیں پریشان کردیا۔ انکوائری ہوتی تو بھید کھل جاتا کہ سیما سے ان کا کیا رشتہ ہے؟ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ سب چوہدری حاکم علی کا کیا دھرا ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا راز ابھی راز ہی میں ہے۔ اسے اپنی سیاسی پارٹی کے افراد کے سامنے بھی نہیں آنا چاہیے۔

وہ پریشان ہو کر بولے۔ ”میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے ایک عورت سے نیکی کرکے ایک ایسی غلطی کی ہے جو ایک مثال بن جائے گی اور اس مثال کے حوالے سے مجھے اور بھی غلطیاں کرنی ہوں گی۔“

چوہدری حاکم علی نے کہا۔ ”نیکی کوئی یونہی نہیں کرتا کوئی نہ کوئی مجبوری ہوگی۔“

ایک پارٹی رکن نے کہا۔ ”پارٹی اقتدار میں آنے کے بعد اپنے رشتے داروں کے نام پر زمینیں الاٹ کرتی ہے یا قرضے لیتی ہے۔ آپ ہزار بار یہ حقیقت چھپائیں کہ قرضہ آپ نے نہیں لیا ہے‘ کسی غیر عورت کو دلایا ہے‘ یہ ہمارے لیے مضحکہ خیز بات ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”کوئی ایسا سیاسی جوڑ توڑ نہیں ہے‘ جو ہم نہیں جانتے ہیں۔ آپ

تو استادوں سے استادی کر رہے ہیں۔"

پارٹی میں تمام اہم وزرا اور صوبائی و قومی اسمبلی کے ارکان بیٹھے ہوئے تھے اور سب ہی یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ جب درانی صاحب اپنے لیے دو کروڑ لے سکتے ہیں تو پارٹی کے دوسرے ارکان کو قرضے کیوں نہیں دلا سکتے اور اگر واقعی انہوں نے کسی عورت کو قرضہ دلایا ہے تو وہ عورت کوئی ایسی ویسی نہیں ہوگی۔ دو کروڑ کا بھاؤ رکھنے والی کسی نہ کسی طور درانی صاحب کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہوگی۔

درانی صاحب ایک ایک کے تیور بھانپ رہے تھے۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا' جو اُن کی حمایت میں بولتا اور بولنے کے لیے انہوں نے چھوڑا ہی کیا تھا۔ فی الحال چوہدری حاکم علی اور پارٹی لیڈر کے سوا یہ حقیقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ درانی صاحب سے سیما کا کیا رشتہ ہے۔ ان کی ملی بھگت سے یہ چال چلی گئی تھی۔ تاکہ پارٹی کے دوسرے ارکان کو بھی ملکی خزانے سے فائدے حاصل ہوتے رہیں اور یہ کام نامور اور ایمان دار آدمی کے ہاتھ سے ہی ہو۔ حمام میں سب ننگے ہوں تاکہ کوئی جواب طلب نہ کرسکے۔

وہ تھوڑی دیر تک کشمکش میں رہے پھر بولے۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس اجلاس میں اتنی ساری قرضوں کی درخواستیں آئیں گی اور ان سب کو منظور کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔"

پارٹی لیڈر نے کہا۔ "ہم آپ پر ظلم نہیں کر رہے ہیں اور نہ ہی آپ کو دبانا چاہتے ہیں۔ آپ ہماری پارٹی کے ستون سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کی ایمانداری کی بدولت ہم بھی ایمان والے سمجھے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم آپ کو بدنام نہیں کریں گے۔ آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرضوں کی فائلیں ہمیشہ مُردہ خانے میں پڑی رہتی ہیں۔ ان فائلوں کو کوئی نہیں چھیڑتا۔ اپوزیشن والے بھی ایسی باتیں چھپالیتے ہیں۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ کون آپ کو بددیانت اور ملکی خزانے میں خیانت کرنے والا ثابت کرے گا۔ جو ایسا کرے گا خود اُس کی سیاسی پارٹی بھی پھنسے گی۔"

خادم ذوالجلال درانی نے شکست خوردہ انداز میں سرجھکالیا۔ چوہدری حاکم علی نے ذرا قریب جھک کر بڑی رازداری سے کہا۔ "درانی صاحب' آپ کو ساری باتیں سمجھادیں۔ اب بھی سمجھ میں نہیں آئے گا تو ہمارے جو لوگ قرضے حاصل کرنے سے محروم رہیں گے' وہ اس عورت کی اصلیت معلوم کرنے کے پیچھے پڑ جائیں گے جو دو کروڑ لے گئی ہے۔ پھر یہ آپ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ کیسے کیسے راز کھلیں گے۔"

یہ آخری زبردست دھمکی تھی۔ وہ گھبرا کر بولے۔ "دیکھئے' جو پارٹی کے سب لوگوں

فیصلہ ہوگا وہی میں کروں گا مگر میں سوچنے کی تھوڑی مہلت چاہتا ہوں۔"

ایک نے کہا۔ "پارٹی لیڈر کا حکم پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ لیڈر کے مشیر بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ پوری پارٹی ایک زبان ہو کر کہہ رہی ہے کہ آپ کو قرضوں کی درخواستوں پر دستخط کرنے ہیں۔ ایسے میں مہلت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ کیا آپ اعتراض کی گنجائش نکالنا چاہتے ہیں؟"

دوسرے نے کہا۔ "اگر آپ استعفیٰ دینے کے متعلق سوچ رہے ہیں تو پھر بسم اللہ کریں۔ ہماری پارٹی کا کوئی دوسرا رکن آپ کی وزارت سنبھال کر ہمارے قرضوں کی درخواستوں پر دستخط کردے گا۔"

درانی صاحب نے کہا۔ "میرے استعفیٰ دینے سے اگر آپ لوگوں کی بات بن سکتی ہے تو مجھے مستعفی ہوجانا چاہیے۔"

چوہدری حاکم علی نے کہا۔ "بات تو بن جائے گی لیکن ہم یہ بھی تو برداشت نہیں کریں گے کہ آپ نے ہماری درخواستوں پر دستخط کیوں نہیں کیے۔ ہم سے زیادہ اُس عورت کو کیوں اہمیت دی؟ وہ عورت کون ہے؟ اس سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

وہ بولے۔ "آپ بار بار اُس عورت کو اس مسئلے میں گھسیٹ رہے ہیں۔ وہ عورت غیر متعلق ہے۔ آپ صرف اپنی اور ہم سب کی باتیں کریں۔"

"بات ایک ہی ہے کہ آپ ان تمام درخواستوں پر دستخط کردیں۔"

درانی صاحب نے گرج کر کہا۔ "میں پارٹی لیڈر سے مہلت چاہتا ہوں۔ کیا دو روز بعد ان درخواستوں پر دستخط کروں گا تو قیامت آجائے گی؟"

پارٹی لیڈر نے کہا۔ "کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ میں آپ کو مہلت دیتا ہوں لیکن یہ بات ذہن میں رکھیں کہ کسی کے لیے دو کروڑ کی درخواست منظور کرکے آپ بددیانتی کے زمرے میں آچکے ہیں۔ اس عورت کی درخواست' آپ کی منظوری اور درخواست کا ریکارڈ بھی محفوظ ہے۔ آپ کے استعفیٰ دینے سے ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمارے بہت سے ارکان آپ کی وزارت سنبھالنے کے لیے بے چین ہیں۔ بس آخری بات یہی ہے کہ آپ کی بددیانتی ریکارڈ ہوچکی ہے۔"

اجلاس برخاست ہوگیا۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو کر اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! کدھر چلوں؟"

وہ خیالات سے چونک گئے۔ "کہیں بھی چلو۔ بس چلتے رہو۔"

گاڑی چلنے لگی۔ وہ سوچنے لگے۔ میں کہاں جارہا ہوں؟ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ

ان درخواستوں پر دستخط کرکے بے ایمانی کی راہ پر چل پڑوں؟ یا اعلان کردوں کہ میں نے ایک بہت بڑی غلطی کی ہے اور حالات مجھ سے مزید غلطیاں کرانا چاہتے ہیں۔

میں نے اپنی پہلی بیوی کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ خاندانی عزت اور شان و شوکت کا خیال نہیں رکھا اور ایک ملازمہ سے مجرمانہ طور پر نکاح پڑھوالیا۔

کیا مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں پورے خاندان کی نظروں سے گر جاؤں اور ایک عورت کو دو کروڑ کا قرضہ دینے کا مجرم کہلاؤں؟

ڈرائیور اُن کی کار سڑکوں پر دوڑاتا رہا اور ٹنکی فل کراتا رہا۔ صبح سے شام ہوگئی۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں آئندہ کیا کرنا ہے؟

وہ رات کو چپکے سے آئے۔ سیما نے ان کے چہرے اور حلیئے سے ان کی پریشانیوں کو محسوس کیا۔ ان کے ساتھ بیڈ روم میں آکر پوچھا۔ "آپ خیریت سے تو ہیں؟"

وہ پھٹ پڑے۔ "کیسی خیریت؟ کیا تم نے مجھے خیریت سے رہنے دیا ہے؟ تم نے مجھے ایک مجرمانہ زندگی گزارنے پر مجبور کردیا۔ کیا میں دنیا والوں کو بتاسکتا ہوں کہ میری دوسری بیوی ہے اور وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہورہے ہیں۔ میں آپ کی زندگی سے اتنی دور چلی جاؤں گی کہ کوئی آپ سے منسوب نہیں کرسکے گا۔"

"تمہارے دور ہوجانے سے کیا بات چھپ جائے گی؟ میں قرضوں کی ان درخواستوں پر کیسے دستخط کروں جو چوہدری حاکم علی اور پارٹی کے دوسرے ارکان پیش کررہے ہیں؟"

سیما نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا چوہدری حاکم علی بھی قرضہ مانگ رہا ہے؟"

"ہاں' وہ تو ایسے دھمکی دے رہا تھا جیسے ہمارے تعلقات کو جانتا ہے۔ بھرے اجلاس میں کہہ رہا تھا کہ تم اس کے دور کی ایک رشتے دار ہو۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ تمہاری کیسی توہین کررہا تھا۔"

سیما نے حیرانی سے کہا۔ "چوہدری میرا رشتے دار نہیں ہے۔ میرے والدین سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ اس نے میرے بھائی کو تھانے سے رہائی دلائی تھی اور اسے کاروبار کرنے کے لیے ایک لاکھ روپے دیئے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے' چوہدری نے مجھے پھانسا ہے۔"

سیما یہ کہہ سکتی تھی کہ اس نے بھی چوہدری کی باتوں میں آکر سچ مچ درّانی صاحب کو پھانسا ہے اور ایک حمام میں پھسل کران کی شریکِ حیات بن گئی ہے۔

لیکن ایسا کرنے سے اس کی وفاداری مشکوک ہوجاتی جبکہ وہ سچ مچ درّانی صاحب کو دولت کمانے کی مشین سمجھ کر چاہنے لگی تھی۔ وہ اپنی محبت اور وفاداری پر داغ لگانا نہیں چاہتی تھی۔

درّانی صاحب نے پوچھا۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ چوہدری نے زبیر کو ایک لاکھ روپے دیئے تھے؟"

وہ ذرا گڑبڑائی پھر بولی۔ "یہ' یہ بات مجھے آج ہی معلوم ہوئی ہے۔"

"لیکن تمہیں یہ تو معلوم تھا کہ چوہدری نے اسے تھانے سے رہائی دلائی تھی۔ تم یہ بتاسکتی تھیں کہ اس چوہدری سے تمہارے والد کی دوستی تھی؟ لیکن آج تک تم نے کبھی چوہدری حاکم علی کا ذکر نہیں کیا۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ ایسی کیا رازداری تھی۔ تم نے کبھی اس لعنت کے متعلق مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"نہیں بتایا تو کون سی قیامت آگئی۔ کبھی اس کا ذکر آتا تو بتادیتی۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ ہماری سیاسی پارٹی کا ایک اہم فرد ہے۔ تم یا تمہارے والدین اور بھائی سیاست کے حوالے سے یہ ذکر کرسکتے تھے کہ چوہدری تم سب سے ملتا رہا ہے۔"

"آپ خواہ مخواہ ناراض ہورہے ہیں۔ ہم نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ ہم سے غلطی ہوئی۔ کیا انسان سے غلطیاں نہیں ہوتیں؟ کیا آپ بڑے پارسا ہیں۔ کیا آپ نے مجھے ہدار کرنے کی غلطی نہیں کی تھی؟"

وہ شکست خوردہ انداز میں سر پکڑ کر بولے۔ "ہاں' وہ میری زندگی کی سب سے پہلی غلطی تھی۔ پھر تمہیں اپنا بنا کر سوچا کہ غلطی ڈھل گئی ہے لیکن اللہ توبہ قبول کرلیتا ہے۔ وہ قبول نہیں کرتا' غلطی کرنے والے کو بعد میں بھی غلطیاں کرنے کی سزائیں دیتا رہتا ہے۔ اب بہت ساری باتیں واضح ہورہی ہیں۔ چوہدری نے تم سب کو آلہ کار بنا کر میری ساری دیانتداری پر پانی پھیر دیا ہے۔"

سیما نے کہا۔ "آپ خواہ مخواہ اس بیچارے کو الزام دے رہے ہیں۔ اس فرشتے نے میرے بھائی کو جیل سے رہائی دلائی۔ اسے کاروبار کرایا۔ اس کی مہربانی سے میں آپ کے گھر میں ملازمہ بن کر آئی۔ آج اس کی نیکی سے آپ کی شریکِ حیات بن گئی۔ اسی نے مجھے عقل سکھائی کہ مجھے اپنی سوکن سے کم تر نہیں رہنا چاہیے۔ عزت اور شہرت دولت سے ملتی ہے۔ اس لیے مجھے کوئی بڑا کاروبار کرنا چاہیے۔ کوئی ٹیکسٹائل مل قائم کرنا چاہیے۔"

وہ بول رہی تھی اور درّانی صاحب حیرت سے منہ پھاڑے اس کا منہ تک رہے تھے۔ ایک شخص بیک وقت ایک عورت کی نظروں میں فرشتہ اور شوہر کی نظروں میں شیطان تھا۔ سچائی واضح طور سے سمجھ آگئی تھی کہ ان کی سیاسی پارٹی نے چوہدری حاکم علی کی حکمتِ عملی کے ذریعے کس طرح انہیں بددیانت ہونے پر مجبور کیا ہے۔

وہ خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوگئے۔ سر جھکا کر جانے لگے۔ سیما نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "آپ کہاں جارہے ہیں۔ آپ آرام سے بیٹھیں' میں ہمیشہ آپ کو سکون پہنچاتی آئی ہوں۔"

"میں بھی یہی سمجھتا رہا ہوں۔ آج پتا چلا' میری پریشانیاں بڑھاتی آرہی ہو۔"

"واہ' بہت خوب! آپ میری محبت اور وفاداری کا یہ صلہ دے رہے ہیں؟ کیا میں آپ کی عزت نہیں رکھتی ہوں۔ کیا میں نے دنیا والوں سے کہا ہے کہ آپ کی بیوی ہوں اور آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں آپ کے سارے راز چھپاتی آرہی ہوں۔"

"میں تمہارے راز چھپانے کی بہت بڑی قیمت ادا کرنے والا ہوں۔ اب مجھے ایک نہیں درجنوں قرضوں کی درخواستوں پر دستخط کرنے ہوں گے۔ اس چوہدری حاکم علی نے بھی ایک کروڑ روپے کے قرضے کی درخواست دی ہے۔"

"چوہدری صاحب نے میری زندگی بنانے کے لیے جو نیک مشورے دیئے ہیں ان کے مقابلے میں ایک کروڑ کم ہیں۔ آپ کو ان کا قرضہ منظور کرلینا چاہیے۔"

درّانی صاحب کا ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک طرف گر گئی۔ درّانی صاحب غصے میں پاؤں پٹختے ہوئے باہر چلے گئے۔

اس کا بھائی زبیر اور اس کے ماں باپ دوسرے کمرے میں بیٹھے ان کا جھگڑا سن رہے تھے۔ درّانی صاحب کے جاتے ہی اس کے پاس آئے۔ وہ رو رہی تھی۔ ماں نے سمجھایا "بیٹی' صبر کرو۔ اس نے کوٹھی اور کار دی ہے۔ دو کروڑ دیئے ہیں۔ ایسا شوہر دس جوتے بھی مارے تو برداشت کرلینا چاہیے۔ کیا تیرا باپ مجھے نہیں مارتا ہے۔ حالانکہ کچھ دیتا دلاتا بھی نہیں۔"

باپ نے کہا۔ "بکواس مت کر۔ میں نے ایک لاکھ کا بیٹا اور دو کروڑ کی بیٹی دی ہے۔"

زبیر نے کہا۔ "ابا! فضول باتیں نہ کر۔ وہ درّانی میری پھول جیسی بہن پر ہاتھ اٹھا کر گیا ہے۔ ابھی سیما اجازت دے تو اس کی ساری عزت خاک میں ملادوں۔ بڑا خاندانی دیانتدار بنتا ہے۔"

سیما نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "چوہدری صاحب ہمیشہ ہمیں نیک مشورے دیتے ہیں۔ میں پہلے ان سے بات کروں گی' پھر درّانی صاحب کی ساری اکڑ نکال دوں گی۔ یہ بھول گیا ہے کہ میں بیوی ہونے کا دعویٰ کروں گی تو انہیں اپنی خاندانی ناک کٹوا کر ساری دنیا کے سامنے بیوی تسلیم کرنا ہوگا۔"

ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا۔ درّانی صاحب پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ پریشانیاں اور بڑھ گئی تھیں۔ ان کے خلاف جو سازشیں ہوئی تھیں' ان کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ اب اس میں شبہ نہیں رہا تھا کہ بری طرح پھنس گئے تھے۔ ایک طرف بددیانتی سے قرضوں کی درخواستوں پر دستخط کرنے پڑتے۔ دوسری طرف سیما سے رشتہ نہیں توڑ سکتے تھے۔ ایک اس کے پاس نکاح نامہ تھا' دوسرے یہ کہ وہ اُن کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

ڈرائیور نے کہا۔ "جناب عالی! آپ صبح سے بھوکے ہیں۔ کچھ کھا پی لینا چاہیے۔"

وہ اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ کوئی جواب دینا نہیں چاہتے تھے۔ پھر خیال آیا کہ ان کی وجہ سے ڈرائیور بھی بھوکا پیاسا ہے اور یہ اس بیچارے پر ظلم ہے۔ انہوں نے کہا۔ "کہیں گاڑی روکو اور کچھ کھالو۔"

"آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"جناب عالی! چھوٹے منہ سے بڑی بات کہہ رہا ہوں' کوئی پریشانی بھوکے رہنے سے اور آنسو بہانے سے نہیں جاتی۔ میری گزارش ہے' کچھ کھالیں۔"

"ٹھیک ہے' گاڑی روکو۔"

اس نے ایک اچھے ہوٹل کے سامنے گاڑی روک دی۔ انہوں نے کہا۔ "تم اندر جا کر کھاؤ۔ میرے لیے ایک پلیٹ سینڈوچ اور بوتل بھجوادو۔"

انہوں نے اسے سو کا نوٹ دیا۔ وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں ان کی مطلوبہ چیزیں لے آیا اور خود ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ پیٹ میں اناج گیا اور ٹھنڈی بوتل پی تو انہیں کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ اسی وقت عشاء کی اذان ہونے لگی۔ اگرچہ وہ باقاعدہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ تاہم ڈرائیور سے کہا۔ "میرا انتظار کرو۔ میں نماز پڑھنے کے بعد آؤں گا۔"

وہ پاس والی مسجد میں آگئے۔ وضو کرکے مسجد کے صحن میں دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ سر جھکا کر دل ہی دل میں کہنے لگے۔ "یارب العالمین! یہی ایک سکون کی اور دنیا والوں سے نجات کی جگہ ہے۔ مجھے سکون دے۔ پریشانیوں سے نجات دے۔ میں نے ایک گناہ کیا' اس کی بہت بڑی سزا بھگت رہا ہوں۔ مجھے ایک بار اس سزا سے بچالے۔ پھر میں کبھی

غلطی نہیں کروں گا۔"

نماز کا وقت ہوا تو انہوں نے باجماعت نماز پڑھی۔ آخر میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ دعا مانگنے کے بعد بھی اسی طرح سر جھکائے بیٹھے رہے اور سوچتے رہے۔ ان لمحات میں دنیا کے حوالے سے نہیں دین کے حوالے سے سوچتے رہے۔

پہلی بات جو سمجھ میں آئی وہ یہ کہ پہلی بار حمام میں پھسلتے وقت خدا سے ڈر کیوں نہیں لگا؟ اور اب دنیا والوں سے ڈر کیوں لگ رہا ہے؟

دوسری بات جو سمجھ میں آئی' وہ یہ کہ عزت دینے والا اللہ ہے اور ذلت دینے والا بھی وہی ہے۔ پھر وہ عزت خاک میں ملنے کے خیال سے کیوں پریشان ہیں؟ اور یہ کیوں سوچ رہے ہیں کہ ان کے ایک گناہ کے بعد غلطیاں ظاہر ہوں گی تو دنیا انہیں ذلیل کرے گی۔ کیسے ذلیل کرے گی؟ خدا کو منظور ہوگا تو ذلیل کرے گی اور خدا کو یہی منظور ہے تو انہیں اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔ اگر وہ ذلت دے گا تو ضرور قبول کرنا چاہیے۔ ذلت کے خوف سے مزید غلطیاں کرنا گویا خدا سے ڈرنا نہیں ہے دنیا والوں سے ڈرنا ہے۔

انہوں نے توبہ کی۔ پھر مسجد سے نکل کر کار میں آکر بیٹھ گئے۔ اپنے گھر پہنچے۔ پہلی بیوی کی گود میں نوزائیدہ بیٹا تھا۔ درانی صاحب کے سسر یعنی چچا صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ والد صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے ان سب کے سامنے بیٹھ کر کہا۔ "میں نے اپنی زندگی میں بہت بڑی غلطی کی ہے۔ آپ حضرات کے اور دنیا والوں کے خوف سے اس غلطی کو چھپاتا رہا لیکن آج نماز کے بعد یہ بات ذہن میں آئی کہ میں دنیا والوں سے ڈر رہا ہوں اور خدا سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ جس کے نتیجے میں مزید غلطیوں کی دلدل میں پھنستا جا رہا ہوں۔"

وہ ابتدا سے لے کر اب تک کے تمام واقعات سنانے لگے۔ بزرگوں کے سر جھک گئے۔ بیوی رونے لگی۔ ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر چچا نے کہا۔ "تم میری بیٹی پر سوکن لے آئے۔ یہ برا کیا۔ میں نے تمہیں گود میں کھلایا ہے۔ تمہارے مزاج اور عادات کو جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ تم جھک گئے تھے۔ پھر یہ کہ تم نے شرعاً نکاح پڑھوایا ہے لیکن میری بیٹی سے اجازت نہیں لی۔ میں اپنی بیٹی اور تمہارے معاملے میں کچھ نہیں بولوں گا۔"

باپ نے کہا۔ "آدمی گرتے وقت یہ نہیں دیکھتا کہ سوکھی زمین پر گر رہا ہے یا کیچڑ پر۔ تم نے بھی نہیں دیکھا کہ وہ ایک ملازمہ تھی۔ ٹھیک ہے کہ تم نے نکاح پڑھوالیا ہے لیکن میرے جیتے جی وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔"

درانی صاحب نے کہا۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ دشمنوں کی چالوں کو نہ سمجھ سکا۔ کے باوجود سیما میری منکوحہ ہے اور ہونے والے بچے کی ماں ہے۔ میں اسے یہاں نہیں لاؤں گا۔ میں نے آئندہ غلطیوں سے بچنے کے لیے سچ باتیں بتادیں۔ اب میں خدا سے ڈر رہا ہوں اور دنیا والوں سے ڈرنا بھول گیا ہوں۔ مجھے اپنے گھر والوں جو سزائیں ملیں گی' دنیا والوں سے جو ذلتیں ملیں گی' سب منظور ہے لیکن خدا کی ضگی منظور نہیں ہے۔"

وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد شریکِ حیات آنسو پونچھتی آکر بستر پر بیٹھ گئی۔ بچے کو تھپک کر سلاتی ہوئی بولی۔ "میں جانتی ہوں' آپ بہت ہیں مگر مجھے اپنی توہین کا احساس ہو رہا ہے۔ میں بڑی دیر سے خود کو سمجھا رہی ہوں ل پھر بھی صدمات سے چُور ہے۔"

درانی صاحب نے کہا۔ "یہ فطری امر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ میں نے ری توہین کی ہے۔ میرے شرمندہ ہونے سے سوکن کا زخم مندمل نہیں ہوگا اور نہ ہی ل برداشت ہوگی۔"

پھر وہ ایک ذرا توقف سے بولے۔ "اگر مجھے پہلے ہی سازشوں کا علم ہوتا تو میں اسے دے دیتا لیکن اب وہ میری ایک اولاد کو جنم دینے والی ہے۔"

"پتا نہیں' وہ اور کتنی اولادیں جنم دے گی۔"

"یہ تو میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اپنی طرف سے طلاق نہیں دوں گا علیحدگی اختیار کرلوں گا۔ اگر وہ طلاق لینا چاہے گی تو اپنی اولاد اس سے لے لوں گا نکہ اس کی پرورش میرا فرض ہے۔"

وہ رات انہوں نے کروٹیں بدل بدل کر گزاری۔ دوسری صبح دفتر پہنچتے ہی انہوں بینک کے ڈائریکٹر کو سیما کی درخواست کے ساتھ طلب کیا۔ "میں نے قرضے کی یہ است منظور کی تھی۔ تم نے کس تاریخ کا چیک جاری کیا ہے؟"

"سر! کل وہ چیک کیش ہو جائے گا۔ مسمات سیما بیگم کو دو کروڑ مل جائیں گے۔"

انہوں نے سیما کی پیش کردہ درخواست کو منسوخ کیا۔ پھر کہا۔ "جس بینک کو چیک ا گیا ہے اسے فوراً حکم دو کہ فلاں نمبر اور تاریخ کا چیک منسوخ ہو چکا ہے۔ سیما ور رقم نہ دی جائے۔"

"جی؟ وہ......... وہ چیک منسوخ ہو جائے گا؟"

"ہاں۔ کیا تم اردو نہیں سمجھ رہے ہو۔ میں انگریزی میں بولوں؟"

"نہیں سر! میں سمجھ گیا۔ اب وہ چیک کیش نہیں ہو گا۔"

"تم ابھی ایک تحریر لکھ دو کہ میں نے ایک دن پہلے مذکورہ چیک کی منسوخی کا حکم دیا ہے اور سیما کی منسوخ شدہ درخواست تمہارے پاس ہے۔"

اُس نے حکم کی تعمیل کی۔ ویسی ہی ایک تحریر لکھ کر لے آیا۔ انہوں نے کہا۔ "کل سے پہلے یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو کہ سیما کی درخواست منسوخ ہوئی ہے۔ اگر تم نے زبان کھولی تو تمہارا تبادلہ کرادوں گا۔"

ڈائریکٹر سہم کر چلا گیا۔ درّانی صاحب نے دوسرے دن کی تاریخ پر وزارت سے استعفیٰ لکھا۔ اسے بریف کیس میں رکھا۔ صبح سات بجے سیما سے فون پر کہا۔ "تمہارے پاس دو کروڑ روپے کا جو چیک ہے اسے بینک نہ لے جانا۔ وہ کیش نہیں ہو گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے قرضے کی درخواست منظور کی تھی اور چیک جاری کرایا تھا۔"

"بے شک' میں نے ایسا کیا تھا لیکن چوہدری حاکم علی کی بدمعاشی نے تمہارا کام بگاڑ دیا ہے۔ تمہیں یقین نہ ہو تو اس سے فون پر پوچھ لو۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ سیما نے پریشان ہو کر فوراً ہی چوہدری حاکم علی کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر بولی۔ "چوہدری صاحب! آج میرا چیک کیش ہونے والا تھا۔ کیا آپ نے اسے رکوادیا ہے؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ تمہیں ذرّے سے آفتاب بنا رہا ہوں۔ یہ چیک کیش نہ ہونے والی بات کون کہہ رہا ہے؟"

"ابھی درّانی صاحب نے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ چیک کیش نہ ہو گا۔ چوہدری کی بدمعاشی سے کام بگڑ گیا ہے۔"

"وہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہمارے درمیان اختلافات پیدا کرنا چاہتا ہے۔"

"اختلافات کی ایسی کی تیسی۔ اتنی بڑی رقم نہ ملی تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ پلیز آپ درّانی صاحب سے اس سلسلے میں بات کریں۔"

"میں ابھی بات کرتا ہوں۔"

اس نے سیما سے رابطہ ختم کیا۔ پھر درّانی صاحب سے رابطہ کیا۔ انہوں نے پوچھا "اچھا تو سیما سے بات ہو چکی ہے۔"

"ہاں' کیا وہ درست کہہ رہی ہے؟"

"پہلے یہ بتاؤ کہ سیما اور اس کے خاندان والوں کو کب سے جانتے ہو؟ کب سے

میرے خلاف سازشیں کر رہے ہو؟"

"میں نے کوئی سازش نہیں کی ہے۔ بلکہ تمہاری دوسری شادی کے راز کو راز ہی رکھا ہے۔ ورنہ تمہارے اعلیٰ خاندان کی عزت خاک میں مل جاتی۔"

"چوہدری! تمہیں یہ سن کر افسوس ہو گا کہ میں نے ایک ملازمہ سے شادی کرنے کا علانیہ اعتراف کر لیا ہے۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ حاکم علی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ درّانی صاحب نے پوچھا۔ "چوہدری! خاموش کیوں ہو گئے؟ میری یہی ایک کمزوری تم لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ انسان عزت کے لیے جیتا ہے اور عزت کے لیے مرتا ہے لیکن میں عزت کے ساتھ ایمان کے لیے جینا اور مرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے دنیا والوں سے ملنے والی نام نہاد عزت کو میں ہی خاک میں ملا رہا ہوں۔"

"اگر آپ ایسا کر رہے ہیں تو بہت بڑی حماقت کر رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ آپ کے اعلیٰ خاندان والے سیما کو قبول کریں گے اور آپ ایک ملازمہ کا شوہر کہلانے میں اپنی بے عزتی نہیں سمجھیں گے۔"

"یہ میرا ذاتی اور خاندانی معاملہ ہے۔ مجھے اپنے اس عمل سے یہ روحانی سکون حاصل ہوا ہے کہ میں اپنے ملک پاکستان کے خزانے سے کسی بھی لالچی سیاستدان کو قرض کے نام پر ایک روپیہ بھی لینے نہیں دوں گا۔"

"آپ بڑی خوش فہمی میں ہیں۔ یہ بھول رہے ہیں کہ آپ کی وزارت چھن جائے گی اور آپ کی جگہ ہماری پسند کا دوسرا وزیر آ کر ہمیں ملکی خزانے سے قرضے دے گا۔"

"یہ میں جانتا ہوں اور پہلے ہی استعفیٰ لکھ کر رکھ لیا ہے۔ میں اپنے بعد آنے والے بے ایمان اور بددیانت وزیر کو نہیں روک سکوں گا جس طرح میں نے خود کو خدا پر چھوڑا ہے' اسی طرح اپنے ملکی خزانے کو خدا پر چھوڑ رہا ہوں۔"

درّانی صاحب نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے بعد ان کی سیاسی پارٹی میں ہلچل مچ گئی۔ پہلے تو کسی پارٹی رکن کو یقین نہیں آیا کہ درّانی صاحب وزارت کو چھوڑنے اور ایک ملازمہ سے منسوب ہونے کا اعتراف کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں۔ اب تو ان پر کسی طرح کا دباؤ ڈال کر ان سے قرضے منظور نہیں کرائے جا سکتے تھے۔

قرضوں کی زیادہ فکر نہیں تھی' وہ درّانی صاحب کی جگہ دوسرا وزیر لا کر یہ کام کر سکتے تھے۔ پریشانی یہ تھی کہ خادم ذوالجلال درّانی جیسا دیانت دار سیاستداں پورے ملک میں مشہور تھا' بہت ہی معزز اور محترم سمجھا جاتا تھا۔ ان کے پارٹی سے علیحدہ ہونے

پر سب سے پہلے اپوزیشن والے حکمران پارٹی پر کیچڑ اچھالتے۔ پھر ملکی اخبارات ان کے اچھے برے کردار پر تبصرے کرتے۔

پارٹی لیڈر نے انہیں اپنے گھر پر بلایا۔ پارٹی کے دوسرے ارکان بھی موجود تھے۔ لیڈر نے کہا۔ "درانی صاحب! آپ تو ہم سے ناراض ہوگئے ہیں۔ آپ قرضوں کی درخواست منظور نہیں کرنا چاہتے نہ سہی۔ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ سنا ہے آپ نے استعفیٰ لکھ رکھا ہے۔ آخر اس کی ضرورت کیا ہے؟"

انہوں نے استعفیٰ پیش کیا۔ پارٹی لیڈر نے کہا۔ "یہ بات نہیں۔ آپ کو جس محکمے کی وزارت پسند ہو، ہم آپ کو اس محکمے کا وزیر بنادیں گے۔"

انہوں نے پوچھا۔ "کون سا ایسا محکمہ ہے جہاں دیانت داری سے کام لیا جاتا ہے اور عوام کو دھوکے نہیں دیئے جاتے ہیں۔ ہر محکمے میں لوٹ کھسوٹ ہے۔ میں نے سوچا تھا سیاست میں رہ کر ملک و قوم کی خدمت کرسکوں گا۔ پہلے دو محکموں کا وزیر رہا۔ پھر یہ تیسری وزارت اختیار کی تھی لیکن ہر جگہ دھاندلی ہے۔ اس آخری وزارت میں تو میری عزت بھی دو کوڑی کی ہوگئی۔ مجھے ایک ملازمہ سے شادی کرنے پر مجبور کردیا گیا۔ کیا اتنی ٹھوکریں کافی نہیں ہیں؟ لہٰذا میں سیاست سے باز آرہا ہوں۔ اسے ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ رہا ہوں۔"

درانی صاحب! آپ کی موجودگی سے ہماری پارٹی کی عزت اور وقار ہے۔ آپ ہمیں چھوڑیں گے تو اپوزیشن والے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔"

"میں نے اپوزیشن کی بھی فائلیں پڑھی ہیں۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب ہی اپنے الیکشن کے اخراجات ملکی خزانے سے سود سمیت وصول کرتے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ آئندہ کسی سیاسی پارٹی میں نہیں رہوں گا۔"

"پہلے آپ سماجی کارکن تھے۔ پھر آپ نے بڑے جذبے سے سیاست میں حصہ لیا۔ اور سیاست ایسی چیز ہے جو آدمی چھوڑنا بھی چاہے تو سیاست اسے نہیں چھوڑتی۔"

درانی صاحب نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "ہاں۔ میں اب ایسی سیاست چاہتا ہوں کہ ملکی خزانے میں مال آئے تو ملک و قوم کی ترقی کے لیے صرف ہو۔ وہ سیاستدانوں کے گھروں میں نہ جائے۔ جب پاکستان کو قائم کرنے کا جذبہ پیدا ہوا تو سرحد سے بنگال تک ماؤں بہنوں اور بیٹیوں نے اپنے زیور اتار کردے دیئے۔ آج ہم اپنی قوم کے کپڑے اتار لیتے ہیں۔ بس نہیں چلتا کہ کھال اتارلیں۔ جس روز ایسے ذہین افراد سیاست میں آئیں

گے جو تجوریوں کے بَل پر نہیں، اپنے بہترین اعمال کے بَل پَر حکومت بنائیں گے اور انہیں اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے ملکی خزانے سے ایک روپیہ نہ لینا پڑے تو اُس روز میں سیاست میں ضرور آؤں گا۔"

"درانی صاحب! آپ کے متعلق یہ طے ہے کہ جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ پھر آپ سیاست چھوڑنے کے متعلق پریس اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے کیا کہیں گے؟"

"یہی کہ سیاست میرے اور میں سیاست کے قابل نہیں ہوں۔ اس لیے غیر معینہ مدت کے لیے سیاست سے دستبردار ہو رہا ہوں۔"

"یہ اخبارات والے بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ آپ سے سوالات کے ذریعے ایسے جوابات اگلوائیں گے، جن سے ہماری پارٹی کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا۔"

"میری سیاسی زندگی کے دوران کوئی ایسا داغ میرے کردار اور عہدے پر نہیں لگا ہے، جو پارٹی کی بدنامی کا باعث بنے گا۔"

"کیا آپ خدا اور رسول ﷺ کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ یہاں سے جاکر اپوزیشن سے نہیں ملیں گے؟"

"میں کہہ چکا ہوں کہ سیاست سے دستبردار ہو رہا ہوں۔ خواہ سیاست آپ کی ہو یا اپوزیشن کی۔"

پارٹی لیڈر نے کہا۔ "بہتر ہے کہ ہم کل ایک پریس کانفرنس طلب کریں۔ اس کانفرنس میں درانی صاحب اعلان کریں کہ ڈاکٹر نے انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے اس لیے یہ وزارت چھوڑ کر طویل عرصے کے لیے سوئٹزرلینڈ جارہے ہیں۔"

انہوں نے کہا۔ "ابھی آپ نے تسلیم کیا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لیے اعلان میں ڈاکٹر کا ذکر نہیں آئے گا اور نہ ہی میں سوئٹزرلینڈ جاؤں گا۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک طویل عرصہ آرام کے لیے سیاست چھوڑ رہا ہوں اور یہ درست ہے کہ ملک سے باہر کچھ عرصے کے لیے جارہا ہوں۔"

"چلیں یہ اعلان بھی ہماری پارٹی کے حق میں ہوگا۔ میں پریس والوں کو کل عصرانے پر بلا رہا ہوں۔"

اس فیصلے کے بعد وہ پارٹی کے تمام افراد سے مل کر چلے گئے۔ ایک گھنٹے کے بعد کچھ اور لوگ بھی رخصت ہوگئے۔ پارٹی لیڈر کے ساتھ اس کے دو مشیر اور تین اہم کارکن رہ گئے۔ ایک مشیر نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ درانی کو پریس کانفرنس میں شریک نہ کیا جائے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ ہم نے قرضے لینے کے لیے اسے چوہدری حاکم علی

اور سیما کے ذریعے پھنسایا ہے۔ یہ سازش کھلنے کے بعد وہ ہمارا وفادار نہیں رہے گا۔ ہمارے خلاف زہر اگلے گا۔"

پارٹی لیڈر نے کہا۔ "واقعی یہ بات عقل میں آتی ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ لہٰذا اس سے اچھائی کی توقع نہیں رکھیں گے۔"

دوسرے مشیر نے کہا۔ "اگر اسے پریس کانفرنس میں شریک نہیں کیا جائے گا تو وہ فوراً فوراً اخبار والوں کو ہمارے خلاف بیانات دے گا۔ اپوزیشن کو اس سے بہت فائدے پہنچیں گے۔"

"یہ درّانی ہمارے گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گیا ہے نہ ہم اسے نگل سکتے ہیں نہ اگل سکتے ہیں۔ اسے نگلیں گے تو یہ پیٹ کی آنتوں میں جاکر پھنسے گا اور اگلیں گے تو اسے اپوزیشن والے اٹھا کر لے جائیں گے۔"

ایسے وقت ایسوں کے لیے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔

ایسے وقت ایسوں کو صرف اجل پکارتی ہے۔

جب اجل نواز اسے لے جائے گا تو سارا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔

☆=========☆=========☆

سیما انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ درّانی صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ چیک کیش نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود وہ بینک گئی تھی اور ناکام واپس آئی تھی۔ تب سے اس کا بھائی زبیر اور اس کے والدین غصے سے تلملا رہے تھے۔ انہوں نے چوہدری حاکم علی کو فون کیا۔ جواب ملا کہ وہ گھر پر نہیں ہے یا پھر ان سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ سیما کو جس حد تک استعمال کرچکا تھا' اس کے بعد اب وہ کام آنے والی نہیں تھی۔ اس سے فی الحال کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔

پھر سیما نے درّانی صاحب کی رہائش گاہ پر فون کیا۔ انہوں نے جواب میں کہا۔ "میں ایک ضروری پارٹی میٹنگ میں جارہا ہوں۔ کسی وقت رات کو فون کروں گا۔"

"ابھی آپ فون بند نہ کریں۔ یہ بتائیں' میرا چیک کیش کیوں نہیں ہوا؟"

"وہ چیک میری اور تمہاری محبت کے درمیان لکھا جاتا تو کیش ہوجاتا لیکن وہ تمہاری اور چوہدری کی سازش کے درمیان لکھوایا گیا۔ اس لیے ایک پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔"

"دیکھئے آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں نے سازش نہیں کی ہے۔ آپ سے محبت کی ہے۔"

"میں تمہاری محبت اور تم سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کر رہا ہوں۔ میرا جو بچہ ہوگا' اس کی پرورش میری ذمے داری ہے۔ میں اس حد تک اس کے اور تمہارے اخراجات برداشت کروں گا۔ میں طلاق دینا نہیں چاہتا۔ تم چاہو تو لے سکتی ہو۔ اس سلسلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرلو۔ رات کو کسی وقت فون پر بات کروں گا۔ خدا حافظ۔"

ریسیور رکھ دیا گیا۔ وہ ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیتی رہی۔ پھر ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ ماں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کیا اس چوہدری نے ہمیں پھنسا دیا ہے۔"

سیما نے کہا۔ "ہم غصہ دکھا کر بڑے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ درّانی مجھ سے علیحدگی اختیار کر رہا ہے۔ کہتا ہے طلاق نہیں دے گا۔ میں لینا چاہوں تو لے سکتی ہوں۔ اگر نہیں لوں گی تو وہ میرے اور بچے کے اخراجات پورے کرتا رہے گا۔"

بھائی زبیر نے کہا۔ ”کہاں دو کروڑ روپے اور کہاں اخراجات کی ماہانہ رقم۔ وہ ہمارے منہ سے تر نوالہ چھین کر سوکھی روٹیاں دے رہا ہے۔“

باپ نے کہا۔ ”بڑے مزے میں زندگی گزر رہی تھی۔ ہماری محنت سے ٹیکسٹائل مل بھی قائم ہو جاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا‘ بھید کیسے کھل گیا کہ تم سوکن کی برابری کرنے کے لیے دو کروڑ حاصل کرنے والی تھیں؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اچانک کھیل کیسے بگڑ گیا۔ ویسے ایک بازی میرے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ خفیہ شادی کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔ جب درّانی اپنے وعدے سے پھر سکتا ہے تو میں بھی پھر سکتی ہوں۔“

ماں نے کہا۔ ”ہاں بیٹی! تم طلاق نہ لینا۔ اسے علیٰحدگی اختیار کرنے دو۔ آخر اس کی بیوی اور بچے کی ماں بن کر رہو گی تو ہو سکتا ہے‘ سوکن کے برابر حصہ حاصل کر سکو۔ تم بچے کے ساتھ عیش و آرام سے رہو گی۔“

سیما کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے ریسیور اٹھا کر درّانی صاحب کے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ ایک ملازم نے کہا۔ ”صاحب گھر میں نہیں ہیں۔“

وہ بولی۔ ”میں بیگم صاحب سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

اسے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ پھر بیگم درّانی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو‘ میں زاہدہ درّانی بول رہی ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”اور میں بیگم سیما درّانی ہوں۔“

”اچھا تو تم میرے شوہر کی ملازمہ ہو۔ کیا اس ماہ کی تنخواہ نہیں ملی؟“

”بکواس مت کرو‘ میں ملازمہ نہیں خادم ذوالجلال درّانی کی منکوحہ بول رہی ہوں۔“

”ہمارے معاشرے کی اسّی فیصد منکوحہ عورتیں اپنے شوہر کی ماہانہ تنخواہ پر گزارہ کرتی ہیں‘ کیا تنخواہ کچھ کم پڑ گئی ہے؟“

”تم بہت غرور سے بول رہی ہو۔“

”یہ تمہیں غرور لگ رہا ہے۔ میں پیدائشی رئیس زادی ہوں۔ اپنے شوہر کے آگے ماہانہ اخراجات کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتی۔ یہ ہمارے شوہر حضرات باہر دو چار شادیاں کرتے ہیں‘ وہی دلہنیں ان کے آگے ہاتھ پھیلاتی ہیں۔ تم خود ہی سوچو۔ میں غرور سے بول رہی ہوں یا سچائی بیان کر رہی ہوں؟“

چند لمحوں تک خاموشی رہی پھر وہ بولی۔ ”کل تک وہ میرے تھے۔ انہوں نے میرے لیے کروڑوں کا قرضہ منظور کیا تھا مگر آج اچانک بدل گئے۔ مجھے بینک سے ایک

ٹی کوڑی بھی نہ ملی کیا اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟“

”اسے اپنی بدنصیبی کہہ سکتی ہو۔ یہ میرے شوہر کا ایمانی جذبہ ہے جو دودھ رپانی کو پانی بنا رہا ہے۔“

”کیا اس کا نقصان تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے۔“

”میں کم عقل ہوں۔ سمجھ نہیں پاتی۔ تم سمجھا دو۔“

سیما نے کہا۔ ”میں درّانی صاحب کی شریکِ حیات کی حیثیت سے تمہاری برابر کی ریک ہوں۔ درّانی صاحب کی دولت اور جائیداد سے مجھے تمہارے برابر کا حصہ ملے گا۔ ر دو کروڑ کا قرضہ منظور ہو جاتا تو میں سوکن کی حیثیت سے اپنے حقوق طلب نہ کرتی۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ درّانی صاحب کے اکاؤنٹ میں چند لاکھ وپے تھے۔ اس میں سے انہوں نے تمہیں کوٹھی اور کار خرید کر دے دی۔ اب ان کے ں اکاؤنٹ میں چند ہزار روپے رہ گئے ہیں۔ یہ بھی میرے شوہر نے دھوکا کھا کر تمہیں ے دیا۔ میں اس میں سے آدھے کا دعویٰ کر سکتی ہوں لیکن تم میرے شوہر کے ایک بچے جنم دینے والی ہو۔ اس لیے اپنا حصہ اس بچے کو دے رہی ہوں۔“

فون پر چند لمحے تک خاموشی رہی۔ بیگم زاہدہ درّانی نے کہا۔ ”شاید تمہیں نہیں لوم کہ میں ایک ارب پتی باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں اور میرے سسر یعنی درّانی صاحب کے والد بھی ارب پتی ہیں۔ جب انہیں پتا چلا ان کے بیٹے نے تم سے شادی کی ہے تو آج وہ اپنے وکیل سے وصیت لکھوا رہے ہیں جس کی رُو سے ان کی تمام دولت اور جائیداد صرف ان پوتے اور پوتیوں کی ہوگی جو مجھ سے جنم لیں گے۔“

سیما کو پتا ہی نہیں تھا کہ بڑے گھروں میں دولت اور جائیداد کے کھیل کس طرح کھیلے جاتے ہیں۔ وہ درّانی صاحب کی منکوحہ ہونے کے رشتے سے اپنے حقوق کے لیے لڑ سکتی تھی مگر مقدمہ برسوں تک لڑتے لڑتے اس کی وہ سوا تین لاکھ کی کوٹھی اور پچاس ہزار کی کار بھی فروخت ہو جاتی۔ پھر اسے کسی چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہنا پڑتا۔

اس نے بڑی آہستگی سے ریسیور رکھ دیا۔ ماں نے پوچھا ”وہ سوکن کیا کہتی ہے؟“

”ماں! میں بری طرح یہ بازی ہار رہی ہوں۔ میرے حصے میں صرف یہ ایک چھوٹی سی کوٹھی اور کار آئی ہے۔ درّانی کے پاس یہی کچھ تھا۔ باقی اربوں روپے کی جائیداد اس کے باپ کی ہے اور باپ اُن پوتے اور پوتیوں کے نام وصیت لکھ رہا ہے جو زاہدہ درّانی سے جنم لے رہے ہیں۔“

باپ نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یہ چوہدری حاکم علی کہاں مر گیا ہے۔ ہمیں کروڑوں

روپے دلانے والا تھا۔ اب فون پر بھی نہیں مل رہا ہے۔ بیٹی! تم پھر اس سے رابطہ کرو۔"

ایسے وقت وہی انہیں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے بہترین مشورے دے سکتا تھا۔ سیما نے اس سے رابطہ کیا۔ اس بار اس کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ "بولو سیما! کیا بات ہے؟"

سیما نے اسے اپنا دکھڑا سنایا۔ وہ بولا۔ "ہو سکے تو درّانی سے رشتہ ختم کرلو یا اپنے طور پر کچھ وصول کرسکتی ہو تو کرلو۔ آئندہ اس سلسلے میں مجھ سے باتیں نہ کرو۔"

"بات کیوں نہ کروں؟ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں چوہدری صاحب؟"

"سیدھی سی بات ہے بی بی! میں سیاسی چالیں چل رہا تھا۔ تمہیں مہرہ بنا کر ایک کروڑ کا قرضہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر کام بگڑ گیا۔ ہماری ذرا سی جلد بازی سے چال الٹ گئی۔ اگر وہ دو کروڑ کا چیک کیش ہو جاتا تو تمہارے ساتھ ہمارے بھی وارے نیارے ہو جاتے۔ مگر اس چیک کے کیش ہونے سے پہلے ہم نے اس کا محاسبہ کیا تو وہ ہوشیار ہو گیا۔ اس نے سرے سے چال ہی بدل دی۔"

اب کیا ہوگا چوہدری صاحب!؟"

"ہم تو اپنی سیاست کھیلتے رہیں گے لیکن تمہاری سیاست ختم ہو چکی ہے۔ آئندہ اس بساط پر تم کام نہیں آؤ گی۔ اس لیے کچھ کھو کر ایک کوٹھی اور کار حاصل کی ہے تو اسے بہت سمجھو اور اپنے طور پر جیسی چاہو زندگی گزارو۔ آئندہ مجھے فون نہ کرنا۔ میں بہت مصروف سیاست داں ہوں۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ سیما ریسیور رکھ کر خلا میں تکنے لگی۔ باپ نے پوچھا۔ "چوہدری صاحب کیا کہتے ہیں؟"

سیما نے خلا میں تکتے ہوئے کہا۔ "وہ سیاسی چالیں چل رہے تھے۔ میں ایک مہرہ تھی' جو پٹ گیا۔ اب ان کی بساط پر میں نہیں رہوں گی۔ اس لیے کھیل ختم ہو چکا ہے۔"

ماں نے کہا۔ "کوئی مذاق ہے کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ تم درّانی کے بچے کو جنم دینے والی ہو۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمیں اس بچے کے نام پر خیرات ملتی رہے گی۔"

بھائی زبیر نے کہا۔ "مجھے غصہ آرہا ہے۔ میری بہن کو خیرات ملے گی تو میں درّانی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی موت اسے پکار رہی ہے۔"

"بھائی جان! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ اسے قتل کر کے پھانسی چڑھ جائیں

گے۔"

"میں تمہارے اور بچے کے حقوق دلانے کے لیے جان پر کھیل جاؤں گا۔ موت کسی نہ کسی بہانے سے آتی ہے۔ درّانی کی ناانصافی اس کی موت کا بہانہ بن رہی ہے۔"

موت' موت اور موت۔ اجل نواز کو سب پکار رہے تھے۔ اس لیے وہ آگیا۔

☆=========☆=========☆

خادم ذوالجلا درانی کو عصرانے میں جانا تھا۔ وہاں پریس کانفرنس بھی تھی۔ وہ شیروانی زیب تن کیے کوٹھی سے باہر آئے۔ وہاں ایک نوجوان ڈرائیور کی وردی میں تھا اور پرانا ڈرائیور سادے لباس میں تھا۔ اس نے ایک ٹیلی گرام دکھا کر درانی صاحب سے کہا۔ "یہ ٹیلی گرام پنڈ سے آیا ہے۔ ماں بہت بیمار ہے۔ آپ کی اجازت سے جاسکتا ہوں۔ یہ نوجوان میرا بہت اچھا قابلِ اعتماد دوست ہے۔ اس کا نام اجل نواز ہے۔ اگر میری واپسی تک آپ اس پر بھروسا کریں تو آپ کا احسان ہوگا۔"

"تمہیں فوراً بتانا چاہیے تھا کہ والدہ بیمار ہے۔" انہوں نے جیب سے دو ہزار روپے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی جاؤ' طبیعت زیادہ خراب ہو تو شہر لے آؤ۔ میں کسی اچھے ہسپتال میں علاج کراؤں گا۔"

وہ سلام کرکے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ اجل نواز نے درانی صاحب کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ پھر ان کے بیٹھنے کے بعد اسٹیئرنگ پر آگیا۔ اسے اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے مین روڈ پر آگیا۔ درانی صاحب نے پوچھا۔ "تمہیں پتا ہے کہاں جانا ہے؟"

"جی ہاں جناب عالی! پارٹی لیڈر کی کوٹھی میں عصرانہ ہے۔ جانا تو وہاں ہے مگر کوئی نہیں جانتا کہ کسے کہاں پہنچنا ہے۔ آدمی خریدنے نکلتا ہے روٹی اور دھوکے سے زہر خرید لیتا ہے۔"

"تم بہت زیادہ بولتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ پارٹی لیڈر کی کوٹھی کا راستہ معلوم ہے؟"

"جی ہاں جناب عالی! مجھے زندگی سے لے کر موت تک کے تمام راستے معلوم ہیں۔"

"تمہاری زبان سے موت کا لفظ سن کر یاد آیا کہ تمہارا نام اجل نواز ہے۔ ایسا نام تو موت کے فرشتے کا ہونا چاہیے۔"

"جناب عالی! یہ انسان کا بھی نام ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اکثر آدمی ہی آدمی کو مارتا ہے۔ جب اس پر جنون سوار ہوتا ہے' اس کے اندر کسی کو قتل کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ اسے قتل کردیتا ہے' تو ان لمحات میں وہ موت کا فرشتہ ہوتا ہے۔ موت کا سبب

یا موت کے اسباب پیدا کرنا انسان کا کام نہیں ہے۔ یہ سب کچھ موت کا فرشتہ ہی کرتا ہے اور جب وہ کسی انسان کے اندر سما کر اسے قاتل بنا کر کسی کو قتل کرتا ہے تو آپ اس انسان کو کیا اجل نواز یا موت کا فرشتہ نہیں کہیں گے؟"

درانی صاحب نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ زیادہ نہیں بولتے تھے اور نہ ہی زیادہ بولنے والوں کو پسند کرتے تھے لیکن کبھی کبھی آدمی کو اپنے مزاج کے خلاف بھی سن لینا چاہیے کیونکہ کبھی کبھی موت بھی آس پاس بولتی ہے اور جب تک اس کی بولی سمجھ میں آتی ہے تو وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

اچانک جیسے قیامت سی آگئی۔ کئی طرف سے فائرنگ کی آوازیں تڑتڑ شور مچانے لگیں۔ تین موٹر سائیکل سوار تھے۔ تینوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہتھیار بردار اپنی اپنی گن سے فائرنگ کرتے ہوئے درانی صاحب کی کار کے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ راستے میں بھگدڑ مچ گئی۔ کسی نے قاتلوں کو پہچاننے کی زحمت نہیں کی۔ کیونکہ ہر ایک کو اپنی اپنی فکر تھی۔ کوئی گولی انہیں بھی لگ سکتی تھی۔

گولیاں درانی صاحب کو لگی تھیں۔ وہ لہو سے تربتر ہو رہے تھے۔ ایسی حالت تھی کہ موت کے فرشتے کو روح قبض کرلینا چاہیے تھی جبکہ وہ بالکل قریب تھا لیکن وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا کسی قریبی ہسپتال کی سمت جارہا تھا۔ کار کے شیشے ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ کار کی باڈی پر کئی جگہ گولیوں کے سوراخ کہہ رہے تھے کہ جب فولادی باڈی کی حالت ایسی ابتر ہوسکتی ہے تو ان گولیوں سے گوشت پوست کے انسان کو چھلنی ہو کر مرجانا چاہیے۔

مگر وقتِ اجل نہیں تھا۔ جب موت کی گھڑی نہ آئے تو موت بھی زندگی کے لیے ڈھال بن جاتی ہے۔ اجل نواز نے انہیں ایمرجنسی وارڈ میں پہنچادیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ...ک کی خبر پورے شہر میں پہنچ گئی۔ صرف قانون کے محافظوں نے ہی نہیں' اپنوں اور ...انوں نے' دوستوں اور دشمنوں نے معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ انہیں فلاں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔

پھر اخبارات والوں کو پتا چلا کہ ایک منسٹر پر گولیاں برسائی گئی ہیں۔ وہاں رپورٹرز اور ...رافرز پہنچنے لگے لیکن پولیس والوں کی مدد سے سب کو اسپتال کے اندر آنے سے روکا ...۔ ایک ڈاکٹر نے باہر آکر بتایا کہ درانی صاحب کی حالت بہت تشویشناک ہے۔ بچنے کی ...نہیں ہے۔ پھر بھی انہیں آپریشن تھیٹر میں بچانے کی کوششیں جاری ہیں۔ سیاستدان بھی وہاں پہنچ رہے تھے۔ حکمران پارٹی اور اپوزیشن کے لوگ بھی تھے۔

حکمران پارٹی کے افراد نے بیان دیا کہ ان کے وزیر پر اپوزیشن کے غنڈوں نے گولیاں برسائی ہیں اور اپوزیشن والوں نے بیان دیا کہ درانی صاحب ایسے نیک اور معزز شخص تھے کہ کوئی دشمن بھی ان سے دشمنی نہیں کرسکتا۔ یہ دشمنی نہیں، سیاسی چالیں ہیں۔ درانی صاحب کو آستین کے سانپ ڈسنا چاہتے ہیں۔

تقریباً دو گھنٹے بعد پتا چلا کہ ان کے جسم سے گولیاں نکال لی گئی ہیں۔ اس کے باوجود وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں۔ اب بھی بچنے کی امید برائے نام ہے۔

پارٹی لیڈر پریشان تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے ایک اہم وزیر کی تشویشناک حالت پر پریشان اور گھبرایا ہوا ہے۔ جبکہ فکر یہ تھی کہ اگر وہ بچ گیا تو کیا ہوگا؟ ان کے مشیر نے کہا۔ "کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی ثبوت اور گواہ نہیں ہے کہ ہمارے آدمیوں نے گولیاں چلائی تھیں۔"

وہ بولا۔ "صحافی اور مبصر کڑی سے کڑی ملاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوسکتا ہے کہ درانی صاحب وزارت سے استعفیٰ دے رہے تھے اور ہماری پارٹی سے علیحدہ ہورہے تھے۔"

"لیکن کیسے معلوم ہوگا؟"

"جب وہ ایک دن پہلے استعفیٰ لکھ کر جیب میں رکھ سکتے ہیں تو استعفیٰ دینے کی وجوہات بھی لکھ کر کسی کو دے سکتے ہیں۔ قرضے حاصل کرنے والی بات کسی کو بتا سکتے ہیں۔"

ایک اور وزیر نے کہا۔ "آپ ناحق پریشان ہورہے ہیں۔ وہ استعفیٰ پیش کرنے والا نہیں بچے گا۔ اسے ایک نہیں، کئی گولیاں لگی ہیں۔ اس کے دم توڑتے ہی استعفیٰ کو ضائع کردیا جائے۔ کسی کو ہمارے اندر کی بات معلوم نہیں ہوگی۔"

سیما اپنے بھائی زبیر اور والدین کے ساتھ اسپتال کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے چوہدری سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرے شوہر تو ایک شریف انسان ہیں، انہیں بھلا کون گولی مار سکتا ہے؟"

چوہدری نے کہا۔ "درانی صاحب کو اسی نے مارنے کی کوشش کی ہے، جسے ان کی ذات سے نقصان پہنچا ہے۔"

وہ بولی۔ "میرا خیال ہے، ایسے شریف انسان سے کسی کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

"تم بھول رہی ہو۔ تمہیں دو کروڑ روپے کا نقصان پہنچا ہے۔"

وہ چونک کر بولی۔ "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے دو کروڑ کی خاطر اپنے شوہر کو

ل کرنے کی کوشش کی ہے؟"

"میں تمہارا پہلے بھی دشمن نہیں تھا، اب بھی نہیں ہوں۔ تمہیں اپنے کام میں
نے کی کوشش کی تھی، مگر ناکامی ہوئی۔ خیر کوئی بات نہیں لیکن درانی صاحب نے
مارے قرضے کی درخواست کو منظور کرنے کے بعد نامنظور کیا اور تمہارا چیک کیش نہیں
نے دیا۔ یہ سارے کاغذات ریکارڈ کے طور پر موجود ہیں۔ اب میں یقین سے نہیں کہہ
تا کہ پولیس والے یہ تمام ریکارڈ دیکھنے کے بعد تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔"

سیما اور اس کے گھر والے پریشان ہوگئے۔ پارٹی کے افراد دو طرح کے بیانات دے
ہے تھے۔ ایک تو اپوزیشن والوں پر شبہ کر رہے تھے۔ دوسری بات یہ کہہ رہے تھے کہ
انی صاحب نے چھپ کر سیما سے شادی کی تھی اسے دو کروڑ روپے بھی دینا چاہتے تھے
رشاید خاندانی جھگڑے پیدا ہوگئے۔ پہلی بیوی کو ان کی دوسری شادی کا علم ہوگیا۔ اس
ے درانی صاحب وعدے کے مطابق سیما کو مطلوبہ رقم نہ دے سکے اور چیک کینسل
ادیا۔ ایسی ہی خاندانی دشمنی کے نتیجے میں انہیں ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سیما کو حراست میں لے لیا گیا۔ اب وہ صرف درانی صاحب کے بیان سے بچ سکتی
ی۔ وہ بیچارے بیہوش پڑے ہوئے تھے۔ انہیں دوسرے دن ہوش آیا لیکن وہ بیان
ینے کے قابل نہیں تھے۔ تیسرے دن پتا چلا کہ وہ کچھ نیم پاگل سے ہوگئے ہیں۔ کسی کو
انتے نہیں ہیں۔ بیوی بچے اور خاندان کے بزرگ آتے ہیں تو وہ سب کو دشمن سمجھتے
ں اور دھتکارتے ہیں۔ "چلے جاؤ، میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔ کون ہو تم لوگ؟ کیوں
رے پاس آتے ہو۔"

ڈاکٹروں نے ان کے تمام رشتے داروں کو ان کے قریب جانے سے منع کردیا۔ وہ
ب کمرے کے باہر سے ہی انہیں دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ وہ زندہ ہیں اور جلد
ادماغی توازن بھی درست ہوجائے گا۔

سیما کے خلاف یہ بات جاتی تھی کہ درانی صاحب نے اسے ایک بہت بڑی رقم سے
وم کردیا تھا لیکن یہ ثبوت اور گواہی نہیں تھی کہ اس محرومی کے باعث اس نے قاتلانہ
لہ کرایا ہے۔ تھانیدار نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "بلا کی خوبصورت ہو مگر
ہرے دنوں سے ہو۔ تمہاری جوانی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب تمہیں کس کی
انت پر چھوڑا جائے۔"

اس کے گھر والوں نے کار بیچ کر اسے رہائی دلائی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ آئندہ
زارا کیسے ہوگا۔ زبیر کا کاروبار بیٹھ گیا تھا۔ ساری رقم ڈوب گئی تھی۔ کچھ عرصہ تک تو

روکھی سوکھی چلتی رہی۔ وہ تین یا ساڑھے تین لاکھ کی کوٹھی ہی آخری جائیداد تھی۔ زبیر نے کہا۔ "اسے بیچ کر کوئی کاروبار کیا جائے۔"

وہ بولی۔ "میں اسے کبھی فروخت نہیں کروں گی۔ تمہیں کاروبار کا تجربہ نہیں ہے۔ ایک لاکھ روپے پہلے ہی ڈبو چکے ہو۔"

اس مسئلے پر بھائی بہن کا جھگڑا بڑھتا گیا۔ آخر ایک دن بھائی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ ادھر سے خبر آئی تھی کہ دڑانی صاحب کے زخم بھر گئے ہیں۔ وہ چلتے پھرتے ہیں۔ اپنی کوٹھی میں آگئے ہیں لیکن ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ کبھی وہ نارمل رہتے ہیں اور کبھی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

ان کے گھر سے ماہانہ اخراجات کے لیے سیما کو رقم ملنے لگی تھی۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے زچگی کا وقت قریب تھا لیڈی ڈاکٹر نے اسے اٹھ کر ذرا ٹہلنے کو کہا۔ وہ ٹہلنے کے دوران ضرورت کے تحت حمام میں گئی تو اس کے چکنے اور گیلے فرش پر سیما کا پاؤں ایسے پھسلا کہ وہ چیخ مار کر گری۔ پھر وہاں سے پھسلتی ہوئی باتھنگ ٹب سے ٹکرا کر رک گئی۔ اس کی چیخ سن کر نرس کمرے سے دوڑتی ہوئی آئی تو سیما کی چیخیں رک گئی تھیں اور ایک نوزائیدہ بچی کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نرس اور سیما کی ماں زچہ اور بچہ دونوں کو سنبھالنے لگی۔

سیانے کہتے ہیں' جہاں بیج بویا جاتا ہے وہیں فصل اُگتی ہے' اس بچی کو پہلے ہی دن حمام میں بویا گیا تھا' وہیں اس نے جنم لیا۔ یہ خوش خبری سب سے پہلے اس کے باپ کو پہنچائی گئی۔ فون کے پاس وہی بیٹھے ہوئے تھے اور نارمل تھے۔ اگر وہاں زاہدہ بیگم یا کوئی اور ہوتا تو یہ خوش خبری ان تک پہنچنے نہ دیتا۔

انہوں نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو' کون ہے؟"

آواز آئی "میں تمہاری ساس بول رہی ہوں۔"

انہوں نے پوچھا "کیا ماہانہ اخراجات پہنچ رہے ہیں؟"

"میں نے اخراجات کے لیے نہیں بلکہ ایک خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا ہے۔ تم ایک بیٹی کے باپ بن گئے ہو۔"

فون پر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی رہی۔ ساس نے پوچھا "کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔"

"باپ بن کر کسے خوشی نہیں ہوتی۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مجھ سے فریب کرنے والی عورت نے اسے جنم دیا ہے۔"

"میری سیما فریبی نہیں ہے۔ وہ دشمن کی باتوں میں آکر بہک گئی تھی۔ غلطی سب سے ہوتی ہے۔ اس سے بھی ایک غلطی ہو گئی۔ اسے معاف کر دو۔"

"معاف کرنے والا خدا ہے۔ میں یہ نہیں بھول سکتا کہ میں آج جس حال کو پہنچا ہوں' یہ سب سیما کے پیدا کردہ حالات ہیں۔ اس کی وجہ سے میں نے سیاست چھوڑی' وزارت چھوڑی' اپنی اعلیٰ خاندانی سطح سے گر کر اسے شریکِ حیات بنایا اور اب اس سے علیٰحدگی کا فیصلہ کر چکا ہوں تو اپنے دوسرے تمام فیصلوں کی طرح اس پر قائم رہوں گا۔"

"کیا اپنی بیٹی کی صورت بھی نہیں دیکھو گے؟ کیا اسے گود میں نہیں لو گے؟"

"یہ خاندانی معاملات ہیں' میں اپنے بزرگوں سے مشورہ کرنے کے بعد فون کروں گا۔"

انہوں نے ریسیور رکھ دیا چند لمحوں بعد پھر گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو۔"

ساس کی آواز سنائی دی۔ "بچی تمہاری پیدا ہوئی ہے۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تمہیں بیٹی سے ملنے کے معاملے میں تمہارے بزرگ تمہیں کیا مشورہ دیں گے لیکن ہمارے خاندان میں یہ دستور ہے کہ بچے کے کانوں میں باپ اذان دیتا ہے۔ تم نہیں آؤ گے تو بیٹی اذان سے محروم رہے گی لہٰذا فیصلہ بزرگوں کو نہیں تمہیں کرنا ہے۔"

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ وہ تذبذب میں پڑ گئے۔ انہوں نے بیگم کو بلایا اور بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر سنائی۔ زاہدہ بیگم کو اس خبر سے تکلیف پہنچی لیکن ڈاکٹروں نے تاکید کی تھی کہ دڑانی صاحب کو ہر حال میں خوش رکھا جائے اور ان کی خوشیوں کو بھی اپنی خوشیاں سمجھ کر بہلایا جائے۔

زاہدہ بیگم نے یہ بات بزرگوں کے سامنے پیش کی۔ سب کو ناگواری محسوس ہوئی لیکن ان سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ چچا نے کہا۔ "بے شک تمہیں وہاں جا کر اپنی بچی کو گود میں لینا چاہیے اور اس کے کان میں اذان سنانا چاہیے لیکن زاہدہ کو ساتھ لے جاؤ بہتر ہے۔"

باپ نے کہا۔ "تم نے سیما سے علیٰحدگی اختیار کی ہے لہٰذا تمہیں اپنی شریکِ حیات زاہدہ کے ساتھ جانا چاہیے۔"

انہوں نے بزرگوں کے مشورے پر عمل کیا۔ سیما کی کوٹھی کے احاطے میں دڑانی صاحب کی کار داخل ہوئی تو سب خوش ہوئے کہ اولاد کی کشش باپ کو کھینچ لائی ہے لیکن زاہدہ بیگم کو ساتھ دیکھ کر مایوس ہوئے۔ ماں نے بیٹی کو جا کر بتایا کہ سوکن بھی آئی ہے۔ یہ

نا گواری اور مایوسی کی بات تھی تاہم وہ زاہدہ بیگم کو اپنے ہاں آنے سے روک نہیں سکتے تھے' وہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی۔

وہ میاں بیوی زچہ کے کمرے میں آئے۔ سیما بچی کے ساتھ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ درّانی صاحب نے بڑی محبت سے بیٹی کو دیکھا۔ اسے اٹھا کر چوما اور پھر اس کے کان میں اذان دینے لگے۔

دونوں سوکنیں چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ اذان کے بعد سیما نے زاہدہ سے کہا۔ "میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

درّانی صاحب بیٹی کو گود میں لئے دوسرے کمرے میں ساس سسر کے پاس چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی سیما نے کہا۔ "خدا کو جو منظور تھا' وہ ہو گیا۔ میں آپ کی سوکن بن گئی' کیا آپ خدا کی رضا پر راضی نہیں رہیں گی؟"

زاہدہ نے کہا۔ "میں راضی ہوں۔ خدا کو منظور تھا کہ ان سے تمہاری شادی ہو۔ اس لیے شادی ہوگئی۔ میں نے حالات سے سمجھوتا کرلیا۔ دوسرے لفظوں میں خدا کی رضا پر راضی رہی اب تمہاری باری ہے۔"

"میری باری؟"

"ہاں۔ اب خدا کو یہی منظور ہے کہ وہ تم سے علیحدہ رہیں۔ لہٰذا تم بھی خدا کی رضا پر راضی رہو۔"

سیما نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں' میں آپ سے باتوں میں جیت نہیں سکوں گی' بس ایک التجا کرتی ہوں۔ آپ میرے شوہر سے علیحدگی ختم کرادیں۔"

"یہ فیصلہ تمہارے شوہر کا ہے۔ میں کیسے ختم کراسکتی ہوں۔"

"وہ آپ کی بات مانتے ہیں۔ اگر آپ کہیں گی تو وہ کم از کم مہینے میں ایک یا دو بار یہاں آسکتے ہیں۔"

زاہدہ نے کہا "پھر تو میرے گھر کی دوسری ملازمائیں بھی مجھ سے یہی التجا کریں گی۔ کیا میں نے اپنے شوہر کو تقسیم کرنے کے لیے شادی کی ہے؟"

سیما کو چپ سی لگ گئی۔ اس کے بعد بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ زاہدہ نے کہا۔ "میں تمہیں دانش مندانہ مشورہ دیتی ہوں۔ تمہیں میرے شوہر سے جو حاصل کرنا تھا وہ کر چکیں۔ اب ان کے اکاؤنٹ میں کچھ نہیں ہے اور میں ان کا ذاتی اکاؤنٹ رہنے بھی نہیں دوں گی لہٰذا تم ان سے طلاق حاصل کرلو۔"

طلاق حاصل کرنے سے مجھے کیا مل جائے گا؟"

"ابھی تمہیں ماہانہ اخراجات ملتے ہیں۔ تم چاہو تو پکے کاغذ پر لکھ دیا جائے گا کہ یہ اخراجات تاحیات ملتے رہیں گے یا چاہو تو پانچ دس لاکھ یکمشت لے لو۔ ابھی جوان ہو۔ کہیں بھی شادی کرکے ایک اچھی زندگی گزارو۔"

"یعنی تم چاہتی ہو' میں اپنی بچی کو کسی سوتیلے باپ کے سائے میں رکھوں؟"

"یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ بچی کو اس کے سگے باپ کے سپرد کردو۔"

"یعنی تمہارے جیسی سوتیلی ماں کے حوالے کردوں؟"

"میں نے مشورہ دیا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ میرے مشورے پر عمل کرو۔ یہ تو تم دیکھ رہی ہو کہ میں نے اپنے شوہر کو آنچل سے باندھ رکھا ہے۔ وہ کبھی آنچل چھڑا کر نہیں آسکے گا۔"

اس نے درّانی صاحب کو آواز دی۔ "آپ کہاں ہیں؟ دیر ہو رہی ہے۔ مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے۔"

وہ بیٹی کو گود میں لئے آگئے۔ پھر بولے۔ "میں نے اس ننھی سی گڑیا کا نام صائمہ درّانی رکھا ہے۔ کیسا ہے؟"

زاہدہ نے کہا۔ "اچھا ہے۔ اگر صرف صائمہ رہے۔"

سیما نے اٹھ کر بچی کو گود میں لے کر کہا۔ "یہ بچی بازار سے نہیں درّانی خاندان سے آئی ہے۔ اس لیے یہ صائمہ درّانی ہی کہلائے گی۔"

زاہدہ درّانی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی۔ سیما نے کہا۔ "میں نے ایک التجا کی تھی کہ میرے شوہر سے علیحدگی کا فیصلہ ختم کرادو مگر تم نے طلاق کا مشورہ دیا' یہ یاد رکھو میں مرجاؤں گی لیکن طلاق کبھی نہیں لوں گی۔ تم لوگوں کی خاندانی شرافت دیکھوں گی کہ کسی قصور کے بغیر مجھے کیسے طلاق دی جائے گی۔ میں خادم ذوالجلال کی شریکِ حیات ہوں اور آخری سانس تک رہوں گی۔"

زاہدہ اپنے میاں کو وہاں سے کھینچتی ہوئی دروازے سے باہر آئی۔ باہر سیما کی ماں کھڑی تھی۔ وہ ساتھ چلتی ہوئی ان کی کار تک آئی پھر بولی۔ "میں تمام باتیں سن رہی تھی۔ تم چاہو تو میں چٹکی بجا کر تمہارے میاں سے اپنی بیٹی کو طلاق کرا سکتی ہوں۔"

زاہدہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "کوئی سودا کرنا چاہتی ہو؟"

"کوئی نیا سودا نہیں ہے۔ وہی پرانا دو کروڑ کا روپے کا قرضہ ہے۔ وہ قرضہ منظور کرادو۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اب میرے میاں نہ سیاست میں ہیں اور نہ ہی وزارت میں۔ پھر قرضہ منظور کرنے کی بے تکی بات کیوں کر رہی ہو۔"

"بات بے تکی ہوتی تو کبھی نہ کہتی۔ تم سوکن سے نجات حاصل کرنے کے لیے دو کروڑ روپے دے سکتی ہو۔ آخر ایک ارب پتی باپ کی بیٹی ہو۔"

"ہم دولت یوں ضائع کرنے کے لیے جمع نہیں کرتے ہیں۔ تم دو کروڑ کا خواب دیکھ رہی ہو' میں تمہاری بیٹی کو دو کوڑی کا نہیں رہنے دوں گی۔"

وہ کار میں بیٹھ کر درانی صاحب کے ساتھ چلی گئی۔

ماں نے سیما سے کے پاس آکر کہا۔ "سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔ تیری سوکن بڑی تیز طرار ہے۔"

"ہاں' میں نے بھی اسے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں درانی سے طلاق لے لوں۔"

"ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا' اس بچی کے طفیل ہمیں اچھی خاصی رقمیں ملتی رہیں گی۔ بس ایک فکر ہے کہ تُو یہ پہاڑ جیسی جوانی کیسے گزارے گی۔"

"گزاروں گی لیکن شادی نہیں کروں گی۔ درانی پر ثابت کروں گی کہ اسی کے نام سے جوانی گزار رہی ہوں۔ جس نے مجھ سے دو کروڑ چھین لیے میں اس سے ضرور انتقام لوں گی۔"

یوں دن گزرنے لگے۔ سیما کو امید تھی کہ باپ اپنی بیٹی سے ملنے ضرور آئے گا۔ اسے اولاد کی محبت لائے گی۔ جب وہ نہیں آیا تو سمجھ میں آگیا کہ زاہدہ بیگم نے میاں کو قابو میں کر رکھا ہے۔

ایک روز اس نے فون کیا۔ دوسری طرف سے درانی صاحب کی آواز سنائی دی "ہیلو' کون ہے؟"

سیما سمجھتی تھی کہ میاں صاحب اس کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیں گے۔ اس نے بچی کے بازو میں ایک چٹکی لی۔ وہ ننھی سی جان تکلیف سے رونے لگی۔

درانی صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ یہ کس کا بچہ رو رہا ہے۔"

"رو رہی ہے۔ اپنے خون کی چیخ و پکار کو پہچاننا چاہیے۔"

وہ سیما کی آواز پہچان کر بولے۔ "تم؟ یہ تم ہو' میری بچی کو رُلا رہی ہو؟"

"میں کیوں رُلاؤں گی۔ یہ خود ہی باپ کی گود میں جانے کے لیے رو رہی ہے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ ایک مہینے کی بچی باپ کی گود کو نہ پہچان سکتی ہے نہ اس کے

لیے رو سکتی ہے۔"

"یاد کرو۔ تم نے زاہدہ کے نوزائیدہ بچوں کو کبھی گود میں لے کر بہلایا ہوگا تو وہ تھوڑی دیر رو کر چپ ہوگئے ہوں گے۔ دنیا کے بے شمار باپ اپنے بچوں کو یہ سوچ کر گود میں نہیں لیتے کہ بچے انہیں پہچانتے ہیں۔ بلکہ باپ رفتہ رفتہ اپنی گود کی گرمی سے انہیں آشنا کراتے ہیں۔"

"میں مانتا ہوں ایسا ہوا کرتا ہے۔ مگر صائمہ کو چپ کراؤ۔"

"یہ اسی طرح روتی رہے گی۔ آپ فون بند کر دیں گے' آپ تک آواز نہیں آئے گی پھر بھی یہ روتی رہے گی۔ اسے چپ کرانا چاہتے ہو تو فوراً آکر اسے اپنے سینے سے لگاؤ۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے۔ میں کہتا ہوں اسے چپ کراؤ۔"

"خدا کی قسم یہ روتے روتے سوجائے گی یا مرجائے گی مگر میں چپ نہیں کراؤں گی۔"

خاموشی چھاگئی درانی صاحب کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ سیما ریسیور کان سے لگائے بڑی توجہ سے کوئی آواز سننا چاہتی تھی۔ مگر کسی کی سانس بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہلکی سی آواز آئی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ "ارے یہ ریسیور نیچے کیوں لٹک رہا ہے' اسے کس نے اٹھایا اور لٹکایا ہے؟"

پھر زاہدہ کی آواز سنائی دی۔ "وہ کسی سے پوچھ رہی تھی۔ "یہ میری کار کون لے گیا؟"

شاید کسی ملازم نے جواب دیا۔ "صاحب ابھی دوڑتے ہوئے گئے ہیں۔ وہی کار لے گئے ہیں۔"

سیما نے ریسیور رکھ دیا پھر روتی ہوئی بچی کو اٹھا کر دودھ پلانے لگی وہ چپ ہوگئی۔ اس نے باپ کو آواز دے کر کہا۔ "ابا! باہر والا گیٹ کھول دیں آپ کے داماد آرہے ہیں۔"

ادھر درانی صاحب کی کوٹھی میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے تاکید کی تھی کہ درانی صاحب کو ہمیشہ نارمل رکھنے کی کوششیں کی جائیں۔ اب سب یہی سوچ رہے تھے کہ ان کی ذہنی رو بہک گئی ہے۔ وہ خود ہی کار ڈرائیو کرتے ہوئے کہیں چلے گئے ہیں۔

درانی صاحب کے والد نے ڈاکٹر سے فون پر پوچھا۔ "کیا میرا بیٹا آپ کے پاس آیا ہے؟"

"جی نہیں۔ بائی دی وے اُس کی ذہنی حالت کیسی ہے؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے بالکل نارمل تھا پھر اچانک ہی کار لے کر کہیں چلا گیا ہے۔"

"کہیں تفریح کے لیے گیا ہوگا۔ کبھی کبھی اسے تنہا چھوڑ دیا کریں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ انہوں نے اپنی بہو زاہدہ سے کہا۔ "گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اسے کبھی کبھی تنہا چھوڑ دیا جائے۔"

زاہدہ نے کہا۔ "لیکن وہ اچانک کہاں گئے ہیں؟ ملازم کہہ رہا ہے وہ بڑی جلدی میں تھے۔"

اس کمرے میں کھڑے ہوئے ملازم نے کہا۔ "شاید وہ کسی کا فون سن کر جلدی سے گئے ہیں۔ جلدی میں ریسیور بھی ٹھیک طرح نہیں رکھا تھا وہ نیچے لٹک رہا تھا۔"

زاہدہ نے پریشان ہو کر اپنے سسر سے کہا۔ "بڑے ابو! کچھ گڑ بڑ ہے۔ کسی نے فون پر انہیں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جسے سن کر وہ دوڑ پڑے ہیں۔"

"ایسی پریشانی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ وہ بھاگتا چلا جائے۔"

"ایسے وقت میں کوئی بھی ہو' اسے سب سے پہلے دشمن کا خیال آتا ہے' زاہدہ کو بھی سیما کا خیال آیا۔ اس نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر سیما کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو' کون ہے؟"

زاہدہ نے کہا۔ "میں بول رہی ہوں' دُرّانی صاحب کہاں ہیں؟"

"تم کچھ روز پہلے یہ دعوے کر کے گئی تھیں کہ اپنے میاں کو آنچل سے باندھ کر رکھتی ہوں بہتر ہے اسے آنچل کی گرہ میں ڈھونڈو۔ بے وقت فون نہ کیا کرو۔ فون کی گھنٹی سن کر میری بچی جاگ جاتی ہے۔ صائمہ دُرّانی سو رہی ہے پھر کسی وقت فون کرو۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس وقت باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آ رہی تھی۔ ماں نے آ کر کہا۔ "تمہارا میاں آیا ہے۔"

"اچھا تم جاؤ۔"

ماں چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی اس نے ننھی سی صائمہ کو ایک جھٹکے سے 'اٹھایا' وہ روتے روتے ابھی دودھ پی کر سوئی تھی۔ اس نے ذرا سی آنکھ کھولی۔ پھر سو گئی لیکن یہ اپنے میاں کو قابو میں کرنے کے منصوبے کے خلاف تھا۔ اسے روتے رہنا چاہیے تھا۔

اس نے بچی کے بازو میں زور کی چٹکی لی۔ وہ ننھی سی جان تلملا کر رونے لگی۔ یہ دوسری بار اس بچی پر ظلم ہوا تھا اور یہ ظلم ماں کر رہی تھی۔ کہتے ہیں اولاد کی تربیت کے لیے کبھی کبھی اس پر سختی کرنی چاہیے لیکن وہ اولاد کے باپ کو زیرِ تربیت رکھنے کے لیے

اپنی ہی بچی کے لیے سنگدل بن گئی تھی۔

اس بار صائمہ ایسے تلملا کر رو رہی تھی کہ اس کی چیخیں باہر تک جا رہی تھیں۔ دُرّانی صاحب کار سے اتر کر تیزی سے چلتے ہوئے کوٹھی کے اندر آئے۔ سیما کے کمرے میں پہنچے۔ پھر صائمہ کو اس کی گود سے چھین کر بولے۔ "تم ماں ہو یا چڑیل؟ اسے گھنٹے بھر سے رُلا رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "شکایت کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔ میں نے گھنٹے بھر رلایا ہے۔ آپ زندگی بھر اسے آہوں اور آنسوؤں میں ڈبونے والے ہیں۔ ایک بار بیٹی کی آواز سن کر چلے آئے۔ کیا ہر بار اطلاع دے سکوں گی کہ یہ خدانخواستہ کسی بیماری یا مصیبت میں ہے۔ یہ دو برس بعد ابو ابو پکارے گی۔ کیا اس کی آواز آپ کے کانوں تک جائے گی۔"

وہ بیٹی کو گود میں لیے ٹہل رہے تھے۔ منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکال کر اسے سمجھانے اور چپ کرانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ باپ اپنی اولاد کو سینے سے لگا کر اس کی تکالیف کو سمجھنے اور ان تکالیف کو دور کرنے کے جتن کرتا رہے تو ماں دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں خوشیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ سب سے پہلی خوشی تو یہ کہ جس مرد سے اس کی ساری زندگی وابستہ ہے' اس مرد کی اولاد کو اس نے جنم دیا ہے۔

دوسری خوشی یہ کہ اولاد کے حوالے سے اپنے شوہر کو ایک نئی محبت اور نئے رشتے سے باندھ لیا ہے۔

تیسری خوشی یہ کہ اس کی اولاد ایک بہت بڑے باپ کے نام سے پہچانی جاتی رہے گی اور شوہر کا گھرانا اس کی بیوی کی پیدا کردہ نسل سے چلتا رہے گا۔

اور سب سے بڑی خوشی یہ کہ شوہر کی دولت اور جائیداد سب کچھ اس بیوی کے بچوں کو ملے گی۔

لیکن ساری کی ساری خوشیاں اکثر پوری نہیں ہوتیں۔ پہلی بیوی نے مسرتوں کی راہیں روک دی تھیں۔ کچھ اپنی غلطی نے بھی مشکلات پیدا کر دیں تھیں۔ ان حالات میں سیما جو کچھ کھو رہی تھی اسے دوبارہ پانے کے جتن کر رہی تھی۔

سیما کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس کا کوئی شجرہ نسب نہیں تھا۔ غریب محتاج ہوتے ہیں یہ ایک الگ بات ہے لیکن ان کا کوئی بہت بڑا فیملی بیک گراؤنڈ نہیں ہوتا۔ سیما اور اس کے والدین بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے آباؤ اجداد برسوں پہلے یا

صدیوں پہلے کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

لیکن ایک بات وہ ساری دنیا سے چھپاتے آرہے تھے کہ ان کے دور کے رشتے داروں کا تعلق ہیرامنڈی سے تھا۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت تھی کہ دس بارہ برس پہلے وہ اس بازار سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ کچھ مجبوریاں تھیں یا دولت مند بننے کی خواہش تھی' جو انہیں وہاں لے گئی تھی۔ بہرحال سیما اور اس کے والدین نے ان رشتہ داروں سے قطع تعلق کیا ہوا تھا۔

پھر بھی یہ خوف رہتا تھا کہ ان رشتے داروں سے کبھی تعلق ظاہر نہ ہو جائے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ سوکن زاہدہ بیگم کو پہنچے گا۔ درّانی صاحب بھی اسے بازاری اور دھوکا دینے کے الزامات کی بنیاد پر آسانی سے طلاق دے سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ درّانی صاحب کے اعلیٰ خاندان کے سامنے سیما احساسِ کمتری میں مبتلا رہتی تھی۔ ایک منکوحہ کی حیثیت سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے بہت تیزی طراری نہیں دکھاتی تھی۔ کوشش کر رہی تھی کہ حکمتِ عملی سے جتنے زیادہ حقوق حاصل ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہوگا۔ ورنہ بات بگڑنے سے بات بازارِ حسن تک پہنچ سکتی تھی۔ اسی لیے اس نے چوہدری سے بھی بگاڑ پیدا نہیں کیا تھا۔

فی الحال جو بازی اس کے ہاتھ میں تھی' اس میں سب سے مضبوط پوزیشن یہ تھی کہ وہ مذہبی اور قانونی طور پر درّانی صاحب کی شریکِ حیات تھی اور اس اعلیٰ خاندان کی بہو کی حیثیت سے ایک باعزت مقام اسے حاصل تھا۔

دوسری مضبوط پوزیشن یہ تھی کہ اس نے درّانی صاحب کی اولاد کو جنم دیا تھا۔ ننھی صائمہ نے جنم لے کر باپ اور بیٹی کا غیرت مند رشتہ قائم کر دیا تھا۔ کسی کمزوری کی بنا پر کسی موقع پر سیما کو طلاق تو دی جاسکتی تھی لیکن بیٹی کے رشتے کو کسی صورت سے بھی توڑا نہیں جاسکتا تھا۔

ایسے میں اس نے باپ کے جذبات کو فون پر چھیڑا تھا اور کامیاب رہی تھی۔ ننھی صائمہ باپ کی گود میں روتے بلکتے تھک ہار کر سینے سے لگ کر سو گئی تھی۔ وہ نہایت شریف' رحم دل اور انصاف پرور باپ تھے۔ سینے سے لگ کر سونے والی بیٹی معصومیت سے احساس دلا رہی تھی کہ وہ اپنے باپ کی بھرپور محبت حاصل کرتے رہنے کی حقدار ہے اور یہ حق اسے نہ ملا تو پھر باپ ناانصافی کا مرتکب ہوگا۔

وہ اپنے ملک اور قوم سے ناانصافی اور بے ایمانی نہیں کرسکتے تھے۔ ملکی خزانے کو قرضے کے نام پر بے ایمان لوگوں کو نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے اپنے بہت بڑے

ھدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ بلکہ سیاست چھوڑ دی تھی۔

مگر سیاست صرف ملک میں نہیں ہوتی' اپنے گھروں میں بھی ہوتی ہے۔ اپنے گھر یں اپنے خاندان میں زیادہ اہمیت حاصل کرنے کے لیے بھی بڑی بڑی چالیں چلی جاتی یں۔ درّانی صاحب ملکی سیاست سے نکل آئے تھے لیکن گھریلو سیاست میں الجھ گئے تھے۔

ان کے خاندان میں ایک پارٹی کی لیڈر زاہدہ بیگم تھی دوسری پارٹی کی لیڈر سیما ھی۔ وہ کسی رشتے سے مستعفی نہیں ہوسکتے تھے۔ ایک پارٹی کو طلاق دے کر دوسری سے ابستہ نہیں رہ سکتے تھے۔ دونوں سے اولادیں تھیں۔ ان اولادوں کو عوام کہا جاسکتا تھا اور وام میں سے کسی کا حق مارنا ان کا شیوہ نہیں تھا۔

انہوں نے بیٹی کو ماں کے پہلو میں سُلادیا پھر کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔ یں نے فیصلہ کیا تھا کہ تمہارا منہ بھی نہیں دیکھوں گا۔ تمہارے ساتھ ایک چھت کے یچے نہیں رہوں گا لیکن آج میری بچی کے ذریعے تم نے مجھے یہاں تنہا آنے پر مجبور ردیا۔"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں۔ ہر انسان سے غلطی ہوتی ہے۔ میں نے چوہدری کی باتوں میں آکر ایک غلطی کی۔ اس کی بار بار معافی چاہتی ہوں۔ ر کوئی راستی پر آنا چاہے تو کیا آپ کا فرض یہ نہیں ہے کہ اسے گمراہی سے بچائیں۔"

"تم نے کوئی معمولی سی غلطی نہیں کی تھی۔ تمہاری وجہ سے میرا تمام سیاسی کیریئر و ہوگیا۔ میں نے مرتے مرتے نئی زندگی پائی ہے۔ میں نادان نہیں ہوں' جانتا ہوں کہ ان لوگوں نے مجھ پر کیوں گولیاں چلائیں تھیں لیکن میں نے کسی کے خلاف بیان نہیں ۔ یہ بھی ایک سیاست ہے اور اسی سیاست کی بنا پر دوسری بار مجھ پر حملہ نہیں ہوا ہے رنہ ہوگا۔ جو لوگ میری طرف سے اندیشوں میں مبتلا تھے' وہ مطمئن ہوگئے ہیں۔"

وہ بولی۔ "اللہ آپ کو لمبی عمر دے اور آپ کا سایہ میری بیٹی پر قائم رکھے۔ آپ ب بار میری وفاداری کو آزما کر دیکھیں پھر کوئی چھوٹی سی غلطی ہو تو مجھے ٹھوکر ماردیں۔"

"اب تو بات تمہاری نہیں' میری صائمہ کی بھی ہے۔ اس معصوم نے کیا غلطی کی ۔ اسے باپ سے دور نہیں رہنا چاہیے۔ میری قربت اور میرا پیار اسے ہمیشہ ملنا ہیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں بہت الجھ گیا ہوں۔"

"الجھن کیسی؟ آپ نے دوسری شادی کو چھپائے رکھنے کا حکم دیا تھا۔ میں اس پر م رہی۔ آپ نے خود اس شادی کا اعتراف کیا۔ ٹھیک ہے کہ آپ کے بزرگوں کی وں میں مَیں کسی گرے پڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں لیکن صائمہ درّانی کا تعلق

تو آپ کے خاندان سے ہے کیوں کہ یہ آپ کا خون ہے۔"

"یہی الجھن ہے۔ صائمہ کو میری دوسری تمام اولاد کے برابر حقوق ملنے چاہئیں لیکن میرے ابو نے صائمہ کی پیدائش سے پہلے ہی وصیت لکھ دی ہے کہ ان کی تمام دولت اور جائیداد صرف ان بچوں کو ملے گی جنہیں زاہدہ جنم دے گی۔ ابو نے اپنی دولت میرے نام بھی نہیں کی۔ آخر میں اپنی بیٹی صائمہ کو کیا دوں؟ اس سے ناانصافی کیسے کروں؟"

"آپ بھی ایک انسان کی حیثیت سے غلطی کر چکے ہیں۔ اگر وہ دو کروڑ کا چیک کیش ہونے دیتے تو وہ تمام رقم ہماری بیٹی کے کام آتی۔"

"پھر وہ دو کروڑ کا قرضہ کیسے ادا ہوتا؟ تمہاری ٹیکسٹائل مل کا منصوبہ ناکام ہوتا تو رقم واپس نہیں ملتی۔"

"اقتدار میں رہ کر قرضہ لے کر گھر جانے والے سیاستدانوں نے کبھی رقم واپس نہیں کی۔ ایک آپ ہی ہیں، جو رقم کی واپسی کی فکر میں آج بیٹی کے مستقبل کو تباہ کر رہے ہیں۔"

"تم اپنے طور پر درست کہہ رہی ہو۔ مگر حرام کی رقم آج بھی ملے تو میں اپنی بیٹی کو نہیں دوں گا۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ اپنی بیٹی کے لیے کسی بڑی فرم میں ملازمت کروں گا۔"

"پھر بھی صائمہ کو آپ کی دوسری اولاد کے برابر نہ دولت ملے گی اور نہ عزت۔ آپ تو بڑے انصاف پسند ہیں۔ کیا آپ کی بیٹی ان کی برابری کر سکے گی؟"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگے۔ بڑی دیر خاموشی رہی پھر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بولے۔ "یہ مسئلہ پیچیدہ ہے۔ آج ہی حل سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس پر غور کرنا ہو گا۔ میں جا رہا ہوں۔ کل پھر اپنی بیٹی کو پیار کرنے آؤں گا۔"

سیما نے پوچھا۔ "صرف بیٹی کو؟ اور میں آپ کی کچھ نہیں ہوں مجھ سے آپ کوئی لگاؤ نہیں رکھیں گے؟"

وہ جاتے جاتے رک گئے۔ انہوں نے سیما کو دیکھا پھر کہا۔ "لگاؤ ہے۔ تم میری بیٹی کی ماں ہو۔"

یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ سیما نے ناگواری سے اس دروازے کو دیکھا جہاں سے وہ گئے تھے پھر اس نے دل میں کہا۔ "بیٹی کے ذریعے ہی سہی۔ لگاؤ تو ابھی رہے گا۔ میں دیکھوں گی کہ یہ حضرت کب تک مجھے نظرانداز کریں گے۔"

ماں نے آکر پوچھا۔ "بیٹی! سب خیریت تو ہے؟"

"خیریت ہے۔ رفتہ رفتہ مزید بات بنتی جائے گی۔ میری صورت نہ دیکھنے والے کو آج یہاں آنا پڑا۔ وہ کل بھی آئیں گے۔ میں نے چاند سی بیٹی پیدا کی ہے۔ اب وہ روز چاند دیکھنے آئیں گے۔"

دونوں ماں بیٹیاں ہنسنے لگیں۔

درانی صاحب اپنی بہت بڑی کوٹھی کے احاطے میں پہنچے تو وہاں سب کو پریشان پایا۔ ان کے والد اور چچا باغیچے میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درانی صاحب کے بچے کھیل رہے تھے اور زاہدہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ ان کی کار دیکھتے ہی تیزی سے چلتی ہوئی آئی پھر بولی۔ "آپ کچھ بتائے بغیر کہاں چلے گئے تھے؟"

وہ کار سے باہر نکلتے ہوئے بولے۔ "ہاں، غلطی ہو گئی۔ تمہیں بتائے بغیر تمہاری کار لے گیا تھا۔"

"میں اپنی کار کے لیے نہیں، آپ کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔"

باپ اور چچا بھی قریب آگئے تھے۔ باپ نے کہا۔ "میاں صاحبزادے! تمہیں کار خود ڈرائیو نہیں کرنا چاہیے تھی۔ کسی ڈرائیور کو ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟"

وہ گھاس پر بچھی ہوئی کرسیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ "میں نے ڈرائیور کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ سیما کے ہاں گیا تھا۔"

سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ زاہدہ ٹھٹک کر کھڑی رہ گئی تھی۔ پھر بولی۔ "اس نے فون کیا اور آپ اتنی تیزی سے گئے کہ ریسیور کو بھی لٹکتا ہوا چھوڑ دیا۔ آخر ایسی کیا ایمرجنسی تھی؟"

"بچی بہت رو رہی تھی۔ میں نے جا کر اسے گود میں لیا تو کمال ہو گیا۔ جیسے وہ باپ کی گود پہچانتی ہے۔ میرے پاس آکر رونا بھول گئی۔ میرے سینے سے لگ کر سو گئی۔"

زاہدہ نے پوچھا۔ "آپ نے سیما سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا؟"

"میں سیما کی بات نہیں کر رہا۔ میں اپنی بیٹی صائمہ کے پاس گیا تھا۔"

باپ نے کہا۔ "آخر اُسی گھر میں گئے تھے۔"

"ابو! میں نے اس گھر کے درو دیوار نہیں دیکھے۔ اپنی بیٹی کو دیکھا اور پیار کیا۔ کیا باپ اپنی اولاد سے پیار نہیں کرتا ہے؟ کیا آپ مجھ سے پیار نہیں کرتے ہیں؟"

"حیثیت دیکھ کر محبت کی جاتی ہے۔ کیا تم اس دو کوڑی کی بچی سے میرے ان پوتے پوتیوں کی برابری کر رہے ہو۔"

"سوری ابو! میرا خون خود دو کوڑی کا ہو گا تو صائمہ دو کوڑی کی ہو گی۔ ورنہ میرے

دوسرے بچوں کے برابر ہوگی۔"

وہ غصے میں گرج کر بولے۔ "تم مجھ سے بحث کر رہے ہو؟"

"معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ بحث نہیں کروں گا۔"

باپ نے کہا۔ "یہ میرا حکم ہے۔ تم آئندہ اس گھر کا رخ نہیں کرو گے۔"

درانی صاحب سر جھکائے بیٹھے رہے۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ باپ نے کہا۔ "چپ کیوں ہو۔ جواب دو۔ میری بہو کے سامنے وعدہ کرو کہ ان ماں بیٹی سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے؟"

"کیسے وعدہ کروں؟ کچھ کہوں گا تو آپ فرمائیں گے کہ میں بحث کر رہا ہوں۔ کیا آپ ایک سوال کی اجازت دیں گے؟"

"بولو۔ کیا سوال ہے؟"

"کیا آپ مجھے بیٹا ماننے سے انکار کرسکتے ہیں؟"

"یہ کیا بکواس ہے؟"

"میں نے سوال کیا ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں کرسکتے ہیں تو میں کیسے صائمہ کو بیٹی ماننے سے انکار کردوں؟ آپ ایک باپ ہو کر ایک باپ سے کہہ رہے ہیں کہ میں اپنی بیٹی سے کوئی تعلق نہ رکھوں۔"

"میں اس بچی کی اوقعات دیکھ کر تمہیں سمجھا رہا ہوں۔"

"پلیز آپ میرے خون کی اوقعات سمجھادیں۔"

باپ نے غصے سے بھڑک کر کہا۔ "دور ہو جاؤ میری نظروں سے' میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔"

درانی صاحب کرسی سے اٹھ کر کوٹھی کے اندر اپنی خواب گاہ میں آگئے۔ زاہدہ ان کے پیچھے آئی پھر بولی۔ "کیا آپ کو احساس ہے کہ آپ ایک دو ٹکے کی عورت کی خاطر میری توہین کر رہے ہیں۔"

وہ بولے۔ "وہ عورت دو ٹکے کی نہیں ہے۔ میں ایک گرا ہوا انسان ہوں۔ تمہیں بتاچکا ہوں کہ میں ایک گناہ گار ہوں۔ وہ ایک گناہ نہ کرتا تو بات اتنی دور تک نہ پہنچتی۔"

"اس نے آپ کو پھانسنے کے لیے ایسا کیا تھا۔"

"ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ دوسرا کس قدر مجرم ہے یا گناہ گار ہے۔ ہمیں اپنے اعمال کا حساب کرنا چاہیے۔ میں اپنے اعمال دیکھتا ہوں۔ جو عمل غلط ہوتا ہے' اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے دل میں ذرا سا بھی ایمان ہے تو مجھے بتاؤ کہ اُس معصوم بچی

کیا قصور ہے۔ وہ میرے اعمال کے نتیجے میں دنیا میں آئی ہے۔ کیا وہ میرے دوسرے ں کے برابر حقوق نہیں رکھے گی۔"

ایمان اپنی جگہ ہے۔ میں اپنے بچوں کے برابر حقوق اسے کبھی نہیں دوں گی۔"

"تو پھر جاؤں یہاں سے۔ اس بچی کا باپ ابھی زندہ ہے۔ میری یہی کوشش ہوگی کہ کسی سے کمتر نہ رہے۔"

وہ روتی ہوئی بولی۔ "آپ پر ایمان اور دیانت داری اتنی حاوی کیوں ہے؟ کیا آپ سے نرالے ہیں۔ آدمی غلطی کی سزا پاتا ہے۔ جرمانہ بھرتا ہے اور ہم جرمانہ ادا کر رہے ۔ ہر ماہ انہیں رقم دیتے ہیں۔ آپ بیٹی کی خاطر مزید رقم بڑھادیں۔ وہ بڑی ہوگی تو اس تعلیمی اخراجات پورے کریں۔ کہیں سے رشتہ آئے گا تو شادی کردیں۔ یوں باپ کے فرائض ادا کریں گے تو ضمیر مطمئن رہے گا۔"

"یہ تم اپنے ضمیر کی بات کر رہی ہو۔ میرا ضمیر اس وقت مطمئن ہوگا جب میرے بچوں کے ساتھ برابر انصاف ہوگا۔"

ان کے درمیان بحث ہونے لگی۔ وہی سیاسی بحث کہ ایک گھر میں دو سوکنیں اور ملک میں دو سیاسی پارٹیاں گلے مل کر نہیں رہ سکتیں۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی شش میں گھر کو اور ملک کو تباہ و برباد کردیتی ہیں۔

کوئی ضروری نہیں کہ ایک گھر میں دو سوکنیں ہوں' دو بھائی بھی اپنی اپنی اہمیت اور ی قائم رکھنے کی حماقت میں اپنا گھر اجاڑ دیتے ہیں۔ ایک زمین' ایک عورت اور ایک ی کے ایک سے زیادہ دعوے دار ہوں تو پھر وہاں امن و امان نہیں رہتا۔ اگرچہ ت اور خاندانی مرتبے کے اعتبار سے زاہدہ بیگم کا پلڑا بھاری تھا۔ تاہم اپوزیشن پارٹی کی پوزیشن بھی کمزور نہیں تھی۔ درانی صاحب انصاف اور دیانت داری کے تقاضے ے کرنے کے لیے اپنی بیٹی صائمہ کی زیادہ حمایت کرنے لگے تھے۔

انہوں نے کئی بار اپنے والد کو سمجھایا کہ انصاف کریں۔ وصیت میں تبدیلی کرکے ہ کو بھی برابر کے حقوق دیں لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ اتنا ضرور کہا کہ اپنی ہی اولاد کا ہے اس لیے خیرات اور زکوٰۃ سے کچھ زیادہ دے دیں گے۔

زاہدہ بیگم اور اس کے والد یعنی درانی صاحب کے چچا نے کہا۔ "وہ مخمل میں ٹاٹ کا ہے اور ہم ایسے مخمل ہیں کہ مخمل کا بھی پیوند نہیں لگاتے۔ سیما کو کسی طرح طلاق ہم ماں بیٹی سے نجات حاصل کرنے کے لیے دو چار لاکھ روپے دے دیں گے لیکن خاندان میں ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلے گی۔"

ایسے مسائل دو چار برسوں میں حل نہیں ہوتے۔ برسا برس لگ جاتے ہیں۔ کبھی پہلی پارٹی دوسری پارٹی کو نیچا دکھاتی ہے۔ کبھی دوسری پارٹی' پہلی پر سبقت لے جاتی ہے لیکن مسائل کا اونٹ بیٹھتے بیٹھتے بھی کسی کروٹ نہیں بیٹھتا۔ بس آسرے میں رکھتا ہے کہ کسی ایک کروٹ بیٹھنے والا ہے۔

درانی صاحب نے ایک بیرونی ملک کی بہت بڑی کمپنی میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی ملازمت کرلی۔ ان کے والد نے غصے سے کہا۔ "کیوں خاندان کی بے عزتی کر رہے ہو۔ ہمارے ہاں کبھی کسی نے ملازمت نہیں کی۔ آخر تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "صائمہ آٹھ برس کی ہوگئی ہے۔ اس کے اخراجات بڑھ گئے ہیں اور اخراجات پورے کرنے کے لیے ملازمت کرنا لازمی ہے۔"

"مزید رقم کی ضرورت ہو تو میں دے سکتا ہوں۔"

"سوری۔ اب میں دوسرے گھر کے اخراجات کے لیے یہاں سے رقم نہیں لوں گا۔ اس گھر کی ضرورت میری محنت سے پوری ہوا کرے گی۔"

سیما نے سنا تو اس نے بھی اعتراض کیا۔ "آپ کو کسی فرم میں ملازمت نہیں کرنا چاہیے۔"

"پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ بیٹی دیکھتے دیکھتے جوان ہوجائے گی۔ مجھے ابھی سے کچھ کرنا چاہیے۔"

"کیا آپ ملازمت کرکے میری بیٹی کو کروڑ پتی' ارب پتی بنا سکیں گے۔"

انہوں نے پوچھا۔ "کروڑ پتی ہونا کیا ضروری ہے؟"

"کیا آپ کے دوسرے تمام بچوں کو ارب پتی کہلانا چاہیے اور ہماری بیٹی کو کچھ بھی نہیں؟ کیا یہ آپ صائمہ سے انصاف کر رہے ہیں؟"

"میں اپنی محنت اور صلاحیتوں سے جس قدر انصاف کر سکتا ہوں' کرتا رہوں گا۔"

"آپ جو کچھ کر رہے ہیں' اس سے زیادہ کے اہل ہیں۔ آپ پہلے کی طرح سیاست میں حصہ لیں۔ لوگ آج بھی آپ کو جھک کر سلام کرتے ہیں۔ آپ پر ووٹوں کی بارش کریں گے۔ آپ جس پارٹی میں جائیں گے' وہاں آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔"

"تم سیاست کو مجھ سے زیادہ نہیں سمجھتی ہو۔"

"خوب سمجھتی ہوں۔ الیکشن میں کامیاب ہونے والا کوٹھیوں اور کاروں کا مالک بن جاتا ہے۔ کوئی وزارت مل جائے تو باہر کے بینکوں میں اس کے ہزاروں اور لاکھوں پونڈز جمع ہوجاتے ہیں۔ اس کے بچے یورپ اور امریکہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کیا آپ

نہیں چاہتے کہ آپ کی یہ بیٹی لندن میں تعلیم حاصل کرے؟"

"یہ تم جتنے خوبصورت خواب دیکھ رہی ہو' سب پورے کرنے کے لیے سیاست سے زیادہ منافع بخش کاروبار اور کوئی نہیں ہے۔ میں الیکشن میں لاکھوں لگا کر کروڑوں کما سکتا ہوں۔ ایسا زبردست منافع منشیات کی اسمگلنگ میں بھی ہے اور بھی کئی غلط طرح کے دھندے ہیں۔ دولت کئی دھندوں سے آتی ہے مگر سب سے شریفانہ اور معزز دھندہ سیاست ہے۔ اس میں بدنامی کم اور خریدے ہوئے اخبارات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے نیک نامی زیادہ ملتی ہے' سرسری سے الزامات عائد ہوتے ہیں لیکن ثبوت نہیں ہوتے کہ اسمگلنگ وغیرہ کی طرح غلط کاری کے ذریعے ملک کو تباہ کیا جا رہا ہے۔"

"آپ نے تو تقریر شروع کردی۔"

"یہ تقریر نہیں نصیحت ہے۔ تم سے پوچھتا ہوں' جب غلط دھندہ کرنا ہی ٹھہرا تو پھر سیاست کیوں؟ منشیات اور ہتھیاروں کی اسمگلنگ کیوں نہ کی جائے؟ ایک خفیہ گینگ بنا کر بینکوں میں ڈاکے کیوں نہ ڈالے جائیں؟"

"میں آپ کو صرف سیاست کا مشورہ دے رہی ہوں۔"

"مشورہ اس لیے دے رہی ہو کہ سیاست میں مجرم پکڑے نہیں جاتے کیوں کہ پولیس اور انتظامیہ سب کی سب اُن کی محافظ ہوتی ہے۔ اقتدار سے نکلنے کے بعد بھی وہ اعزت جاگیردار اور صنعت کار ہوتے ہیں۔"

"یعنی آپ مجھے اور میری بیٹی کو زاہدہ بیگم کی اونچی سطح پر نہیں لائیں گے۔ اپنی اتوں سے اور دلائل سے ہمیں ان کے مقابلے میں کمتر رکھیں گے؟"

"میں تمہیں سمجھا نہیں سکوں گا۔ حکمران پارٹی بھی مجھے بہت بڑے بڑے عہدے آفر کرتی ہے اور میں انکار کرتا ہوں کیوں کہ میرا ایمان اور میرے اصول تمہاری طرح ان کی سمجھ میں نہیں آتے ہیں۔"

"آج کی دنیا میں صرف مال کمانے کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ آپ ایسی بولی بولتے ں جو آج کے زمانے میں نہ بولی جاتی ہے نہ سمجھی جاتی ہے۔"

وہ بیزار ہو کر بولے۔ "بہتر ہے کوئی دوسری بات کرو۔"

"گھر گرہستی میں مرد سے کمانے اور سماجی رتبہ بڑھانے کی باتیں کی جاتی ہیں۔ صائمہ سکول کی گاڑی میں جاتی ہے۔ کوئی یقین نہیں کرتا کہ وہ اس خادم ذوالجلال درانی کی بیٹی ہے' جو کبھی وزیر ہوا کرتا تھا اور جسے لوگ ارب پتی باپ کا بیٹا کہتے ہیں۔"

"تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ میں نے اپنی بیٹی سے انصاف کرنے کے

لیے اعلیٰ خاندان والوں سے بغاوت کی ہے۔ اب یہاں روز آتا ہوں اور اپنی بیٹی کے ساتھ گھنٹوں گزارتا ہوں۔"

"کیا آپ کو احساس نہیں ہے کہ آپ کی چہیتی زاہدہ بیگم فون پر میرا مذاق اڑاتی ہے کہ آپ نے دو کروڑ روپے کا چیک مجھے دے کر چھین لیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میں ہمیشہ اس کی برابری کا خواب دیکھتی رہ جاؤں گی اور اس کی باتیں اس کے طعنے سونی صد درست ہیں۔ وہ جو کہہ رہی ہے' وہی آپ کر رہے ہیں۔ بیٹی سے محبت صرف دکھاوے کی ہے۔"

وہ بیٹی کی محبت سے مجبور ہو کر آتے تھے اور بیوی سے لڑتے جھگڑتے چلے جاتے تھے۔ ایک عرصے تک یہی سلسلہ رہا۔ صائمہ بارہ برس کی ہوگئی۔ اسے دیکھ کر باپ کا دل ڈرتا تھا کہ اول تو حسبِ منشا خاندانی رشتہ شاید ہی ملے۔ مل بھی گیا تو وہ اپنی خاندانی حیثیت کے مطابق جہیز نہیں دے سکیں گے اور نہ ہی خاندان کے لوگ شریک ہوں گے۔

اور بہت سی مجبوریاں اور ناکامیاں تھیں۔ اُن کے دوسرے بچے لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ساری دنیا گھوم رہے تھے۔ صائمہ نے کبھی اپنے ملک کا کراچی شہر نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی مگر دوسرے بچوں کی طرح اس میں شاہانہ انداز نہیں تھا' بے چاری بجھی بجھی سی دکھائی دیتی تھی۔

ایک بار وہ اپنی فرم کے کام سے جرمنی گئے۔ پندرہ دن کے بعد واپس آئے تو سیما نہیں ملی۔ وہ اپنے والدین اور بیٹی کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی۔ اس کوٹھی کو فروخت کر دیا تھا۔ اب وہاں دوسرے لوگ رہائش پذیر تھے۔

انہوں نے موجودہ مالک مکان سے پوچھا۔ "کیا آپ سیما بیگم کا پتا بتا سکتے ہیں؟"

مالک مکان نے کہا۔ "جناب درانی صاحب' آپ کو اس ملک میں کون نہیں جانتا۔ پلیز اندر تشریف لے آئیں۔"

انہوں نے کہا۔ "عزت افزائی کا شکریہ۔ میں بہت مصروف ہوں پھر کبھی آؤں گا۔ آپ میری بیگم کے متعلق کچھ بتائیں۔"

"جناب' میں کیا بتا سکتا ہوں۔ انہوں نے اس کوٹھی کا سودا کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ لوگ یہاں کی تمام جائیداد فروخت کر کے ملک سے باہر جا رہے ہیں۔ وہ بڑی عجلت میں تھیں۔ ایک ہفتے میں اس کوٹھی کی فروخت کا تمام کام مکمل ہوگیا۔ میری خواہش ہے آپ کچھ ٹھنڈا گرم پی کر جائیں۔"

وہ شکریہ ادا کر کے اپنی کوٹھی میں آگئے۔ انہیں بیٹی کی یاد ستا رہی تھی۔ سیما پر غصہ آ رہا تھا کہ ان سے مشورہ کئے بغیر دھوکا دے کر کوٹھی بیچ دی اور بیٹی کو باپ سے جدا

کر دیا۔

زاہدہ نے مسکرا کر کہا۔ "منہ لٹکا کر آئے ہیں۔ کیا اپنی چہیتی بیگم سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

وہ ڈانٹ کر بولے۔ "خاموش رہو۔ تمہیں دوسرے گھر سے کیا لینا ہے۔"

"میں دوسرے گھر سے بھلا کیا لوں گی؟ ابتدا میں ماہانہ خیرات دیتی رہی ہوں۔ مجھے تو آپ کی فکر ہے۔ وہ چلی گئی تو کیا ہوا' میں بھی تو شریکِ حیات ہوں۔"

انہوں نے چونک کر پوچھا۔ "تم کیسے جانتی ہو کہ وہ چلی گئی ہے؟"

"میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس نے کوٹھی بیچ دی ہے۔ یہاں ابو اور بڑے ابو سب لو معلوم ہے۔ اس نے کل رات فون کیا تھا۔"

انہوں نے جلدی سے پوچھا۔ "وہ کیا کہہ رہی تھی؟"

"اس کا خیال تھا کہ آپ جرمنی سے واپس آگئے ہیں۔ میری آواز سن کر بولی۔ میں رانی سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ وہ نہیں ہے تو اسے صرف اتنا بتا دینا کہ میں نے ٹھی فروخت کر دی ہے اور صائمہ کو لے کر جا رہی ہوں' اگر وہ دوسرے دن آئے تو کہنا رے فون کا انتظار کرے۔"

سیما کے اس مختصر سے پیغام نے اور زیادہ بے چین کر دیا۔ طرح طرح کے خیالات نے لگے کہ وہ بیٹی کو لے کر کہاں گئی ہے؟ کیا اس شہر میں ہے یا بیٹی کو چھپا کر رکھنے کے ے کسی دوسرے شہر چلی گئی ہے؟

وہ ملک سے باہر بھی جا سکتی تھی۔ کوئی تیرہ برس پہلے جو کوٹھی تقریباً تین لاکھ میں یدی گئی تھی اب وہ پندرہ لاکھ میں فروخت ہوئی تھی۔ سیما ایک حد تک مالدار ہو کر بیٹی لے گئی تھی۔

درانی صاحب کے والد بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ بستر سے لگے ہوئے تھے۔ انہوں کہا۔ "اب تمہاری آنکھ کھل جانا چاہیے۔ چھوٹی ذات کے لوگ اسی طرح اپنی اوقات اتے ہیں۔ تم نے ایک کوٹھی اس کے نام کی وہ اسے بیچ کر تمہارا ساتھ چھوڑ گئی کیوں اب تم سے کچھ اور پانے کی توقع نہیں تھی۔"

"ابو! ہم بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کو ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی ات پہلے دکھائی' میری معصوم بیٹی کو اس کے جائز حقوق سے محروم کیا۔ ان حالات میں ی کارروائی ضرور ہوتی ہے اس لیے سیما نے بھی جواباً اپنی اوقات دکھائی ہے۔"

زاہدہ نے کہا۔ "خس کم جہاں پاک۔ اچھا ہوا چلی گئی۔ ہمیشہ کے لیے نجات مل

گئی۔"

دُرّانی صاحب نے کہا۔ "وہ تمہارے سر پر سوار نہیں تھی کہ تمہیں نجات مل گئی ہے۔ تم نے کچھ نہیں کھویا ہے۔ میں اپنی بیٹی کی قربت سے محروم ہو گیا ہوں۔ وہ بھی میرے لیے تڑپ رہی ہوگی۔ مجھے یاد کر رہی ہوگی۔"

"کوئی کسی کو زندگی بھر یاد نہیں کرتا۔ چند دنوں کے آنسو ہوتے ہیں۔ پھر صبر آ جاتا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "یہاں میرے پانچ بچے ہیں' اگر میں انہیں چھوڑ کر چلا جاؤں تو کیا ان کے متعلق بھی تم یہی کہو گی کہ انہیں چند دنوں تک یاد کروں گا۔ پھر بھول جاؤں گا۔"

"آپ نے صائمہ کی طرح میرے بچوں کو بھی کبھی پیار نہیں دیا۔ آپ زیادہ وقت اسی بیٹی کے ساتھ گزارتے تھے۔ کبھی میرے بچوں کی قدر نہیں کی۔ وہ چھٹیوں میں لندن سے آتے ہیں تو آپ مل لیتے ہیں ورنہ خود کبھی ملنے نہیں جاتے۔"

"یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی کہ میں اپنی بیٹی کی محرومیوں کا احساس کم سے کم کرنے کے لیے اسے زیادہ پیار اور قربت دیتا ہوں اور دیتا رہوں گا۔ خدا کرے وہ پھر مل جائے۔"

وہ باتیں کر رہے تھے مگر ان کا دھیان فون کی طرف لگا ہوا تھا۔ اس دوران کئی بار گھنٹیاں بجیں۔ انہوں نے لپک کر ریسیور اٹھایا مگر مایوس ہوئے۔ یا تو رانگ نمبر تھا یا پھر کسی عزیز کا فون آیا۔ ایک بار زاہدہ کی سہیلی کا فون آیا۔ وہ طویل گفتگو کرنے لگی۔ دُرّانی صاحب نے کہا۔ "تمہیں پتا ہے کہ سیما کسی وقت بھی فون کر سکتی ہے۔ اس لیے سہیلی سے معذرت چاہو اور گفتگو ختم کرو۔"

وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میں ایسی بداخلاق نہیں ہوں کہ محبت سے بات کرنے والی سہیلی کو شب بخیر کہہ دوں۔"

وہ ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر پھر باتیں کرنے لگی۔ دُرّانی صاحب نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر فون بند کر دیا۔ وہ غصے سے بولی۔ "آپ مجھ سے زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ نے فون کیوں بند کر دیا؟"

"ڈرائنگ روم میں دوسرا فون ہے۔ وہاں جاؤ اور صبح تک سہیلی سے باتیں کرتی رہو۔"

وہ ریسیور پٹخ کر کھڑی ہو گئی پھر وہاں سے طنطناتی ہوئی چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد پھر گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا۔ سہیلی کہہ رہی تھی۔ "شاید لائن کٹ گئی تھی۔ کوئی

نہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی........."

انہوں نے کہا۔ "بی بی! آپ ریسیور رکھ دیں۔ میری ایک ضروری کال آنے والی ہے۔ زاہدہ آپ سے دوسرے فون کے ذریعے رابطہ کر رہی ہے۔"

انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر بے چینی سے انتظار کرنے لگے اور سوچنے لگے کہ ...انے یوں دھوکا کیوں دیا ہے؟ میں اسے ماہانہ دس ہزار دیا کرتا تھا۔ وہ عیش و عشرت سے ...گی گزار رہی تھی۔ اس کی یہ شکایت ختم کر دی تھی کہ بیٹی اسکول کی گاڑی میں جاتی ...۔ اب ان کی اپنی ایک چھوٹی سی کار ہو گئی تھی۔ شاید وہ چھوٹی سی کار چھوٹے پن کا ...اس دلاتی تھی اور سیما کا یہ تقاضا جاری تھا کہ ہماری بیٹی بھی ملک سے باہر جا کر تعلیم ...ل کرے گی۔

دُرّانی صاحب سیما کے یہ تقاضے پورے نہیں کر رہے تھے۔ اسی لیے وہ اچانک ...ں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کہاں جائے گی؟ آخر ایسا کون سا مضبوط سہارا مل گیا ...کہ وہ ماہانہ دس ہزار روپے کی آمدنی کو ٹھکرا کر چلی گئی ہے؟

یہ بہت اہم سوال تھا جس کا جواب شاید وہ فون پر دیتی لیکن یہ بہت بڑا ظلم تھا کہ ...لو باپ سے جدا کر دیا تھا۔ انہیں سیما کی بے وفائی کا صدمہ نہیں تھا۔ وہ برسوں پہلے اس ...فریبی محبت کو سمجھ گئے تھے' تب ہی دو کروڑ کے چیک کو کینسل کرا دیا تھا اور اپنی نیک ...برقرار رکھنے کے لیے وزارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ انہوں نے کتنی قربانیاں دی ...ں اور سیاسی شہرت اور بے داغ مقبولیت کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ یہ وہ بے وفا عورت سمجھ ...ں سکتی تھی۔

وہ رات کے دس بجے سے فون کا انتظار کر رہے تھے۔ بھوک مر گئی' نیند اڑ گئی تھی ...ھی ٹہل رہے تھے اور کبھی بیٹھ رہے تھے۔ زاہدہ نے پوچھا۔ "کیا تمام رات لائٹ آن ...ہے گی؟ مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی ہے۔"

وہ بولے۔ "ہمارے بزرگوں نے یہ عالیشان محل بنایا ہے۔ یہاں بے شمار کمرے ...۔ تم آج کہیں بھی جا کر سو سکتی ہو لیکن تم نہیں جاؤ گی۔ سوکن میں یہ بڑی خوبی ہوتی ...کہ وہ اپنی بے چینی چھپا کر رکھتی ہے۔"

"میں بھلا کس بات کے لیے بے چین رہوں گی۔ آپ کا فون آئے نہ آئے میری بلا ...۔"

"میں نے فون کی بات نہیں کی تھی پھر تم نے کیسے سمجھ لیا کہ اسی فون کے لیے

تمہاری بے چینی ہے؟"

وہ ذرا گڑبڑا گئی پھر جھنجلا کر بولی۔ "مجھے کیا لینا ہے اس کے فون سے۔ اللہ کرے وہ مرکھپ گئی ہو۔"

"خدا کرے' تمہاری یہ بددعا قبول ہو۔ ماں نہیں رہے گی تو میں بیٹی کو اپنے پاس لے آؤں گا اور میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں' میری بیٹی کے خلاف برے کلمات زبان پر نہ لانا ورنہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔"

زاہدہ بیگم نے منہ پھیر لیا۔ دوسری طرف کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر شوہر نے دکھتی رگ پکڑی تھی۔ اسے بھی سوکن کے فون کا انتظار تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ سیما سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی ہے یا نہیں؟ یا پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو کر کہیں دور جا کر بیٹی باپ سے چھین کر کیسی چالیں چل رہی ہے۔

وہ پوری رات لمحہ لمحہ گزرتی رہی۔ صبح اذان سے کچھ پہلے فون کی گھنٹی بجی۔ زاہدہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دُرّانی صاحب نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ پھر کہا۔ "ہیلو' میں دُرّانی بول رہا ہوں۔"

زاہدہ آہستہ آہستہ بستر پر رینگتی ہوئی شوہر کے قریب بلکہ کان سے لگے ریسیور کے قریب آئی۔ دوسری طرف سیما کہہ رہی تھی۔ "مجھے رات کے آٹھ بجے معلوم ہو چکا تھا کہ آپ آگئے ہیں پھر آپ ہماری فروخت شدہ کوٹھی سے مایوس ہو کر اپنی کوٹھی میں چلے گئے ہیں۔"

دُرّانی صاحب نے پوچھا۔ "جب تمہیں معلوم تھا تو تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟"

"میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ایک باپ اپنی بیٹی کی جدائی میں کس طرح تمام رات جاگتا ہے۔"

"میری بیٹی کہاں ہے؟"

"وہ روتے روتے سو گئی ہے۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ ہم نے کوٹھی چھوڑ دی ہے پھر پاپا ہم سے ملنے کہاں آئیں گے۔ میں نے دلاسہ دے کر اسے سلا دیا ہے۔"

"تم ابھی کہاں ہو؟"

"یہ بتانا ہوتا تو آپ کے جرمنی جانے سے پہلے بتا دیتی۔"

"مجھے دھوکا دے کر جانے کی وجہ کیا ہے؟"

"میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ آپ بیٹی کو پانے کے لیے کتنی قربانیاں دے سکتے

ہیں۔"

"تم کیسی قربانی چاہتی ہو؟"

"فی الحال میرا ایک ہی مطالبہ ہے کہ سیاست میں واپس آجائیں۔"

"یہ کیا حماقت ہے۔ تمہیں اس مطالبے سے کیا حاصل ہوگا؟"

"میں جانتی ہوں کہ آپ جیسا قابل شخص کسی نہ کسی شعبے کا وزیر بنایا جائے گا۔ ہماری صائمہ ایک ارب پتی باپ کی بیٹی نہ سہی' ایک بہت بڑے وزیر کی بیٹی تو کہلائے گی۔ آپ کے دوسرے بچوں کے مقابلے اس کی بھی بہت بڑی سماجی حیثیت ہوگی۔"

"سیما! میری بات کو سمجھو' جو ذرہ جہاں ہوتا ہے' وہیں آفتاب ہوتا ہے۔ ہماری بیٹی کسی سے کم تر نہیں ہے۔ میں اسے علم کی اتنی دولت دوں گا کہ سب اس کے سامنے ہیچ ہو جائیں گے۔"

وہ بولی۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے سمجھاتے آرہے ہیں۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں اور میری باتیں آپ نہ سمجھنا چاہتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا تم بیٹی کو مجھ سے دور کر کے اپنی باتیں منوانا چاہتی ہو؟"

"ایک بیٹی ہی ہمارا سرمایہ ہے۔ یہی ہماری سب کچھ ہے۔ اگر آپ اس کے لیے سب یہ کچھ نہیں کر سکتے تو پھر کچھ نہ کریں۔ آپ کے بہت سے بچے ہیں ان میں گم ہو جائیں۔ ایک بدنصیب بیٹی کو بھلا دیں۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو۔ نہ میں اسے بھلا سکتا ہوں' نہ اس کے لیے جو پیار ہے اس میں کمی کر سکتا ہوں۔"

"جب اسے اتنا چاہتے ہیں تو صرف پیار نہ دیں اسے اونچی حیثیت بھی دیں۔ ہمارے ملک کے لاکھوں ننگے بھوکے غریب اپنے بچوں کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں۔ ان میں اور آپ میں فرق ہونا چاہیے۔"

"تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرا سیاست میں آنا ضروری نہیں ہے بلکہ صائمہ کو بہت اونچی حیثیت دلانا لازمی ہے اور اس مقصد کے لیے میں دن رات کوششیں کر رہا ہوں۔"

"میں نے دن رات کوششیں کرنے والوں کو دیکھا ہے اور راتوں رات امیر بننے والوں کو بھی دیکھا ہے۔ بیٹی جوان ہونے والی ہے۔ میں دن رات کی کوششوں کو نہیں مانتی۔ آپ کے پاس وہ شہرت اور نیک نامی ہے کہ آج سیاست میں آنے کا اعلان کریں

گے تو کل وزیر بنادیئے جائیں گے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم گھوم پھر کر سیاست کی طرف مجھے کیوں لانا چاہتی ہو۔ کیا وہ مکار چوہدری پھر تمہارا ہمدرد اور مشیر بن گیا ہے؟"

"میں اُس پر لعنت بھیجتی ہوں۔ زندگی کے حالات نے اور آپ جیسے سیاست دانوں نے مجھے بڑے سبق سکھائے ہیں۔ ان میں سے یہ پہلا سبق آپ کو سکھا رہی ہوں۔ صائمہ نیند میں آپ کو پکار رہی ہے۔ شاید اس کی آنکھ کھلنے والی ہے۔ میں دو دن کی مہلت دیتی ہوں۔ اچھی طرح سوچ لیں، پرسوں رات فون کروں گی۔"

انہوں نے کہا۔ "ٹھہرو۔ ابھی فون بند نہ کرنا۔ ہیلو۔ ہیلو سیما! ہیلو ہیلو........"

وہ کریڈل کو کھٹکھٹانے اور اسے آوازیں دینے لگے لیکن دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔

دوسرے دن درّانی صاحب اپنے والد اور چچا کے سامنے پھٹ پڑے کہ یہ کیسا اعلیٰ اور شریف خاندان ہے کہ اپنے ہی خون کو اس کے جائز حقوق سے محروم رکھتا ہے۔ آپ لوگ سیما کو برداشت نہیں کرتے، بے شک نہ کریں لیکن صائمہ میری بیٹی ہے۔ باپ کی جائیداد مجھے ملنی چاہیے، یہ میرا قانونی حق ہے۔ اس کے بعد میں وہ جائیداد اپنی تمام اولاد میں برابر تقسیم کرنے کا حق رکھتا ہوں۔"

والد صاحب بسترِ علالت پر پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "میں جانتا تھا، تم یہ قانونی نکتہ نکالو گے۔ باپ کی دولت اور جائیداد سے قانوناً تمہیں کچھ نہ کچھ ملے گا۔ اسی لیے میں نے وصیت لکھنے سے پہلے ایک عاق نامہ لکھا ہے۔ چونکہ تم نے باپ کو دھوکا دے کر میری لاعلمی میں دوسری شادی کی تھی اس لیے میں نے تمہیں فرزندی سے عاق کردیا۔ آئندہ تم نہ میرے بیٹے رہو گے اور نہ ہی میرے وارث رہو گے۔ صرف زاہدہ کے بطن سے جنم لینے والے بچے میرے وارث ہیں۔"

درّانی صاحب باپ کی باتیں سن کر دنگ رہ گئے پھر پوچھا۔ "آپ نے عاق نامہ کب لکھا تھا؟"

چچا نے کہا۔ "جس دن پتا چلا کہ تم نے دوسری شادی کی ہے۔ اس کے دوسرے ہی دن یہ لکھ دیا گیا تھا لیکن تم سے چھپایا گیا تھا کیوں کہ فرزندی سے خارج ہونے کے بعد تم اس کوٹھی میں قدم رکھنے کے بھی حقدار نہیں تھے۔ یہ بات تمہیں معلوم ہوتی تو تم یہ گھر چھوڑ کر چلے جاتے اور سچ پوچھو تو ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ صرف سیما اور اس سے ہونے والی اولاد کو دور رکھنے کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔"

درّانی صاحب نے کہا۔ "یعنی میں ملازمت کرنے سے پہلے اپنے عاق کرنے والے باپ کے گھر میں حرام کھاتا رہا۔"

چچا نے کہا۔ "تم غلط نہ سمجھو۔ بھائی جان نے تمہیں عاق کیا ہے مگر میں نے تو تم سے رشتہ نہیں توڑا۔ میں تمہارا چچا ہوں۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ تم باپ کا نہیں، چچا کا کھاتے رہے ہو۔"

"چچا کا نہیں، سسر کا کھاتا رہا ہوں۔ آپ کی بیٹی میری شریکِ حیات ہے۔ اس لیے مجھے یہاں، باپ نے بیٹا بنا کر نہیں، چچا نے گھر داماد بنا کر رکھا ہے۔"

"بیٹے! تم بات کو کہیں سے کہیں لے جا رہے ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہیں داماد سے زیادہ بیٹا سمجھا ہے۔"

درّانی صاحب ہنسنے لگے پھر زور زور سے قہقہے لگا کر اِدھر سے اُدھر جانے لگے۔ زاہدہ نے انہیں دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔ "خاموش ہو جائیں۔ آپ اس طرح قہقہے کیوں کیوں لگا رہے ہیں؟"

وہ ایک دم سے چپ ہوگئے۔ انہوں نے زاہدہ کو، چچا کو اور باپ کو دیکھا پھر حیرانی سے کہا۔ "یہ کیسی دنیا ہے؟ ہم کس زمین پر جی رہے ہیں؟ ہمارے رشتے دار کون ہیں اور کون نہیں ہیں۔ پلک جھپکتے ہی رشتے بدل جاتے ہیں۔ یہاں اس عالیشان کوٹھی میں ابھی میں کون ہوں؟ جسے باپ سمجھتا رہا، اس کا بیٹا نہیں ہوں۔ جسے بیوی سمجھ کر برسوں سے اپنے گھر میں رکھا تو پتا چل رہا ہے کہ میں اسی بیوی کے ہاں گھر داماد ہوں۔"

وہ بے چینی سے پھر ٹہلنے لگے۔ اُن کے والد نے کہا۔ "خواہ مخواہ جذباتی نہ بنو۔ میں نے کسی دوسری بہو کو اس خاندان میں آنے سے روکنے کے لیے عاق نامہ لکھا ہے۔ ورنہ تم اب بھی میری جان ہو، میرے بیٹے ہو۔ اتنی بڑی دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔"

"ابو! پھر وہ عاق نامہ کیا ہے؟ کیا اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟"

"وہ محض ایک کاغذی کارروائی ہے۔ میں اسے دل سے نہیں مانتا۔ تم میرے بیٹے ہو۔"

"آپ کی بھتیجی زاہدہ بیگم سے میرا نکاح کاغذ پر ہوا۔ وہ نکاح نامہ آج بھی موجود ہے۔ اگر میں دل سے زاہدہ کو اپنی بیوی تسلیم نہ کروں تو پھر وہ نکاح نامہ بھی محض کاغذی کارروائی ہوگا۔"

زاہدہ سہم کر بولی۔ "خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ ہمارا شرعی طور پر نکاح

پڑھایا گیا تھا۔"

"سیما سے بھی شرعی طور پر نکاح پڑھایا گیا تھا۔ اب دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا فیصلہ ہو۔ یا تو کاغذی کارروائی کی اہمیت ہو یا پھر دل سے کسی کو بیٹا اور کسی کو بیوی تسلیم کرنا لازمی ہو۔"

چند لمحات تک خاموشی رہی پھر وہ بولے۔ "عاق نامہ کی اہمیت ہے۔ اتنی اہمیت ہے کہ میں اپنے باپ کا بیٹا رہوں یا نہ رہوں مگر اپنی بیٹی کو اس خاندان سے اور اپنے باپ کی دولت سے کچھ نہیں دے سکوں گا۔"

انہوں نے اپنا کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں میں کتنے برسوں سے یہاں حرام کھا رہا ہوں۔ چچا جان' آپ کے پاس حساب ہو تو مجھے دیں۔ فی الوقت جرمنی سے جو سامان لایا ہوں۔ وہ یہاں ہے اور ایک سوٹ کیس میں پچیس ہزار روپے ہیں۔ اس کے بعد جو رقم میری طرف نکلے گی۔ اس کا ایک ایک پیسہ ادا کردوں گا۔ اس کے بعد بھی کچھ ادائیگی رہ جائے گی تو اس میں میری غلطی نہیں ہوگی۔ کیوں کہ آپ لوگوں نے مجھے برسوں سے عاق ہوجانے والی بات نہیں بتائی تھی۔"

وہ کہتے جارہے تھے اور اپنے بدن سے کپڑے اتارتے جارہے تھے۔ انہوں نے کوٹ کے بعد شرٹ اتاری' بنیان اتاری پھر پتلون اتارنے لگے۔ چچا نے آگے بڑھ کر روکتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا دماغ چل گیا ہے؟؟"

انہوں نے کہا۔ "میرے بدن کی کوئی چیز میری نہیں رہی۔ میری رگوں میں جو لہو دوڑ رہا ہے اس میں بھی حرام شامل ہے۔ جب تک میں برسوں کا قرضہ ادا نہیں کروں گا اپنے اندر شرم سے مرتا رہوں گا۔ چونکہ شرم کا تقاضا ہے اس لیے صرف ایک نیکر پہن کر جارہا ہوں۔ کل تک اسے بھی واپس کردوں گا۔"

چچا اسے روکتے رہے لیکن انہوں نے پتلون اتار کر پھینک دی۔ باپ نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ارے اسے ر[illegible]۔ کیا یہ ننگا یہاں سے جائے گا؟؟"

اور وہ جارہے تھے۔ صرف ایک نیکر پہن کر کمرے سے نکلے تو چچا نے ملازموں کو آوازیں دیں۔ "اسے روکو۔ یہ پاگل ہوگیا ہے۔ اسے باہر نہ جانے دو۔"

کئی ملازم دوڑتے ہوئے آئے۔ انہوں نے درّانی صاحب کو گھیر لیا۔ التجا کرنے لگے۔ "حضور' آپ ایسی حالت میں باہر نہ جائیں۔ خدا کے لیے کپڑے پہن لیں۔"

وہ بولے۔ "مجھے پاگل نہ سمجھو۔ میں لاعلمی میں ایک شخص کو باپ سمجھ کر اس گھر میں رہتا اور کھاتا پیتا آیا ہوں۔ اب وہ مجھ پر قرض ہے۔ ابھی میرے پاس جو کچھ تھا وہ میں

نے ادائیگی کے طور پر دے دیا ہے۔ یہ لوگ جلد ہی صحیح حساب بتائیں گے کہ میں نے اس گھر سے کیا کچھ لیا ہے۔ کچھ مانگو تو وہ بھیک ہے اور واپس کرنے کے وعدے پر کچھ لو تو وہ قرض ہے۔ یہ لوگ میری لاعلمی میں مجھے قرض دیتے رہے۔ چونکہ میں فقیر نہیں ہوں' مانگنے والا نہیں ہوں اس لیے ان لوگوں نے مجھے جو کچھ دیا وہ قرض ہے۔ اس کی ادائیگی مجھ پر واجب ہے۔"

وہ جانے لگے۔ ملازموں نے انہیں پکڑ لیا۔ چچا نے کہا۔ "یہ پاگل ہوگیا ہے۔ اسے ایک کمرے میں بند کردو۔"

ملازموں نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ کئی تھے۔ درّانی صاحب اُن کی گرفت سے نہ نکل سکے۔ انہیں ایک خالی کمرے میں بند کردیا گیا۔

زاہدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنے والد اور سسر سے کہنے لگی۔ "آپ لوگوں نے انہیں عاق نامہ کے متعلق کیوں بتایا۔ کیا آپ نہیں جانتے ہیں کہ وہ کتنے غیرت مند ہیں۔ اگر باپ کے گھر نہیں رہیں گے تو گھر داماد بن کر رہنا بھی گوارا نہیں کریں گے۔ آپ لوگوں نے انہیں جنون میں مبتلا کردیا ہے۔"

سسر نے کہا۔ "بیٹی! یہ بات کب تک چھپائی جاسکتی تھی۔ میرے مرنے کے بعد اسے معلوم ہوتا کہ وہ عاق شدہ ہے۔"

باپ نے کہا۔ "یہ جنون عارضی ہے۔ تم اپنے آنسو پونچھ لو' میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا پھر شام تک کئی ڈاکٹر آئے اور گئے۔ سب کی رپورٹ یہی تھی کہ مریض بظاہر نارمل ہے۔ صرف کپڑے نہیں پہننا چاہتا' آپ اسے مجبور نہ کریں۔ فی الحال ایک نیکر میں رہنے دیں۔

چچا نے کہا۔ "یہ کچھ کھاتا پیتا بھی نہیں ہے۔ جبراً کھلانے کی کوشش کرو تو اگل دیتا ہے۔ اس گھر کا پانی بھی نہیں پی رہا ہے۔"

درّانی صاحب سر جھکائے کرسی پر بندھے ہوئے بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے انہیں جوش اور جنون میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ جہاں تک قرض کی ادائیگی کا سوال ہے' وہ ضرور ادا کریں گے لیکن پہلے اس کوٹھی سے نکلنے کے لیے انہیں نارمل ہونے کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔

ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہ سن کر ضرور طیش میں آتا کہ باپ نے بھائی اور بھتیجی (بہو) کی خاطر سیما کا راستہ روکنے کے لیے اسے فرزندی سے خارج کردیا ہے۔ پھر درّانی

صاحب کی غیرت نے انہیں جنون میں مبتلا کردیا تھا کہ وہ برسوں سے عاق ہونے کے بعد اس گھر سے حرام کھاتے رہے ہیں۔

وہ پچھلی رات کے جاگے ہوئے تھے۔ کرسی پر بندھے بندھے ہی سوگئے۔ زاہدہ نے آکر انہیں اس حالت میں دیکھا تو رو پڑی۔ اس ملک میں ایک وزیر کے عہدے پر رہنے والا شخص اور ایک مستند چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کس حال میں بندھا ہوا سو رہا تھا۔ وہ روتی ہوئی باپ اور سسر کے پاس آئی پھر بولی۔ "ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ پاگل نہیں ہیں۔ خوددار ہیں۔ اپنا سب کچھ چھوڑ کر جانا چاہتے تھے مگر آپ لوگوں نے اپنی عزت رکھنے کی خاطر پاگل قرار دیا ہے۔"

"بیٹی! سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ صرف ایک نیکر پہن کر چلا جاتا تو ہماری تو ناک کٹ ہی جاتی۔ دنیا والے اس کے ساتھ ہمارا بھی مذاق اُڑاتے۔"

"میں پوچھتی ہوں عاق نامہ کی کیا ضرورت ہے۔ کیا وہ میرے سہاگ سے زیادہ ضروری ہے؟ ایک سوکن آتی ہے تو آنے دیں۔ میں اسے برداشت کرلوں گی لیکن اتنے ذہین اور غیرت مند شوہر کی توہین برداشت نہیں کروں گی۔"

باپ نے کہا۔ "وہ ذہین ہوتا تو دوسری شادی کبھی نہیں کرتا۔ بات صرف سوکن کی نہیں۔ اس کی بیٹی صائمہ کے حقوق ادا کرنا ہوں گے۔ بھائی جان کے پاس جو کچھ ہے' اس میں سے حصے کئے جائیں تو صائمہ کو کم از کم دس کروڑ کی جائیداد ملے گی۔ پھر درّانی اس بیٹی کو زیادہ چاہتا ہے۔ اپنا حصہ بھی اسے دے دے گا۔ کیا یہ سب کچھ برداشت کروگی۔"

زاہدہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بچوں کو جو کچھ ملے گا اس میں سے کچھ صائمہ لے جائے۔

باپ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ناحق پریشان ہو رہی ہو۔ تم دیکھتی جاؤ وہ کل تک نارمل ہوجائے گا۔"

اجل نواز کو اس کوٹھی میں ایک فاضل ڈرائیور کی حیثیت سے رکھ لیا گیا تھا۔ کیوں کہ جب درّانی صاحب پر گولیاں برسائی گئی تھیں تب اس نے بھی زخمی ہونے کے باوجود انہیں اسپتال پہنچایا تھا۔ لہٰذا اسے وفادار اور جاں نثار ملازم سمجھ کر رکھ لیا گیا تھا۔ وہ رات کو کھانے کی ٹرے لے کر درّانی صاحب کے پاس آیا پھر ان کی رسیاں کھول کر بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ پاگل نہیں ہیں۔ چلیں فوراً کچھ کھالیں۔"

انہوں نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں پاگل نہیں ہوں؟"

اجل نے کہا "اگر ہوتے تو نیکر بھی اتار دیتے مگر شرم مانع تھی اور شرم ہوش مند کو آتی ہے۔"

وہ چلا گیا پھر کھانا ختم ہونے تک ایک جوڑا لباس لے آیا اور بولا۔ "آپ خود دار اور غیرت مند ہیں۔ اپنی فرم سے واجبات وصول کرنے کے بعد لباس خریدیں گے پھر یہ لباس واپس کردیں گے۔"

"اجل نواز! تم بہت اچھے اور سمجھ دار ہو۔ میں چاہتا ہوں' تم میرے ساتھ رہو۔"

"میں اپنے وقت پر ضرور آپ کے پاس آؤں گا۔ فی الحال آپ تنہا جائیں' سب سو رہے ہیں' کوئی آپ کا راستہ نہیں روکے گا۔"

وہ پوری طرح لباس پہن کر جانے لگے۔ اجل نے کہا۔ "اپنے ابو کو ایک نظر دیکھتے جائیں۔"

"مجھے عاق کرنے کے بعد وہ میرے ابو نہیں رہے۔ اب انہیں کس رشتے سے دیکھوں؟"

"صرف ایک موت ایسی ہے جو زندگی کے رشتوں کو عاق کرتی ہے۔ باقی تمام رشتے ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں۔"

وہ اجل کے مشورے کے مطابق باپ کے کمرے میں آئے۔ وہ بے خبر سو رہے تھے۔ درّانی صاحب نے بڑے جذبوں سے انہیں دیکھا پھر دل میں کہا۔ "انہوں نے مصلحتاً مجھے بیٹا ماننے سے انکار کردیا لیکن میں انہیں باپ ماننے سے انکار نہیں کرسکتا۔ آخر یہ میرے ابو ہیں۔"

انہوں نے جھک کر باپ کی پیشانی کو بوسہ دے دیا پھر الٹے قدموں چلتے ہوئے انہیں دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ انہیں کسی نے نہیں روکا۔ نائٹ ڈیوٹی والا چوکیدار سو رہا تھا۔

ان کے جانے کے بعد بیمار باپ کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے اپنے پائنتی پر اجل نواز کو دیکھا۔ وہ سفید کفن جیسے لبادے میں تھا۔ انہوں نے اجل کو پہچانا۔ اس سے پوچھنا چاہا کہ وہ سفید لبادے میں موت کے فرشتے جیسا کیوں لگ رہا ہے؟ ان کے ہونٹ کھلے لیکن زبان نہ ہل سکی۔ ایک حرف بھی زبان سے ادا نہ ہوا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھاکر سرہانے رکھی ہوئی کال بیل بجائی۔ ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے پوچھا۔ "جناب کو کیا چاہیے؟"

وہ اپنی آنکھوں سے اجل کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ملازم نے ادھر دیکھا موت

کا فرشتہ کبھی کسی کو نظر آتا تو ملازم کو بھی دکھائی دیتا۔ اس نے اپنے مالک کو چھو کر دیکھا تو جسم ٹھنڈا سا لگ رہا تھا۔ نبض دیکھی تو ڈوبتی ہوئی سی لگی۔ وہ دوڑتا ہوا گیا پھر زاہدہ کے باپ کو نیند سے اٹھا کر بولا۔ "جلدی چلیں۔ بڑے مالک کی حالت اچھی نہیں ہے۔ وہ بستر سے اٹھ کر ادھر گئے۔ ملازم نے زاہدہ کے دروازے پر بھی دستک دی۔ اسے بھی بتایا کہ بڑے مالک کی نبض ڈوب رہی ہے وہ کچھ بول نہیں پا رہے ہیں۔"

وہ بھی فوراً ہی اٹھ کر اپنے سسر کے کمرے میں آئی۔ باپ وہاں موجود تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "بھائی جان کیسی طبیعت ہے؟ کیا ڈاکٹر کو بلاؤں؟ تب ان کی زبان نے حرکت کی۔ وہ اپنے پائنتی دیکھ کر بولے۔ "وہ۔ وہ اجل۔ وہ اجل ہے۔"

باپ بیٹی نے ادھر دیکھا پھر زاہدہ نے کہا۔ "بڑے ابو! اجل نہیں ہے۔ خدا آپ کا سایہ ہم پر قائم رکھے۔"

وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولے۔ "مم۔ میرا بیٹا درّانی' میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ مم۔ میں نے اسے عاق نہیں کیا ہے۔ وہ.......... وہ کہاں ہے؟"

"میں ابھی بلا کر لاتی ہوں۔ ابھی آ رہی ہوں۔"

وہ دوڑتی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں درّانی صاحب کو باندھ کر رکھا گیا تھا۔ مگر کرسی خالی تھی۔ رسیاں کھلی ہوئی تھیں اور قیدی نہیں تھا۔ ایک طرف زمین پر کھانے کی ٹرے اور پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے کمرے میں گھوم کر باتھ روم میں جا کر آوازیں دیں۔ فرار ہونے والے قیدی کی آواز تو کیا قدموں کے نشان بھی نہ ملے۔

وہ پھر تیزی سے چلتی ہوئی اِدھر اُدھر میاں کو تلاش کرتی ہوئی سسر کے کمرے میں آئی۔ وہ دیدے پھیلائے بیٹے کے انتظار میں دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زاہدہ نے آ کر کہا۔ "وہ نہیں ہیں۔ کہیں چلے گئے ہیں۔"

باپ کے منہ سے ایک لمبی سی سانس نکلی۔ جیسے ہائے نکلی ہو۔ اجل نے روح کھینچ لی تھی۔

زاہدہ کے باپ نے انہیں آواز دی۔ "بھائی جان۔"

زاہدہ نے قریب ہو کر پکارا۔ "بڑے ابو۔"

زندگی بھی کیا چیز ہے۔ جب جاتی ہے تو زندہ آوازوں سے بھی دُور ہو جاتی ہے۔ بھائی نے نبض ٹٹولی' دل کی خاموشی پر ہاتھ رکھا پھر بڑے بھائی کی پھیلی ہوئی آنکھوں کو بند کر کے منہ پر چادر ڈال دی۔

اب پتا نہیں بیٹا کہاں تھا۔ آخری رسومات میں شریک ہو سکتا تھا یا نہیں؟ ان کی

میت پر رونے کے لیے صرف بھائی اور بہو رہ گئے تھے۔ بعد میں دوسرے رشتے دار ماتم کرنے کے لیے آ گئے تھے۔ باپ نے زاہدہ کو ایک کمرے میں لے جا کر رازداری سے کہا۔ "یہ کبھی کسی سے نہ کہنا کہ بھائی جان نے دم توڑنے سے پہلے یہ اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے بیٹے کو عاق نہیں کیا تھا۔"

"مگر ابو! انہوں نے ایسا کہا تھا۔"

"کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کی تحریر موجود ہے کہ وہ اسے فرزندی سے خارج کر چکے تھے اور اپنا سب کچھ تمہاری اولاد کے نام لکھ گئے تھے۔ اگر اپنے بچوں کی بھلائی چاہتی ہو تو مرنے والے کے آخری الفاظ ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔"

سوگ منانے والے رشتے دار پوچھ رہے تھے کہ ایسے وقت بیٹا کہاں ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ بیٹے کو باپ کی وفات کی خبر نہیں ہے' اسے خبر دینے کے لیے تلاش کیا جا رہا ہے۔

چچا کو معلوم تھا کہ داماد کون سی فرم میں ملازمت کر رہا ہے۔ وہ فرم میں اطلاع دینے گئے کہ مسٹر درّانی آئیں تو ان کے والد کی وفات کی خبر انہیں سنائی دی جائے۔ یوں درّانی صاحب کو اطلاع مل گئی۔ وہ قبرستان پہنچ گئے۔ آخری تمام رسومات کے بعد چچا نے کہا۔ "بیٹے! گھر چلو۔"

انہوں نے جواب میں کہا۔ "کیا پھر مجھے پاگل ثابت کر کے رسیوں سے بندھوانے کا ارادہ ہے۔"

"ہمیں غلط نہ سمجھو۔ آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ وہاں تمہارے بیوی بچے ہیں۔ کیا اُن کے ساتھ زندگی نہیں گزار دو گے؟"

"ایک شرط پر وہاں آؤں گا۔ پہلے آپ عاق نامہ کی نقل مجھے دکھائیں' جس تاریخ سے مجھے عاق کیا گیا تھا' اس دن سے حساب کریں کہ میں نے وہاں رہ کر کیا کھایا پیا' پہنا اور کیا کچھ خرچ کیا ہے۔ پہلے واجب الادا قرضہ بتائیں۔ میں وہ تمام قرض ادا کرنے کے بعد زاہدہ اور بچوں کو اس مکان میں بلاؤں گا جو مجھے کمپنی کی طرف سے دیا گیا ہے۔"

"کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہاں ہماری دو کوٹھیاں میں اور تم زاہدہ اور ان کو کمپنی کے مکان میں رکھو گے؟"

انہوں نے کہا۔ "میرے ابو کا کوئی مال میرا نہیں رہا۔ باقی جو ہے وہ آپ کا اور زاہدہ کا ہے اور میں آپ کے ہاں گھر داماد بن کر نہیں رہوں گا۔"

"میں جانتا ہوں' تم بڑے ضدی ہو مگر بیوی بچوں سے ملنے دو چار گھنٹوں کے لیے تو آ سکتے ہو۔"

"ضرور آؤں گا۔ جب تمام قرض ادا کردوں گا۔ ویسے ایک عرض ہے کل رات سیما وہاں فون کرے گی۔ زاہدہ سے کہہ دیں کہ آئندہ وہ مجھ سے دفتر پر رابطہ کرے۔"

"میں زاہدہ کو یہ ہدایت کردوں گا۔ ویسے سوم اور چالیسویں میں تو ضرور آؤ گے۔"

"ابو نے مجھے عاق کیا تھا' میں نے ان سے رشتہ نہیں توڑا تھا۔ اس لیے آج قبر پر مٹی ڈالنے آگیا۔ اب تو صرف مغفرت کے لیے دعا کرنا ہے اور کلام پاک کی تلاوت کرنا ہے اور یہ کام میں اپنے گھر میں کروں گا۔"

درانی صاحب وہاں سے چلے آئے۔ دوسرے دن دفتر میں سیما نے فون پر کہا۔

"ابھی میں نے اخبار میں آپ کے والد کے انتقال کی خبر پڑھی ہے۔ آپ کے گھر فون کیا تو آپ کے چچا صاحب نے فرمایا کہ آپ گھر چھوڑ کر جاچکے ہیں اور آپ کا کوئی پتا معلوم نہیں ہے۔"

"تمہیں یہاں کا نمبر کیسے معلوم ہوا؟"

"ٹیلیفون ڈائریکٹری سے۔ کیا واقعی آپ نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے؟"

"ہاں' آئندہ فون پر وہاں ہماری بات نہیں ہوسکے گی۔ فی الحال کمپنی کے ایک مکان میں رہتا ہوں۔"

"آپ میری بات مان لیں۔ اپنی زندگی اور اپنی صلاحیتیں برباد نہ کریں' سیاست میں آجائیں۔"

"یہ مشورہ سامنے آکر دو۔"

"آپ مشورے پر عمل کریں تب صائمہ کو لے کر آؤں گی۔"

"کیا تمہیں احساس ہے کہ میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔"

"ہاں یہ بات تو بیچ ہی میں رہ گئی کہ آپ نے اپنے والد کا مکان کیوں چھوڑ دیا؟"

"جب میں نے تمہارے ساتھ شادی کا اعلان کیا تھا۔ اُس کے دوسرے دن میرے والد مرحوم نے مجھے عاق کردیا تھا۔ یہ بات مجھے پرسوں معلوم ہوئی۔ وہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ مجھے فرزندی سے خارج ہونے کا اتنا صدمہ نہیں ہے جتنا کہ اپنے چچا کے اخراجات پر زندگی گزارنے کا ہے۔ یوں سمجھو کہ میں تقریباً بارہ برس سے گھر داماد کی حیثیت سے زندگی گزارتا رہا اور اس حقیقت سے بے خبر رہا۔"

"میں یقین سے کہتی ہوں کہ تمہارے چچا اور زاہدہ کے بہکانے میں آکر تمہارے والد نے تمہیں عاق کیا تھا؟"

"وہ بچے نہیں تھے میرے باپ تھے۔ انہوں نے کسی کے بہکاوے میں آکر یا اپنی

رضی سے ایسا کیا ہو۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ میں تقریباً بارہ برس چچا کا مقروض رہا ں۔ عاق کرنے والی بات مجھ سے چھپائے رکھنے کے لیے میرے چچا کی طرف سے تمہیں نہ اخراجات دیئے جاتے رہے۔ اب حقیقت معلوم ہونے کے بعد یہ تمام رقومات مجھ پر جب الادا ہیں۔"

"آپ عجیب انسان ہیں۔ بھلا قرضہ کیسا؟ کیا لوگ اپنے سسرال میں رہتے اور ھاتے پیتے نہیں ہیں؟"

"گھر دامادی کو میں اپنی توہین سمجھتا ہوں اور مجھے دھوکا دے کر گھر داماد کے طور پر لھا گیا تھا۔ جب تک میں ان کی وہ تمام رقم ادا نہیں کروں گا' میرے دل پر بوجھ رہے "

"اگر ایسی بات ہے تو آپ بارہ نہیں نو برس کا حساب کریں۔ کیونکہ پچھلے تین برس ے آپ ملازمت کر رہے ہیں اور ہمارے بھی اخراجات خود برداشت کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔ میری بیٹی سے بات کراؤ۔"

"وہ اسکول گئی ہے۔ اگر آپ شام چار بجے تک دفتر میں رہیں گے تو اُس سے بات سکیں گے۔"

"میں اس وقت تک دفتر میں رہوں گا جب تک اس کی آواز نہیں سنوں گا۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد زاہدہ نے فون کیا۔ پھر کہا۔ "میں بڑی دیر سے بطہ کر رہی تھی۔ کیا سیما نے پکڑ رکھا تھا؟"

وہ سخت لہجے میں بولے۔ "یہ دفتر ہے۔ اسے سوکنوں کا اکھاڑہ نہ بناؤ۔ کام کی بات و۔"

"آج یہاں پورا خاندان جمع ہورہا ہے۔ چار بجے سے چنے پڑھے جائیں گے۔ آپ موجودگی ضروری ہے۔ ورنہ رشتے دار باتیں بنائیں گے۔"

"تمہارے باپ کے پاس میرے والد کا تحریر کردہ عاق نامہ ہے۔ وہ تمام رشتے روں کو دکھادو۔ پھر کوئی میری عدم موجودگی پر باتیں نہیں بنائے گا۔"

"آپ میری ایک بات مان لیں۔ سیما کو طلاق دے دیں۔ میں آپ کے سامنے وہ ل نامہ جلادوں گی۔"

"مہنگائی بڑھتی جارہی ہے۔ ماچس کی تیلی بچاکر رکھو۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ چار بجے تک بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ ٹھیک وقت پر ٹی سنائی دی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو بیٹی! یہ تم ہو؟"

"جی ہاں پاپا! میں ہوں۔ میں بیان نہیں کرسکتی کہ آپ سے دور ہو کر دل کس طرح دکھ رہا ہے۔ میں بہت روتی رہی ہوں۔ امی کہتی ہیں مجھے اُس باپ کے لیے نہیں رونا چاہیے جو مجھ سے زیادہ میرے سوتیلے بھائی بہنوں کو چاہتا ہے۔"

"صائمہ! تمہاری امی غلط کہتی ہیں۔ میں تمہیں سب سے زیادہ چاہتا ہوں۔"

"پاپا! میں آپ کے سامنے نادان بچی ہوں۔ مگر اپنی عمر کے حساب سے دنیا کو سمجھتی جارہی ہوں۔ میں اپنے سوتیلوں کے مقابلے میں خود کو بہت کمتر سمجھ رہی ہوں۔ کیا آپ مجھے میرے حقوق نہیں دلائیں گے؟"

کیا تمہاری امی نے یہ نہیں بتایا ہے کہ تمہارے دادا نے انتقال سے پہلے مجھے تمام حقوق سے محروم کردیا تھا؟"

"انہوں نے آپ کو محروم کیا تھا۔ مگر میرے سوتیلے بھائی بہن تو محروم نہیں ہیں۔ ارب پتی کہلاتے ہیں۔ میں کیا کہلا رہی ہوں پاپا!"

"بیٹی! تم اس وقت اپنی ماں کی زبان بول رہی ہو اور میری مجبوریاں نہیں سمجھ رہی ہو۔"

"پاپا! اپنی ماں' ماں ہی ہوتی ہے۔ دشمن کی زبان سے نہیں بولتی ہے۔ انہوں نے آپ کی مجبوریاں بھی بتائی ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ آپ میری خاطر اونچے سے اونچا مقام حاصل کرسکتے ہیں۔"

"سمجھ گیا۔ تم بھی ماں کی طرح چاہتی ہوں کہ میں سیاست میں آجاؤں۔"

"اس میں برائی کیا ہے پاپا؟ آپ ملک اور قوم کی خدمت کریں گے۔ میں فخر کروں گی۔"

"باپ کی جان! کچھ اور تعلیم حاصل کرلو۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ سیاست اور خصوصاً جمہوریت میں ملک کی ترقی اور خوشحالی ہے لیکن ہمارے ہاں سیاست میں جو چند گنے چنے چہرے آتے ہیں' وہ ملک کا چہرہ بگاڑتے جاتے ہیں۔ مجھ جیسے لوگ دیانتداری سے کام کرنا چاہیں تو ان کا جو حال ہوتا ہے' وہ تمہارے سامنے ہے۔ تمہارا باپ آج گھر کا رہا ہے' نہ گھاٹ کا۔"

"پاپا! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟"

"جسے تم سچ سمجھتی ہو' اسے کہتے وقت یہ کبھی نہ سوچو کہ کوئی برا مانے گا۔"

"آپ نے میری سوتیلی ماں کے کہنے پر میری امی کو دو کروڑ روپے سے محروم کردیا۔ اگر یہ رقم ہمارے پاس ہوتی تو آج آپ اپنے گھر کے ہوتے۔"

"میں نے ایمان اور اصولوں کے مطابق دو کروڑ کا چیک کینسل کیا تھا۔ اس معاملے میں دو سوکنوں کی لڑائی نہیں تھی۔"

"آپ کیوں مجھے بچی سمجھ کر بہلا رہے ہیں؟ سیدھی سی بات سمجھ میں آتی ہے کہ امی کے لیے پہلے ایمان اور اصول تھے تب ہی آپ نے چیک جاری کرایا۔ دوسرے دن سوکن نے آپ کا ایمان بدل دیا۔"

"میں بحث نہیں کروں گا۔ اتنا کہوں گا کہ ابھی دنیا کو تو کیا' باپ کو بھی پہچاننے کی تمہاری عمر نہیں ہے۔ اپنی امی کو سمجھاؤ کہ ہم سب مل کر ایک چھت کے نیچے رہیں گے۔"

"کس رشتے سے رہیں گے؟ میرے پیدا ہونے سے پہلے آپ نے امی سے علیحدگی اختیار کرلی۔ کیا آپ اسے بھی جھوٹ کہیں گے؟ کیا آپ نے میری سوتیلی ماں کو میری امی پر ترجیح نہیں دی۔ خواہ چیک کی بات ہو' یا شوہر کی محبت' آپ نے ہر معاملے میں میری امی سے ناانصافی کی ہے۔"

"یہ تو میں بھی کل تک نہیں جانتا تھا کہ میرے پیدا ہونے والے باپ نے مجھ سے کیسے ناانصافی کی ہے۔ میں تمہارے سوالوں کے جواب کیسے دوں؟ دوں گا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ بہت سی باتیں خدا سمجھاتا ہے یا وقت کی ٹھوکریں سمجھا دیتی ہیں۔"

"کیا یہ سمجھنا غلط ہے کہ آپ بارہ برس سے علیحدگی اختیار کرکے میری امی کی توہین کرتے رہے ہیں اور اب دکھاوے کی محبت نہ کریں۔ محبت کرنے کے لیے آپ کے پاس بچوں کی کمی نہیں ہے۔"

ایسا کہتے وقت وہ رو رہی تھی پھر اُس نے فون بند کردیا۔ انہوں نے ہیلو ہیلو کہہ کر بیٹی کو آوازیں دیں پھر شکست خوردہ سے ہو کر ریسیور رکھ دیا۔ فون پر بیٹی کے رونے کا انداز دل کو تڑپا رہا تھا۔

یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ سیما نے ان کے خلاف بیٹی کے دماغ میں زہر بھر دیا ہے۔ ماں نے بیٹی کو جو کچھ بتایا' اس میں سچائی تھی لیکن ان سچائیوں کے پیچھے ماں کا بھی کتنا فراڈ چھپا ہوا تھا یہ اس نے بیٹی کو نہیں بتایا تھا۔ سچائی کو سمجھنا کبھی بہت آسان ہوتا ہے اور کبھی بہت مشکل' یہ باتیں ابھی صائمہ کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں۔

انہوں نے وہ رات کمپنی سے ملنے والے مکان میں گزاری۔ ایسے گزاری جیسے اتنی بڑی دنیا میں تنہا ہوں جب کہ خاندان کے افراد دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ماموں' پھوپھی' پھوپھا' تایا زاد اور چچا زاد رشتے بے شمار تھے۔ ان میں سے بیشتر بزنس مین کروڑ پتی لوگ

تھے اور کچھ سرکاری اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ انہوں نے دُرانی صاحب سے شام کو ایک عزیز کے ہاں ملاقات کرنے کو کہا۔ وہ شام کو وہاں پہنچے۔ خاندان کے بڑے بڑے لوگ تھے۔ ایک نے کہا۔ "کل آپ اپنے والد کے سوم میں نہیں آئے۔ تمام رشتے داروں کو حیرانی ہوئی پھر تمہارے چچا نے بتایا کہ مرحوم اپنی موت سے پہلے آپ کو عاق کر چکے تھے۔ ہمیں سن کر بڑا افسوس ہوا۔"

دُرانی صاحب نے کہا۔ "آپ حضرات سے زیادہ افسوس یہ سن کر مجھے ہوا کہ عاق کئے جانے والی بات بارہ برس بعد بتائی گئی اور میں اس گھر میں کسی رشتے یا تعلق کے بغیر رہتا رہا۔"

ایک چچا زاد بھائی نے کہا۔ "آپ کی شرافت اور دیانت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ سنا ہے آپ بارہ برس کا قرضہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ یہ کوئی قرضہ نہیں ہے۔ کیوں کہ آپ باپ کے نہ سہی چچا کے گھر میں رہتے تھے۔"

"یہ اپنے اپنے سوچنے کا انداز ہے۔ میں گھر داماد کہلانا پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا میں نے جو کچھ کھایا اور پیا اور لیا دیا' وہ سب مجھ پر قرض ہے۔ ان بارہ برسوں میں پچھلے تین برس سے ملازمت کر رہا ہوں۔ اس حساب سے نو برس کا تمام قرض ضرور ادا کروں گا۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "تمہارے ان ہی اصولوں نے تمہیں سیاست میں رہنے نہیں دیا۔ تم اصولوں کے پابند ہو۔ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہمارے چل چلاؤ کا وقت آگیا ہے تو تمہاری دیانت داری سمجھ میں آرہی ہے۔ بے شک قرض ایک پیسے کا ہو یا ایک کروڑ کا' اسے ادا کرنا چاہیے۔"

دوسرے بزرگ نے کہا۔ "تمہارے چچا کہتے ہیں کہ تم فضول خرچ نہیں ہو۔ سادگی سے زندگی گزارتے ہو۔ ہم نے بھی یہی دیکھا ہے۔ ہم سب کا خیال ہے کہ تم نے اپنے چچا کے سالانہ پچیس ہزار روپے خرچ کئے۔ اس حساب سے تم پر نو برس کے دو لاکھ پچیس ہزار قرض ہے۔"

دُرانی صاحب نے کہا۔ "اس سے کئی گنا زیادہ قرض ہے۔ آپ لوگ رعایت کر رہے ہیں۔"

چچا نے کہا۔ "قرض میں وصول کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اتنا ہی قرض ہے اور یہ خاندان کے تمام بزرگوں کا فیصلہ ہے۔ اس سے تم انکار نہیں کرسکتے۔"

دوسرے تمام بزرگ بھی یہی کہنے لگے۔ بعض نے کہا۔ یہ قرض کی رقم ہم سے لے کر اپنے سسر کو ادا کرو تاکہ زاہدہ اور بچوں کے پاس جانے کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

دُرانی صاحب نے کہا۔ "چونکہ یہ خاندان کے تمام بزرگوں کا فیصلہ ہے۔ اس لیے چچا جان کو ہر ماہ پانچ ہزار روپے اپنی تنخواہ سے ادا کروں گا۔ جب دو لاکھ پچیس ہزار کی ادائیگی ہو جائے گی تو میں زاہدہ اور بچوں سے ملنے جایا کروں گا۔ اس سے پہلے بیوی بچے بے شک میرے گھر آسکتے ہیں اور میرے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔"

ایک پھوپھی صاحبہ نے کہا۔ "ہم سب ایک اعلیٰ خاندان کے افراد ہیں۔ ہماری دولت مندی' ہمارا مرتبہ سب جانتے ہیں۔ تم زاہدہ اور بچوں کو کمپنی کے ایک معمولی سے مکان میں رہنے کو کہہ رہے ہو؟"

"آپ اپنی بڑی حیثیت کے مطابق ایسا کہہ رہی ہیں۔ زاہدہ بھی ارب پتی ہے لیکن میں بارہ ہزار روپے کا ماہانہ ملازم ہوں۔ اپنے بیوی بچوں کو اپنی اوقعات کے مطابق رکھوں گا۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف۔"

وہ تھوڑی دیر بحث مباحثہ میں الجھتے رہے پھر ان سب سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ان پر تبصرے اور تنقیدیں ہونے لگیں۔ کسی نے کہا۔ "بڑا دیانت دار بنتا ہے۔ پتا نہیں کس گری پڑی عورت کو بارہ برس سے رکھا ہوا ہے۔"

کسی نے کہا۔ "یہ کبھی ہماری طرح دولت مند نہیں بن سکے گا۔ قرضے ادا کرتے کرتے مر جائے گا۔ بھلا قرضے کبھی ادا کئے جاتے ہیں؟"

"سیاسی قرضے ہوں' زرعی قرضے یا صنعتی قرضے ہوں' یہ سب لیے جاتے ہیں' دیئے نہیں جاتے۔ ان قرضوں کو معاف کرانے کا ہنر ہوتا ہے مگر یہ دُرانی سیاست میں رہ کر بھی یہ ہنر سیکھ نہ سکا۔"

"کچھ لوگ اپنی ذہانت اور صلاحیتوں سے کام لینا نہیں جانتے ان میں سے ایک یہ دُرانی ہے۔"

"آدمی کو جو چیز سب سے پہلے ڈبوتی ہے' وہ ہے اس کی ایمانداری اور دیانتداری۔ بیچارہ!"

ایک نے کہا۔ "بے وقوف کو بے چارہ نہیں کہتے۔ یہ تو حماقت کی انتہا ہے کہ وہ سسر کا قرضہ ادا کر رہا ہے جب کہ سسرال سے ہمیشہ لیا جاتا ہے کبھی دیا نہیں جاتا۔"

دُرانی صاحب گھر آگئے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ فی زمانہ ایمانداری سب سے بڑی حماقت سمجھی جاتی ہے اگر یہ جانتے تب بھی ایمانداری سے باز نہ آتے۔ سچے اصولوں کے پابند تھے۔ اسی لیے عذاب اٹھا رہے تھے۔

انہوں نے دوسرے دن بیٹی کے فون کا انتظار کیا مگر اس کی آواز سننے سے محروم

رہے۔ اس طرح دوسرا تیسرا دن بھی گزر گیا۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ سیما ان کے صبر کو، باپ کی محبت کو آزما رہی ہے۔

وہ دفتر کا کام توجہ سے کرتے تھے اور فون کی طرف بھی دھیان رہتا تھا پھر ایک دن فون پر سیما کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے پوچھا۔ ”کیوں میرے صبر کو آزماتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”ہم ماں بیٹی بھی صبر سے انتظار کر رہی ہیں کہ آپ ہمارے سماجی مرتبے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔“

”میں صائمہ کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنا چاہتا تھا مگر ماہانہ پانچ ہزار قرض ادا کیا کروں گا۔ یہ قرض تقریباً چار برس میں ادا ہوگا۔“

”آپ رقم گنوانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ چار برس میں صائمہ شادی کے قابل ہو جائے گی۔“

”ہاں، میں بری طرح الجھ گیا ہوں۔“

”آپ یوں کہیں کہ بری طرح پستی میں گرتے جا رہے ہیں۔ ایسے وقت ملازمت نہیں، صرف سیاست ہی آپ کے تمام مسائل حل کر سکتی ہے۔“

”تم نے میری بیٹی کے دماغ میں اسی طرح کا زہر بھرا ہے۔ میرے خلاف خوب سکھا پڑھا رہی ہو۔ اس سے بات کراؤ۔“

”وہ اپنی ماں پر ہونے والی زیادتیوں سے بد دل ہے۔ جب تک آپ اس کی اہمیت بڑھانے کے لیے سیاست میں نہیں آئیں گے تب تک وہ آپ سے بات نہیں کرے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ اسے بھی کہہ دینا اس کا باپ کبھی کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ درّانی صاحب کے دن رات بڑی الجھنوں میں گزر رہے تھے۔ ان کے اپنے سگے کئی تھے پھر بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے قرضے کی قسط پانچ ہزار روپے ادا کر رہے تھے۔ کبھی ہوٹل میں اور کبھی گھر میں پکا کر کھاتے تھے۔ کبھی بیمار ہوتے تو بیٹی صائمہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے تھے۔ سادگی سے زندگی گزارنے کے باعث انہوں نے قسطوں کی رقم زیادہ سے زیادہ بڑھا دی۔ اس طرح ڈھائی برس میں تمام قرض ادا کر دیا۔

یوں تین برس گزر گئے۔ ان دنوں اُن کے گھر کی اور ملک کی حالت ایک جیسی تھی۔ ملک شدید سیاسی بحران سے گزر رہا تھا۔ ملک کے صدر اور دو سیاسی پارٹیوں میں زبردست کشمکش جاری تھی۔ زاہدہ بیگم کا تقاضا تھا کہ درّانی صاحب شوہر کی ذمے داریاں

پوری کرنے کے اہل نہیں رہے۔ لہٰذا انہیں اپنی گھریلو سیاست چھوڑ کر سسرالی عالیشان کوٹھی میں آجانا چاہیے۔ دوسری پارٹی لیڈر سیما بیگم کو درّانی صاحب کے گھر سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے اب تک ان کی بیٹی کو ان سے چھپا کر رکھا تھا اور تقاضا تھا کہ وہ سیاست میں آئیں تو بیٹی سے مل پائیں گے۔

انہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ سیاست میں نہیں آئیں گے۔ جب تک غلط سیاسی پالیسیوں پر عمل ہوتا رہے گا، وہ ادھر کا رخ نہیں کریں گے لیکن اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔ پاکستانی سیاست میں وہ تماشا ہوا جو شاید آج تک کسی ملک میں نہ ہوا ہو۔ سیاسی بحران پر قابو پانے کے لیے امریکہ سے ایک وزیراعظم کو امپورٹ کیا گیا۔ وہ وزیراعظم کبھی تیس برس پہلے پاکستانی تھے۔ اتنے طویل عرصے تک پاکستان کی سیاست سے غیر حاضر رہنے والے نے یہاں کے سیاسی بحران پر قابو پانے کی تدابیر پر عمل شروع کر دیا۔

اس عمل کا ایک حصہ یہ تھا کہ خادم ذوالجلال درّانی کو اسلام آباد طلب کیا گیا۔ درّانی صاحب جیسے اور چند دیانتدار افراد ایسے تھے، جنہوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ان سب کی دیانتداری کے ریکارڈز دیکھنے کے بعد ہی انہیں ایک خفیہ اجلاس میں طلب کیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ آئندہ پاکستانی سیاست میں تطہیر کی جائے گی۔ اب تک سیاستداں جو خفیہ طور پر جرائم کرتے رہے، ان پر جرائم کا خاتمہ کیا جائے گا۔“

ایک ریٹائرڈ جج نے پوچھا۔ ”جن سیاستدانوں کے جرائم تاریخی نوعیت کے ہوں گے، جنہیں تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی کیا ان مجرم سیاستدانوں کو عوام کے سامنے بے نقاب کیا جائے گا؟“

جواب ملا ”بے شک۔ آپ ان کی پوشیدہ رکھی ہوئی رپورٹ اور فائلیں پیش کریں۔ کسی کو معاف نہیں کیا جائے گا۔“

ایک سابقہ سیاستداں نے کہا۔ ”بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں، جنہیں ایک خاص مدت تک پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ ایسے معاملات عوام تک پہنچنے نہیں دیتے۔ کیوں کہ عوام کے اندر بھی ملک دشمن عناصر چھپے ہوتے ہیں۔ جیسے حمودالرحمان کمیشن اور اوجڑی کیمپ کی تحقیقاتی رپورٹ وغیرہ کو اس وقت کے حالات کے تحت مخفی رکھنا لازمی تھا مگر بیرونی ممالک کے اخبارات نے ان سانحات کی رپورٹ وغیرہ کو کچھ صحیح اور کچھ غلط انداز میں شائع کیا۔ کیا آپ انہیں پوری صحت اور درستی سے شائع ہونے دیں گے تاکہ پاکستان کی تاریخ کے درست ہونے پر کوئی حرف نہ آئے؟“

جواب ملا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں۔ ماضی میں جن معاملات کو ٹالنے یا معرضِ التوا میں

رکھنے کے لیے کمیشن اور کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں۔ ان سب کی رپورٹیں من عن شائع کی جائیں گی۔"

خادم ذوالجلال درانی نے کہا۔ "میں نے بھی بد دل ہو کر سیاست چھوڑ دی۔ حکمران پارٹی کے بڑے ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم ان کی جائیداد گروی رکھے بغیر اور کسی ٹھوس ضمانت کے بغیر ان کے قرضوں کی درخواستیں منظور کرلیں۔ ایسا ہوتا آیا ہے چونکہ میں اصولوں کے خلاف ایسا نہیں کرسکتا تھا اس لیے میں نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔"

جواب ملا۔ "آپ واپس اپنے عہدے پر آئیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ماضی کے تمام قرض نادہندگان کے نام شائع بھی کئے جائیں گے اور ان سے قرضوں کی وصولی بھی کی جائے گی۔"

جب اتنے ایمان سے اور صداقت سے پہلی بار پاکستان میں سیاست کی ابتدا ہو رہی تھی تو پھر درانی صاحب انکار نہیں کرسکتے تھے۔ ایک مثبت اور ایماندارانہ سیاست کے لیے وہ راضی ہوگئے۔ انہوں نے سابقہ وزارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ نے عوام میں مسرتوں کی ایک نئی لہر دوڑا دی یہ یقین ہوگیا کہ اب سیاست میں دھاندلی نہیں چلے گی۔

سب سے زیادہ خوشی تو ان ماں بیٹی سیما اور صائمہ کو ہوئی۔ بیٹی نے فون پر خوشی سے چیخ چیخ کر کہا۔ "پاپا! میں جانتی ہوں کہ آپ میرے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دے سکتے ہیں۔ آپ نے مجھ سے ملنے اور مجھے گلے لگانے کے لیے دوبارہ سیاست میں قدم رکھا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "تمہاری خوشی بجا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نصیب سے پاکستانی سیاست کا رخ بدل دیا ہے۔ یہ تبدیلی حسبِ ایمان ہے۔ میں ایک نئی سرکاری رہائش گاہ میں مل سکتا ہوں۔ تم اپنی امی کے ساتھ رات کے آٹھ بجے آسکتی ہو۔"

"آپ پلیز ایک منٹ ذرا ہولڈ کریں۔ ابھی بتاتی ہوں۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ وہ اپنی ماں سے فون پر ہونے والی بات کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے باپ سے کہا "پاپا' میں امی کے ساتھ آرہی ہوں۔ ٹھیک آٹھ بجے۔"

فون پر صرف بیٹی سے باتیں نہیں ہوئیں۔ خاندان کے بڑے سرمایہ دار اور دیگر بزرگ بھی انہیں پھر سے وزارت کا عہدہ سنبھالنے پر مبارکباد دینے لگے۔ کچھ خاندانی افراد دفتر میں آکر گلے ملنے لگے۔ چچا بھی آئے۔ انہوں نے داماد کو گلے لگا کر کہا۔ "تم ہیرا

ہو ہیرا۔ جب بھی ملکی سیاست میں انقلاب آئے گا' ہمارے ملک کے اکابرین تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ ہم تمہاری دیانت داری پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ تم نے تو چچا اور سسر کا رشتہ نہیں دیکھا۔ جو قرضہ تم پر عائد کیا گیا' تم نے اسے ادا کردیا۔ ورنہ لوگ سسرال سے لیتے ہیں دیتے نہیں ہیں۔"

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ آرام سے تشریف رکھیں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ "زاہدہ تمہیں یاد کر رہی ہے۔ بچے لندن سے آئے ہوئے ہیں۔ تم گھر پر کب رہو گے۔ وہ ملاقات کے لئے آئیں گے۔"

درانی صاحب نے کہا۔ "مجھے اپنے تمام اپنوں سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔ میں دیر سے گھر جا رہا ہوں کیونکہ یہاں قرض نادہندگان کے ناموں کی فہرست تیار کرارہا ہوں۔ سات بجے گھر جاؤں گا لیکن.........

"لیکن کیا؟ کوئی مجبوری ہے؟"

"مجبوری میری نہیں' آپ حضرات کے لیے ہوگی۔ کیوں کہ آج سیما اور میری بیٹی صائمہ بھی وہاں موجود رہیں گی۔"

چچا کا منہ لٹک گیا۔ پھر انہوں نے کہا۔ "بچے لندن سے آئے ہوئے ہیں۔ وہ تم سے نہیں ملیں گے تو مایوس ہوجائیں گے۔ یوں کرو سیما اور صائمہ کو کل بلوالو' آج ہمارے ساتھ وقت گزارو۔"

"میں آپ سے پہلے اپنی بیٹی کو ملاقات کا وقت دے چکا ہوں۔ وہ آج آئے گی۔ ہوسکتا ہے میرے پاس ہی رہ جائے اور میں بھی اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہوں گا۔"

"بیٹے! یہ تم ناانصافی کی بات کر رہے ہو۔ زاہدہ تمہاری پہلی بیوی ہے' پہلے اسے بچوں کے ساتھ تمہارے پاس آنا چاہیے۔"

"آج کیوں آنا چاہیے؟ اس لئے کہ وہ ایک منسٹر درانی کی رہائش گاہ ہے؟ آپ کی صاحبزادی اپنے شوہر سے ملنے آئے گی یا ایک وزیر سے؟"

"بیٹے! تم اس کے شوہر پہلے ہو وزیر بعد میں۔"

"تو پھر یہ شوہر ساڑھے تین برس تک ایک کمپنی کے مکان میں رہا' وہ ملنے کیوں نہیں آئی؟"

"تمہیں یہ احساس دلانے کے لئے ہماری دنیا میں اونچی سوسائٹی اور اونچے مرتبے کی قدر ہوتی ہے۔ تمہاری وہ سیما بھی تمہیں اسی لئے چھوڑ گئی تھی۔"

"میں کسی سیما کو اہمیت نہیں دیتا صرف اپنی بیٹی صائمہ سے ہونے والی ناانصافی کو مدِ نظر رکھتا ہوں۔ وہ زاہدہ کے بچوں کی طرح ارب پتی نہیں کہلائے گی لیکن ایک وزیر کی بیٹی ہونے پر فخر کیا کرے گی۔"

میں تم سے بحث نہیں کروں گا لیکن تم ایک رات کا کھانا کھانے زاہدہ کے پاس تو آسکتے ہو۔"

"بے شک آؤں گا۔ وہ میری شریکِ حیات ہے۔ اپنے بچوں سے ملنا چاہتا ہوں' کل فون پر بتاؤں گا کہ کس رات آسکوں گا۔"

چچا چلے گئے۔ اس رات درّانی صاحب نے اپنی صائمہ بیٹی کو تقریباً چار برس بعد دیکھا تو خوش ہوئے اور حیران بھی۔ ان چار برسوں میں وہ جوان ہوگئی تھی۔ سولھویں سال میں تھی۔ سیما نے کہا۔ "میں نے دشمن بن کر بیٹی کو آپ سے جدا نہیں کیا تھا۔ آج آپ خود فیصلہ کریں کہ میں نے بھلائی کی تھی یا نہیں۔ بیٹی کی جدائی نے آپ کو پھر وزیر بنا دیا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "میرے سامنے بیٹی کو صحیح سوچ دو' اسے بتاؤ کہ اس کا باپ مر سکتا ہے مگر منفی سیاست نہیں کر سکتا۔ بیٹی کو بتاؤ کہ میں زاہدہ سے زیادہ تمہیں چاہتا ہوں۔ اسی لئے زاہدہ پر تمہیں سوکن بنا کر لایا' تم پر زاہدہ کو سوکن نہیں بنایا۔ مگر تم ایک سیاستداں چوہدری سے مل کر مجھے بے ایمان اور امانت میں خیانت کرنے والا بنانا چاہتی تھیں۔"

سیما نے کہا۔ "آپ بیٹی کے سامنے مجھے فریبی کہہ رہے ہیں۔"

"تم نے بھی میری عدم موجودگی میں میری بیٹی کے اندر میرے خلاف زہر بھر دیا ہے۔"

صائمہ کہا۔ "پاپا! اتنے عرصے کے بعد امی سے مل کر پھر جھگڑا کر رہے ہیں۔"

"میں جھگڑا نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں۔ ماضی میں چند سیاستدانوں نے تمہاری ماں کو آلۂ کار بنایا تھا تاکہ میں انہیں دو کروڑ کا قرضہ دوں تو وہ لوگ بھی درجنوں کی تعداد میں مجھ سے بڑے بڑے قرضے لے سکیں۔ جب مجھے اس سازش کا علم ہوا تو میں نے تمہاری ماں کا دو کروڑ کا چیک کینسل کرادیا۔"

صائمہ نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ والدین ایک ہی بات دو طرح سے کریں تو اولاد ماں کے اور باپ کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی۔"

سیما نے کہا۔ "آپ ایک طویل عرصے بعد بیٹی سے ملاقات کرکے اسے ذہنی الجھن

میں مبتلا کر رہے ہیں۔ آج خوشی کی رات ہے۔ ہمیں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔"

"درست کہتی ہو۔ میں بھی صرف ایک بات کہوں گا۔ اس کے بعد ہم ماضی کو بھول کر نئی زندگی شروع کردیں گے۔ اور وہ یہ بات ہے کہ سچائی کبھی منہ نہیں چھپاتی جھوٹ بولنے والے ساتھ چھوڑ کر منہ چھپاتے ہیں۔ بس اب ماضی کا قصہ ختم کرو اور یہ بتاؤ کہ میں نے تمہاری ضد پوری کی۔ سیاست میں آگیا۔ اب میری بیٹی میرے ساتھ رہے گی یا نہیں اور بیٹی کے ساتھ تم بھی؟"

سیما نے کہا۔ "ہم ماں بیٹی آپ کے ساتھ رہیں گے۔"

فیصلہ ہوگیا۔ صائمہ کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس رات اس نے اپنی کئی سہیلیوں سے فون پر گفتگو کی اور انہیں خوش خبری سنائی کہ اس کے پاپا وزیر بن گئے ہیں اب وہ اپنے پاپا کے ساتھ رہتی ہے۔

رات کو ایک الگ بیڈ روم میں سیما نے بیٹی سے کہا۔ "میں تمہارے پاپا کے پاس جا رہی ہوں اور یہ بات پھر اچھی طرح سمجھاتی ہوں۔ اپنے پاپا کو کبھی نہ بتانا کہ میں نے پچھلے چار برس تک تمہیں کہاں چھپا کر رکھا تھا۔ وہ اپنی صفائی میں میرے خلاف جو کہتے ہیں انہیں کہنے دو۔ مجھے تمہارا ایک شاندار مستقبل بنانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔"

وہ بیٹی کو اپنے طور پر سمجھا کر درّانی صاحب کے پاس آگئی۔ وہ دوسری رات زاہدہ اور بچوں سے بھی ملنے گئے تھے۔ ان کی دونوں بیویاں اور دوست احباب اکثر پوچھا کرتے تھے کہ یہ وزارت محض عبوری حکومت تک رہے گی یا وہ الیکشن کے بعد بھی اس عہدے پر رہیں گے۔

وہ جواب دیتے۔ "اب میں سیاست میں آگیا ہوں تو اپنے علاقے سے ضرور الیکشن لڑوں گا۔ باقی اللہ مالک ہے۔"

عبوری حکومت پر بھی اچھی اور بُری آرا قائم کی گئیں مگر اس حکومت کے ایک کارنامے نے بتادیا کہ اس ملک کے حکمران بننے والے سیاستدان ہر دور میں کس طرح ملکی خزانہ لوٹتے رہے ہیں اور قرضے لے لے کر خزانہ خالی کرتے رہے ہیں اور ملکی اخراجات پورے کرنے کے لئے بیرونی ممالک سے قرضے لیتے رہے ہیں۔

درّانی صاحب نے دن رات کی محنت سے قرض نادہندگان کے نام اور قرضوں کی رقومات کی تفصیلات کے ساتھ ایک لمبی فہرست تیار کرلی تھی۔ ان کی یہ محنت کس حد تک رنگ لائی؟ جن نادہندگان کی فہرست تیار کی گئی تھی ان میں سے بیشتر کے نام شائع ہونے سے رہ گئے۔

انہوں نے پوچھا۔ ”یہ باقی نام شائع کیوں نہیں کئے گئے؟“

جواب ملا۔ ”ان نادہندگان نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے نام پوشیدہ رکھے جائیں تو وہ مخصوص مدت میں تمام قرضے ادا کردیں گے۔ یہ بڑے بااثر افراد ہیں۔ انہیں ناراض کئے بغیر قرضے واپس مل جائیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔“

درانی صاحب اس جواب سے مطمئن ہوگئے تھے۔ وصولی کی یقین دہانی ہوچکی تھی اور اخبارات میں جن نادہندگان کے نام شائع ہوچکے تھے‘ انہیں وارننگ دی گئی تھی کہ جو قرض ادا نہیں کرے گا‘ اسے انتخابات میں حصہ لینے نہیں دیا جائے گا۔ پھر آنے والی نئی حکومت ان کے خلاف کارروائی کرے گی۔

ایک رات سیما‘ صائمہ اور درانی صاحب کھانے کی میز پر تھے۔ سیما نے کہا۔ ”میرا بھی قرضہ آپ پر ہے۔ دو کروڑ کا چیک میرے نام جاری ہوچکا تھا لیکن آپ نے اسے کیش ہونے نہیں دیا۔ اب آپ پھر قرضے کی درخواست منظور کرسکتے ہیں۔“

انہوں نے کہا۔ ”تم جانتی ہو گروی رکھنے کے لئے میرے پاس جائیداد نہیں ہے اور میں اصولوں کے خلاف درخواست منظور نہیں کروں گا۔“

”میں اپنے لئے نہیں‘ ہماری بیٹی کے لئے مانگ رہی ہوں۔ آپ کی بیٹی صائمہ قرضے کی درخواست دے گی۔“

”صائمہ نادان نہیں ہے۔ یہ دیکھ رہی ہے کہ حکومت قرض لینے والوں سے سختی کے ساتھ نمٹنے والی ہے۔ یہ میری دن رات کی محنت کو بھی سمجھ رہی ہے کہ میں نادہندگان کے نام وصولی کے نوٹس جاری کر رہا ہوں۔ ایسی صورت میں خود قرضہ لینا اور وہ بھی اصولوں کے خلاف لینا سراسر بد دیانتی ہے۔ ہمارے خلاف بھی محاسبہ ہوگا۔“

صائمہ نے کہا۔ ”امی! ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ قرضہ لیا جائے۔ آپ پاپا سے جھگڑا نہ کریں۔“

سیما نے کہا۔ ”بیٹی! تم اس توہین کو نہیں سمجھ رہی ہو کہ کس طرح میرا چیک کینسل ہونے کے بعد تمہاری سوتیلی ماں کی جیت ہوئی تھی۔ وہ بدستور ارب پتی ہے اور ہم کنگال ہیں۔“

”میرے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ میں ایک منسٹر کی بیٹی ہوں۔“

”تمہارے پاپا ہمیشہ منسٹر نہیں رہیں گے مگر وہ زاہدہ ہمیشہ دولت مند رہے گی۔ ہم ماں بیٹی پھر اس مقام پر پہنچ جائیں گے‘ جہاں سے گزر کر آئے ہیں۔“

درانی صاحب کھانا چھوڑ کر چلے گئے۔ اب اس گھر میں صاحبِ دولت بننے کا جھگڑا

شروع ہوچکا تھا۔

عبوری حکومت کی مدت پوری ہوگئی۔ انتخابات کے نتیجے میں ایک نئی حکومت قائم ہوگئی۔ درانی صاحب اپنے حلقے سے کامیاب ہوئے تھے اور حکمران پارٹی میں تھے لہٰذا ان کی وہ وزارت بحال رہی۔

نئی حکومت کے سامنے بے شمار مسائل تھے۔ ان مسائل کے درمیان قرضوں کی وصولی کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ رہا تھا۔ درانی صاحب نے کئی بار اوپر تک یاد دہانی کرائی کہ نادہندگان سے وصولی کے بعد ملکی خزانہ اتنا ہوگا کہ ہمیں بیرونی ممالک سے سود پر قرضہ نہیں لینا پڑے گا لیکن ان کے نوٹس کا جواب کبھی تو ملا نہیں اور کبھی تسلیاں ملیں۔ وہ حیران ہو رہے تھے کہ اتنے اہم معاملے کو پسِ پشت کیوں ڈالا جارہا ہے؟

پھر انہوں نے دیکھا کہ جن پر پابندیاں عائد کی گئیں تھیں کہ جب تک وہ قرض ادا نہیں کریں گے انتخابات میں حصہ نہیں لے سکیں گے‘ وہ لوگ اسمبلیوں میں پہنچے ہوئے تھے۔ کچھ حکمران پارٹی میں تھے اور کچھ اپوزیشن میں تھے۔

ایک سیاستداں نے سمجھایا۔ ”درانی صاحب! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ فہرست آپ نے مرتب کی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ پارٹی کوئی سی بھی ہو‘ سب کے بااثر بندوں نے قرضے لئے ہیں اور یہ سب کے سب ایک اسمبلی میں نہیں‘ ایک حمام میں بیٹھے ہیں۔ یہاں کوئی کسی کو ننگا کہہ کر قانونی کارروائی نہیں کرسکتا۔ کرے گا تو وہ ننگا بھی اس کا ننگا پن ظاہر کردے گا۔“

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اس سیاستداں نے سمجھایا۔ ”آپ نے برسوں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اب عقل سے کام لیں‘ اپنے لئے بھی پانچ دس کروڑ بنالیں۔ میرا تعلق وزارتِ خارجہ سے ہے۔ میں آپ کو خوشخبری سناتا ہوں کہ ورلڈ بینک نے ہمیں قرضہ دینا منظور کرلیا ہے۔ بڑے ممالک کے دیگر مالیاتی ادارے بھی کچھ نہ کچھ دے رہے ہیں۔ بینک دولت پاکستان خالی نہیں رہے گا۔ ہماری چاندی ہوگی۔ صرف اگلے بجٹ میں مہنگائی بڑھے گی۔ وصولی تو عوام سے ہی کرنی ہے۔“ وہ کوئی جواب نہ دے سکے حیرت سے انہیں دیکھتے رہے۔

اس رات وہ نڈھال سے ہو کر سر جھکائے اپنی رہائش گاہ میں آئے تو وہاں بیوی اور بیٹی نہیں تھیں۔ انہوں نے ملازم سے پوچھا۔ تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ دروازے پر اجل نواز کی آواز سنائی دی۔ ”حضور! سلام عرض کرتا ہوں۔“

انہوں نے چونک کر پوچھا۔ ”اجل نواز! تم ہو؟ کب آئے؟“

"میرے آنے کا وقت ہو رہا تھا اس لئے چلا آیا۔ آج شام کو آیا تو بیگم صاحب نے یہ لفافہ آپ کو دینے کو کہا۔"

درّانی صاحب وہ لفافہ لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ اسے کھول کر اندر سے تہہ کئے ہوئے دو کاغذات نکالے۔ پہلے کاغذ کو کھولا۔ سیما نے انہیں مخاطب کرکے لکھا تھا۔

"درّانی صاحب! میں پھر اپنی اور آپ کی بیٹی صائمہ کو لے جارہی ہوں۔ وہیں' جہاں پہلے لے گئی تھی۔ میں نے صائمہ کو اپنی جان کی قسم دی تھی کہ ہم ماں بیٹی نے چار برس جہاں گزارے ہیں' وہ ہرگز آپ کو کبھی نہ بتائے۔

وہ آپ کو دل و جان سے چاہتی ہے مگر اس نے میری قسم رکھ لی۔ آپ نے تنہائی میں اس سے پوچھا تو اس نے آپ کو ایک غلط پتا بتادیا مگر اب میں بتادوں کہ اپنی ایک خالہ زاد بہن اور ماموں کے ہاں رہا کرتی تھی۔ آج بھی صائمہ کو وہاں لے جارہی ہوں۔ شاید یہ سن کر آپ کا کلیجا پھٹ پڑے کہ اس جگہ کو بازارِ حسن کہتے ہیں۔

میں نے پچھلے چار برسوں میں بیٹی کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اسے تھوڑا سائر سنگیت اور گھنگھرو باند کر تھرکنا سکھایا ہے۔ میری خالہ زاد بہن کی اور ماموں کی بیٹیوں نے بھی یہی کیا۔ کیوں کہ بینکوں سے قرضے کی صورت میں جو دولت آتی ہے' وہ اکثر یہیں آتی ہے۔ مجرا سننے والے ہزاروں لاکھوں ہر رات لٹا کر جاتے ہیں۔

زاہدہ اور اس کے بچے دولت سے کھیلیں۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ ایک کنگال دیانت دار وزیر کے ساتھ رہوں اور وہ وزارت کی مدت پوری کرکے ہمیں صرف محتاجی دے۔ یہ حماقت میں نہیں کروں گی۔

میں نے بیٹی کے جوان ہونے تک آپ کو مختلف طریقوں سے سمجھایا لیکن آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے' جس پر چل کر میرے رشتے داروں کی بیٹیاں کروڑ پتی نہ سہی لکھ پتی بن گئی ہیں۔ ان کے پاس کوٹھیاں ہیں۔ کاریں ہیں اور آہیں بھرنے والے رئیسوں کی قطاریں لگی ہیں۔

میری بیٹی ان سب خالہ زاد اور ماموں زاد بہنوں سے زیادہ حسین اور دل نشین ہے۔ آخر آپ کا خون ہے۔ آپ کو یہ سمجھادوں کہ اپنے بہت بڑے سرکاری عہدے کا فائدہ اٹھا کر مجھ سے میری بیٹی کو چھین لینے کی حماقت نہ کریں۔ اس میں آپ کی بدنامی ہوگی۔ اول تو میں عدالت میں بیان دوں گی کہ وہ آپ کی بیٹی نہیں ہے۔ دوم اخبارات میں اس موضوع کو اچھالا جائے گا کہ صائمہ کون ہے؟ آپ کا پورا باعزت خاندان آپ کے پیچھے پڑ جائے گا۔ اس دنیا میں کون سی بات یقین سے یا بے یقینی سے کہی جاسکتی ہے؟

جب پورے ملک میں یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کس نے قرضہ لیا ہے؟ کس نے ادا کیا ہے؟ اور کس نے ادا نہیں کیا ہے تو پھر یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ صائمہ درّانی کسی وزیر کی بیٹی ہے یا نہیں؟

اگر وزیر کی بیٹی ہے تو ایک وزیر کی اوقعات کیا ہے؟ اور اگر بیٹی نہیں ہے تو آپ کا ضمیر اور آپ کا ایمان اسے بیٹی یقین سے کہتا رہے گا۔

آپ پیچیدہ در پیچیدہ معاملات میں الجھتے جائیں گے۔ آپ کو الجھنوں سے نکالنا میرا فرض ہے۔ میں آپ کو ایک پُرسکون زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں اور یہ تب ہی ممکن ہے' جب آپ کی بیٹی عزت آبرو سے زندگی گزارے گی۔

اس لفافے میں جو دوسرا کاغذ ہے۔ اسے صائمہ نے لکھا ہے اور یہ پانچ کروڑ روپے کے قرضے کی درخواست ہے۔ آپ یہ درخواست منظور کرلیں گے۔ مطلوبہ رقم کا چیک جاری کرادیں گے اور وہ چیک کیش ہوجائے گا تو آپ کی بیٹی عزت آبرو سے زندگی گزارنے کے لئے آپ کے پاس آجائے گی۔

اگر آپ نے نامنظور کیا۔ کل ہمیں چیک نہ ملا اور وہ پرسوں کیش نہ ہوا تو پرسوں رات کو اُس بازار میں صائمہ درّانی کا پہلا مجرا ہوگا۔

درّانی صاحب! ہماری پہلی ملاقات حمام میں ہوئی تھی۔ ہماری بیٹی بھی حمام میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ ساری دنیا ایک حمام ہے۔ یہاں کسی کو اس کا ننگا پن نظر نہیں آتا۔ ایسا شخص خود کو ملبوس شریف سمجھتا ہے۔ جبکہ وہ دو کوڑی کا حریف ہوتا ہے۔

یہ حکومت ہو یا وہ حکومت ہو کوئی کسی کو نادہندہ نہیں کہے گا۔ آپ پر بھی کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔ لوگ دوسروں کی بیٹیاں خریدنے کے لئے قرضہ لیتے ہیں۔ کیا آپ اپنی بیٹی کی آبرو رکھنے کے لیے قرضہ منظور نہیں کریں گے؟ آپ کی ایک دستخط مٹی کو سونا بناسکتی ہے۔

اگر آپ بیٹی کو مٹی میں ملانا چاہتے ہیں تو میں پرسوں رات دس بجے صائمہ درّانی کے پہلے مجرے کی دعوت دے رہی ہوں۔ فقط' آپ کی مجبور شریکِ حیات' سیما درّانی۔"

خط کی تحریر ختم ہوگئی۔ وہ جوں کے توں اس خط پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سیما کا اور اس کے رشتے داروں کا تعلق بازارِ حسن سے ہوگا۔ بعض لوگ ساری زندگی گزارنے کے بعد سمجھتے ہیں کہ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی ایک اندھے کی طرح رہے پھر یہ کہ جو شریف اور دیانت دار ہوتے ہیں' وہ زیادہ خوش اور فریبی نہیں ہوتے۔ دوسروں کو بھی ہم مزاج سمجھ کر دھوکا کھاتے رہتے ہیں۔

جو کچھ بھی ہوا تھا' ہو رہا تھا اور ہونے والا تھا اس میں ایک ہی بات اہم تھی کہ صائمہ' دُرّانی صاحب کا خون بھی تھی ان کی بیٹی بھی تھی' اگر وہ اس حقیقت کو جھٹلانے کے لئے یہ سوچتے کہ سیما جیسی عورتیں ناقابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ بچہ کسی اور کا ہوتا ہے' نام کسی کا دے دیتی ہیں تو محض بہلاوا ہوتا۔

لیکن یہ تو صرف بازاری عورت کی بات نہیں ہے اچھے اچھے گھرانوں کی عورتیں بھی ایسا کرسکتی ہیں۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ دنیا کی کوئی سی بھی عورت جس مرد کی طرف انگلی اٹھادے' وہی اس کے بچے کا باپ ہوتا ہے اور دُرّانی صاحب تو ہر بات خدا پر چھوڑتے تھے۔ سیما قانونی گرفت سے بچنے کے لئے جھوٹ کہہ سکتی تھی مگران کا ایمان کہتا تھا کہ صائمہ اُن کی اور صرف اُن کی بیٹی ہے۔

وہ رات بھر بڑے بے چین رہے۔ نیند اُڑ گئی تھی۔ اجل نواز نے چائے لاکر دی اور کہا۔ "جب جاگنا ہی ٹھہرا تو پھر چائے پیتے رہیں اور سوچتے رہیں۔ شاید مسئلے کا کوئی حل نکل آئے۔"

انہوں نے چائے کی پیالی لے کہا۔ "کیا تم میرا مسئلہ جانتے ہو؟"

"میں مسئلہ نہیں جانتا۔ صرف آپ کے چہرے سے پریشانیاں پڑھ رہا ہوں۔"

وہ خاموشی سے چائے پینے لگے پھر انہوں نے پیالی خالی کرنے کے بعد اسے دیتے ہوئے کہا۔ "اجل! پتا نہیں کیوں تمہیں قریب پاکر یوں لگتا ہے جیسے مجھے تمام مسائل سے نجات مل جائے گی۔"

وہ خالی پیالی لے جاتے ہوئے بولا۔ "صرف موت ہی ہے جو انسان کو تمام مسائل سے نجات دلاتی ہے۔"

وہ اپنی خواب گاہ میں آگئے۔ وہاں جاگتے رہے۔ حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔ وہ وقت پر اپنے دفتر پہنچے۔ اپنی لاڈلی اور مظلوم بیٹی کا معاملہ ذہن پر مسلط تھا۔ وہ اسے مظلوم اس لئے سمجھتے تھے کہ اس کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے آج تک کچھ کر نہیں پائے تھے حتیٰ کہ اتنے بڑے عہدے پر ہو کر بھی بیٹی کے پیروں سے گھنگھرو اتارنے کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ بس ایک ہی راستہ تھا کہ بیٹی کے قرضے کی درخواست منظور کرلیتے۔

انہوں نے لفافہ کھول کر بیٹی کی لکھی ہوئی درخواست نکالی۔ بڑے پیار سے اس کی تحریر کو دیکھا پھر اسے آنکھوں سے لگایا۔ اسے الگ کیا تو وہ درخواست آنسوؤں سے ذرا بھیگ گئی۔ اس صدمے کو کوئی شریف انسان سمجھ سکتا تھا جس کی بیٹی گناہ کے بازار میں پہنچ گئی ہو۔

یہ ایمان پتھر جیسا سخت ہوتا ہے۔ یہ جب آدمی کو آزمائشی مار مارتا ہے تو اس پتھر کی چوٹ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ ایسے میں ایمان ڈگمگا جاتا ہے پھر آدمی وہ کرتا ہے جو نہیں کرنا چاہیے۔

انہوں نے قلم اٹھایا پھر بیٹی کی درخواست پر ریمارکس لکھنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے بینک کے ڈائریکٹر کو طلب کیا۔ اس سے کہا۔ "میں نے یہ درخواست منظور کرلی ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو پانچ کروڑ روپے کا چیک بنوا کر لے آؤ۔"

وہ حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ انہوں نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا پھر اسے تہہ کرکے جیب میں رکھ لیا۔

ایک گھنٹے کے اندر پانچ کروڑ روپے کا چیک آگیا۔ انہوں نے اسے جیب میں رکھا پھر دفتر سے باہر آئے۔ اجل نواز نے ان کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بولا۔ "کہاں چلوں؟"

انہوں نے کہا۔ "اسٹیٹ بینک۔"

کار آگے بڑھ گئی پھر مختلف راستوں سے گزر کر اسٹیٹ بینک پہنچ گئی۔ دُرّانی صاحب نے اندر جاکر منیجر سے ملاقات کی۔ ایک وزیر کے آنے سے پورے بینک میں ہلچل سی مچ گئی۔ انہوں نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر منیجر کو دیتے ہوئے کہا۔ "اس پر عمل ہونا چاہیے۔"

پھر انہوں نے فون پر بیٹی سے رابطہ کیا اور کہا۔ "تمہاری درخواست پر تمہارا موجودہ پتا اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ میں ابھی تمہارا مطلوبہ چیک لے کر آرہا ہوں۔"

صائمہ نے کہا۔ "اوہ پاپا! آپ اس محلے میں نہ آئیں۔"

"بیٹی! کیوں نہ آؤں؟"

"یہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ اس ملک کے وزیر ہیں۔ چیک کیش ہونے کے بعد میں آپ کے پاس آجاؤں گی۔"

"نہیں۔ اپنی ماں کے ساتھ انتظار کرو۔ میں ابھی آرہا ہوں۔"

انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ باہر آکر اجل کو بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ نہ بتاتے تب بھی وہ جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے اور کیا کر گزرنا ہے۔

کار اسٹارٹ ہونے سے پہلے انہوں نے کہا۔ "میری گاڑی سے پرچم اتار دو۔ جہاں ہم جارہے ہیں' وہاں پرچم کے تقدس پر حرف نہیں آنا چاہیے۔"

حکم کی تعمیل ہوئی۔ وزیر کی گاڑی سے پرچم ہٹا دیا گیا۔ وہ باپ بن کر اس کوٹھے پر

پہنچ گئے جہاں ماں بیٹی اور ان کے کچھ بازاری رشتے دار ان کے منتظر تھے۔ صائمہ باپ کو دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئی پھر بھیگی ہوئی آنکھوں سے بولی۔ "پاپا! آپ سے کچھ لینے سے پہلے یہ کہہ دینا چاہتی ہوں کہ میں دولت مند باپ کی بیٹی نہیں ایک ذہین اور ایماندار وزیر کی بیٹی کہلانا چاہتی ہوں۔ امی نے مجھے وہ درخواست لکھنے پر مجبور کیا تھا۔"

"پھر تو بیٹی! تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ باپ تمہاری درخواست نامنظور کرے تو ماں تمہیں سر بازار نچا سکتی ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ بھی سمجھ رہی ہوں کہ آپ اپنے خون کو رُسوا ہونے نہیں دیں گے۔"

انہوں نے جیب سے پانچ کروڑ کا چیک نکال کر سیما کو دیتے ہوئے کہا۔ "تم نے الزام لگایا تھا کہ میں نے زاہدہ کے بہکانے میں آکر دو کروڑ کا چیک کینسل کرادیا تھا۔"

سیما نے کہا۔ "میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ آپ نے مجھے سوکن کے مقابلے میں کنگال کر دیا تھا۔"

انہوں نے کہا۔ "سیما بیگم! کل جب بینک جاؤ گی تو یہ پانچ کروڑ کا چیک بھی کیش نہیں ہو گا۔"

"آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ آپ میرے ساتھ ظلم کرسکتے ہیں' اپنی بیٹی کے ساتھ نہیں کرسکتے۔"

"میں نے پہلے بھی ظلم نہیں کیا تھا انصاف کیا تھا۔ اب بھی انصاف کر رہا ہوں۔ اپنی بیٹی کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میرا ایمان اور دیانتداری جو کہتی ہے' میں وہی کرتا ہوں۔ بیوی اور بیٹی کا رشتہ نہیں دیکھتا۔ میں نے اپنے ابو مرحوم سے بھی یہ نہیں پوچھا کہ دوسری شادی جرم نہیں تھی پھر مجھے اربوں روپے کی جائیداد سے محروم کیوں کیا گیا۔ میرے ساتھ جو ہوتا ہے' اسے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش سمجھتا ہوں۔"

سیما نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ چیک کیش نہیں ہوگا۔"

انہوں نے اس سے چیک لیا اور پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے۔ سیما نے غصے سے کہا۔ "میں بھی تمہاری خاندانی عزت کی دھجیاں اُڑادوں گی۔ اسی جگہ خادم ذوالجلال درانی کی بیٹی مجرا کرے گی۔"

صائمہ نے کہا۔ "میں بچپن سے پاپا کی نیک نامی سنتی آرہی ہوں۔ کل آپ نے مجھ سے قرضے کی درخواست لکھوائی تھی تو میں اندر سے سہمی ہوئی تھی۔ امی! آپ سے نہیں پاپا کے ایمان سے سہمی ہوئی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اگر پاپا نے وہ درخواست منظور نہ کی تو

آپ ضد میں آکر ضرور مجرا کرادیں گی تب میرے دیانتدار باپ کی عزت کا کیا بنے گا۔"

سیما نے کہا۔ "کچھ نہیں بنے گا۔ تم یہ سمجھ لو کہ یہ تمہارا باپ نہیں ہے۔"

"یہی میرے پاپا ہیں۔ میرا ایک ہی باپ ہے اور میرے پاس ثبوت ہے کہ میں خادم ذوالجلال درانی کی بیٹی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ان سے دور گئی۔ اپنے گریبان سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی پھر اسے کھول کر اس کا تمام رقیق مادہ اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ ماں نے چیخ کر پوچھا۔ "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

باپ نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لیا۔ وہ بولی۔ "میں درانی کی بیٹی ہوں۔ مجھے اپنے باپ کے ایمان کی پختگی کا پورا یقین تھا اور میں یہ جانتی تھی کہ مطالبہ پورا نہ ہوا تو ماں ہم باپ بیٹی کی شرافت کو تماشا بنادیں گی۔ میں نے گھنگرو پہننے سے پہلے ہی یہ زہر کی شیشی چھپا کر رکھ لی تھی۔"

ایسا کہنے کے بعد اس نے ابکائی سی لی۔ اس کے منہ سے لہو نکلنے لگا۔ درانی صاحب نے بیٹی کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر پکارا۔ "اجل! گاڑی کو دروازے پر لاؤ۔"

اجل نواز نہیں آیا۔ اس نے آنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ خاموشی سے صائمہ کی روح قبض کی اور واپس چلا گیا۔

سیما نے چھاتی پیٹ کر روتے ہوئے درانی سے کہا۔ "تم باپ نہیں قصائی ہو۔ تم نے بیٹی کو کچھ نہیں دیا صرف موت دی ہے۔"

انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ بیٹی مجرا کرے گی تو ہمارے خاندان کا شجرہ داغ دار ہوجائے گا لیکن اپنی زمین اور اپنے وطن کا بھی ایک شجرہ ہوتا ہے جو سیاسی دیانت داری سے پھلتا اور پھولتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ خواہ کچھ ہوجائے ایک مجرا کرنے والی بیٹی کا باپ کہلاؤں گا لیکن اصولوں کے خلاف ملکی خزانے سے ایک پیسہ بھی قرض کے طور پر کسی کو نہیں دوں گا۔

"دیکھو' میری آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں کیوں کہ اس جوان بیٹی نے سیاسی دیانتداری کو قائم رکھنے کے لئے اپنی جان دے کر ثابت کردیا ہے کہ ہماری جوان نسل آئندہ پاکستان کا قومی خزانہ لوٹنے کی کسی کو اجازت نہیں دے گی۔ ایسے تمام سیاسی حمام توڑ دے گی جہاں مفاد پرست اپنا ننگا پن قوم سے چھپاتے ہیں۔"

=========ختم شد=========